سالگرہ نمبر

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جنوری 2013

نگران اعلیٰ
معراج رسول

www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 42 • شمارہ 01 جنوری 2013 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

انشائیہ

نیا سال

جون ایلیا

ہم ایک نیا سال شروع کر رہے ہیں۔اس سال میں ہمیں پاکستان کی تاریخ کے حساب سے پچھلے سالوں کا حساب دینا ہے۔

نئے سال اور پرانے سال' کے کوئی معنی نہیں ہیں۔زمانے میں نہ لمحے ہیں' نہ ساعتیں' نہ دن ہیں' نہ ہفتے' نہ مہینے ہیں اور نہ سال۔ زمانہ ایک لمحہ بھی ہے اور لمحے کا ہزارواں حصہ بھی۔زمانہ ازل بھی ہے اور ابد بھی۔زمانہ ہی وہ سب کچھ ہے' جو ہے۔

زمانہ وجود اور عدم کا ایک سمندر ہے۔ایک بے کنار اور بے کراں سمندر' جس میں ہم بہہ رہے ہیں' ڈوب رہے ہیں اور ابھر رہے ہیں۔پھر بھی ہمارا جسم ہے کہ نہیں بھیگتا۔ہمارے کپڑے ہیں کہ خشک رہتے ہیں۔زمانہ ہمارے دائیں بھی ہے اور بائیں بھی۔زمانہ ہمارے سامنے بھی ہے اور پیچھے بھی۔زمانہ ہمارے اوپر بھی ہے اور ہمارے نیچے بھی۔زمانہ ہمارے اندر بھی ہے اور ہمارے باہر بھی۔ہمارا بدن اور ہماری روح زمانے کے سوا اور کیا ہیں؟ وہ جو مل رہے ہیں اور وہ جو بچھڑ گئے ہیں۔وہ کون ہیں' وہ کون تھے؟ میں اور تم' جو ایک دوسرے میں سانس لے رہے ہیں۔میں اور تم جو ایک دوسرے کا سکھ بھی ہیں اور دکھ بھی۔آخر ہم کون ہیں؟ وہ جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں' وہ جو ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتے تھے' وہ جو ایک دوسرے کی جدائی میں مر جاتے تھے اور رسائی میں جی اٹھتے تھے' وہ کون تھے؟ کون تھے وہ' کیا وہ زمانے کے سوا کچھ اور تھے؟

زمانہ ہی تو ہے جو ہمیں مارتا ہے اور ہمیں جلاتا ہے۔زمانہ ہی تو ہے جو ہمارے ساتھ رہتا ہے اور ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔زمانہ ہی تو ہے جو گزرتا ہے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور زمانہ ہی تو ہے جو کبھی نہیں گزرتا۔ہاں' زمانہ کبھی نہیں گزرتا۔کیا تم نہیں دیکھتے کہ ستارے ہیں اور ہیں۔کہکشاں ہے اور ہے۔پہاڑ ہیں اور ہیں۔سمندر ہے اور ہے۔کیا تم کائنات کو بدلتے ہوئے دیکھتے ہو؟ کیا سورج کبھی نکلتا ہے اور کبھی نہیں نکلتا؟ کیا چاند کبھی ڈوبتا ہے اور کبھی نہیں ڈوبتا؟ یہی تو زمانہ ہے جو ہے اور سب کچھ ہے۔یہی تو زمانہ ہے جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

جب تم سب کچھ کہنا چاہو اور بس ایک ہی لفظ کہہ سکو تو کہہ دو' زمانہ۔اور جب تم کچھ بھی نہ کہنا چاہو اور سب کچھ کہہ سکو تو بس ایک لفظ کہہ دو' زمانہ۔ہماری اور تمہاری ساری زباں دانی اور نکتہ سامانی' اس ایک لفظ کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہے؟

ہم جو لمحہ بھی گزار رہے ہیں وہ آخری لمحہ ہے۔زندگی اور آرزومندی کا آخری لمحہ۔اور یوں تو لمحوں کا حساب اور شمار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ہم گزرتے رہیں گے اور گزر جائیں گے اور لمحہ پھر بھی باقی رہے گا۔

کیا تم مجھے ایک بات بتاؤ گے' تمہارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ سوچو اور سوچ کر جواب دو کہ ہمارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ حقیقت کیا ہے جو نہ ہمارے ہونے سے بدلتی ہے اور نہ ہمارے نہ ہونے سے؟

تمہارے دانش مندانہ سکوت نے میرے سوال کا جواب دے دیا اور اس کے سوا اس سوال کا کوئی اور جواب تھا بھی نہیں۔ہے بھی نہیں۔وہ سب سے بڑی حقیقت گزرنا' گزرتے رہنا اور گزر جانا ہے۔کیا ہمارے دکھوں میں سب سے بڑا دکھ یہ نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں' گزرتے جا رہے ہیں اور گزر چکے ہیں؟

ہمارے پاس دن' رات' ہفتے' مہینے اور برس نہیں ہوتے۔ہمارے پاس تو بس ایک لمحہ ہوتا ہے۔اور یہی ایک لمحہ ہمارے لیے دن' رات' ہفتہ' مہینا اور برس ہوتا ہے۔ہم زمانے ہی میں ہوتے ہیں اور زمانے ہی میں نہیں ہوتے۔ہمارے پاس ایک ہی تو پونجی ہے اور وہ خود ہم ہیں۔اس گھڑی' اس لمحے اور اس پل کے ہم۔

اس گھڑی' اس لمحے اور اس پل کے ہم' نیا سال منانے والے ہیں۔یہ سال' یہ صدی ہم نے جی جی کے اور مر مر کے گزاری ہے جس کے سال جو ہم نے اپنی نئی پہچان اور اپنے ہونے کے نئے دھیان کے ساتھ گزارے ہیں' وہ تو عجب کچھ تھے۔اندھیروں اور اجالوں کے چار گھونٹ تھے اور اندھیروں اور اجالوں کی اونچائی اور نیچائی تھی جن کے بیچ ہم ہونے نہ ہونے کا دکھ جار ہے تھے' سکھ منا رہے تھے۔

وہ دن اور پہلے کے وہ ہم' گزر گئے ہیں۔اب ہم اپنے ہونے کا نیا پن بسر کرنا چاہتے ہیں۔نئی خواہشوں' نئے خیالوں اور نئے خوابوں کے ساتھ گزر کرنا چاہتے ہیں۔اور دیکھو' خواہش کے بعد نئی خواہش' خیال کے بعد نئے خیال اور خواب کے بعد نئے خواب کے ساتھ گزر بسر کرنا ہی زندگی ہے اور اب تو پہلے سے زیادہ اچھا موسم ہے۔اب تو پہلے سے زیادہ اچھے دن ہیں۔ہم نے تو بہت برے دن گزارے ہیں۔کیا نہیں گزارے؟ ہم نے تو ان برے دنوں میں بھی اپنی امیدیں نہیں ہاریں۔وہ ساری امیدیں ہمارے وجود میں مہک رہی ہیں۔وہ ساری تمنائیں ہماری نمود میں دمک رہی ہیں۔اب ہمیں نئی امیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبے گنگنانا چاہئیں تاکہ جمہوریت زندہ رہے' پاکستان تابندہ رہے۔



آپ کے خط

عزیز قارئین!
السلام علیکم!

جنوری 2013...... کا شمارہ نئے سال کی آمد اور گزشتہ سال کے گزر جانے کا احساس لیے حاضر ہے۔ وقت کا پہیا یونہی گھومتا رہے گا، زندگی کے دن گھٹتے اور عمر بڑھتی رہے گی مگر یہ ایک اچھی بات ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمیشہ ایک تجسس چھپا رہتا ہے، جس کے سہارے انسان اپنی امید نوٹنے نہیں دیتا۔ بہرحال سال نو اور سسپنس کی سالگرہ کی بے حد مبارکباد اس دعا کے ساتھ کہ یہ سال امت مسلمہ اور ہم پاکستانیوں کے لیے خوش آئند ہو اور ہم آپ کے تحریری مشوروں کی روشنی میں پرچے کو مزید بہتری کی طرف لے جاتے رہیں۔ بے شمار دکھی لمحات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم ارباب اقتدار سے ایک عاجزانہ درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں کچھ صحیح ہو نہ ہو لیکن تعلیمی نظام میں بہتری کے آثار نظر آنے بہت ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ پچھلے دنوں حسن ابدال کے ایک اسکول ٹیچر نے محض تاخیر سے اسکول پہنچنے پر اس طرح بے رحمی سے مارا کہ بچہ اپنی جان ہی گنوا بیٹھا۔ لہٰذا تدریسی عملے کی نا صرف علمی قابلیت بلکہ اخلاقی اور نفسیاتی تربیت بھی بے حد اہم ہے۔ معلوم نہیں ناقص تعلیمی نظام کی وجہ سے ملکی حالات تباہ ہیں یا ملکی حالات کی وجہ سے نظام تعلیم کا یہ حال ہے۔ جو بھی ہو مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بہترین اور یکساں نظام تعلیم اور قابل اساتذہ ہماری نسل کی بقا اور شاندار مستقبل کی ضمانت ہیں...... اس کے ساتھ خوشخبری یہ ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے اسنوکر کے کھلاڑی محمد آصف نے بلغاریہ میں ایک بین الاقوامی مقابلے میں شاندار فتح حاصل کرکے پاکستان کا نام روشن کیا۔ عالمی چیمپئن شپ کا یہ اعزاز پاکستانی کھلاڑی محمد یوسف کے بعد اب محمد آصف کے پاس ہے۔ (مبارک ہو) ہماری نوجوان نسل کا یہی جذبہ ہونا چاہیے۔ پاکستانی قوم کی یہی شان ہے وہ روتی ہے تو اپنے لیے ہنسنے کا سبب بھی خود ہی تلاش کرلیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آنے والے دنوں میں ہمارے وطن کو ان گنت کامیابیوں اور ترقیوں سے نوازے...... ہمیشہ سلامتی اور بقا قائم رہے (آمین) سنہرے خوابوں اور خوش گفتاریوں کے سنگ ذرا ہم بھی رخ کرتے ہیں اپنی جھنکارتی محفل کی جانب۔

☩ **ابن مقبول جاوید احمد صدیقی**، راولپنڈی سے تبصرہ کررہے ہیں "انتہائی سادہ مگر پُرکشش ٹائٹل جو منفرد سا لگا...... ذاکر جی ویل ڈن۔ سسپنس تو کئی سالوں سے زیر مطالعہ ہے۔ کچھ انتہائی مصروفیت کی وجہ سے حاضر مجلس نہ ہوسکا۔ پہلے تو عرض ہے کہ کئی ماہ و سال سے پہلے والی مجلس "آپ کے خطوط" کو رونق بخشنے والے کہاں چلے گئے؟ مثلاً ضیا الرحمان، سانگھڑ، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، بھکر، شان گھنگوری، بشریٰ باجوہ، بشریٰ افضل، سعدیہ ہما شیخ، طاہرہ یاسمین، ارم خان وغیرہ۔ بھئی پہلی فرصت میں ہماری طرح محفل کی رونق بڑھائیں۔ ہاں محترم ریاض بٹ، ہمایوں سعید جنوں اور انجم فاروق ساحلی وقتاً فوقتاً ریگولر رونق بڑھا رہے ہیں۔ اصل میں محترمہ روشنی رشید کا تبصرہ پڑھ کر میں بھی ان کا ساتھ نبھانے چلا آیا۔ بہترین تبصرہ و خط احسان سحر میانوالی کا تھا۔ بھرپور تبصرہ خوب گہرائی لیے ہوا تھا۔ قیصر اقبال کلول نے بھی بھرپور تبصرہ اور چھیڑ چھاڑ میں حصہ لیا۔ شاہد عمران آپ کے لیے لمحۂ فکریہ کہ محمد جاوید بلوچ نے آپ پر چربہ سازی کا الزام لگا دیا ہے؟ یار ہمایوں سعید سچ تو یہ ہے کہ خوب صورت عورت کے ساتھ 90 فیصد عام شکل کے مرد ہی نظر آتے ہیں؟ یہ اس صنف نازک کی مہربانی نہیں ہے کہ ایسے اچھے کردار کے مردوں کو بھی قبول کرلیتی ہیں۔ مگر مرد جیسا بھی ہو، کالا گورا، خوش شکل، بے حد بدشکل سب دنیا کی حسین ترین بیوی کے لیے ہی کوشاں رہتے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی جی صرف دو تین لائنوں کا تبصرہ؟ تصویر العین صاحبہ سالگرہ مبارک ہو۔ ویسے بھی اس بار صرف تین ہی آپ لوگ محفل میں حاضر ہوئی ہیں؟ یعنی ماریہ فاروق اور سعدیہ بخاری؟ یہ ماہا ایمان جی کہاں ہیں؟ حمیرا رضا اور دل نشین؟ اور بقول سعدیہ بخاری کے یہ امریکن سٹڈی کے موافق غائب حضرات مانسہرہ کے ڈبل ایم اے اور محمد نعمان خوشبو لگا کے۔ آجاؤ بھی۔ رضوان تنولی صاحب لکھتے ہیں کہ میں تو صرف سسپنس کی پہلی تاریخی کہانی اور قسط وار سلسلے پسند کرتا ہوں اور تبصرے میں دوسری کہانیوں پر بھی تبصرہ کیا ہے؟ خیر اچھی بات ہے؟ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ ہمارے سسپنس میں کہانیوں کا انتخاب بھی بے حد شاندار ہوتا ہے۔ تاریخی کہانی، آخری صفحات پر بے مثال انتخاب، اسلامی کہانی اور ملک صفدر حیات کی بہترین جاسوسی کہانی اور پھر کچھ بدلیسی مگر شاندار ترجمے اور مزاح و مداح سے بھرپور ہماری معاشرتی کہانیاں، اسی لیے قاری صفحہ ایک سے 290 صفحہ تک سسپنس کے ہر لفظ کے حصار میں بندھا ہوا رہتا ہے اور اس کے پیچھے بھی کم از کم چار دھائیوں کی عرق ریز محنت، مسلسل بہتر سے بہتر کی تلاش اور وہ کرگزرنا جو دوسروں کے لیے ناممکن ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد ہمیشہ سے چھائے رہے۔ بت شکن بھی ماضی کے سبق آموز اور عبرت آموز واقعات سے بھرپور رہی۔ مگر کاش انسان ماضی سے سبق حاصل کرسکتا۔ مگر وائے قسمت! کاشف زبیر کی مختتم مزاج بے حد زبردست رہی۔ شرمین اور فرید کے کردار بھی خوب تھے واہ کاشف صاحب! ایک ویلوٹ جب بھی آیا، چھا گیا دوسرے دلوں پر۔ اس دفعہ بھی بلی کی چوری انوکھی روداد بنی رہی۔ جاسوسی! انوکھا طریقہ اور بے چاری بلی بھینٹ چڑھ گئی۔ ایک مائیکرو فلم کے لیے اوآجی عشق اور سیاست میں سب جائز ہے۔ پہاڑ اوجھل ابھی زیر مطالعہ ہے یقیناً دل موہ لینے والی روداد ہوگی ملک صاحب زندہ باد۔ یہ ہیں ہمارے نامور اور انتہائی بامعنی اور گہرائی لیے ہوئے کہانیوں کے خالق جناب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب اور ایک اور شاہکار، یادگار اور پراثر واقعہ کہانی لے آئے ہیں۔ "خوئے نہاں" اور انجام بھی زبردست۔ رافعہ، آغل خان، غلامو، توفیق اور امتیاز کے گرد گھومتی ایک معاشرتی کہانی۔ گوشہ عافیت وائٹ کے لحاظ سے انوکھی سائیکالوجی کی حامل کہانی رہی اور مزہ دے گئی۔ مسافر ابھی زیر مطالعہ ہے اور مریم کے خان کی پیش عقل یقیناً اس ماہ کی سب سے بہتر بلکہ بہترین کہانی رہی۔ ان نقص کے حامل بچوں کا آپس کا اتفاق، پیار، احساس ذمے داری، لوگوں کے منہ پر تھپڑ ہے کہ جو کچھ یہ آج کل ہو رہا ہے۔ عقل نہیں ہے مگر عقل کے اندھوں سے زیادہ ذہن ہے۔ کمائی و مائی، منظر امام نے انوکھا طریقہ واردات صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ واہ رکشا کی آمدنی کیسے کیسے طریقے سے بنائی گئی۔ چار ست ایک چوراہا تو احمد اقبال کی سدا کی طرح دل کو چھوتی ہوئی، عقل کی تہوں میں بستی چلی گئی۔ میں نے اس طرح پڑھی جیسی کیفیت مسمریزم زدہ انسان کی ہوتی ہے۔ زبردست انمول موتی لگا۔ کشکول کی کیا تعریف کروں۔ اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین کے اردگرد بے پناہ خوب صورت واقعات میں 50 فیصد صرف کشکول کے لیے سسپنس لیتا ہوں۔ اب یہ ہے کہ لوچن اور دوشنو کے ساتھ کیا ہوگا؟ اور شیخ حامد کے لیے خفیہ راز کھولنے والے کی بھی قلعی کھولیں؟ کون غدار ہے؟ اگلے ماہ کا انتظار بے قرار...... صفحہ 15 پر محی الدین نواب کی سحر انگیز قلم سے لکھی کہانی کا جس کا وعدہ ہوا ہے انتظار ہے بے تابی سے۔ کیا یہ سسپنس 5 تاریخ کو نہیں آسکتا؟ خرم صاحب بٹ صاحب کی والدہ محترمہ اور محمد الیاس خان کی والدہ کے لیے فرداً فرداً دعا کی اللہ تعالیٰ غریق رحمت کریں اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائیں، آمین ثم آمین۔ محفل شعر و سخن میں تینوں قارئین کی بہترین کاوش تھی اور شعروں میں سے بابر عباس، محمد قدرت اللہ نیازی، سعدیہ بخاری، احسان سحر اور زرمین خان کی کاوش خوب رہی۔ تفصیلی تبصرے کا شکریہ

☩ **طاہر عباس**، کوٹلی آزاد کشمیر سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "آپ کے سسپنس ڈائجسٹ کی تو بات ہی الگ ہے، یہ منفرد ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔ میرا اور سسپنس ڈائجسٹ کا ساتھ "موت کے سوداگر" کی پہلی قسط سے ہے اور آج تک قائم اور دائم ہے۔ سسپنس کا ایک سحر ہے جس سے نکلنا تو ناممکن ہے۔ شدت سے اس کے آنے کا انتظار رہتا ہے۔ اتنا لمبا عرصہ ہوگیا سسپنس پڑھتے ہوئے لیکن پہلی بار آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے قابل اشاعت ہوگا (خوش آمدید) ایک کہانی تاریخی اور ایک اسلامی جس سے بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ رائٹرز میں ڈاکٹر ساجد امجد، طاہر جاوید مغل، ڈاکٹر شیر شاہ سید، کاشف زبیر اور محی الدین نواب پسندیدہ ہیں، یہ سب لوگ سسپنس کو چار چاند لگاتے ہیں۔ فاتح پوری پڑھنے سے جذبہ جہاد کی ترغیب ملتی ہے۔ فاتح اسلام صلاح الدین ایوبی کی فتوحات پر ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔ موجودہ حالات میں امت مسلمہ کو ایسے ہی انقلابی سپہ سالار اور رہنما کی ضرورت ہے۔ انوکھا ملاپ میں حامد نے ثابت کردیا کہ محبت بڑی طاقت ہے۔ قسط وار کشکول بھی زبردست جارہی ہے۔ لیاقت حسین کا روحانی کردار بھی اپنی مثال آپ ہے۔ صدیقی صاحب کے تمام کردار کہانی سے انصاف کرتے نظر آتے ہیں خاص طور پر سراج، میڈم، اورنگ زیب وغیرہ۔ بیگ انکل کی دائمی نجات بھی ٹھیک تھی۔ بوڑھا درخت میں نصیحت ہے کہ امید سے دنیا قائم ہے، ناامیدی انسان کو ختم کردیتی ہے۔ مسافر بھی میری پسندیدہ کہانی ہے، شاندار سلسلہ ہے۔ ممنوعہ میں نواب صاحب نے معاشرے کے ایک دردناک موضوع کو جلا بخشی۔ بے راہ روی ہمیشہ معاشرے کو دیمک زدہ کردیتی ہے۔"

☩ **ڈاکٹر وسیم خالق گہیاں**، گجرات سے شریک محفل ہیں "اس بار ماہنامہ سسپنس 21 نومبر کو ملا۔ حسینہ سرورق اس سال بھی ملک کے حالات بہتر نہ ہونے کی وجہ سے اس سال کے اختتام پر کسی ستون کو بانہوں میں تھامے ہوئے پائی گئی۔ سب سے پہلے جون ایلیا مرحوم کی، ایک آرزو کی خیرخبر لی جس پر تبصرے کے لیے ہمیشہ کی طرح اب بھی معذرت۔ محفل یاراں کا رخ کیا تو میدان کے اکھاڑے میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے والے قیصر اقبال قلابازیاں لگاتے ہوئے پائے گئے اس سے دل نہ بھرا تو انہوں نے سات آٹھ منٹ بعد پھر فرط جذبات سے ایک قلابازی لگائی۔ حسنین عباس بلوچ، آزادی مبارک ہو۔ تصویر العین صاحبہ سالگرہ کے بجائے اگر لوگ سہ روزہ سالگرہ مناتے تو میری اور آپ کی سالگرہ اکٹھی ہوتی کیونکہ 21 دسمبر کو ہماری بھی سالگرہ ہے۔ بہرحال ہماری طرف سے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ احمد خان توحیدی آپ کا تبصرہ نہایت ہی خوب صورت تھا۔ رمضان پاشا صاحب آپ کو ٹریجڈی مناظر بھلا کیوں اچھے لگتے ہیں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ سب ہمایوں سعید کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔ رہنے دو، ابھی بچہ ہے کھیلنے کودنے دو اسے۔ اب ایک نظر کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے ماضی کے جھروکوں سے لی گئی کہانی۔ بت شکن کا دیدار کیا اور محمود غزنوی کی بے پناہ فتوحات پر اسے سیلوٹ کرنے میں کسی بھی طرح بخل سے کام نہیں لیا۔ پہاڑ اوجھل میں جیجے کے کردار نے الجھن میں الجھائے رکھا۔ انوار صدیقی کی سلسلہ وار کہانی کشکول زلف یار کے پیچ و خم کی طرح ایک معمانی ہوئی ہے۔ میڈم روبی کا سراپا حسن اور شبنم کے خوب صورت ہونٹ کسی بھی قسم کی قیامت ڈھانے سے اب قاصر ہیں۔ مسافر بہتر سے بہتر ہورہی ہے۔ شاہد سلیم کے کردار کے جنون عشق نے اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھا۔ چار ست ایک چوراہا میں حرام طریقوں سے کمائی گئی دولت سے اولاد نرینہ کی پرورش کرنے والے خود بھی عذاب الٰہی سے نہ بچ سکے اور ان کی اولاد اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرکے بھی خوش اور مطمئن زندگی نہ گزار سکی۔ باقی ڈائجسٹ ابھی تک خرابی صحت کی بنا پر زیر مطالعہ ہے۔" (اللہ آپ کو جلد صحت یاب کرے۔ آمین)

☩ **اے۔ ایم چودھری**، احمد پور شرقیہ سے چلی آرہی ہیں "دسمبر کا سسپنس 2 دن لیٹ، بڑے انتظار کے بعد 20 نومبر کو ملا، جتنا انتظار سسپنس کا کرنا پڑا اتنا تو میں گھر والوں کا بھی نہیں کرتی۔ خیر ٹائٹل پر نگاہ دوڑائی۔ واہ کیا بات ہے بڑے عرصے بعد مجھے ٹائٹل پسند آیا ہے، جہاں پیاری معصوم دوشیزہ ہیلر کے ساتھ کھڑی کسی کی یاد میں کھوئی کھوئی سی لگی۔ اس کے بعد اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے سیدھی محفل دوستاں میں جا پہنچی جہاں پر قیصر اقبال کلول صاحب کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے۔ بھائی جان آئے او، تے چھاگئے ٹھاہ کرکے۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔ بہت اچھا تبصرہ لگا آپ کا۔ دوسرے نمبر پر جاوید بلوچ صاحب بونگیاں مارتے نظر آئے لیکن بھیا تبصرہ اچھا لگا۔ ہمایوں سعید راج یہ آپ اپنی عادت بتا رہے ہیں کہ ترجیحی بنیادوں پر آپ نے محبت کی اب یہ پتا نہیں کتنی بار کی خیر اب کی بار تو نبھا لیجیے گا ورنہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ حسنین عباس بھیا اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب فرمائے (آمین) انجم فاروق صاحب کے پین کی انک شاید کم تھی یا کوئی نوٹ بک دستیاب نہیں تھی جو اتنا مختصر خط لکھا۔ بھیا اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔ تصویر العین سسٹر ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، اللہ عزوجل آپ کو لمبی عمر یا عطا فرمائے (آمین) انکل احمد خان توحیدی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اور انکل آپ ہمارے بزرگ ہیں اور بزرگوں کو بچوں کے درمیان موجود رہنا چاہیے تو پلیز آتے رہیے گا۔ مانا کہ تفسیر انکل اور بابر عباس ہمارے ضعیف العمر بزرگ ہیں لیکن آپ بھی شرکت کریں گے تو خوشی ہوگی۔ رمضان پاشا بھائی ابھی شادی ہوئی نہیں اور خون کی کمی ابھی سے۔ بیوی آنے کے بعد کیا بنے گا، جب بیوی کی ڈانٹ سے روزانہ خون خشک ہوگا۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب جب آپ ہر معاملے کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں تو ماہا کی اصلیت بھی سمجھ لو، ارے میں بھول گئی کسی خاص کی اصلیت جاننے کے لیے بھی اعلیٰ دماغ چاہیے اور وہ آپ کے پاس...... آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ بابر عباس انکل جی کیسے ہیں آپ اور آج کل بڑی خوش فہمی میں کیوں مبتلا ہیں؟! اگر ہماری آنٹیاں محفل میں شرکت نہیں فرما رہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا ڈر ہے جناب۔ ویسے اپنے بارے میں تو بتائیے آپ کس گارڈن کے آلو ہیں۔ یاسر علی بھائی کیا اب بھی چاچو سے لے کر پڑھتے ہیں یا خود ہی اپنی جیب ہلکی کرلیتے ہیں، خوش آمدید۔ محفل میں اب ڈر کر بھاگ مت جائیے گا۔ سعدیہ بخاری ڈیئر آہستہ آہستہ یہ کرخت حضرات نعمان پیارے کی طرح گم ہوجائیں گے جس طرح اپنی ماہا کی آمد پر تفسیر میاں گم ہوگئے ہیں۔ ماریہ فاروق سسٹر صوبیہ تفسیر بابر، تفسیر عباس بابر کی وائف اور عون کی والدہ محترمہ ہیں۔ ریاض شاہد بھائی بہت مبارک ہو آپ کو، اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب عطا فرمائے اور برے کاموں سے دور رکھے (آمین) رضوان تنولی صاحب لگتا ہے کہ آپ کی دم ہے جو ہر وقت آپ کو دم یاد رہتی ہے دھیان کیجیے گا اگر آپ کی دم پر کسی کا



✠ **نورین صبا**، کورنگی، کراچی سے تبصرہ کررہی ہیں "اس سال کا آخری شمارہ اب کے 16 تاریخ کو ہی ہاتھ آ گیا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی بہت بھلا لگا۔ سادہ مگر بے حد جاذبِ نظر۔ گزشتہ سال ایسا گزرا کہ آہٹ بھی نہ ہوئی۔ شاید ہم اپنے شہر کے حالات سے سکتے میں رہے۔ محرم الحرام بہت خوف کے ساتھ شروع ہوا۔ نیچے دیکھتے ہی دیکھتے 4 شہروں میں دھماکے۔ گیس کی فراہمی الگ معطل، لگتا ہے ہم نے اپنے آپ پر رحم کرنا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے بت شکن میں سلطان محمود غزنوی پر بہت دلچسپ اور تحقیق سے بھرپور تحریر کی ہے۔ بہت معلومات میں اضافہ ہوا۔ کاشف زبیر کی تحریر مستقیم مزاج کیا خوب کہانی ہے۔ بہت ہی نصیحت آمیز، گریم جیکسن کا ایک بازو کٹ گیا لیکن دوسرے بازو یعنی پوتے نے کیا خوب کام دکھایا۔ کشکول میں انوار صدیقی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بلی کی چوری میں نک ویلیٹ 007 ایجنٹ بنے رہے۔ پہاڑ اوجھل میں ملک صفدر کی محنت اور ایمانداری کی کیا بات ہے۔ خوئے نہاں جیسے کردار ہمارے معاشرے میں اکثر و بیشتر نظر آتے ہی رہتے ہیں، کبھی چہرے بدل کر کبھی حالات اور خدوخال بدل کر، لیکن ڈاکٹر عبدالرب کے قلم کا نشتر وڈیرا شاہی کے ناسور پر خوب چلا۔ تنویر ریاض صاحب کی گوشۂ عافیت انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ مسافر میری پسندیدہ کہانی ہے۔ میں سب سے پہلے کترنیں اور اس کے بعد مسافر پھر باقی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ اس دفعہ شہر یار کو بہت بڑی مشکل میں ڈالا گیا وہ بھی بے یار و مددگار، کہانی میں تیزی کے ساتھ دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ احمد اقبال کی چار سمت ایک چوراہا بہت طویل کہانی۔ معاشرے کی بے حسی کا بھرپور اظہار، لیکن مجھے بہت اکتاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ قصہ چہار درویش کو جدت دے کر توڑ مروڑ کے رکھ دیا گیا۔ میری دعا ہے جنوری 2013ء کا سالگرہ نمبر بہترین ہو۔"

✠ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس بار سرورق سادہ تھا، ساتھ ہی دلکش بھی۔ اس ماہ کا انشائیہ حسب حال تھا، یعنی وطن عزیز کے موجودہ حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے قیصر اقبال بھائی مبارک باد۔ محمد جاوید بلوچ بھائی آپ کی ادھوری مجبوری پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ تصویر العین صاحب میں کسی بھی معاملے سے گھبراتا نہیں ہوں۔ کھاریاں والے بابر عباس بھائی آپ کی دعا مجھے پسند نہیں آئی کیونکہ مجھے اپنے گلے میں ڈھول لٹکانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں۔ اشعار کی محفل میں یاسر علی راجپوت کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ صوبیہ تفسیر بابر کا چناؤ بھی لاجواب تھا۔ بت شکن، یہ شہرہ آفاق تاریخ پڑھی ہوئی ہے مگر کہانی کا لکھا ہوا قصہ زیادہ لطف دیتا ہے اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مستقیم مزاج، کہانی بہت عمدہ تھی لیکن اسے اتنی زیادہ وسعت دینے کی ضرورت نہ تھی۔ کشکول، یہ دبنگ کہانی اب اپنے اختتام کی طرف گامزن ہوتی نظر آرہی ہے، یہ رائے مسافر کے لیے صحیح نہیں ہے۔ بلی کی چوری، میں نک ویلیٹ نے اپنی خداداد صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا، کہانی مزیدار تھی۔ پہاڑ اوجھل، میں وہی تفتیش وہی بھاگ دوڑ، آخر کار مشکل مرحلہ نمٹا ہی دیا۔ حسام بٹ زندہ باد! گوشۂ عافیت، پسند نہیں آئی۔ خوئے نہاں بھٹی صاحب نے اپنی دیرینہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس بار بھی وڈیرا شاہی کی نسبت ایک دبنگ کہانی تحریر کی ہے جو کہ کافی عرصہ یاد رہے گی۔ پیش عقل میں سانولی لڑکی نے اپنی حکمت عملی سے ریس ہی معطل کر ڈالی یوں اپنی شکست سے بچ گئی، بچوں کے لیے ایک اچھی کہانی تھی۔ کمائی وبائی میں کمائی تو ہو ہی رہی تھی لیکن وبائی ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ چار سمت ایک چوراہا، آیا یہ تو ایک ٹکٹ میں چار مزے والی کہانی تھی، اقبال صاحب نے اس کہانی میں بہت سوں کا پول کھول کر رکھ دیا، ساتھ ہی بہتوں کا بھلا بھی کر ڈالا، مدتوں یاد رہے گی یہ کہانی۔ سرمد شہید کا نام تو سن رکھا تھا مگر قصہ اب سامنے آیا۔"

✠ **ارسل کاظمی**، آزاد کشمیر سے محفل میں چلے آرہے ہیں "میں عرصۂ دراز سے سسپنس کا خاموش قاری ہوں اور پہلی مرتبہ اس خوب صورت محفل میں شامل ہونے کی جسارت کررہا ہوں (خوش آمدید) سسپنس بلاشبہ ایک معیاری پرچہ ہے اور میں نے ہمیشہ اسے اپنے دوست کی طرح ہی پایا ہے۔ اپنی پسندیدہ محفل، محفل خطوطاں کی طرف بڑھے اور محفل کے شرکا کی نخرے بازیوں اور شرارتوں سے محظوظ ہوئے۔ کرسی صدارت پر قیصر اقبال کو جلوہ افروز پایا، مبارک ہو۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے مسافر اور کشکول کا مطالعہ کیا۔ بلاشبہ دونوں عمدہ تحریریں ہیں اور معاشرے میں جرائم کے ساتھ ساتھ اصلاح کے پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ احمد اقبال کے قلم سے چار سمت ایک چوراہا ایک شاندار اور سبق آموز تحریر تھی۔ چاروں دوستوں کی منزل درست تھی مگر راہ کا انتخاب انہیں راس نہ آیا اور چاروں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ دیگر تحریروں میں پیش عقل ایک ایسے جذبے کی دعوت دیتے ہوئے جو فی الحال پاکستانی قوم میں مفقود ہے، عمدہ تحریر تھی۔ کمائی وبائی بہت جلد محبت میں گرفتار ہو کر لٹ جانے والے ایک بے وقوف عاشق کی ناکامی اور انکشاف کی داستان تھی۔ بلی کی چوری، پہاڑ اوجھل، خوئے

> ✠ **سہیل طارق**، گوجرانوالہ سے پنجابی وچ لکھتے ہیں۔ "یار سچی گل ایہہ اے کہ سسپنس مینوں بڑا چنگا لگدا اے۔ قیصر اقبال کلول نے تے ایدکی واقعی میدان مارلیا اے۔ وہ جی گل ایہہ اے کہ ساڈا شہر "گجراں" دا شہر اے۔ جے تسیں کدی تشریف لیاؤ تے "مجھ" دا خالص دودھ پیانواں گے۔ اک ایہہ گل دسو کہ جے میں پنجابی زبان وچ لکھ کے کوئی کہانی بھیجاں...... تے اوہنوں سسپنس وچ چھاپ دیو گے؟...... ورائٹی ہووے گی۔"
>
> "یار طارق! تیری کدرے مت تے نہیں ماری گئی اے۔ اردو زبان دے پرچے وچ پنجابی دی کہانی کینویں چھپ سکدی اے۔ باقی رہی خالص دودھ دی گل تے...... مینوں اک گل دس، تینوں میرے نال دشمنی کی اے۔ کراچی وچ پوڈر دا دودھ پی کے ساڈے وچ انی سان نہیں رہی کہ خالص دودھ دا مزہ چکھ سکاں۔ گجراں دے شہر وچ انشاء اللہ تہاڈے نال ملاقات ضرور ہووے گی۔ پنجابی زبان مینوں چنگی طرح نہیں آؤندی۔ کوشش کیتی اے۔ قیصر اقبال کلول ہوراں تہاڈی تریف توں ایمان نال بڑے ہی خوش ہوئے نے۔ اس میرے یار تے تہاڈا شکریہ ادا کیتا اے۔"

نہاں اور مستقیم مزاج اوسط درجے کی کہانیاں تھیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ محفل شعر و سخن میں عدنان یوسف اور جنید احمد ملک کے اشعار عمدہ تھے۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں "دسمبر کا سسپنس بروقت مل گیا، سرورق میں ایک حسینہ نظر آرہی تھی۔ اس



پاؤں آ گیا تو...... اور جناب صنف نازک کو آپ جیسے بھوتوں سے نہ خوف پہلے تھا نہ اب ہے۔ یاسر علی راجپوت، عون بابر عباس، قدرت اللہ نیازی اور غلام رسول خان کے اشعار بہت پسند آئے۔ اس کے بعد سیدھی مسافر کی خبر لی جہاں شہر یار صاحب پل میں ماشہ پل میں تولہ والی صورت حال سے دوچار نظر آئے، مار دھاڑ کرکے آخر نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ یہ قسط بہت زبردست رہی حالانکہ لگتا تھا کہ اناڑی پڑھ رہی ہوں، ہر دو منٹ پر اغوا لیکن بہرحال بہت مزہ آیا یہ قسط پڑھنے کا، اب دیکھو شاہد سلیم کے لیے شہر یار کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد کشکول میں چھلانگ لگائی جہاں اورنگ زیب اور سراج ایکشن میں نظر آئے وہیں شیخ حامد کی حالت سے مزہ دوبالا ہو گیا۔ اب لگتا ہے کہ اس ناسور کے دن تھوڑے ہیں۔ پلیز اینڈ میں اورنگ زیب یا سراج کو کچھ مت کیجیے گا یعنی مت ماریے گا۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے تو تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔"

✠ **عدنان یوسف**، بنوں سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس سال کا آخری رسالہ دسمبر سے پورے گیارہ دن پہلے مل گیا، یہ ہوا کمال نمبر 1 کہ مہینا شروع ہونے سے پہلے رسالہ مل جائے، سرورق میں ہمیشہ کی طرح خوب صورت لڑکی، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ محفل یاراں میں کرسی کنٹری پر قیصر اقبال کلول صاحب موجود تھے جو پچھلے میچ (ماہ) کا کنٹری (تبصرہ) پورے خشوع و خضوع سے کررہے تھے، محمد جاوید بلوچ کسی ماما ایمان نامی جڑی بوٹی کی بات کررہے تھے اور ایک بار پھر قیصر اقبال...... یہ ہوا کمال نمبر 2...... ماریہ فاروق ہر دفعہ رسالے کی قیمت کا رونا روتی ہے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، جو اس دفعہ ایک ہی زاویے کے گرد گھومتی ہوئی نظر آئی۔ ہاں شاہد سلیم کی انٹری پسند آئی، کشکول کا اب آخری وقت آرہا ہے اور اس کے ساتھ شیخ حامد کا بھی...... مختصر کہانیوں میں نک ویلیٹ کی بلی کی چوری بے حد پسند آئی۔ کاشف زبیر صاحب مستقیم مزاج اور عبدالرب بھٹی کی خوئے نہاں بھی اچھی کہانیاں تھیں۔"

✠ **حبیب احمد**، کرک سے محفل میں چلے آرہے ہیں "یہ میرا کسی بھی شمارے میں پہلا خط ہے (بہت دیر کی مہرباں......) دسمبر کا شمارہ 23 نومبر کو ملا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے جس میں حسام بٹ کی والدہ کی انتقال کی خبر سن کر افسوس ہوا اور شمارہ چھوڑ کر ان کے لیے سورہ یٰسین پڑھی اور واپس آکر اپنی پسندیدہ کہانی مسافر پر نگاہ دوڑائی جس میں شہر یار ایک دلدل سے بچ کر دوسری دلدل میں دھنستا جارہا ہے (شاید آپ تصور کی آنکھ سے دیکھ بھی رہے ہیں) اور اس کے بعد حسام بٹ کی تحریر پڑھی جو کہ بہت اچھی تھی اور آخر میں چار سمت ایک چوراہا، پڑھی۔ جس میں مجھے سمتوں کی سمجھ آ گئی لیکن چوراہے کی سمجھ نہیں آئی۔ اس کے علاوہ مسافر کی کتنی اقساط باقی ہیں وہ بھی بتادینا۔ مطلوبہ کتاب کے بارے میں مجھے جواب ضرور دینا میں انتظار کروں گا آپ کے جواب کا۔" (مشکل ہے)

✠ **ایم رضوان ملغانی**، کاسی اسٹریٹ، کوئٹہ سے تشریف لائے ہیں "کافی عرصے سے خاموش ہوں...... لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں پاتا الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، کیا کہوں کہ سسپنس عمدہ ہی نہیں عمدہ ترین ہے (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ) کردار تخلیق کرنا، انہیں ایک سانچے میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ یہ صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس فن سے وابستہ ہیں۔ یہ جسارت ہر کوئی نہیں کرسکتا پر ایک ادنیٰ سی کوشش اس ناچیز انسان نے بھی کی ہے۔ امید ہے پڑھ کر رائے ضرور دی جائے گی۔" (پڑھ کر رائے قائم کی جائے گی)

✠ **تنویر آصف چودھری**، دینہ، جہلم سے چلے آرہے ہیں "سسپنس سے میرا تعلق تو پرانا ہے شاید ہی اب کوئی پرانا ڈائجسٹ مجھ سے بچا ہو پر محفل میں شرکت فرسٹ ٹائم ہے (خوش آمدید) خط لکھنے کا مقصد صرف ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ رب کائنات ان کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور زورِ قلم اور زیادہ کرے آج کے دور میں کتابوں کو ہاتھ لگانے کو جی تو بہت چاہتا ہے پر ٹائم نہیں ملتا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا ہی حوصلہ ہے جو کتابوں سے گوہر نایاب چن چن کر ہمارے لیے لاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے ایک استدعا ہے کہ دجال کے بارے میں لکھیں یہ ان کی ایک عظیم اسلامی خدمت ہوگی اور اپنی قوم پر احسان بھی۔ باقی سسپنس کی ساری تحریریں معیاری تھیں۔ مرزا صاحب کی دائمی نجات سبق آموز تحریر تھی۔ مسافر ایک زبردست کہانی ہے جو دن بدن زور پکڑتی جارہی ہے اور نواب صاحب کی کیا بات ہے۔"

✠ **نوید انجم بٹ**، گہیاں، گجرات سے محفل میں شریک ہورہے ہیں "میں 2002ء سے ماہنامہ سسپنس کا مستقل قاری ہوں اس سے پہلے بندۂ ناچیز گاہے بگاہے محفل شعر و سخن میں شرکت کرتا رہا ہے اور اسی حوصلہ افزائی کی بدولت پہلی بار محفل یاراں میں شریک ہورہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ خوش آمدید کہیں گے (خوش آمدید) حسینۂ سرورق کو ذاکر انکل نے فرصت کے لمحات میں بیٹھ کر اپنے خوب صورت شاہکار کو سسپنس کی زینت بنایا۔ سب سے پہلے جون ایلیا کے انشائیہ ایک آرزو کو سرسری پڑھا پھر محفل یاراں میں پہنچے جہاں پر قیصر اقبال مسند صدارت پر فائز تھے مبارک ہو بھائی آپ کے تبصرے سے یہی لگا کہ آپ کرکٹ کمنٹیٹر ہیں بچ کے رہنا اب ہر کوئی زیرِ عتاب ہے کیا کرکٹ کیا امپائرز کیا کمنٹیٹر۔ اب آگے قدرت اللہ بھائی کا مشہور جملہ بولوں گا کہ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔ محمد جاوید بلوچ کا طاہرہ گلزار کو دیا گیا جواب کافی پسند آیا۔ تصویر العین اوکاڑہ، سالگرہ مبارک ہو۔ قدرت اللہ نیازی صاحب شیر خان کی صدارت کرسی پر پھولے نہیں سمارہے تھے اسے کہتے ہیں غیروں کی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ باقی لگتا ہے کہ بابر عباس نے ڈائجسٹ ملتے ہی تبصرہ کردیا تبھی تو کہانیوں پر تبصرہ غائب ہے۔ ماریہ فاروق بجلی کی مانند محفل میں وارد ہوئی اور پلک جھپکتے ہی چلی گئی باقی۔ راجا ثاقب اور نعمان پیارے کی کمی بھی دل دکھارہی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بت شکن پڑھی جس میں نگاہوں سے اوجھل محمود غزنوی کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد سے گزارش ہے کہ کبھی رضیہ سلطان کے حالات سے بھی پردہ اٹھائیں۔ پہاڑ اوجھل میں ملک صفدر نے باقی تھانیداروں کے برعکس معاملے کی سنگینی کو انتہائی سمجھداری سے سلجھادیا۔ انوار صدیقی کی کہانی کشکول بور کررہی ہے۔ ناصر ملک کی مسافر میں شہر یار کی مشکلات ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ احمد اقبال کی چار سمت ایک چوراہا۔ احمد اقبال اس میں تعلیم کا قصور نہیں بلکہ قصور ان کی منفی سوچ کا ہے اگر یہ پڑھے لکھے چاروں دوست مطمئن نہیں تو دوسری طرف ہم جیسے ان پڑھ گنوار بھی اپنی طرز زندگی سے بھی مطمئن نہیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

کے بعد انشائیہ میں حاضری دی۔ گلے شکووں سے دعائیہ انداز، انشائیہ نے سوچ کے در وا کیے۔ انسان کے رویے واسرار و رموز کے پردوں میں چھپے ہوئے عیاں ہوئے۔ آگے چل کر محفل میں داخل ہوئے جہاں سب سے پہلے نمبر پر قیصر اقبال کلول تھے۔ مبارکباد اور دوستوں کے مکتوب بھی شامل تھے۔ اپنی حاضری بھی نظر آئی۔ آگے بڑھے تو مسافر کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس مرتبہ کی قسط سنجیدہ اور ایکشن سے یکسر مبرا تھی، کشکول بھی اپنا سفر کامیابی سے جاری وساری رکھے ہوئے ہے۔ اس کے بعد تاریخی واقعات سے مزین بت شکن پڑھی جس میں محمود غزنوی کے حالات وواقعاتِ زندگی سے آگاہی ہوئی۔ وہ ہمت وجرأت کا پیکر تھا اور تاریخ میں بت شکن کے نام سے مشہور ہوا۔ مختتم مزاج نے اچھا تاثر دیا۔ بلی کی چوری نک ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ تھا۔ پہاڑ او جھل اور خوئے نہاں نے بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھی، محفل شعر وسخن میں بھی معیاری اشعار اچھے لگے۔ گوشۂ عافیت میں بیوی سے اتنا بیزار ہوا اور اس کو قتل کر دیا۔ پیش عقل میں ریس میں حصہ لینے والی بچیوں نے اچھا درس دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے سرمد شہید لکھ کر تاریخ کے گمنام جھروکوں سے پردہ اٹھایا۔ اللہ والے کے دلوں کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح آخری صفحات کی خوب صورت کہانی چارست ایک چوراہا احمد اقبال جیسے بے مثال لکھنے والے کی بہترین تحریر تھی۔ کہانی کا اختتام بھی اچھے انداز میں کیا گیا۔“

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ”دسمبر کے شمارے میں خوب صورت سی لڑکی مشرقی انداز میں کسی شعری تفسیر بنی کھڑی ہے۔ ذاکر، انکل ویلڈن۔ جون ایلیا کراچی کی صورتِ حال پر افسردہ سے انشائیہ کے ساتھ موجود تھے۔ قیصر اقبال، بجگرا پنے تبصرے کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے مبارکاں بھایا جی! آپ کی بھاگ دوڑ کام آ گئی لیکن صنف اوئی اوئی کے پاس پناہ لینا بالکل اچھا نہیں لگا۔ جاوید بلوچ! بھائی آپ کو تو پتا ہے چوری شدہ مال کہاں واپس ملتا ہے۔ عادل خان Wellcome اور ہمایوں سعید کو جو ملا وہ سب کچھ تھا صرف پیار نہیں تھا۔ محترم ہمایوں سعید! محفل میں کی جانے والی نوک جھوک صرف دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے برا نہ منایئے گا۔ حسنین عباس! اللہ آپ کو اور تمام اسیران کو اپنے فضل سے رہائی نصیب فرمائے اور عمران حیدر کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ انجم فاروق کے اختصاریہ نے سارہ راجپوت راولپنڈی کی عجلت ومصروفیت کی یاد دلا دی۔ تصویر العین مبارک ہو خیر سے کتنی صدیوں کی ہو گئی ہیں آپ؟ احمد خان توحیدی! جناب اگر گستاخی ہو گئی ہو تو معذرت کہ آپ تو بزرگ ہیں ہمارے۔ بابر عباس آپ اتنے قدیم ہیں؟ اور کیا واقعی سسپنس بھی ڈیڑھ روپے کا بھی ہوا کرتا تھا؟ سعدیہ بخاری آپ کی آہ سے کیا مطلب اخذ کیا جائے اور میری بھینسیں واپس کر دیں، مہربانی ہوگی۔ ماریہ فاروق! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ریاض شاہد سزائے موت سے بریت کی مبارک باد قبول کریں۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی جس نے میری طرح اپنا سحر طاری کر رکھا ہے، شیخ حامد کو کال کر کے معلومات دینے والے کے بارے میں ہم کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ شہریار کو مسافر میں سخت حالات سے سامنا کرنا پڑا اور ساری قسط میں شہریار ”لکن میٹی“ کھیلتا رہا۔ شاہد کا کردار ڈرامائی طور پر کہانی کا حصہ بنایا گیا۔ احمد اقبال کی چارست ایک چوراہا غلط کام کا غلط نتیجہ کی تشریح کرتی نظر آئی۔ چار یار اگر اپنی فیلڈ میں کام کرتے رہتے تو یقیناً اس سے زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے۔ کمائی ومائی منظر امام کی دلچسپ تحریر تھی ہر جگہ ایک ہی رکشا والے کی موجودگی شروع سے ہی ہمیں کھٹک رہی تھی بھلا ہو اس دوست کا جس نے ان کا پول کھول دیا۔ ساجد امجد بت شکن لے کر آئے، پڑھ کر خون کو گرمایا۔ کاشف زبیری کی مختتم مزاج میں فریڈ جیکسن کی دادا سے محبت بہت پسند آئی ایک مادر پدر آزاد معاشرے کے ایسے واقعات بالکل انہونے سے محسوس ہوتے ہیں۔ اقبال کاظمی نک کے لیے بلی کی چوری کا کیس لے کر آئے جو خاصا منافع بخش ثابت ہوا۔ محفل شعر وسخن بھی کافی معیاری رہی احسان سحر کے مراسلے بھی زبردست رہے۔ سالگرہ نمبر میں نواب صاحب کی شمولیت کا اعلان کر کے ادارہ نے سنسنی سی پھیلا دی ہے ابھی سے انتظار شروع ہو گیا ہے۔ حسام بٹ صاحب اور محمد الیاس خان، ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔“

✠ **سارہ**، کراچی سے شریک محفل ہیں ”عرب نقوش کی مالک دوشیزہ کی تصویر سے مزین، بہترین سرورق کے ساتھ سسپنس ملا۔ جن لوگوں نے ویلکم کیا ان کا بہت شکریہ...... قیصر اقبال کلول...... ویلکم...... پہلی شرکت کے لیے...... اور آتے ساتھ ہی قبضہ......؟ جاوید بلوچ! آپ اپنی خیر منائیں، ایسا نہ ہو کہ ہائے کر کے بیٹھنے اور ای کہہ کے اٹھنے کا موقع بھی نہ ملے۔ تصویر العین! اپنے لیے مجھے اپنا نام بہت پسند ہے آپ کا نام آپ کو مبارک...... بابر انکل...... مجھے یقین ہے سب کو پیچھے تو میں چھوڑوں گی، آپ کی آفر کا شکریہ۔ احسان سحر! میرا تبصرہ آپ کو بہت زور سے لگا؟ بھائی جی سوری...... اس بار سسپنس کچھ زیادہ ہی اچھا لگ رہا ہے، ایک بات سچ بتاؤں؟ وہ یہ کہ خواتین کی بہ نسبت مرد حضرات سسپنس کے لیے زیادہ اچھا لکھتے ہیں (شاید اسی لیے آپ نے اتنے مختلف رنگوں کے قلم استعمال کیے کہ آپ کا خط بھی خوب صورت ہو گیا) ڈاکٹر ساجد امجد کی بت شکن دلچسپ رہی۔ مختتم مزاج، کاشف زبیری کا خاصا ہے...... کہ گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔ نک ویلوٹ نے کمال کرتے ہوئے اچھے طریقے سے بتا دیا کہ کچھ بھی ہو اصول آخر اصول ہے۔ کشکول خاصی ہنگامہ خیز رہی۔ اورنگ زیب نے شیخ حامد کی دم پر ٹھیک سے پاؤں رکھ دیا ہے، مسافر میں شہریار نے کمال کر دیا۔ اب کہہ سکتے ہیں وہ اس غلط کام میں علی الاعلان کندن بنتے جا رہا ہے۔ احمد انکل کی چارست ایک چوراہا، بہترین تحریر رہی۔ آج کے حالات وواقعات کا عمدہ نمونہ دلفریب انداز میں پیش کیا...... اور اینڈ میں تو بچ بچ دھماکا کر دیا، غیر متوقع انجام کے ساتھ...... محفل شعر وسخن میں یاسر علی راجپوت کا انتخاب Best۔“

✠ **قیصر محمود اعوان**، خالد محمود اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”ماہنامہ سسپنس کے خطوط کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنے کے لیے یہ میری دوسری کوشش ہے۔ مجھے میرا پیارا پرچہ 20 نومبر کو ملا ہر بار کی طرح ایسے محسوس ہوا جیسے میرے لیے کسی نے ویزا بھیجا ہو۔ اس کے ساتھ تھوڑا رنج بھی ہوا جب خطوط قارئین میں مجھے اپنا تحریر کردہ خط نہ ملا۔ سرورق کیا ہی شاندار تصویر محو تصور بنائی گئی ہے اور اس کی آنکھیں تو واقعی لاجواب بنائی ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی نہایت متفکرانہ سوچ میں کراچی کے حالات پر روشنی ان کے محب وطن ہونے اور طائرانہ سوچ وروشن خیالی کی عکاسی ہے۔ اس کے بعد محفل یاراں پہنچے۔ کرسیٔ صدارت پر قیصر اقبال کلول بجگر کو براجمان پایا۔ مبارکاں۔ لگتا ہے فٹ بال سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں آپ۔ محمد

جاوید بلوچ کا تبصرہ اچھا لگا۔ طاہر الدین بیگ صاحب آپ قسمت والے ہیں جو مہینوں کا حساب لگا رہے ہیں باقی ہم سے پوچھیں کہ دن کیسے کٹتے ہیں۔ ہمایوں سعید انجم فاروقی احسان پاشا کی تحریریں پڑھیں، باقی محمد حسنین بلوچ صاحب ہمارے سابقہ قیدی رہائی آپ کو آزاد فضاؤں کی مبارک ہو۔ تصویر العین آپ کو ہماری طرف سے سالگرہ مبارک۔ باقی آپ نے لکھا کہ رمضان پاشا صاحب غیر شادی شدہ ہو کر گھبراتے نہیں، اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی، ادریس احمد خان، بابر عباس، حسنین عباس، اے ایم چودھری، احسن سحر ورضوان تنولی کی تحریریں اچھی تھیں۔ محترمہ سعدیہ بخاری آپ کی وکالت نہایت شاندار رہی۔ علاوہ ازیں کشکول پڑھی۔ SP اورنگ زیب کی کارکردگی شاندار جا رہی ہے، اگلی قسط میں دشنو امید ہے کوئی نیا کام کر دکھائے گا۔ دوسری کہانی مسافر پڑھی، شہریار ایک مصیبت سے نکلتا ہے دوسری میں پھنس جاتا ہے۔ امید ہے یہ دلچسپی جاری رہے گی خوئے نہاں پڑھی جس میں وڈیروں کے ظلم وزیادتی کے بارے میں لکھا تھا یہ رونا تو آج بھی جاری ہے، باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اشعار میں طارق کلیرا، سعید عباسی، غلام رسول خان کے اشعار پسند آئے۔“

✠ **انجم فاروق ساحلی**، لاہور سے چلے آ رہے ہیں ”اس مرتبہ سسپنس کا ٹائٹل سادگی اور دلکشی کے ساتھ کسی گہری سوچ، کسی لمبے انتظار کی عکاسی کرتا ہوا محسوس ہوا۔ پتھر کے ستون سے لپٹی حسینہ کی آنکھیں بھی کچھ پتھرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ خطوط کی محفل خاصے بھرپور تاثرات پر مبنی تھی۔ پہاڑ او جھل اچھی کاوش تھی۔ بلی کی چوری دلچسپ اور معیاری پیشکش تھی۔ پیش عقل کا اختتام فکر انگیز تھا۔ کمائی ومائی منظر امام صاحب کی کاوش بھی دلچسپ ومنفرد تھی۔ محفل شعر وسخن میں غلام رسول، لاہور کا شعری انتخاب خوب صورت تھا۔ صفحہ نمبر 153 کے لطائف پُرلطف تھے۔ بت شکن تاریخ کا ایک روشن باب تھی۔ سرمد صاحب کا احوال بھی خوب تھا۔ مسافر اور کشکول اپنے مخصوص انداز میں تیزی سے محوِ سفر ہیں۔ چارست ایک چوراہا کے بعض مقامات متاثر کن تھے لیکن متعدد جگہوں پر کہانی مضمون کا رنگ اختیار کرتی چلی گئی۔ امید ہے سالگرہ نمبر میں نواب صاحب کی آمد متاثر کن ہوگی۔ کوئی مختصر تحریر بھیجی جا سکتی ہے یا نہیں؟“ (بالکل بھیجی جا سکتی ہے)

✠ **شیر علی خان**، خانیوال سے چلے آ رہے ہیں ”اس دفعہ کی حسینہ اور کچھ خاص لوگوں میں کافی مماثلت نظر آئی۔ سیاسی کیسز ملالہ اور یوتھ فیسٹیول کی سیاست اور اب کراچی کا خون میں نہائے محرم کے بعد جون ایلیا کی ”آرزو“ سے بالکل متفق ہوں کہ اللہ تمام برادریوں میں افہام وتفہیم سے برداشت کا مادہ پیدا کریں تاکہ 71 والے حالات نہ پیدا ہو جائیں۔ اس دفعہ 16 نومبر کو انٹرن شپ اور Laptop اسکیم کی منعقدہ تقریب VAAR راولپنڈی میں شرکت کا موقع ملا۔ وزیراعلیٰ اور اس کے حواریوں کو خوب مواقع میسر آئے۔ جلسے کے بیچوں بیچ نوجوان نسل ستائش کے بجائے تبدیلی کے نعرے لگاتی نظر آئی، جس سے آئندہ کی سیاست کے منظر نامہ کی تصویر کشی ہو گئی۔ قصرِ صدارت کی طرف دھیان دیا تو ملکی سیاست کی طرح تعلقات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جاوید بلوچ اگر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو شیشہ مان لیا جائے تو اگلی دفعہ بیگم نوازش علی کا خط ضرور شامل ہوگا۔ بیگ صاحب نے اس دفعہ کافی پیلاہٹ کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمایوں سعید کی باتوں کو جاوید بلوچ انجوائے کرتے ہیں تو تفسیر عباس کو شکایتی لہجہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال عمران بلوچ کے بارے میں سن کر کافی پریشانی ہوئی۔ تصویر العین آپ کو عمر کی کٹوتی (سالگرہ) مبارک ہو۔ احمد خان توحیدی صاحب کا تبصرہ کافی اسٹیل قسم کا رہا، کافی جگہ منگنی شادی اور نکاح کا ذکر کرتے نظر آئے۔ لگتا ہے متاثرین میں شامل ہیں۔ ادریس بھائی اس دفعہ ناموں کی لسٹ یعنی بلیک لسٹ زیادہ کالی نہیں ہوئی۔ پیارے انکل! ڈائجسٹ ٹرینوں کے بجائے PIA سے بھجوایا کریں، چاہے قیمت 60 سے 70 کر دیں کیونکہ میری باجی طاہرہ گلزار کافی خفا ہیں مجھے بھی راولپنڈی کے بجائے ایبٹ آباد سے ڈائجسٹ دستیاب ہوا ہے۔ احسان سحر ہماری محفل کے بوڑھے درخت اب لچکدار نہیں رہے۔ تنولی صاحب کڑوے کسیلے انداز للکار کے ساتھ قلم کی تلوار لیے میدانِ جنگ میں جنگ کرتے نظر آئے۔ بت شکن کو بار بار پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ مسافر اور کشکول میں اس دفعہ بھی مار دھاڑ اور اغوا عروج پر رہے۔ گوشۂ عافیت میں مشکلات سے نہ گھبرانے کا درس ملا۔ احمد اقبال چارست ایک چوراہا میں سماج سے ایک خوب صورت کہانی لے کر آئے اور آج کل کے حقیقی واقعات سے پردہ اٹھایا۔ اشعار میں محمد ادریس اور نسیم احمد کے اشعار پسند آئے۔“

✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں ”آنچل اوڑھے معصوم لڑکی پاکیزہ حسن کا شاہکار ثابت ہوئی۔ پہلے نمبر پر موجود قیصر صاحب کا تبصرہ بلاشبہ زبردست تھا، بس قدرت اللہ کو نیچرل کہہ کر یعنی اتنا پیارا نام بگاڑ کر آپ نے اسکول پرنسپل کا نہیں، اسکول کے بچے ہونے کا ثبوت دیا۔ جاوید بلوچ صاحب نے منہ میں ہری مرچیں رکھ کر ماہا اور سعدیہ کا ذکر سولہ مرتبہ فرمایا۔ تصویر العین صاحبہ ہمیں سرعام اتنی بددعائیں مت دو۔ قدرت برادر! ہمیں آج تک کسی بھی لڑکی نے بھائی بنانے کی بے وقوفی نہیں کی۔ اسی لیے تو مجھے ان سب کو عقل سے پیدل کہنے والوں پر غصہ آتا ہے۔ بابر صاحب! اب اگر آپ بزرگانہ روش اپنائیں گے اور لڑتے جھگڑتے بچوں میں ثالث کا کردار ادا کریں گے تو اچھا لگے گا۔ سعدیہ صاحبہ! ہم نہایت ایمانداری سے بجلی کے وزیر جیسے بیان کو سچ کر دکھائیں گے۔ چودھری صاحب! اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی طرح سنسان بیابان دل ہونے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ عدنان برادر! وہ جو سیاسی محبت نے آپ کے دل کے زنگ آلود تاروں کا ستیاناس کر دیا تھا تو آپ نے کسی الیکٹریشن سے رجوع کیا یا نہیں؟ سب سے پہلے چارست ایک چوراہا سے شروعات کی۔ چار دوستوں اور ان کے آباواجداد کے گرد گھومتی نہایت تیز رفتار اور دلچسپ کہانی ثابت ہوئی۔ حالات اور قسمت کے ستائے ہوئے ہونہاروں کا یوں غلط سمت میں چلنا آج کل انہونی اور ناقابلِ یقین بات نہیں۔ ملک صاحب حسبِ عادت دلچسپ کیس لیے حاضر ہوئے۔ کاشف زبیر کی مختتم مزاج توقعات پر پوری نہیں اتری۔ سندھ دھرتی کی کہانی خوئے نہاں میں ہمیں آغل خاں سے زیادہ رافیہ قصوروار لگی، بے شک ان کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ مگر جب انہیں پتا چلا کہ شوہر کو میرا یہ فعل پسند نہیں تو انہیں فوراً وہ تعلق ختم کر دینا چاہیے تھا۔ تحریر ریاض کی گوشۂ عافیت بھی لاجواب رہی۔ مریم کے خان کی کہانی پیش عقل نے واقعی سوئے ضمیر جھنجھوڑ ڈالے۔ منظر امام کی حسبِ سابق معاشرتی کہانی کمائی ومائی سبق آموز رہی۔ محفل شعر وسخن میں پہلے نمبر پر موجود شعر کو پڑھا بہت، وجاہت۔“

✠ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے محفل میں تشریف لا رہے ہیں ”میزانِ زیست سے ایک اور سال تفریق ہو گیا اور قرطاس کے سینے پر...... کئی تلخ



وسفاک واقعات رقم کر گیا۔ حالات جوں کے توں رہے...... بلکہ اور بھی بدترین ہوتے چلے گئے، وہی...... مہنگائی، غربت، بے روزگاری، فرقہ بندی، دہشت گردی، لوٹ مار، لاقانونیت اور...... ارباب اختیار و اقتدار کی وہی بے حسی، خاموشی و خود غرضی...... ماہِ محرم الحرام کے مغموم و مقدس ایام...... یوم عاشور جب تاریخ انسانیت کا سب سے بھیانک اور لرزہ خیز سانحہ رونما ہوا۔ خوشگوار انقلاب اور مثبت تبدیلیوں کا خواب...... دیوانے کا خواب ہے۔ رب عظیم کے حضور دعا ہے کہ امت مسلمہ کے حال اور حالات پر رحم فرمائے۔ سسپنس کی تاخیر...... ذہنی اذیت کا باعث بن رہی ہے، سادہ سا خوب صورت سرورق اور نہایت سادہ سی خوبرو دوشیزہ سرورق...... ذاکر صاحب کے کمال فن، مہارت و مشاقی کا نایاب نمونہ ہے۔ جون ایلیا کا تلخ و سفاک انشائیہ، ایک آرزو...... لوح وقت پر خون جگر سے رقم کیا گیا۔ آپ کے خط میں...... آپ کا اداریہ ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتا ہے، ہم اسے ٹیپ کا بند کہتے ہیں، مسندِ خلافت پر جگر سے قیصر اقبال کا شاندار اور جاندار تبصرہ...... بہت ہی مبارکاں...... علی پور سے محمد جاوید بلوچ...... قربانیوں کے بکرے فریزر میں نہایت اہتمام و حفاظت کے ساتھ رکھ دیے جاتے ہیں یہ بھی امت مسلمہ کا المیہ ہے۔ ہمایوں سعید اگر کھالوں کے بیوپاری بن کر بھی چلے جاتے تو سعدیہ بخاری سے ملاقات نہ ہوتی کیونکہ سنا ہے انہوں نے...... مرغی کی قربانی دی تھی۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ عہد ناگوار کے تلخ حالات اور تلخ رویوں پر افسردہ نظر آئے۔ سرگودھا سے حسنین عباس بلوچ، بہت زیادہ اور تہ دل سے مبارکباد کہ آپ کو اذنِ رہائی مل رہا ہے اور عمران حیدر بلوچ سے متعلق جان کر بہت افسوس ہو رہا ہے، ہماری جانب سے ان کی مزاج پرسی ضرور کیجیے گا۔ اوکاڑہ سے بہت پیاری تصویر العین سالگرہ مبارک ہو۔ سعدیہ بخاری بادام اور ان کے جیسی سخت اشیا کھانے سے قاصر اور معذرت خواہ ہیں۔ کھاریاں سے بابر عباس، آپ کی بے لوث محبتیں ہمارے لیے متاع قلب و جان ہیں۔ آپ کو شہریار اور میڈم شکیلہ کے رومانس سے بوریت ہوتی ہے اچھی بات ہے۔ آپ کی موجودہ عمر کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ابتدائی صفحات پر ماضی کے آئینے میں...... خزینۂ تاریخ سے ایک اور گوہر نایاب...... ایک نادر روزگار شخصیت سلطان محمود غزنوی کی بے مثل و ولولہ انگیز داستان۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین اور نہایت بیش قیمت تحریر و تحقیق ثابت ہوئی۔ کاشف زبیر کی پراثر کوشش۔ مختتم مزاج...... نہایت کامیاب رہی، سانپ کی خصلت رکھنے والے انسان نما لوگوں کا پراثر احوال...... سانپ کی سرشت میں وفا نہیں ہوتی۔ یہ اٹل حقیقت ہے۔ اسرار و تحیر کی دبیز تہوں میں پنہاں انوار صدیقی کا ماورائے عقل سلسلہ کشکول...... سسپنس کی خاص الخاص سوغات ہے۔ اقبال کاظمی کی دلچسپ اسٹوری بلی کی چوری...... بھی دلچسپ ثابت ہوئی۔ پہاڑ اوجھل بھی زبردست رہا۔ سندھ کے وڈیرا راج کا ایک اور لرزہ خیز منظر...... خوئے نہاں چشم افلاک نت نئے تماشے دیکھنے پر مجبور و محوِ حیرت ہے۔ تنویر ریاض کا گوشۂ عافیت بھی خوب رہا۔ زندگی کی راہِ پرخار میں پابرہنہ و پاپیادہ...... مسافر کی تلخ و طویل مسافت، ناصر ملک کی مسافر دل کی آنکھوں سے پڑھی جاتی ہے۔ پسندیدہ مصنفہ مریم کے خان کی اثر انگیز روداد پیش عقل ضمیر کی عدالت میں ایک دلخراش تماشا، ضیا تسنیم بلگرامی کی سرمد شہید ایک ایمان افروز تحریر...... دلچسپ مصنف کے دلچسپ طرز بیاں سے مزین کمائی و مائی...... وجود زن کی فتنہ انگیزیاں، دلچسپ پرمزاح مگر قابل افسوس...... معاشرے کے جراح اور ماہر نباض احمد اقبال کے قلم کا شاخسانہ۔ رشتوں کی دیواروں میں دراڑوں اور امید و آس کے کچے دھاگوں کے ٹوٹنے کا دلچسپ مگر روح فرسا قصہ، ناقابل فراموش و ناقابل بیاں، چارسمت ایک چوراہا...... عالم نفسانفسی...... بیشک کہ یہی قرب قیامت کے آثار ہیں۔ حسام بٹ اور محمد الیاس خان کی والدہ ماجدہ کے انتقال پرملال پر ہم ان کے صدمۂ جانکاہ میں برابر کے شریک ہیں۔"

✠ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے محفل کی زینت بنی ہیں" آج محرم کی سات تاریخ ہے مجھے تو کرب و بلا کے میدان سے یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی کی ہر آزمائش پر صبر و تحمل، برداشت، استحکام اور اسی شجاعت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس دفعہ بھی ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ پہلے نمبر پر قیصر اقبال کلول تھے۔ پہلی بار شرکت کی اور پہلے نمبر پر آ گئے، ویلڈن۔ لیکن پلیز کمنٹری کم ہی کیا کریں اور شکر ہے کہ آپ نے بروقت بریک لگائی ورنہ یقیناً بلیک ہول میں ہی جا کر گرتے۔ عادل خان ہم آپ کو محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں اور عمران حیدر بلوچ کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔ احمد خان توحیدی آپ کی سالگرہ پر ہپی برتھ ڈے۔ رمضان پاشا ٹائٹل پر اس سے زیادہ برا تبصرہ یقیناً کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ وہ ناکام عاشق آپ ہی تو تھے، یاد نہیں کیا۔ تین بھائی تین کہانیاں بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس کا تبصرہ اچھا لگا۔ سعدیہ بخاری آپ ایلچی لے کر کیا کریں گی۔ ریاض شاہد مبارک ہو، انشاء اللہ جلد ہی آپ حسنین عباس بلوچ کی طرح رہا ہو جائیں گے۔ عدنان یوسف کیا ٹائٹل گرل کی صورت آپ کی کھوئی ہوئی محبوبہ سے ملتی تھی جو سرورق چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے جو محفل کی رونق کو چار کیا آٹھ کیا سولہ چاند لگا رہے تھے۔ کترنیں میں اس دفعہ محمد جاوید راؤ کی جدید محاورے چوائس اچھی لگی۔ کشکول میں اب شیخ حامد کے گرد اور تنگ زیب کا جال تیزی سے بن رہا ہے یقیناً اب اس کا انجام زیادہ دور نہیں اور لیاقت حسین کے ساتھ جب تک اس کی ماں ہے یقیناً بدی کی طاقتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اقبال کاظمی کی بلی کی چوری اچھی کاوش تھی۔ پہاڑ اوجھل میں ہمیشہ کی طرح صفدر حیات نے یہ کیس بھی حل کر لیا اور اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ دو محبت کرنے والوں کو ملا دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی خوئے نہاں کا انجام دکھی کر گیا۔ گوشۂ عافیت میں وائٹ نے صرف ایک کمرے کے حصول کے لیے اپنی بیوی کا قتل کر دیا۔ مسافر میں پتا نہیں کیوں مجھے شہریار پر رہ رہ کر غصہ آتا ہے شاید اس لیے کہ وہ میڈم کا غلام بنا ہوا ہے۔ (اتنا غصہ؟ یہ اچھی بات نہیں ہے) مریم کے خان کی پیش عقل بہت اچھی کہانی تھی اور اس کہانی میں جو پڑھنے کو ملا کاش اس کا عملی مظاہرہ ہم بھی کر سکیں۔ کمائی و مائی میں اس لڑکی صائمہ شایان کو خوب بے وقوف بنایا۔ ویسے جو خود ہی لٹنے کو تیار ہو اسے لوٹنے میں مزہ بہت آتا ہے۔ چارسمت ایک چوراہا نے خاص متاثر نہ کیا۔ اسے پڑھ کر وہ تین دوستوں والی کہانی یاد آ گئی جو ایک غار میں پھنس جاتے ہیں اور پھر اپنی اپنی نیکی یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ محفل شعر و سخن میں یاسر علی راجپوت، احسان سحر، محمد امجد ریاض کی پسند اچھی لگی مجھے۔"

✠ **حمیرا رضا**، لاہور سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں" سسپنس باقاعدگی سے گھر آ رہا ہے مگر ہائے رے ستم بالائے ستم اب بہت ہی کم وقت ملتا ہے خود اپنی ذات کو وقت دینے کا۔ ہمیشہ سسپنس میں سے کچھ نہ کچھ پڑھتی ہی رہتی ہوں کبھی تاریخی کہانی تو کبھی مرزا امجد ایڈووکیٹ، کبھی ملک صفدر حیات تو

کبھی ڈاکٹر شبیر شاہ سید، منظر امام فرخ فرحت کی ان گنی چنی گھڑیوں میں جو بھی کہنہ مشق رائٹر نظر سے گزرے انہیں پڑھ لیتی ہوں، مگر بہت بہت معذرت کہ تبصرہ نہیں کر پاتی۔ ارے میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کچھ عرصہ سے میری آئی سائیٹ (نظر) خطرناک حد تک کم ہو رہی ہے چشمہ بھی لگ گیا ہے۔ ہر وقت سر درد میں مبتلا رہتی ہوں (اللہ آپ کو صحت دے، آمین) آج قلم حسنین عباس بلوچ بھائی کی وجہ سے اٹھایا۔ ارے میرے اچھے بھائی میں بھلا آپ کو کیوں بھولنے لگی جب آپ نے محفل میں حاضری دی، میں نے تب بھی یاد رکھا اور غیر موجودگی کو بھی۔ آپ نے دعا کی درخواست کی تھی خاص داتا دربار میں جا کر ان دنوں اپنے بیٹے کی پیدائش کے سلسلے میں کراچی میں تھی تو شوہر کو بھیج دیا آپ کے کام سے (جزاک اللہ) عمران حیدر بلوچ بھائی کے گردوں کی خرابی کا پڑھ کر کافی دکھ ہوا، خدا آپ کو صحت دے اور آپ کو خدا جلد از جلد رہائی دے اور باقی بے گناہ اسیران بھی آزادی کی منزل کو پہنچیں اور ادارے سے معذرت کہ ابھی کچھ بھی پڑھ نہیں سکی (جب پڑھ لیجیے گا تو اپنی رائے ضرور دیجیے گا) کچھ عرصہ ہوا سسپنس سے خواتین کے خطوط کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ شاید وہ سب بھی میری طرح مصروف ہیں، میری جانب سے تمام پاکستانیوں کو نیا سال مبارک ہو خدا آنے والے سال کو امت مسلمہ کے لیے پرسکون بنائے۔ آمین۔"

✠ **سعدیہ بخاری**، اٹک سے تبصرہ کر رہی ہیں" دسمبر کا سسپنس محرم الحرام کی 5 تاریخ کو سوگوار فضا میں ملا جہاں ایک طرف مسلمان واقعۂ کربلا کی یاد میں سوگوار ہیں تو دوسری طرف پیغمبروں کی سرزمین ارض فلسطین پر کفار اسلام نہتے اور معصوم فلسطینیوں پر بم برسا رہے ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا کراچی کے حالات پر نوحہ کناں ہیں جہاں اپنے ہی اپنوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ دسمبر کے شمارے کا سرورق سوفٹ کلرز میں بے حد خوب صورت کتابی چہرے، براؤن آنکھوں والی سادہ سی حسینہ جانے کیا سوچ رہی ہے؟ محفل خطوط میں اس بار بھی صدارت صنف وجاہت ہی کے پاس رہی۔ انکل نے تو یہ شاخ الووں کو جھکنے پر ہی الاٹ کر دی۔ قیصر اقبال صاحب صدارت مبارک ہو محترم عرض یہ ہے کہ یہ گولوں کا زمانہ نہیں ہے چوکوں اور چھکوں کا دور ہے جس میں بعض اوقات ایک بولر یا بیٹسمین میچ کا پانسا پلٹ دیتا ہے، آپ تعداد کو رو رہے ہیں۔ دوسرے نمبر پر جھوٹی افواہیں پھیلانے کے ماہر جاوید بلوچ ماہا ایمان کی فکر میں گھلنا چھوڑیں وہ وہی ہیں جو ہیں آپ شارقہ سلجوق پر تحقیق و تفتیش کریں۔ بہت سے نئے لوگ بھی نظر آ رہے ہیں سب کو خوش آمدید۔ ہمایوں سعید آپ کے ماہا کو دیے گئے جواب سے ہم پورا پورا اتفاق کرتے ہیں۔ شکر ہے آپ کا دماغ بھی چل پڑا۔ اے ایم چودھری آپ کا تبصرہ پسند آیا لیکن پلیز اپنے پورے نام کے ساتھ شرکت کریں۔ قدرت اللہ نیازی دھوکے باز وہ ہوتے ہیں جو عورتوں کا نام استعمال کرتے ہیں اور اسے شرارت کا نام دے دیتے ہیں۔ تصویر العین ڈیئر ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اینڈ انکل احمد خان توحیدی آپ کو بھی زندگی کی 60 ویں بہار مبارک ہو۔ رضوان احمد تنولی ویلکم بیک، یہ بتائیں پہلے کسی کے سینڈل دیکھ کے بھاگے تھے؟ قیصر اقبال، جاوید بلوچ اینڈ احسان سحر کے تبصرے زبردست تھے۔ ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب پہاڑ اوجھل سے بلاشبہ نازلی اور اسلم نے اپنی محبت پانے کے لیے غلط راستہ چنا مگر تقدیر ان کے ساتھ تھی کہ اپنی منزل پانے میں کامیاب رہے۔ مسافر شہریار کے اغوا سے لے کر واپسی تک تمام قسط ایکشن سے بھرپور تھی۔ شہریار حیدر خان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو رہا ہے۔ کشکول خلاف معمول فل ایکشن میں زبردست رہی۔ شیخ حامد کا انجام صاف نظر آ رہا ہے۔ تاریخی کہانی بت شکن کہلانے والے غزنی سلطان محمود غزنوی تاریخ ہند کی نامور شخصیت کی داستان سادہ اور سیرت و کردار میں اپنی مثال آپ اللہ کی مدد پر بھروسا کیا اور کامیابی حاصل کی۔ آخری صفحات کا توشۂ خاص احمد اقبال کے نشتر انگیز کے قلم کا شاخسانہ چارسمت ایک چوراہا رشتوں کی پامالی اور شارٹ کٹ سے راتوں رات دولت مند بننے کی خواہش رکھنے والے نوجوانوں کا انجام آخر کار یہ ہوتا ہے کہانی کم حقیقت زیادہ ہے۔ مختصر کہانیوں میں ہماری موسٹ فیورٹ رہی مختتم مزاج مغرب میں رشتوں سے وفا نبھانے کا یہ خوب صورت انداز بہت اچھا لگا۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح مختصر ترین مگر چونکا دینے والی مزاحیہ تحریر لے کر آتے ہیں۔ خوئے نہاں اور گوشۂ عافیت درمیانے درجے کی کہانیاں تھیں۔ بلی کی چوری بھی تعریف کے لائق ہے۔ پیش عقل بھی پراثر کہانی تھی۔ اشعار کی محفل میں یاسر علی راجپوت اور محمد جاوید راہ کا انتخاب پسند آیا۔"

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں" سب سے پہلے حسنین بلوچ کی رہائی کا سن کر دل خوش ہوا۔ اللہ عمران بلوچ کو بھی رہائی دے۔ اسلامی سال شروع ہو چکا ہے اور دعا ہے کہ پاکستان کو اچھے حکمران نصیب ہوں۔ ابتدا قیصر کلول سے، مجھے لگتا ہے آپ کلول بہت کھاتے ہیں، شادی شدہ ہو کر حسینہ سے دل لگی؟ اگر ہمایوں سعید، سعدیہ کے گھر کے سامنے قربانی کے گوشت کی آس میں بیٹھے تھے تو جاوید بلوچ آپ وہاں کیا کر رہے تھے۔ شکریہ طاہر الدین بیگ آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا۔ ورنہ کچھ "سنگرتی" انداز رکھنے والے ستائش نہیں کرتے۔ تصویر العین ثبوت تو آپ ہمایوں سے مانگو۔ رمضان پاشا اپنی آنکھوں کا علاج کروائیں۔ آپ کو سرورق کی لڑکی کی ناک اپنے جیسے لگی توبہ توبہ قیامت کی نشانیاں۔ ماہا آپ کو ہمایوں کے پرایا ہونے پہ دکھ ہے یا خوشی۔ انکل آپ مجھے بلیک لسٹ کر رہے ہیں۔ اس لیے کہانیوں پر تبصرہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ خط لکھنا چھوڑ سکتی ہوں مگر ڈائجسٹ کو پڑھنا نہیں چھوڑ سکتی، اس لیے مجبوری کے تحت خط کسی اور سے لکھوا رہی ہوں۔ (ناراض ہونے سے پہلے محفل میں جگہ کی مجبوری کو سمجھ لیتیں تو ناراض نہ ہوتیں) سسپنس کے عاشقوں کا دل نہ دکھائیں، ماہا ایمان دل نشین، آمنہ سیٹھانی واپس آ جائیں تاکہ مدمقابلوں کی "ٹکرکوں" ختم ہو اور اچھل کود بند ہو۔ ہمارے ہونے سے ہی محفل رنگین ہے۔" (بے شک...... حالات سنگین ہیں)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

چودھری احمد خان، راولپنڈی۔ ساجدہ راجا، ہندواں سرگودھا۔ بابر عباس، کمیل عباس، حسنین عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ حافظ محمد عرفان، سرگودھا۔ سید محی الدین اشفاق، لیہ۔ ماریہ فاروق، چمن۔ عبدالغفور خٹک، اٹک۔ اختر عباس تھراج، ظفر اقبال ظفری، کبیر والا۔ سنسان دل، جودھپور، کبیروالہ



فلک تک چل

ڈاکٹر ساجد امجد

دورِ حاضر ہو یا عہدِ گزشتہ... وقت ہمیشہ سے مختلف چہروں اور حوصلوں میں ڈھل کر اقتدار کی بساط پر بازی پلٹتا رہا ہے... یہ بھی حقیقت ہے کہ تاج و تخت کی بھول بھلیاں عجیب سبق آموز ہوتی ہیں، جہاں برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ نامور عہد ساز "حیدر علی" کی پیدائش پر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس فرزند دل پذیر کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے یوں رقم ہو جائے گا کہ یتیمی کی کٹھنائیاں اٹھانے والے بچے کے دروازے پر دنیاوی حشمت و جاہ کبھی دستک دے گی جس نے باپ کے قرض کے عوض اسیری کی، زندگی بھی گزاری۔ تاریخی جملہ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے" کہنے والا ٹیپو سلطان اسی بہادر شخص کا فرزند تھا جس نے اپنی شجاعت اور دلیری سے مرہٹوں اور انگریز قوم کے دانت کچھ اس طرح کھٹے کیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ریاست میسور کا کل رقبہ جو صرف 33 دیہاتوں پر مشتمل تھی، حیدر علی جیسے حکمران کے دور میں اسّی ہزار میل تک پھیلتا چلا گیا اور جب وقت پلٹا کھائے اور... انہی رقبوں کا دائرہ تنگ ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے ہیں۔ طاقت کے حصول، استعمال اور پھر زوال... گویا اقتدار کے قصے سب ہی ایک جیسے مگر... فرق صرف نتائج میں آتا ہے اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ کون سا حکمران کس قدر دل عزیز تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

شیخ ولی محمد کے پاس اس اعزاز کے سوا کوئی اعزاز نہیں تھا کہ وہ مکہ شریف کے قبیلۂ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں کہ وہ عرب سے ہجرت کر کے دہلی اور پھر بہ عہد عادل شاہ گلبر گہ (دکن) کیوں آئے۔ وہ کسی تجارتی قافلے کے ہمراہ بھی نہیں آئے تھے اور نہ کسی حملہ آور کے لشکر میں شامل تھے یعنی نہ تو وہ کوئی خوش حال تاجر تھے نہ صاحب سیف کہ جاگیریں اپنے نام کراتے تلوار کی نوک سے اپنا مقدر بناتے۔ وہ تو ایک عام سے آدمی تھے۔ عام بھی اور گم نام بھی۔ انہوں نے گلبر گہ میں الوند کے مقام پر اقامت اختیار کی۔ حصولِ رزق کے لیے نہ کوئی پیشہ اپنایا، نہ حرصِ دنیا کے لیے ہاتھ پاؤں چلائے۔ خاموشی سے ایک خانقاہ سے منسلک ہوگئے۔ عبادتِ الٰہی میں دن رات گزارنے لگے۔ کئی مواقع ایسے آئے جب دنیاوی حشمت وجاہ ان کے دروازے پر دستک دینے آنکلی لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ منہ پھیرے کھڑے رہے البتہ یہ دعا ہر وقت ہونٹوں پر رہتی کہ ”اے خدا! میری اولاد کو میری طرح گم نام نہ رکھیو۔ انہیں نیک شہرت سے مالا مال کیجیو۔ آئندہ نہ جانے زمانہ کیا رخ اختیار کرے۔ وہ کوئی پیشہ اختیار کریں، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ان کے پیشِ نظر رہے۔“

یہ سترھویں صدی کے اوائل کا ہندوستان تھا۔ محمد عادل شاہ بیجاپور کا حکمران تھا۔

شیخ ولی محمد اپنی زندگی کا مقصد تلاش کر چکے تھے۔ وہ اپنی اولاد کو بھی اسی راستے پر چلانا چاہتے تھے...... چنانچہ جب ایک روز خانقاہ کا ایک درویش ان کے سامنے آکر بیٹھا تو انہوں نے ایک عجیب سا سوال اس درویش سے کیا۔

”کیا تیرے گھر میں کوئی بیٹی بھی ہے؟“

”شیخ صاحب، میں ایک کیا تین بیٹیوں کا باپ ہوں۔“

”ان میں سے ایک میرے گھر بھیج دے۔“

”شیخ صاحب، آپ اس عمر میں شادی کریں گے؟“

”میں تیری بیٹی اپنے لیے نہیں اپنے بیٹے کے لیے مانگ رہا ہوں۔“

”یہ تو میری خوش بختی ہوگی۔ میں تیار ہوں۔“

شیخ ولی محمد نے اپنے بیٹے محمد علی کی شادی اس درویش کی بیٹی سے کردی۔ یہ شادی محمد علی کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ اللہ نے انہیں یکے بعد دیگرے چار لڑکے دیے۔ لڑکوں کے نام محمد الیاس، شفیع محمد، محمد امام تھے ...... اور چوتھے فتح محمد تھے۔

محمد علی بھی خانقاہ سے وابستہ تھے لیکن شادی کے بعد آمدن بڑھانے کے لیے کھیتی باڑی بھی شروع کر دی تھی۔ اسی محدود آمدنی پر خوش تھے لیکن بیوی کا اصرار بڑھتا جارہا تھا۔ اس بے چاری نے غربت ہی غربت دیکھی تھی لہٰذا اب خوش حالی کے اجالے کا تقاضا بھی کرتی تھی۔ اس زمانے میں سپاہ گری ایک منافع بخش پیشہ تھا لیکن محمد علی نہ سپاہی تھے نہ سپاہی زادے۔ بیوی کو ان سے یہی گلہ رہتا تھا۔ اس نیک بخت کے سات بھائی تھے جو بیجاپور میں تھے اور عادل شاہ ثانی کی فوج میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ وہ محمد علی کو بھی اکساتی رہتی تھی کہ بیجاپور چلا جائے۔ وہاں ملازمتوں کے اچھے مواقع ہیں لیکن محمد علی اپنے والد کے ڈر سے ”الوند“ چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب شیخ ولی محمد کا انتقال ہوگیا تو محمد علی کی بیوی کا اصرار بھی شدت اختیار کر گیا۔ محمد علی مجبور ہوگئے اور بیجاپور چلے گئے۔ برادران نسبتی نے خیر مقدم کیا اور محمد علی ان کے ساتھ رہنے لگے۔

ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ مغلوں اور بیجاپور کی افواج کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جنگ اتنی خوفناک تھی کہ محمد علی کے ساتوں بھائی اس جنگ میں کام آگئے۔ یہ خبر ان کے گھر پہنچی تو ان کی بیوی پر قیامت ٹوٹ پڑی، سات بھائیوں کی ایک ساتھ ہلاکت کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ ان کی بیوی غم کی تصویر بن کر رہ گئی۔ محمد علی نے یہی سوچا کہ بیوی کو اس مقام سے دور لے جایا جائے تاکہ اس کے دل سے غم کے اثرات دور ہوں۔ اس بے بسی کے عالم میں انہیں ”کولار“ کا حاکم شاہ محمد یاد آیا جو کبھی ”الوند“ آیا تھا اور خانقاہ میں اس سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس معمولی سی جان پہچان کو انہوں نے سہارا بنایا اور ”کولار“ چلے گئے۔ حاکم شاہ محمد ان کے زہدو اتقا کا قائل تھا لہٰذا ان کی آمد کو اپنے علاقے کے لیے خیر و برکت قرار دیا اور وسیلۂ روزگار کے لیے اپنی جائداد کا انتظام وانصرام ان کے حوالے کر دیا۔ اس نوکری کے علاوہ وہ کھیتی باڑی بھی کرنے لگے۔

کولار میں فارغ البالی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بیٹوں نے بھی جوانی میں قدم رکھ دیا تھا۔ اب وہ بھی باپ کا ہاتھ بٹا رہے تھے لیکن سب سے چھوٹے بیٹے فتح محمد میں وہ آثارِ بغاوت دیکھ رہے تھے۔ اسے نہ تو کھیتی باڑی میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کسی درگاہ کا خادم بننے میں بلکہ وہ پیشۂ سپاہ گری کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ بات باپ سے کہنے کی ہمت نہیں تھی لیکن باپ تک یہ بات پہنچ ضرور گئی تھی۔ ایک روز انہوں نے فتح محمد کو اپنے پاس بلایا اور تصدیق چاہی۔

”میں سن رہا ہوں کہ تمہیں آبائی پیشے کھیتی باڑی سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ میں سپاہ گری سے رغبت رکھتا ہوں۔“

”صرف اس لیے کہ تم دنیاوی جاہ وعزت کے طلب گار ہو۔“

”اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

”ہمارے آباواجداد نیک اور متقی لوگ تھے۔ وہ اگر چاہتے تو دنیاوی حشمت وجاہ حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنے آپ کو دنیاوی علائق سے بچائے رکھا اور تم آباواجداد سے انحراف کر رہے ہو۔“

”ابا جان، پیشہ کوئی ہو۔ انسان اپنی ذات میں نیک اور متقی ہو سکتا ہے اور پھر سپاہ گری تو مسلمانوں کی شان ہے۔“

”تم زیادہ سے زیادہ سپاہی بن سکتے ہو۔ اپنے آقا کے حکم پر بعض اوقات مسلمانوں کا خون بھی بہاؤ گے۔ اگر مغلوں سے جنگ ہوتی ہے تو کیا مغل مسلمان نہیں؟ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ صرف مرہٹوں کے خلاف تلوار اٹھاؤ گے۔ میں تمہیں کبھی اس خونریزی کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ تمہارے سات ماموں ایک ہی جنگ میں کام آگئے تھے۔ مجھے تم بہت عزیز ہو۔ میں تمہاری جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“

فتح محمد زیادہ اصرار نہ کر سکے لیکن انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان کے دوسرے بھائی بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ تینوں بھائی پردے سے لگ کر باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے تنہائی ملتے ہی فتح محمد سے صاف کہہ دیا کہ وہ لومڑی کی طرح گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے پر قناعت نہیں کر سکتے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ باپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ اس وقت چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔

یہ خاموشی باپ کے احترام میں باپ کی زندگی تک تھی۔ باپ کی وفات کے بعد فتح محمد نے کولار کو خیر باد کہہ دیا اور ارکاٹ کی راہ لی اور ارکاٹ کے صوبیدار نواب سعادت علی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔

نواب نے انہیں دو سو پیادوں اور پچاس سواروں کا کمان دار بنا دیا۔ فتح محمد حوصلہ مند سپاہی تھے اور آگے بڑھنے کا بے تحاشا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ اس معمولی نوکری سے مطمئن نہ ہوئے، ارکاٹ کو خیر باد کہا اور میسور کا رخ کیا۔ میسور جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ میسور میں ان کا بھتیجا فوج میں خدمات سرانجام دے رہا تھا لہٰذا میسور پہنچتے ہی انہیں براہ راست نائک کا عہدہ مل گیا۔

نائک کا عہدہ گرانقدر اہمیت کا حامل تھا لیکن اس کے باوجود فتح محمد زیادہ عرصہ میسور میں مقیم نہ رہ سکے۔ میسور کے امرا کے باہمی نفاق نے انہیں بدظن کر دیا۔ ریاست کا حال یہ تھا کہ راجا عضوِ معطل تھا اور امرا کی حکمرانی تھی۔ اس صورت حال سے وہ بہت جلد دلبرداشتہ ہوگئے اور پھر والی سرا نواب درگاہ قلی خان کی ملازمت اختیار کر لی۔

نواب نے چار سو پیادوں اور سو سواروں کا انہیں کمانڈار مقرر کیا۔ ایک جنگ میں انہوں نے ایسی بہادری کا مظاہرہ کیا کہ ہاری ہوئی جنگ کو فتح میں بدل دیا۔ والی سرا ان سے ایسا خوش ہوا کہ انہیں قلعہ دود بالا پور کا حاکم بنا دیا۔ فتح محمد اپنے اہل خانہ کے ساتھ دود بالا پور میں سکونت پذیر ہوگئے۔

اسی مقام پر 1721ء میں ان کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس بیٹے کا نام انہوں نے حیدر علی تجویز کیا۔ حیدر علی سے تین سال بڑا ایک بیٹا اور بھی تھا۔ اس کا نام شہباز تھا۔

حیدر علی کی پیدائش کے وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ فرزند دل پذیر ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے گا۔

حیدر علی نامور باپ کا بیٹا تھا۔ دنیاوی عیش وعشرت کے تمام سامان مہیا تھے۔

درگاہ قلی خان کی موت کے بعد فتح محمد نے اس کے بیٹے عبدالرسول خاں کے ساتھ خود کو وابستہ کر لیا۔

حیدر علی پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ اس کا بھائی شہباز آٹھ سال کا تھا کہ ”سرا“ کے صوبہ دار طاہر خاں اور عبدالرسول خاں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ فتح محمد اس جنگ میں ہلاک ہوگئے۔

فتح محمد کیا مرے ان کے خاندان پر افتاد ٹوٹ پڑی۔

فتح محمد اپنی وفات کے وقت مقروض تھے۔ اس قرض کو وصول کرنے کے لیے درگاہ قلی کے ایک اور بیٹے عباس قلی نے فتح محمد کے خاندان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دیے۔ تمام اثاثہ چھین لیا اور کم سن بھائیوں حیدر علی اور شہباز کو قید کر لیا۔

یہ مصیبت کوئی معمولی مصیبت نہیں تھی۔ فتح محمد کے دونوں بیٹے قید میں تھے۔ ان کی بیوہ بھی ایک طرح سے اسیری کی زندگی گزار رہی تھی۔ اسے یہ صدمہ تھا کہ بچوں کی جو عمر تعلیم و تربیت کی ہوتی ہے وہ قید و بند میں گزر رہی ہے۔ ان کا مستقبل کیا ہوگا یہ بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس مصیبت کی گھڑی میں انہیں فتح محمد کے بھتیجے حیدر کا خیال آیا جو میسور کی فوج میں ملازم تھا اسی کی سفارش پر فتح محمد مرحوم بھی میسور کی فوج میں ملازم ہوئے تھے لیکن ملازمت چھوڑ کر ''سرا'' آ گئے تھے۔

فتح محمد کی بیوہ نے کسی نہ کسی طرح اپنی پیتا اپنے خاوند کے بھتیجے تک پہنچا دی۔ یہ سرگزشت ہی ایسی تھی کہ حیدر کا دل موم ہو گیا لیکن معاملہ ''سرا'' کے حاکم کے بھائی کا تھا جس سے وہ براہ راست نہیں نمٹ سکتا تھا۔ وہ مختلف تدبیریں سوچتا رہا اور بالآخر ایک درخواست لکھ کر میسور کے حاکم سے مدد کا طالب ہوا۔ یہ درخواست اس نے راجا میسور تک پہنچا دی۔ کئی امرا نے اس کی جانب سے سفارش بھی کی۔ فتح محمد چند برس پہلے میسور کی فوج میں رہ بھی چکا تھا لہٰذا راجا میسور نے ضروری سمجھا کہ فتح محمد کی بیوہ کی مدد کی جائے۔

والی میسور نے سرا کے حاکم کو خط لکھا۔ حاکم کو جونہی حالات کا علم ہوا اور تصدیق ہو گئی، اس نے عباس قلی کو ڈرا دھمکا کر فتح محمد کے خاندان کو آزاد کرا لیا۔

رہائی کے بعد فتح محمد کی بیوہ اپنے بچوں کے ہمراہ بنگلور روانہ ہوئی اور بنگلور سے سرنگا پٹم جا پہنچی اور پھر فتح محمد کے بھتیجے نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ دونوں بچوں کی پرورش اپنے بچوں کے مانند کرنے لگے۔ فن سپاہ گری اور گھڑسواری میں تربیت دینے لگے۔

حیدر علی کا خاندان جن نامساعد حالات سے گزرا تھا اس میں کسے اتنی فرصت تھی کہ اس کی تعلیم کی طرف توجہ دیتا۔ دس سال تک وہ خاندان کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا رہا۔ اس آوارہ خرامی نے اسے تعلیم کے حصول کی طرف سے غافل رکھا۔ اس میں کچھ اس کی اپنی کاہلی کا بھی دخل رہا ہوگا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو وہ ناخواندہ رہ گیا۔

اس کا ناخواندہ رہ جانا اس کی آئندہ زندگی کا دیباچہ نہیں تھا قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ حیدر علی ابتدا میں فوجی زندگی کی پابندیوں سے بھی بھاگتا تھا البتہ شکار سے اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ شکار ہی اس کی فوجی تربیت کا حصہ تھا۔ اسی شوقِ شکار نے اسے ایک ماہر نشانہ باز بنا دیا تھا اور پھر یہی نشانہ بازی اس کے مستقبل کی شاندار ضمانت بن گئی۔

اس کا بڑا بھائی شہباز خان اپنے خاندان کے ہمراہ دیون ہلی یا دیوان ہالی میں مقیم تھا۔ اس کا خاندان بھی وہیں آ گیا تھا۔ حیدر علی کی عمر اس وقت انیس بیس سال تھی۔ بھائی کی نگرانی میں اس نے فوجی تربیت حاصل کر لی تھی۔ نشانہ تو اس کا ایسا تھا کہ دور دور تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ اسی دوران دیون ہلی میں نشانہ بازی کا ایک مقابلہ ہوا۔ شہباز خان، لاابالی حیدر علی کو بھی اس مقابلے میں لے گیا۔ حیدر علی نے اس مقابلے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس کی مہارت سے ریاست میسور کا وزیر مالیات تیج راج اتنا متاثر ہوا کہ اسے ریاست میسور میں باقاعدہ ملازمت دے کر پچاس سوار اور دو سو پیادہ کا افسر مقرر کر دیا (بعض مورخوں نے تیج راج کا تلفظ نجا راج بھی لکھا ہے۔ ہم اسے تیج راج لکھیں گے)

اس تقرری کے بعد حیدر علی کی ترقی کی وہ تمام منزلیں روشن ہو جاتی ہیں جن سے گزر کر وہ دنیاوی عزت و جاہ کی آخری منزل سے ہمکنار ہوا۔

حیدر علی اور اس کے خاندان کی حالت بہت سقیم تھی۔ اپنی ترقی میں نہ تو اسے خاندانی وجاہت کی مدد ملی اور نہ دولت کی۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا اپنی صلاحیت، لیاقت اور ثابت قدمی سے حاصل کیا اور ان سب کا نقطۂ آغاز میسور کی ملازمت تھی۔

ریاست میسور بہت ہی چھوٹی تھی۔ اس کا کل رقبہ 33 دیہات پر مشتمل تھا۔ اس کی آبادی اور پیداوار وغیرہ بھی اسی تناسب سے بہت محدود تھی لیکن جب اسی مختصر ریاست کو حیدر علی جیسا مدبر حکمران ملا تو اس نے اس کا رقبہ 80 ہزار مربع میل تک پھیلا دیا۔ تاریخ اس کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ اس نے سرنگا پٹم میں سلطنت خداداد جیسی خوش حال ریاست قائم کی لیکن تاریخ کو یہ بھی یاد ہے کہ اس ریاست کو مسلم کش غدار مسلمانوں نے دشمنان وطن سے مل کر ختم کر دیا اور اب اس ریاست کا رقبہ صرف 29 ہزار مربع میل رہ گیا ہے۔

ریاست میسور کا حکمران راجا کرشنا راج تھا لیکن وہ محض ایک کٹھ پتلی تھا۔ ریاست کا نظم و نسق دیوراج اور تیج راج کے ہاتھوں میں تھا۔ ان بھائیوں نے تختِ شاہی کی

تزئین و آرائی کے لیے راجا کو راج گدی پر برقرار رکھا تھا۔ ورنہ اصل حکمرانی یہ دونوں بھائی کر رہے تھے۔

دیوراج ریاست کا سپہ سالار تھا جبکہ تیج راج وزیر مالیات لیکن چونکہ دیوراج بوڑھا ہو گیا تھا لہٰذا اس نے فوجی امور اپنے چھوٹے بھائی تیج راج کو سونپ دیے تھے اور خود شعبۂ مالیات کی دیکھ بھال اور نگرانی سرانجام دیتا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جب حیدر علی نے میسور میں قدم رکھا۔ وہ اس گم نام ریاست میں گم نام پڑا رہتا لیکن ایک واقعے نے اس کی زندگی بدل دی۔ مرہٹوں سے خطرے کے پیشِ نظر دیوراج اور تیج راج کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ آصف جاہ نظام الملک پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کریں۔ نظام الملک کی وفات ((1749) کے بعد میسور کی حکومت نے جانشینی کی رسہ کشی میں ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔ تیج راج نے حیدر علی کو میسور کی اس فوج کے ہمراہ روانہ کیا جو نظام الملک کے بیٹے ناصر جنگ کی مدد کے لیے بھیجی گئی تھی۔ ناصر جنگ اقتدار کی یہ جنگ اپنے چچازاد بھائی مظفر جنگ کے ساتھ لڑ رہا تھا۔

اس وقت حیدر علی پانچ سو بندوقچیوں اور پانچ سو سواروں کا افسر تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ماتحت کچھ بے قاعدہ فوجی دستے بھی تھے۔

اس دوران ناصر جنگ کو قتل کر دیا گیا اور میسور کی افواج وطن واپس آ گئیں۔ اس قتل کے بعد افراتفری پھیل گئی۔ حیدر علی کے بندوقچیوں نے اس افراتفری سے پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے طلائی سکوں سے لدے ہوئے بہت سے اونٹ پکڑ لیے اور حیدر کی رہائش گاہ پر لے آئے۔ نشانِ حیدری کا مصنف بیان کرتا ہے۔

''وطن واپس جاتے ہوئے راستے میں حیدر علی نے ان چار اونٹوں پر قبضہ کر لیا جو شاہی خزانے سے لدے ہوئے تھے اور جن کو باغی پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ حیدر نے دولت پر قبضہ کر لیا۔''

وہ اس خزانے کے ہمراہ میسور پہنچا اور اپنی فوج کی نفری میں اضافہ کیا اور اسے فرانسیسیوں سے تربیت دلوانے کا بھی اہتمام کیا۔

فرانسیسی اور انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اس وقت آپس میں برسرپیکار تھیں اور حیدر آباد اور ارکاٹ کی حکمرانی کے لیے اپنے اپنے امیدواروں کی حمایت پر کمربستہ تھیں۔ فرانسیسی اس کشمکش میں کامیاب رہے۔ انہوں نے حیدر آباد میں مظفر جنگ اور اس کے قتل کے بعد صلابت جنگ کو مسندِ اقتدار پر بٹھا دیا۔ ارکاٹ میں بھی انہیں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے نواب ارکاٹ انورالدین کو قتل کر دیا۔ نواب کا بیٹا محمد علی ترچناپلی بھاگ گیا۔ فرانسیسیوں اور اس کے امیدوار چندا صاحب نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ترچناپلی میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ جب محاصرے نے طول کھینچا تو محمد علی نے میسور کے تیج رائے سے مدد طلب کی اور اس مدد کے عوض ترچناپلی اور اس سے ملحقہ علاقے میسور کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔ تیج راج نے فوراً مدد کی ہامی بھری اور ترچناپلی جا پہنچا۔ حیدر علی بھی اپنی گھڑسوار اور پیادہ فوج کے ساتھ میسور کی فوج کے ہمراہ تھا۔

یہ مہم تو ناکام رہی لیکن تیج راج اپنی عاقبت نااندیشی کی بدولت تین چار کروڑ روپے ضائع کر بیٹھا۔ تین برس ضائع کرنے کے بعد لوٹ آیا، مایوس و نامراد۔

ترچناپلی کی مہم تیج راج کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی لیکن حیدر علی کی قسمت کے دروازے کھل گئے۔ وہ اس جنگ میں نہ صرف شریک ہوا تھا بلکہ بہادری کے ایسے کارنامے سرانجام دیے تھے کہ تیج راج پر اس کی صلاحیتیں روشن ہو گئیں۔ اس نے حیدر علی کو ''ڈنڈی گل'' کا فوجدار مقرر کر دیا جہاں زمینداروں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔

حیدر علی نے ان زمینداروں کی سرکوبی کی اور امن و امان بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی فوج میں بھی اضافہ کیا اور توپ خانے کی تنظیم نو کی اور فرانسیسیوں کے اشتراک سے اسلحہ خانہ بھی قائم کیا۔

ترچناپلی کی مہم کے اخراجات کی وجہ سے میسور کی ریاست اپنے فوجیوں کی تنخواہیں ادا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ ہر سو انتشار پھیل چکا تھا۔ اب اس انتشار سے فائدہ اٹھانا حیدر علی کا کام تھا۔

میسور کا راجا کرشنا سنگھاسن سے دور تھا لیکن طاقت نہ ہونے کے باوجود یہ سوچتا ضرور رہتا تھا کہ کسی طرح تیج راج اور دیوراج سے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس وقت بھی وہ اسی فکر میں گم تھا۔ اس کی رانی اس کے سرہانے بیٹھی راجا کے چہرے کے رنگ کو بدلتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''راجا جی، جب سے تیج راج وزیر بنا ہے اداس تو آپ رہتے ہی ہیں لیکن آج تو منہ کچھ زیادہ ہی لٹکا ہوا ہے۔'' رانی نے راجا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''تم دیکھ رہی ہو مجھے کس طرح مکھن سے بال کی طرح نکال دیا گیا ہے۔''

"یہ کوئی آج کی کہانی ہے۔"
"میں تو اس لیے خاموش تھا کہ ملک کا نظام چل ہی رہا ہے لیکن ترچناپلی میں جو تیج راج کو عبرت ناک شکست ہوئی ہے اس سے وہ میرے دل سے اتر گیا ہے۔ اس سے تو میں مرہٹوں کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو میری راج گدی مجھے مل جائے۔"
"آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ مرہٹے تاوان کی بقایا رقم کا تقاضا کرنے والے ہیں۔"
"تیج راج نے ریاست کو اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ خزانہ خالی ہے۔ فوجیوں کو تنخواہیں دینے تک کے لیے پیسے نہیں۔"
"پھر ایسے میں آپ نے کیا سوچا ہے مہاراج؟"
"سوچا ہے تیج راج کو اس کے عہدے سے ہٹا دوں اور اس کی جگہ کھانڈے راؤ کو وزیر بناؤں۔"
"یہ کام کیا اتنا ہی آسان ہے جتنا آپ سوچ رہے ہیں؟"
"تیج راج میں تو اب دم خم رہا نہیں، البتہ حیدر علی سے ڈر لگتا ہے۔ تیج راج اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔ حیدر علی اس کی حمایت ضرور کرے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح حیدر علی اور تیج راج کے درمیان بگاڑ پیدا ہو جائے۔ حیدر علی ہمیں تیج راج سے نجات دلا دے۔ اس کے بعد حیدر علی کا پتا بھی صاف کر دیں گے۔"
سوال یہ تھا کہ یہ گھنٹی بلی کے گلے میں باندھے کون؟ حیدر علی کو کون آمادہ کرے کہ وہ تیج راج کی معزولی میں راجا کی مدد کرے۔
اس کام کا ذمہ راجا کی ایک رانی لکشمی نے اٹھایا کیونکہ کچھ دنوں سے اسے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ نوجوان حیدر علی اس کی طرف ملتفت ہے، یہ گمان اس لیے بھی پیدا ہوا تھا کہ حیدر علی کی بیوی ایک بچی کی پیدائش کے بعد معذور ہو گئی تھی۔ حیدر علی خود کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ اس کی بیوی خود اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی ہے کیونکہ اب وہ ازدواجی تعلق رکھنے کے قابل نہیں رہی ہے۔ رانی لکشمی اتنی بے حجاب تھی کہ حیدر علی کو کھلے لفظوں میں دعوت گناہ دیتی رہتی تھی۔ حیدر علی یہ باتیں سنتا اور مسکرا کر چپ ہو جاتا تھا۔ بس اسی کو رانی اس کا ملتفت ہونا کہتی تھی۔
جس وقت رانی، راجا سے محو گفتگو تھی اس سے ایک دن پہلے ہی حیدر علی سے اس نے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔
"نائیک جی، آپ کیسے نوجوان آدمی ہیں، بیوی کے بغیر رہ رہے ہیں اور ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔"
"رانی جی، اب اللہ نے میری بیوی کو معذور کیا ہے تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔"
"اسی لیے تو کہتی ہوں دل بہلانے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں۔"
"آپ جن ذرائع کی بات کر رہی ہیں وہ سب گناہ میں شامل ہیں۔"
"نائیک جی، جوانی میں کیا گناہ کیا ثواب۔ راجا جی اولاد سے محروم ہیں ان کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔"
"اچھا اب میں چلتا ہوں۔"
حیدر علی جیسا پاکباز مسلمان اس گناہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا جس کی دعوت اسے رانی دے رہی تھی۔
رانی ہر مرتبہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ حیدر علی کو تیج راج کا تعاون حاصل ہے اسی لیے وہ اس کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ اب جو راجا سے گفتگو ہوئی تو رانی لکشمی کے دل میں ایک شمع سی روشن ہو گئی۔ اگر وہ تیج راج اور حیدر علی کے درمیان اختلافات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو حیدر علی اکیلا رہ جائے گا۔ اسی لیے اس نے اس کام کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔
رانی نے حیدر علی پر مہربانی ظاہر کرنے کے لیے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا بلکہ خود اس سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔
حیدر علی کی معذور بیوی اپنے بستر پر تھی۔ رانی نے کچھ دیر اس کی خیریت دریافت کی اور پھر حیدر علی کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھ گئی۔
"نائیک جی، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ آپ کی سمجھ بوجھ کے بھی قائل ہوں اور آپ کے پہاڑ جیسے شریر (جسم) کی بھی۔"
"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ وہ کہیے۔"
"میری یہی پسندیدگی ہے جو آپ کی ترقی دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے مہاراج کو قائل کیا ہے اور انہی کا پیغام لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔"
"کیسا پیغام؟"
"میری بات دھیان سے سننا۔ تمہارے سامنے کی بات ہے کہ تیج راج نے ریاست کا کیا حال کر دیا ہے۔ پچھلے سالوں میں راجا نے دو کروڑ روپے کے عوض مرہٹوں سے صلح کی تھی۔ ایک کروڑ ادا کر دیا گیا تھا۔ اب مرہٹے باقی رقم کا تقاضا کر رہے ہیں۔ تیج راج نے خزانے میں ایک کوڑی نہیں چھوڑی ہے۔ اگر رقم ادا نہیں کی گئی تو وہ میسور پر حملہ کر دیں گے۔"
رانی یہاں تک کہنے پائی تھی کہ حیدر علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "رانی جی، آپ اتنی سی بات پر پریشان ہو گئیں۔ آپ فکر چھوڑ دیں، مرہٹوں سے میں نمٹ لوں گا۔"
"بات صرف اتنی نہیں ہے۔" رانی نے کہنا شروع کیا۔ "مہاراج یہ چاہتے ہیں کہ تیج راج کو معزول کر دیا جائے اور اس کی جگہ کھانڈے راؤ کو وزیر مقرر کیا جائے۔ کھانڈے راؤ آپ کا دوست بھی ہے اور آپ کا ملازم بھی رہا ہے۔ اس کے پردے میں آپ ہی سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔"
حیدر علی نہایت زیرک شخص تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تیج راج کو درمیان سے ہٹا کر یہ لوگ اسے تنہا کرنے کے درپے ہیں۔ تیج راج سے پیچھا چھڑانے کے بعد یہ لوگ مجھے بھی برداشت نہیں کریں گے۔ تیج راج ہندو ہونے کے باوجود راجا کو برداشت نہیں۔ میں تو پھر مسلمان ہوں۔
یہ بات سب کو معلوم تھی۔ رانی بھی جانتی تھی کہ حیدر علی، تیج راج کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ میسور کے لوگ بھی تیج راج کے غلط فیصلوں کا ذمے دار حیدر علی کو قرار دیتے تھے۔ حیدر علی کے لیے اچھا موقع تھا کہ وہ اپنی نیک نامی میں اضافہ کرے اور تیج راج کو منظر نامے سے ہٹا دے لیکن یہ اقدام وطن کے لیے اچھا نہیں تھا۔ مرہٹے تاک میں لگے ہوئے تھے اور کھانڈے راؤ پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔
حیدر علی نے کمال ہوشیاری سے رانی کو ٹال دیا۔
"ابھی آپ کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ میں تیج راج سے خود بات کروں گا۔"
رانی کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تیج راج اتنی آسانی سے ماننے والا نہیں اور اگر راجا نے زبردستی کی تو خانہ جنگی یقینی ہے۔ ریاست بدنظمی کا شکار ہو جائے گی۔ مرہٹے تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس صورتِ حال سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ اسے وطن کی سلامتی عزیز تھی۔ اس نے یہی سوچا کہ وہ اس معاملے کو جب تک ٹال سکتا ہے ٹالتا رہے گا۔ اس نے رانی کے نام پیغام بھیجا کہ آپ لوگ اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے رہیں۔ جب تک میں نہ کہوں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔
یہ پیغام دینے کے بعد حیدر علی ڈنڈی گل چلا گیا۔
یہ تو سیاسی معاملات تھے۔ حیدر علی رانی کی طرف سے یوں بھی خوف زدہ تھا۔ انسان تھا، سوچتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ رانی کا جادو اس پر چل جائے اور وہ گناہ میں ملوث ہو جائے۔ بہتر یہ ہے کہ میں شادی کر لوں، رانی کا منہ بند ہو جائے گا۔ یہ شادی جلدی ہونا چاہیے، بعد میں نہ جانے کیا حالات پیدا ہوں۔ اس نے اپنے ایک سالار میر رضا علی خاں کی ہمشیرہ فاطمہ بیگم عرف فخر النسا سے شادی کر لی۔ اسی بیوی سے اللہ نے انہیں ایک بیٹے سے نوازا۔ اس بیٹے کا نام ٹیپو سلطان رکھا گیا۔ جوان ہونے کے بعد اسی بیٹے نے باپ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔
حیدر علی نے رانی کو باور کرا دیا تھا کہ جب تک وہ نہ کہے تیج راج کو نہ چھیڑا جائے۔ رانی نے یہ پیغام راجا تک پہنچا بھی دیا تھا لیکن وہ جلدی میں تھا۔ راجا نے تیج راج اور دیوراج سے پیچھا چھڑانے کے لیے سازشوں کا جال بچھا دیا۔ ان سازشوں کا مرکزی کردار کھانڈے راؤ تھا اور بعض رانیاں بھی راجا کے ساتھ شامل تھیں۔
تیج راج اپنی جاگیر ستی منگل گیا ہوا تھا۔ حیدر علی ڈنڈی گل میں تھا کہ راجا کو موقع مل گیا اور اس نے تیج راج کی معزولی کے احکام صادر کر دیے۔ معزولی کی خبر تیج راج کو ہوئی تو وہ ستی منگل سے دوڑا چلا آیا۔ اس کے ساتھ معمولی سی فوج تھی۔
راجا کے براہ راست ماتحت تقریباً ایک ہزار فوجی تھے۔ راجا ان کے ہمراہ قلعے سے باہر نکلا۔ ان فوجیوں نے جان پر کھیل کر تیج راج کا مقابلہ کیا لیکن وہ گولہ باری کا سامنا نہ کر سکے۔ اس گولہ باری سے راجا کے ذاتی خدمت گار اور دیگر مرد و خواتین ہلاک ہو گئے۔ تیج راج کے آدمیوں کو موقع مل گیا کہ وہ محل میں داخل ہو جائیں۔
تیج راج بضد تھا کہ راجا کو بھی قتل کر دیا جائے لیکن بڑے بھائی دیوراج نے مخالفت کی بالآخر دونوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ راجا اور اس کے اہل خانہ کو قید کر دیا جائے، قتل نہ کیا جائے۔
دیوراج بہت مجبوری کی حالت میں راجا کو قید کرنے پر تیار ہوا تھا ورنہ وہ تو مکمل پسپائی کے اختیار میں تھا۔ تیج راج اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اختلافات اتنے بڑھے کہ دیوراج اپنے اہل خانہ اور ذاتی سپاہ کے ساتھ سیتا منگلم چلا گیا۔
راجا کے قید ہو جانے کے بعد میسور کی ریاست تیج راج کے قدموں میں تھی اور وہ اس ریاست کا واحد مالک تھا۔
راجا کی رہائی ناممکن تھی۔ دیوراج بھی جا چکا تھا۔ حیدر علی کی طرف سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس کا دوست تھا۔

تیج راج کو خود مختار ہوئے ابھی ایک مہینا ہوا تھا اور ابھی استحکام کی منزلیں دور تھیں کہ مرہٹوں نے جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میسور کو نشانہ بنایا اور سرنگاپٹم کا محاصرہ کرلیا۔

تیج راج اس وقت مرہٹوں سے لڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ مرہٹوں کی توپوں نے گولے برسانے شروع کیے تو وہ بڑی مشکل سے چند دن ان گولوں کے سامنے ڈٹا رہا۔ وہ بھی اس اُمید پر کہ حیدر علی اس کی مدد کو پہنچ جائے گا۔ حیدر علی پہنچ بھی جاتا لیکن مرہٹوں کی حکمتِ عملی نے اسے بروقت نہیں پہنچنے دیا۔ دراصل مرہٹوں نے میسور کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرنے سے قبل مالابار کے سربراہوں کو پالاگھاٹ کے حاکم پر چڑھا دیا تاکہ حیدر علی ادھر الجھ جائے اور سرنگاپٹم پہنچنے میں اسے دیر ہوجائے۔

تیج راج مرہٹوں کی گولہ باری سے تنگ آکر صلح کے لیے مجبور ہوگیا۔ اس نے 22 لاکھ ہرجانہ ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے 2 لاکھ نقد ادا کردیے اور بقایا رقم کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر 13 تعلقے دشمن کے حوالے کردیے۔

حیدر علی سرنگاپٹم پہنچا تو اس وقت تک مرہٹے محاصرہ اٹھا کر جاچکے تھے۔ تیج راج لٹے ہوئے مسافر کی طرح بے دست و پا بیٹھا تھا۔

حیدر علی نے مشورہ دیا۔ ’’برسات کے آنے تک ہمیں صبر کرنا چاہیے۔ موسم برسات کے آتے ہی مرہٹہ کارندوں اور مرہٹہ فوجوں کو ان اضلاع سے نکال باہر کرو جو انہیں ضمانت کے طور پر دیے گئے ہیں۔ اس زمانے میں دریا چڑھے ہوئے ہوں گے اور مرہٹے اس وقت تک کرشنا اور تنگ بھدرا پار نہ کرسکیں گے جب تک کہ پانی کی سطح کم نہ ہوجائے۔‘‘

’’اس سے کیا ہوگا؟‘‘ تیج راج نے مردہ آواز میں کہا۔ ’’جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا ہوگا۔‘‘

’’مجھے اتنا وقت مل جائے گا کہ میں ڈنڈی گل سے امدادی کمک لاسکوں۔‘‘

حیدر علی کا یہ مشورہ نہایت مناسب تھا کیونکہ خزانہ خالی پڑا تھا۔ حکومت دیوالیا ہوگئی تھی۔ یہ موقع تاوان ادا کرنے کا نہیں تاوان بٹورنے کا تھا۔ اس کے لیے مہلت درکار تھی۔

یہ مشورہ دینے کے بعد حیدر علی ڈنڈی گل روانہ ہوگیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی تیج راج کے خلاف فوجی بغاوت ہوگئی۔ ان سپاہیوں نے جنہیں تنخواہیں نہیں ملی تھیں تیج راج کے محل کا محاصرہ کرلیا تاکہ اشیائے خورونوش کی فراہمی روکی جاسکے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ تنخواہیں ادا کرے۔

حیدر علی کو ڈنڈی گل میں اس کی خبر پہنچی تو اس کی وطن پرستی نے جوش مارا۔ وہ اس موقعے سے بہت بڑا فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن اس نے تیج راج کی مدد کا فیصلہ کیا اور دیوراج کے پاس ستیا منگلم پہنچ گیا۔ اسے وطن کا واسطہ دیا اور سمجھایا کہ وہ تیج راج سے صلح کرلے اور اس کی مدد کرے تاکہ بغاوت ختم ہو۔ اس وقت دیوراج سخت علیل تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھائی سے صلح کرلے گا۔

حیدر علی سرنگاپٹم آیا اور تیج راج کو مشورہ دیا کہ وہ راجا کو قید سے رہا کردے اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرلے۔

تیج راج شاید اس مشورے کو تسلیم نہ کرتا لیکن دیوراج کے انتقال کی خبر آگئی۔ فوجیوں کی تنخواہ تلوار بن کر سر پر لٹک رہی تھی۔ ایسے میں راجا ہی کچھ کام آسکتا تھا لہٰذا تیج راج مجبور ہوگیا۔ تیج راج نے محل پر حاضری دی اور راجا کرشنا سے معافی طلب کی۔ راجا، تیج راج سے خوش نہیں تھا لیکن حیدر علی درمیان میں تھا اور ریاست کے معاملات دگرگوں تھے۔ راجا نے دربارِ عام منعقد کیا اور تیج راج کو معاف کردیا۔

سپاہیوں کا مطالبہ اب بھی اپنی جگہ تھا۔ وہ تیج راج کے وعدوں پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ حیدر علی نے پھر دوستی نبھائی۔ سپاہیوں کو ایک بڑے میدان میں جمع کیا اور ناراض فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی اپنے ذمے لے لی۔

’’بے بدل سپاہیو! میری بات غور سے سنو۔ میسور کی طاقت تم ہو۔ تمہارے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ تمہاری تنخواہیں ابھی تک ادا نہیں ہوئیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری تنخواہیں میں ادا کروں گا۔ تیج راج کا اس میں کوئی دخل نہیں، تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ خزانہ خالی ہے لیکن میں نے بندوبست کرلیا ہے۔ بہت جلد رقم کا انتظام ہوجائے گا۔‘‘

سپاہیوں نے خوشی سے نعرے بلند کیے۔ سب حیرت زدہ تھے کہ حیدر علی اتنی رقم کا بندوبست کیسے کرے گا۔

وہ راجا سے بات کرنے کے لیے محل میں گیا تو ایک مرتبہ پھر رانی لکشمی اس کے سامنے تھی۔ وہ حیدر علی کو کئی سال بعد دیکھ رہی تھی۔ اس کی محبت اس کی آنکھوں میں آگئی۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

’’نائیک جی، دوسری شادی مبارک ہو۔ اب تو سنا ہے ایک بیٹا بھی تمہاری بیوی کی گود میں آگیا ہے۔ میری گود ابھی تک خالی ہے اور اب کیا بھرے گی۔ اب تو تم میرے نہیں پورے میسور کے محبوب ہو۔ تمہیں اتنی فرصت کہاں کہ میری طرف آنکھ بھر کر دیکھو۔‘‘

’’رانی جی، یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ ہمیں اپنے سے زیادہ وطن کی فکر کرنی چاہیے۔ مجھے مہاراج سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔‘‘

’’ہائے رام، کتنے کٹھور ہو۔ راجا جی تو چھپر کھٹ سے نہیں اٹھتے تم سے بات کیا کریں گے۔ پھر بھی میں تمہیں روک تو نہیں سکتی۔ میری پرارتھنا ہے کہ تم خوش رہو۔‘‘

وہ راستے سے ہٹ گئی۔

راجا کرشنا ہمیشہ سے اسے پسند کرتا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود اس پر بھروسا کرتا تھا۔ اسے دیش بھگت کہتا تھا اور اب تو وہ اس کا نجات دہندہ تھا۔ اسے قید سے رہائی دلائی تھی اور سینہ ٹھونک کر کہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے تیج راج اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔

اسے دیکھتے ہی راجا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

حیدر علی راج محل سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر وہ اطمینان تھا جو کسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے بعد ہوتا ہے۔

حیدر علی نے راجا کے احکامات کی بجاآوری کرتے ہوئے رقم کے بجائے وہ تمام سرکاری جائداد تقسیم کردی جو قابلِ تقسیم تھی۔ اس میں راجا کے ہاتھی اور گھوڑے بھی شامل تھے۔ یہ سب کچھ اتنا تھا کہ چار ہزار گھڑسواروں کی تنخواہوں کی مکمل ادائی ہوگئی۔

حیدر علی اس وقت میسور کا سب سے مقبول آدمی تھا۔ راجا کے نزدیک وہ اس کا یکہ وتنہا محافظ تھا۔ سپاہی اسے اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے کہ ان کی تنخواہوں کی ادائی اسی کی سعی و کاوش کی بدولت ہوئی تھی۔ حیدر علی کو اپنی مضبوط حیثیت کا احساس تھا مگر اس وقت وہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور نہیں سمجھتا تھا کہ تیج راج کو اقتدار سے بے دخل کرسکے۔ اس کو اس معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی تھی لیکن تیج راج کی نامقبولیت اسے اکسا ضرور رہی تھی۔

حالیہ انتشار میں حیدر علی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسے بنگلور کا قلعہ اور ضلع جاگیر کے طور پر عطا کیا گیا۔ حیدر علی کو اپنی اہمیت کا احساس اسی سال نہایت شاندار طریقے سے ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ مرہٹوں نے میسور کی سرحد پار کرلی اور تاوان کی بقایا رقم کا مطالبہ کرنے لگے جو تیج راج نے ان سے معاہدہ کیا تھا۔

مرہٹے ان اضلاع میں پہنچ گئے تھے جو گزشتہ معاہدے کے مطابق ان کے پاس گروی رکھے گئے تھے۔ راجا میسور اور تیج راج نے فوجی عہدے داروں کو حکم دیا کہ وہ مرہٹہ سرداروں کا راستہ روکنے کے لیے کارروائی کریں لیکن کوئی فوجی عہدے دار اس کے لیے آمادہ نہ ہوا لہٰذا حیدر علی کو میسور کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ راجا نے اسے خان بہادر کا لقب دیا۔ اس کے علاوہ ذاتی علم، ذاتی ہاتھی اور ذاتی مسند شاہی بھی عطا کی۔

مرہٹہ سرداروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے لکھا۔ ’’ہم حیدر کو بنگلور میں داخل ہونے دیں گے اور تب اپنی توپیں نصب کریں گے اور پھر دیکھیں گے کہ وہ کیسے ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔‘‘

حیدر علی نے پیش قدمی کا آغاز کیا اور ان تمام قلعوں کی طرف فوجی دستے متعین کردیے جہاں سے مرہٹے پایۂ تخت کی طرف آسکتے تھے۔ گویا تمام راستوں کی ناکابندی کردی۔

مرہٹے جلد ہی اتنے مجبور ہوگئے کہ حیدر علی سے مقابلے کے لیے کوچ کرنے لگے۔

مرہٹوں کے پاس حیدر علی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ فوج تھی لہٰذا وہ مرہٹوں کو کھلے میدان میں شکست دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ایک ایسے پہاڑی خطے میں اپنا پڑاؤ کیا جو سواروں کے لیے ناقابلِ عبور تھا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ دن کے اوقات میں باہر نہ نکلیں اور رات ہوتے ہی شب خون مارنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔

’’ہم کھلے میدان میں مقابلہ نہیں کرسکتے لیکن اگر شب خون کا سلسلہ جاری رہا تو ہم انہیں تھکا سکتے ہیں۔ وہ واپس پلٹنے پر مجبور ہوجائیں گے۔‘‘

دو مہینے کی لگاتار محنت کے بعد وہ مرہٹوں کو میسور کی حدود سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ حیدر علی نے مقبوضہ قلعوں کو اپنی فوج کے حوالے کیا اور بذاتِ خود سرنگاپٹم کی طرف لوٹ گیا۔

حیدر علی کو بڑی بڑی جاگیریں اور مرہٹوں کو بڑی رقوم کی ادائی نے ریاست کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ ریاستی اخراجات کی متحمل ہوسکے۔ کچھ کھانڈے راؤ کی سازشیں بھی تھیں جو ریاست کو مالی بحران سے نکلنے نہیں دے رہی تھیں۔ وہ راجا کو اس توہین اور ہتک کی یاددہانی بھی کراتا رہتا تھا جو تیج راج کے ہاتھوں راجا کو اٹھانی پڑی تھی۔ یہ بھی باور کراتا رہتا تھا کہ تیج راج ہی اس مالی بحران کا ذمے دار ہے۔

حیدر علی عملی طور پر سپہ سالارِ اعظم بن چکا تھا لہٰذا راجا

کو اب تیج راج کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ راجا نے حیدر علی سے کہا۔ ”تم تیج راج سے اپنے تمام تعلقات توڑ لو۔“

حیدر علی اس حکم کو مانتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ ایسا کرتے ہوئے آئندہ فوجوں کو باقاعدہ تنخواہوں کی ادائی کی ذمے داری اس پر آجاتی تھی اور خزانے کی حالت اس پر ظاہر تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک روز یہی سپاہی اس کے محل کے سامنے دھرنا دیے بیٹھے ہوں گے۔ اس کا حال بھی تیج راج جیسا ہی ہوگا۔

”کیا سوچ رہے ہو حیدر علی۔“

”مہاراج میں سوچ رہا ہوں سپاہی آج تیج راج سے تنخواہوں کا مطالبہ کر رہے ہیں کل مجھ سے کریں گے۔“

”اس کا انتظام ہوجائے گا۔“

تنخواہوں کی ادائی کے لیے حیدر علی کو مزید علاقے دیے گئے۔ اس طرح نصف سلطنت سے زیادہ علاقہ براہ راست اس کے قبضے میں آگیا۔

حیدر علی سبکدوشی کی بات چیت کرنے کے لیے جیسے ہی تیج راج کے دروازے پر پہنچا وہ سمجھ گیا کہ منصوبہ تیار ہے۔ وقت آچکا۔ اس نے دروازے کھول دیے۔ حیدر علی نے تمام واقعات و حقائق کھول کر اس کے سامنے بیان کردیے۔

”اب آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ وزارت سے دست کش ہوجائیں۔ راجا کی حماقت سے ملک میں شورش پھیلی ہوئی ہے اور نام آپ کا ہو رہا ہے۔“

”اچھا ہوا یہ مطالبہ آپ کی طرف سے ہوا ورنہ میں تو خود اس جھنجھٹ سے نجات پانا چاہتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ ریاست پر اس احسان کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟“

”میں اس سلسلے میں راجا سے بات کروں گا۔ آپ کو جتنی رعایت مل سکتی ہے ضرور ملے گی۔“

تیج راج کو ایک جاگیر دی گئی جس کی آمدنی تین لاکھ پگوڈا تھی۔ اس کو ایک ہزار سوار اور تین ہزار پیادے رکھنے کی اجازت بھی دی گئی لیکن بعد میں راجا میسور نے کھانڈے راؤ کے مشورے سے اس کی جاگیر میں کٹوتی کر دی۔ راجا کی طرف سے حکم نامہ جاری کیا گیا۔

”تیج راج کو فوج رکھنے کی ضرورت نہیں اور اسے تین لاکھ پگوڈا کی آمدنی کی حامل جاگیر کے بجائے ایک لاکھ پگوڈا کی جاگیر عطا کی جائے اور حکم دیا جائے کہ وہ فی الفور میسور سے نکل جائے۔“

تیج راج نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ حیدر علی سے کہا گیا کہ وہ میسور کا محاصرہ کرلے۔ حیدر علی نے میسور کا محاصرہ کرلیا۔

اقتدار کی بھول بھلیاں بھی عجیب سبق آموز ہوتی ہیں۔ تیج راج اپنی زندگی کی آخری لڑائی اس شخص کے خلاف لڑ رہا تھا جس کی اب تک کی ترقی تیج راج کی مہربانیوں کی مرہون منت تھی۔

جب برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ تیج راج کے سفید فام دستے کے سالار اعلیٰ نے غداری کی اور حیدر علی سے مل گیا۔ تیج راج کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

رانی لکشمی اور راجا کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی تھی۔ تیج راج کا وجود ریاست میسور سے الگ ہوگیا تھا۔ دیوراج پرلوک سدھار گیا تھا۔ کھانڈے راؤ کو وزیر سلطنت بنا دیا گیا تھا۔

کھانڈے راؤ کو ریاست کے اس حصے کا وزیراعظم بنایا گیا تھا جو حصہ ابھی حیدر علی کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ یہ حصہ کل سلطنت کے آدھے سے زیادہ نہیں تھا۔ کھانڈے راؤ کو یہ کمی بری طرح کھٹکتی تھی کہ سلطنت کا آدھا حصہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس پر حیدر علی قابض ہے۔ حیدر علی کے مطالبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ کھانڈے راؤ کو یہ فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ اگر یہی حال رہا تو تمام ریاست پر حیدر علی کا قبضہ ہوجائے گا۔ وہ حیدر علی سے ٹکر لینے کا بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

حیدر علی کے بڑھتے ہوئے مطالبات سے راجا بھی نالاں رہنے لگا تھا۔ اس کا تو وہی حال ہوا تھا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ پہلے تیج راج کے مطالبوں سے پریشان تھا اب حیدر علی کے مطالبے پریشان کر رہے تھے۔ حیدر علی اب اتنی طاقت پکڑ چکا تھا کہ کوئی اس کے خلاف نہیں بول سکتا تھا۔ وہ سپہ سالار تھا لیکن وزیر کھانڈے راؤ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

جب سے حیدر علی نے دوسری شادی کی تھی رانی لکشمی سمجھنے لگی تھی کہ حیدر علی اب اس کے ہاتھ آنے والا نہیں۔

طاقت پکڑتے ہی حیدر علی کے رویے میں بھی ایسی سرد مہری آگئی تھی جس نے رانی کو مایوس کردیا تھا۔

محبت جب نفرت میں بدلتی ہے اور انتقام لینے پر اتر آتی ہے تو بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ رانی لکشمی بھی ایسے ہی مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ناکامی نے اس کے دل میں آگ سی لگا دی تھی۔ اب وہ راجا کو بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ حیدر علی سے تنگ آنے لگا تھا۔ اس کی طرف سے مخالفت کا امکان نہیں تھا لیکن کھانڈے راؤ کی طرف سے اسے شک تھا

کیونکہ وہ حیدر علی کا نائب رہ چکا تھا۔ اس کی وفاداری خریدنے کی ضرورت تھی۔ رانی نے کھانڈے راؤ کو بلا بھیجا۔ رانی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ خود حیدر علی سے دامن چھڑانے کو تیار بیٹھا ہے۔ اسے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو اسے رانی کی صورت میں میسر آگیا۔ اس منصوبے میں کھانڈے راؤ کے شامل ہونے کی دیر تھی، راجا کے دوسرے وفادار بھی اس سازش میں شریک ہوگئے۔

جب سازش پک کر تیار ہوگئی تو کھانڈے راؤ نے تجویز پیش کی۔

”ہم حیدر علی سے تنہا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہمیں مرہٹہ سردار وساجی پنڈت کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے۔ ایک طرف سے ہم حیدر علی پر حملہ کریں دوسری طرف سے مرہٹے اس پر چڑھ دوڑیں۔ اس طرح ہم بہ آسانی حیدر علی کو سلطنت سے باہر نکال سکتے ہیں۔“

”مرہٹوں کو اس حملے کے لیے تیار کون کرے گا؟“ ایک وزیر نے سوال کیا۔

”اس کے لیے تو ہمیں راجا کی مدد کی ضرورت ہوگی۔“ ایک وزیر نے کہا۔

”راجا جی ہم سے باہر نہیں ہیں۔“ کھانڈے راؤ نے کہا۔ ”جو ہم کہیں گے انہیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اگر نہیں کریں گے تو ہم انہیں گدی سے اتارنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔“

مختصر یہ کہ کھانڈے راؤ نے راجا سے ملاقات کی اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اسے اس منصوبے سے تو اتفاق تھا لیکن وہ مرہٹوں کو بلانے سے ہچکچا رہا تھا لیکن جب اس نے کھانڈے راؤ کے تیور دیکھے تو وہ مرہٹوں کو خط لکھنے پر آمادہ ہوگیا۔

خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا اور یہ سازشی ٹولہ مناسب موقعے کا انتظار بھی کرتا رہا۔

راجا کی اجازت ملتے ہی کھانڈے راؤ نے اپنی طرف سے بھی مرہٹوں کو ایک چٹھی لکھی۔

”حیدر علی میسور کی تاک میں ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو ہندو حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا اور یہ اسلامی ریاست ہمیشہ آپ کے لیے خطرہ بنی رہے گی۔ اگر حیدر علی کو گرفتار کرنے میں آپ ہماری مدد کریں تو ہم ہمیشہ آپ کے وفادار رہیں گے اور ایک معقول رقم کے علاوہ ہمیشہ ’چوتھ‘ بھی دیتے رہیں گے۔“

کھانڈے راؤ نے اپنے اقتدار کے لیے ریاست کو مرہٹوں کی باجگزار بنانے کی پوری کوشش کی۔

یہ حیدر علی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یہ 33 مشکل دیہات پر مشتمل یہ ریاست دریائے کرشنا کے جنوب میں پورے جنوبی ہند تک پھیل چکی تھی اور اب کھانڈے راؤ اس کے ٹکڑے کرنے پر بضد تھا۔

حیدر علی کی زیادہ تر فوج فرانسیسیوں کی مدد کے لیے گئی ہوئی تھی۔ فوج کا ایک حصہ ارکاٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ حیدر علی کے پاس محض پندرہ سو افراد کی نفری موجود تھی۔ حیدر علی اس سازش سے بے خبر بیوی بچوں کے ساتھ سرنگاپٹم میں تھا کہ دشمن نے سرنگاپٹم کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور گولے برسنا شروع ہوگئے۔ حیدر علی نے بیوی کو جھنجھوڑا۔

”ہمارے خلاف سازش ہوگئی ہے۔ میرے پندرہ سو افراد کب تک مقابلہ کریں گے۔“

”آپ کی وفاداری کا یہ صلہ؟“

”یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں۔ مجھے اپنا دفاع کرنا ہے۔“

”اب دفاع ممکن نہیں۔“ بیوی نے کہا۔ ”آپ اپنی جان بچا کر سرنگاپٹم سے نکل جائیں۔ دشمن کو آپ کی تلاش ہوگی ہماری نہیں۔ آپ زندہ رہے تو فوجیں جمع کر کے دوبارہ سرنگاپٹم آسکتے ہیں۔“

برسات کی اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے سرنگاپٹم سے نکلنا تھا لیکن وہ کہاں جائے گا یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ گرفتاری سے اچھی تو موت ہے، اس نے سوچا۔ بیوی، بچوں کو خدا کے سپرد کیا اور گھر سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ دو سو کے قریب گھڑ سوار تھے اور سونے چاندی سے بھری ہوئی تھیلیاں تھیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح دریائے کاویر کے سامنے پہنچ گیا۔ چڑھے ہوئے دریا کی موجیں دل دہلا رہی تھیں۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور دریا میں کود پڑا۔ موجوں کو چیرتا ہوا دریا کے پار چلا گیا۔

اب وہ محفوظ تھا لیکن محفوظ منزل کی تلاش میں تھا۔ بنگلور میں اس کی طرف دار فوج کا ایک دستہ موجود تھا۔

وہ بنگلور کی طرف چل دیا۔ بیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد وہ بنگلور پہنچ گیا۔ اس کی طرف دار فوج کے سرداروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

حیدر علی کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ بنگلور میں رہ کر اپنا دفاع اس وقت تک کرتا رہے، جب تک وہ فوج واپس نہیں آجاتی جو مخدوم علی کی نگرانی میں فرانسیسیوں کی مدد کو گئی ہوئی تھی۔

کھانڈے راؤ، مرہٹوں کو لے کر سرنگاپٹم میں داخل

ہوا تو اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ حیدر علی فرار ہو چکا ہے۔ صبح تک فوجیوں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ حیدر علی بنگلور کی طرف گیا ہوگا کیونکہ وہاں اس کا ایک فوجی دستہ تھا۔

حیدر علی نے بنگلور پہنچتے ہی مخدوم علی کو خط لکھ دیا تھا کہ جس فوج کو لے کر فرانسیسیوں کی مدد کو جارہے ہو اسے لے کر فوراً واپس آجاؤ۔

مرہٹے بھی حیدر علی کے تعاقب میں بنگلور کی طرف روانہ ہوئے۔

مخدوم علی کو جیسے ہی حیدر علی کا پیغام موصول ہوا اس نے برق رفتاری سے واپسی کا سفر طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ انیکل کے مقام پر تھا کہ مرہٹوں اور کٹھ پتلی راجا کی مشترکہ افواج نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ مرہٹے تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ مخدوم علی بنگلور کی طرف بڑھنے سے قاصر ہو گیا۔ اس نے پسپائی اختیار کی اور ایک مقام پر محصور ہو کر رہ گیا۔

حیدر علی کو معلوم ہوا تو اس نے تھوڑی سی فوج بنگلور کے دفاع کے لیے اپنے پاس رکھی اور بقایا فوج کو مخدوم علی کی مدد کے لیے روانہ کر دیا۔ اس امدادی فوج کی کمان میر فیض اللہ کے پاس تھی۔ یہ فیض اللہ امدادی فوج لے کر جارہا تھا کہ مرہٹوں نے اسے راستے میں دھر لیا۔ وہ کھلے میدان میں جنگ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جلد ہی اپنے نو سو سپاہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ کچھ قتل ہوئے کچھ قید ہو گئے۔

حیدر علی کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ مخدوم علی دشمن کے گھیرے میں تھا۔ امدادی فوج کٹ چکی تھی، بنگلور کے دفاع کی اب کوئی صورت نہیں تھی۔ اب اپنے مستقبل کی ضمانت تک اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ مجبور ہو گیا کہ مرہٹوں سے صلح صفائی کی بات کرے۔

صلح کی بات کئی روز جاری رہی اور بالآخر مرہٹوں نے صلح کے عوض پانچ لاکھ کا مطالبہ کر دیا۔ مرہٹے پانچ لاکھ روپے لے کر اپنی فوج کو واپس لے گئے۔

اب حیدر علی کے لیے مہم آسان ہو گئی تھی۔ اس کے مقابل صرف کھانڈے راؤ رہ گیا تھا جس سے بہ آسانی مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی فوج اِدھر اُدھر سے جمع کی اور سرنگا پٹم جانے کے لیے دریائے راوی پار کر گیا۔ کھانڈے راؤ اس سے مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ کھانڈے راؤ کی فوج چار ہزار سپاہ پر مشتمل تھی جو یورپی بندوقوں سے مسلح تھی۔ اس کے مقابلے میں حیدر علی کی فوجی نفری انتہائی کم تھی لیکن حیدر علی نہایت اعلیٰ جنگی قابلیت کا مالک تھا۔ کثرت وقلت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

حیدر علی نے اسی حکمت عملی کا سہارا لے کر چند خطوط ایک ہی مضمون کے تحریر کیے۔ مضمون یہ تھا۔

"اگر آپ اپنے سپہ سالار کھانڈے راؤ کو ہلاک کر دیں گے تو حیدر علی سے قرار واقعی انعام پائیں گے۔"

یہ خطوط کھانڈے راؤ کے فوجی افسران کے نام تحریر کیے گئے تھے۔ پیغام بر سے کہا گیا تھا کہ وہ کھانڈے راؤ کے لشکر میں پہنچ کر جان بوجھ کر گرفتار ہو جائے۔ اس کے بعد اسے کیا کرنا ہے وہ بھی بتا دیا گیا تھا۔

یہ پیغام بر منصوبے کے مطابق کھانڈے راؤ کے فوجی افسران کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اسے پکڑ کر کھانڈے راؤ کے پاس لے گئے۔ کھانڈے راؤ نے اس کی تلاشی لی تو وہ خطوط برآمد ہوئے۔

"یہ کیا ہے؟"

"جو آپ دیکھ رہے ہیں۔"

"تم اور تمہارا مالک میرے افسروں کو بہکا رہا ہے۔"

"آپ بہت بھولے ہیں کھانڈے راؤ۔ آپ کے لشکر میں یہ میرا تیسرا پھیرا ہے۔ آپ کے کئی افسروں نے ان خطوط کا مثبت جواب دیا ہے۔ مجھے تو آپ قتل کر ہی دیں گے لیکن آپ کے کئی افسروں نے آپ کو ہلاک کرنے کی قسم کھائی ہے۔ آپ اپنی فکر کریں۔"

کھانڈے راؤ نے اس خدشے کے پیش نظر کہ قاصد کو قتل کرنے سے راز نہ کھل جائے، اسے جانے دیا لیکن خود بھی اتنا خوف زدہ ہوا کہ اپنی فوج کو چھوڑ کر سرنگا پٹم کی طرف بھاگ نکلا۔

وہ عجیب عالم تھا کہ جب رات گزری اور صبح فوج کو معلوم ہوا، ان کا سپہ سالار انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ نکلا ہے۔ وہ ابھی اس حیرت سے نکلنے نہ پائے تھے کہ حیدر علی کی فوج نے سامنے اور عقب سے بھرپور حملہ کر دیا۔ سپہ سالار کے بغیر فوج کیا لڑتی محض چند گھنٹوں میں دشمن کی فوج، توپیں، جنگی ساز و سامان حیدر علی کے قبضے میں آگیا۔

کھانڈے راؤ کے جنگی قیدیوں نے حیدر علی کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی جس سے حیدر علی کی فوجی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ چند روز یہاں ٹھہرنے کے بعد حیدر علی نے سرنگا پٹم پر چڑھائی کر دی۔ شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور شاہی محل پر گولہ باری شروع کر دی۔ کھانڈے راؤ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ مقابلہ کرتا۔ محل میں کھلبلی مچ گئی۔ گولوں کے جواب میں مستورات کی چیخیں محل سے باہر آرہی تھیں۔

راجا نے بدحواس ہو کر ایک معتمد کو حیدر علی کے پاس بھیجا اور صلح کا طالب ہوا۔

"راجا سے کہنا، مجھے تم سے کوئی پرخاش نہیں۔ جس کھانڈے راؤ کو محل میں چھپا کر رکھا ہے اسے میرے حوالے کر دو۔ میں گولہ باری بند کر دوں گا۔"

راجا کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کھانڈے راؤ کو حوالے کر دے۔ راجا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ حیدر علی نے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے گولہ باری شروع کر دی۔ محل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہی رانیاں جو کھانڈے راؤ کو وزیراعظم بنانے کے جرم میں شریک تھیں اب راجا کے پاؤں پڑ رہی تھیں کہ وہ کھانڈے راؤ کو حیدر علی کے حوالے کر کے ان کی جان بچا لے۔

سیاہ چادر میں ملبوس ایک عورت حیدر علی کے افسروں کے پاس آئی اور ملتمس ہوئی کہ وہ اسے حیدر علی کے پاس لے چلیں۔ یہ تو ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ عورت محل سے نکلی ہے یقیناً کوئی اہم شخصیت ہوگی لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کون ہے۔ اسے ضروری پوچھ گچھ کے بعد حیدر علی کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے حیدر علی کے سامنے پہنچ کر اپنا منہ کھول دیا۔

"رانی جی، آپ!" حیدر علی نے چونک کر کہا۔

"ہاں میں۔ آپ کو محل میں بلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی اس لیے خود حاضر ہو گئی۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں کس لیے؟"

"مجھے ہمیشہ میری ضرورت تمہارے سامنے لائی ہے۔ اس وقت بھی میں اپنے مطلب سے آئی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں، اسی محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ آپ محل پر گولہ باری بند کر دیں۔"

"میں نے ہمیشہ آپ کی خواہشات کو ٹھکرایا ہے لیکن آج نہیں ٹھکراؤں گا کیونکہ اس میں مجھے کوئی گناہ نہیں ملے گا۔"

"گولہ باری بند کر دیں گے؟"

"ایک شرط پر۔" حیدر علی نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ "کھانڈے راؤ کو میرے حوالے کر دو۔"

"تم وعدہ کرو کہ اس کی جان بخش دو گے۔"

حیدر علی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر تبسم ابھر آیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

رانی نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا لیکن حیدر علی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"میرے مذہب میں اس کی ممانعت ہے۔ آپ میرے لیے غیر ہیں۔"

"تم نے میری بات کی لاج رکھ لی۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" رانی نے کہا اور جس طرح آئی تھی اسی طرح منہ ڈھانپ کر باہر نکل گئی۔

حیدر علی نے گولہ باری بند کر دی۔

کھانڈے راؤ مجرم کی طرح اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ حیدر علی نے اپنا قول پورا کیا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ہلاک نہیں کرے گا یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ قید بھی نہیں کرے گا۔ اس نے کھانڈے راؤ کو لوہے کے ایک بڑے پنجرے میں قید کر دیا۔ اس پنجرے میں اسے کھانا ڈال دیا جاتا تھا۔

کھانڈے راؤ سمیت اس پنجرے کو اس نے بنگلور بھیج دیا۔ تقریباً ایک سال بعد وہ بدنصیب اسی پنجرے میں اپنی زندگی کے دن پورے کر کے مر گیا۔

ہندو امرا میں حیدر علی اب بھی اتنا ہی مقبول تھا جتنا پہلے تھا۔ اس نے ان امرا کو ساتھ لیا اور راجا سے ملنے چلا گیا۔ اس کی رانیوں نے اسے پھر مشورہ دیا کہ وہ حیدر علی سے ملاقات نہ کرے۔ راجا نے انکار کر دیا لیکن وہ حیدر علی تھا۔ کسی کے روکے رکنے والا نہیں تھا بلکہ اب تو وہ فاتح تھا۔ ایک دستہ فوج کا اس کے ساتھ تھا۔ وہ زبردستی اندر گھس گیا اور دروازے پر پہرا بٹھا دیا۔

وہ راجا کے ساتھ نہایت ادب سے پیش آیا اور تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔

"میرے ساتھ ساتھ آپ کے امرا کا بھی یہ خیال ہے کہ اب ریاست کے معاملات مضبوط ہاتھوں میں ہوں اور آئے دن کی سازشوں سے چھٹکارا ملے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" راجا نے کہا۔ "کھانڈے راؤ نے سخت نادانی کی کہ تمہیں ناراض کر دیا۔ اب تم آگئے ہو، تمہارے ساتھ مل کر سب ٹھیک کر لوں گا۔"

"آپ سے کیا امید رکھوں جبکہ آپ خود مجھے ہٹانے کی سازش میں شریک تھے۔"

"یہ مجھ پر بہت بڑا الزام ہے۔ میں کسی سازش میں شریک نہیں تھا۔"

"یہ مت بھولیے کہ کھانڈے راؤ میرے قبضے میں ہے۔ اس نے تفتیش کے دوران سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"وہ جھوٹا ہے، اپنا جرم میرے سر تھوپنا چاہتا ہے۔"

"اگر وہ جھوٹا ہے تو پھر یہ کیا ہے؟"

حیدرعلی نے چند خطوط اس کے سامنے رکھ دیے۔ راجا کی طرف سے مرہٹوں کے نام لکھے گئے یہ خطوط مرہٹوں سے ایک جھڑپ کے دوران اس کے ہاتھ لگ گئے تھے۔

”میں نے جس ریاست کی ترقی کے لیے دن رات ایک کردیے تھے، آپ اسی ریاست کو مرہٹوں کے ہاتھوں نیلام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔“

اس کے ساتھ آئے ہوئے ہندو امرا نے بھی ان خطوط کو پڑھا۔ ان پر بھی راجا کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔ راجا لاکھ کہتا رہا کہ وہ بہکاوے میں آگیا تھا لیکن ان امرا نے اس سے دست برداری کا مطالبہ کردیا۔

”آپ کمزور تھے اسی لیے سازشیوں کے بہکاوے میں آگئے۔ آئندہ پھر آسکتے ہیں۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ آپ حیدرعلی کے حق میں دست بردار ہوجائیں کیونکہ اس وقت ریاست میں حیدرعلی کے سوا کوئی نہیں جو انتظامات سنبھال سکے اور ریاست کو مرہٹوں کے دست برد سے بچاسکے۔“ امرا نے پرزور مطالبہ کیا۔

راجا نے ہوا بدلی دیکھی تو حیدرعلی کی خوشامد پر اتر آیا۔

”حیدرعلی میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست کہا اور سمجھا ہے۔ کیا تم بھی ان امرا کی ہاں میں ہاں ملاؤ گے۔“

”راجاجی، یہ سردار جو آپ سے مطالبہ کررہے ہیں اس میں میری خواہش کو دخل نہیں لیکن کہہ یہ ٹھیک رہے ہیں۔ وطن کی سلامتی کی خاطر آپ کو ان کا مطالبہ تسلیم کرلینا چاہیے۔“

راجا اب سمجھ گیا تھا کہ چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر کچھ شرائط طے ہوجائیں تو آئندہ زندگی آرام سے گزر جائے گی۔

”میں نے اس دیش کی خدمت کی ہے۔ کیا میں اسی سلوک کا مستحق ہوں کہ بھوکا مار دیا جاؤں؟“

”ہم آپ کو بھوکا کیسے مار سکتے ہیں۔“ حیدرعلی نے تسلی دی۔ ”آپ کو وظیفہ ملتا رہے گا اور ایک جاگیر گزارے کے لیے مل جائے گی۔“

”اس کا مطلب ہے مجھے محل چھوڑنا پڑے گا؟“

”محل اس کا ہوگا جس کی حکومت ہوگی۔ اب یہاں کا حکمران میں ہوں۔“

”اگر میرے دیش کی بہتری اسی میں ہے تو میں سلطنت کے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔“ راجا نے اس طرح کہا جیسے وہ ان سب پر کوئی احسان کررہا ہو۔

”آپ اس مضمون کی ایک تحریر لکھ دیں تاکہ میں مشتہر کرادوں۔ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ راجا کی جگہ حیدرعلی نے سنبھال لی ہے۔“

راجا نے تحریر لکھ دی۔ حیدرعلی نے اس کا اعلان ریاست میں نشر کرادیا۔

”میں راجا میسور اعلان کرتا ہوں کہ آج تاریخ 4 مئی 1761ء سے حیدرعلی ریاست کے مالک ہوں گے۔ ریاست کے لوگوں کو چاہیے کہ حیدرعلی کے حکم کو میرا حکم سمجھیں اور مانیں۔“

حیدرعلی، راجا سے تحریر لکھوانے کے بعد دیوان خانے سے باہر نکل رہا تھا کہ رانی لکشمی راہ میں آگئی۔

”مہاراج حیدرعلی، مجھے محل کب خالی کرنا ہے؟“

”رانی جی، آپ مجھ پر طنز کررہی ہیں۔“

”میں نے کوئی غلط سوال کرلیا؟“

”رانی جی، یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ میں نے جو کچھ کیا اس پر میں مجبور کردیا گیا تھا۔“

”مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تو صرف آپ کو دیکھنے چلی آئی تھی کہ کیا خبر پھر کبھی آپ کے درشن ہوتے ہیں یا نہیں۔“

حیدرعلی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کچھ دیر رانی کے سامنے رکا رہا تو اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

⊜⊜⊜

حیدرعلی کچھ دنوں سرنگاپٹم کے انتظام وانصرام میں مشغول رہا اور پھر بنگلور چلا گیا۔ وہ ابھی بنگلور میں تھا کہ بصالت جنگ کا سفیر ادرنی سے اس کے پاس آیا اور عرض کی کہ ہوسکوٹ کے محاصرے میں بصالت جنگ کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

بصالت جنگ حیدرآباد کے حکمران صلابت جنگ کا بھائی تھا۔ وہ کچھ دنوں تک تو صلابت جنگ کا دیوان رہا اور پھر ایک دوسرے بھائی کی سازش کا شکار ہوکر معزول ہوگیا۔ پھر وہ اپنے علاقے ادرنی چلا گیا جہاں کا وہ نواب تھا۔ جب مرہٹوں کو پانی پت میں شکست ہوئی تو بصالت جنگ کو جنوب کی جانب علاقوں میں توسیع کا خیال آیا کیونکہ اس وقت مرہٹوں میں انتشار تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ”ہوسکوٹ“ کا محاصرہ کرلیا۔ اس نے اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا اور ہوسکوٹ فتح ہونے میں نہ آتا تھا۔

حیدرعلی بنگلور میں مقیم تھا جو ہوسکوٹ سے صرف 18 میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ بصالت

جنگ کے وسائل جواب دے چکے ہیں۔

بصالت جنگ کو مشکل میں دیکھ کر حیدرعلی کے سینے میں دبے ہوئے انتقام کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ ہوسکوٹ کے راستے ہی میں ”سرا“ پڑتا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس کے باپ فتح علی نے کبھی ملازمت کی تھی، قریب ہی دودبالاپور تھا۔ یہاں اس نے بچپن میں قید کے دن گزارے تھے۔ عباس قلی خاں جس نے اس پر مظالم کیے تھے اب بھی اسی علاقے میں مقیم تھا۔ اسی نام کے ساتھ اسے وہ سب مظالم یاد آگئے جن سے اس کا خاندان گزرا تھا۔ 32 برس قبل کے واقعات اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ اب وہ کمسن بچہ نہیں تھا۔ وہ اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ اس نے ایک مانوس ارادے کے ساتھ اپنے ایک پیغام رساں کو بصالت جنگ کی چھاؤنی روانہ کیا اور اس شرط پر تین لاکھ فراہم کرنے کی پیشکش کی کہ اسے سرا کے نواب کے خطاب سے نوازا جائے گا۔

بصالت جنگ نے یہ شرط منظور کرلی۔

سندیں تیار ہوئیں اور حیدرعلی ”سرا“ کا نواب بن گیا۔

وہ اپنی فوجیں لے کر بصالت جنگ کی خدمت میں پیش ہوگیا اور ایک ہی جھٹکے میں ہوسکوٹ کا قلعہ فتح کرلیا۔

ہوسکوٹ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد حیدرعلی نے دودبالاپور کی جانب پیش قدمی کی جہاں اس کا پرانا دشمن عباس قلی مقیم تھا۔

عباس قلی خاں نے جو سنا کہ حیدرعلی آرہا ہے تو اس نے حرم کی مستورات اور قیمتی اسباب کے ساتھ ارکاٹ کی جانب راہ فرار اختیار کی۔ اس کے فرار کی خبر سن کر ”سرا“ کے محاصرے کے لیے پیش قدمی کی۔ محصور فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئی۔

حیدرعلی اب ”سرا“ کا مطلق العنان حاکم بن چکا تھا۔ اس نے بتدریج ”سرا“ کے ماتحت علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔

حیدرعلی ابھی ”سرا“ میں مقیم تھا کہ اس کے سامنے ایک ہندو نوجوان چین بسویا کو پیش کیا گیا۔ یہ نوجوان حیدرعلی سے ملنے کا مشتاق تھا۔

یہ خوبرو نوجوان حیدرعلی کے سامنے آیا تو حیدرعلی نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں اور ہم سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں راجا بدنور (یا یدنور) کا متبنیٰ ہوں۔ راجا کے مرنے پر اس کی رانی نے اپنے برہمن وزیر سے ناجائز تعلقات پیدا کرلیے ہیں۔ ان دونوں نے مل کر مجھے میرے حق سے محروم کردیا اور خود حکومت پر قابض ہوگئے۔ اگر آپ مجھے میری ریاست واپس دلادیں تو گراں قدر نذرانہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا اور ہمیشہ آپ کا باجگزار ہوں گا۔“

”نوجوان مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمہارا حق تمہیں دلواؤں گا لیکن شرط یہ ہے کہ بدنور کی فتح تک تمہیں میرے پاس رہنا ہوگا تاکہ بدنور کی فتح کے بعد تمہارے دعوے کی تصدیق ہوسکے۔“

”میں آپ کی حراست میں رہنے کو تیار ہوں۔ جب آپ بدنور فتح کرلیں گے تو وہاں کا بچہ بچہ میری گواہی دے گا۔ اگر عیاش رانی آپ کے ہاتھ لگ گئی تو وہ خود قبول کرلے گی کہ میں کون ہوں۔“

بدنور کا قلعہ زیادہ دور نہیں صرف پچاس میل کی مسافت پر تھا لیکن اس قلعے تک پہنچنے کے لیے گھنے جنگلات سے گزرنا پڑتا تھا۔

حیدرعلی نے نوجوان کو ہمراہ لے کر فوج کو کوچ کا حکم دیا۔

وہ جنگل میں اس احتیاط سے داخل ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ ابھی اس نے چند میل کی مسافت طے کی تھی کہ ریاست کا اولین قلعہ ”سیموگا“ دکھائی دیا۔ حیدرعلی نے بہ آسانی قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اس قلعے سے حیدرعلی کو قیمتی اشیا کے علاوہ ایک لاکھ پگوڈا کا خزانہ بھی ہاتھ لگا۔ اس مقام پر ریاست بدنور کی رانی کی جانب سے ایک سفیر حیدرعلی سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا اور چار لاکھ پگوڈا حیدرعلی کے حضور بہ طور نذرانہ پیش کرنے کی پیشکش کی لیکن حیدرعلی نے اس پیشکش کو ٹھکرادیا اور آگے بڑھتا رہا اور راستے کے قلعوں پر قبضہ کرتا ہوا بدنور پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا۔ رہنمائی کے لیے نوجوان چین بسویا ساتھ تھا۔

حیدرعلی نے رانی سے کہلوایا کہ وہ قلعہ اس کے حوالے کردے لیکن وہ جنگ کرنے کو تیار تھی اور جنگ ہوئی لیکن انجام یہ ہوا کہ حیدر کا ایک جانباز دستہ فصیل پر چڑھا اور قلعہ فتح ہوگیا۔ رانی کو گرفتار کرکے حیدرعلی کے پاس لایا گیا۔

اس موقعے پر ایک مغربی مورخ میچاند (MICHAND) نے یہ کہانی بیان کی ہے۔

”نوجوان چین بسویا جس کی عمر صرف سولہ سال تھی اور جو اپنی جوانی میں حسن وعشق کے فریب کا مارا تھا۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا تھا وہ بھی بدنور میں تھی چنانچہ بدنور کی مکمل فتح کے بعد اسے بھی حیدرعلی کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ حیدرعلی اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس

نے نوجوان سے وہ لڑکی طلب کی۔

''میں نے تجھے تیری ریاست دلوائی ہے اس کی قیمت کے طور پر یہ لڑکی مجھے دیدے۔''

چینن بسویا یہ سنتے ہی مشتعل ہوگیا۔ ''جب میری محبوبہ ہی مجھے نہ ملے تو تاج و تخت بیکار ہے۔ آپ یہ سلطنت اپنے پاس رکھیں، میں فقیر بن کر رہ لوں گا لیکن محبوبہ نہیں گنوا سکتا۔''

حیدر علی برافروختہ ہوگیا اور اس نے زبردستی نوجوان کی محبوبہ کو اس سے چھین لیا۔''

اس کہانی پر مکمل اعتماد نہیں کیا جاسکتا لیکن اس نے چینن بسویا سے بے وفائی ضرور کی۔ بدنور کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سونے کی سرزمین ہے۔ حیدر علی اسے ایک بار دیکھنے کے بعد چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ حیدر علی ایسی سرزمین سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا خصوصاً ایسی حالت میں کہ ریاست میسور زبردست مالی بحران کا شکار تھی۔

حیدر علی نے چینن بسویا، بیوہ رانی اور اس کے بھائی کو دوا گیری روانہ کردیا اور اس طرح اپنے اقتدار کا اعلان کیا جیسا اس نے اپنی سلطنت کے کسی حصے میں نہیں کیا تھا۔ بدنور کا نام حیدر نگر رکھا گیا اور وہ اس کی راجدھانی قرار پایا۔ یہاں اس نے پہلی بار سکے کے اجرا کے حق کو استعمال کیا اور اپنا سب سے پہلا سکہ ''بہادری پگوڈا'' کے نام سے جاری کیا۔

بدنور کے لوگوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ چینن بسویا کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لہٰذا کئی سازشوں نے جنم لیا۔ حیدر علی نے ان سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تقریباً ایک ہزار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ان سازشوں سے نمٹنے کے بعد اردگرد کے بیشتر علاقے فتح کرلیے۔

ان علاقوں کی فتح کے بعد حیدر علی نے سرنگا پٹم کا رخ کیا۔

کئی برس کے وقفے کے دوران مادھوراؤ مرہٹہ اپنے باپ بالاجی کی جگہ مرہٹوں کا پیشوا بن چکا تھا اور مرہٹوں نے اپنی پیش قدمی کا آغاز کردیا تھا۔

⊕⊕⊕

مرہٹے مسلسل پیش قدمی کر رہے تھے اور خطے میں تباہی مچائے ہوئے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے حیدر علی نے فوجی دستے روانہ کیے اور پھر خود بھی روانہ ہوگیا۔

ایک مقام راٹ ہالی پر فریقین کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی لیکن یہ ایک فریب تھا، حیدر علی اس کا شکار ہوگیا۔ دشمن کی تعداد چار ہزار سے کسی طور بھی زیادہ نہیں تھی اور وہ بھی جلد بھاگ کھڑی ہوئی۔ حیدر علی نے تعاقب شروع کردیا۔ مرہٹے بھاگتے رہے حیدر علی ان کے پیچھے تھا۔ اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب اس نے خود کو پچاس ہزار مرہٹہ فوج کے سامنے پایا۔ بھاگنے والے مرہٹے اسے اپنی اصل فوج تک لے آئے تھے۔ اب نہ آگے بڑھنے کی گنجائش تھی نہ پیچھے ہٹنے کی۔ اس نے ایک خشک ندی کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ دونوں طرف سے توپوں کی گولہ باری کے تبادلے کا آغاز ہوگیا۔

غروب آفتاب کے وقت مرہٹوں کی گولہ باری ختم ہوئی تو حیدر علی کی فوج کی ایک ہزار سپاہ ہلاک ہوچکی تھی۔

دوسرے دن پھر گولہ باری شروع ہوگئی۔ اسی گولہ باری کے دوران مادھوراؤ نے حیدر علی کو خط روانہ کیا۔

''ہم آپ سے دو دو ہاتھ کرنے آئے ہیں لہٰذا آپ ہمارے ساتھ دو دو ہاتھ کرلیں ورنہ ہم یہ تصور کریں گے کہ حیدر علی ایک سپاہی ہرگز نہیں ہے۔''

اب حیدر علی کا توقف کرنا خود کو بزدل کہلوانے کے برابر تھا۔ چنانچہ اس نے پیش قدمی کی اور کھلے میدان میں مرہٹوں سے جا بھڑا۔ اس معرکہ آرائی میں مرہٹوں کا پلہ بھاری رہا۔ حیدر علی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ حیدر علی بھیس بدل کر اپنے خیمے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

مرہٹوں نے پڑاؤ اٹھایا اور بدنور کی جانب پیش قدمی شروع کردی۔ حیدر علی نے بھی بدنور کا رخ کیا اور شکار پور کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اس مقام پر بھی مرہٹوں نے معرکہ آرائی کی اور حیدر علی مسلسل پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوا اور صلح پر بھی۔

حیدر علی کو بہ طور تاوان جنگ 8 لاکھ ادا کرنے پڑے۔

مادھوراؤ اپنے دارالحکومت پونا چلا گیا۔

یہ خطرہ ٹل ضرور گیا تھا لیکن حیدر علی جانتا تھا کہ مرہٹے جارحانہ عزائم رکھتے ہیں اور وہ اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی ضرور کوشش کریں گے۔

اگر حیدر علی چاہتا تو مرہٹوں سے نمٹنے کے لیے نظام یا انگریزوں سے معاہدہ کرسکتا تھا لیکن اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔

اس نے انگریزوں کو کبھی دوست نہیں بنایا۔ اسی لیے مدراس کے گورنر نے لکھا تھا۔

''یا تو ہم حیدر کو اپنا دوست بنالیں یا اس کو ایک دشمن سمجھ کر تباہ کردیں لیکن اسے دوست بنانے کے سلسلے میں اب تک تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئی ہیں۔''

حیدر علی تو انگریزوں سے معاہدہ نہ کرسکا لیکن نظام علی (حیدرآباد) نے انگریزوں سے مدد مانگ لی۔ پیشوا نے نظام علی کے ساتھ اتحاد کرلیا تھا۔ نظام علی نے مسلمان ہوتے ہوئے ایک مسلمان (حیدر علی) کے خلاف مرہٹوں سے نہ صرف اتحاد کیا بلکہ برطانوی راج کو بھی مطلع کیا کہ ہمیں حیدر علی کے خلاف برطانوی فوج کی مدد درکار ہے۔ برطانوی فوج ایک ماہ کے اندر اندر مدد کو پہنچ جائے۔

مرہٹے اتنی جلدی میں تھے کہ انہوں نے اپنے حلیف کا انتظار بھی نہیں کیا اور دریائے کرشنا عبور کرلیا۔ مرہٹوں نے سرا کے قلعے کا رخ کیا۔ حیدر علی کا برادر نسبتی یہاں مقیم تھا۔ اسے مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی۔ دوا گیری کا وہ قلعہ جسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا مرہٹوں کے تسلط میں آگیا۔ دیگر کئی علاقے بھی ہاتھ سے چلے گئے۔

یہ فتوحات اپنی جگہ لیکن حیدر علی یہ بھی سن رہا تھا کہ نظام علی بس پہنچنے ہی والا ہے لہٰذا اسے صلح کی طرف راغب ہونا پڑا۔

مرہٹہ سردار بھی اس کوشش میں تھا کہ نظام کی آمد سے قبل صلح ہوجائے ورنہ وہ بھی اپنا حصہ طلب کرے گا۔

حیدر علی کو 31 لاکھ بہ طور تاوان ادا کرنے کا وعدہ کرنا پڑا۔ جو علاقے مرہٹوں نے فتح کیے تھے انہی کے پاس رہے۔

نظام کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

اس شکست کے بعد اس نے نظام کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تاکہ انگریزوں کا مقابلہ کرسکے۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگیا اور نظام نے اس کے ساتھ انگریزوں سے لڑنے کا معاہدہ کرلیا۔ یہ ایک نئی صورت حال تھی جس کا مقابلہ انگریزوں کو کرنا تھا۔

حیدر علی اور نظام کی افواج ارکاٹ کی جانب پیش قدمی کررہی تھیں۔

انگریزی افواج کا کمانڈر کرنل اسمتھ تھا۔

چوہے بلی کا کھیل چلتا رہا۔ کہیں حیدر اور نظام کی فوجوں کو فتح حاصل ہوئی کہیں انگریز فتح یاب ہوئے۔ جو فوج شکست یاب ہوتی، کسی دوسری جانب پیش قدمی کرلیتی۔ یہ کھیل ایک سال تک جاری رہا۔ اس موقعے پر نظام نے حیدر علی سے بے وفائی کی۔ اس نے خفیہ طور پر انگریزوں کو صلح کی پیشکش کی۔ مدراس حکومت نے نظام کو مجبور کیا کہ وہ حیدر علی کا ساتھ چھوڑ کر کرنل اسمتھ کے ساتھ مل جائے تو صلح ہوسکتی ہے۔

حیدر علی اور نظام اتحادی تھے۔ صلح ہوتی تو دونوں سے ہوتی۔ نظام کو یہ شرط مسترد کردینی چاہیے تھی لیکن وہ حیدر علی کو چھوڑ کر یہ شرط ماننے پر تیار ہوگیا۔

مدراس حکومت اور نظام علی کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔

حیدر اب انگریزوں سے لڑنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ اس کو جزیرہ نما کے مشرقی حصے سے نکل کر مغربی حصے مالابار میں انگریزوں کے حملے روکنے کے لیے جانا پڑا۔

مشرق میں کرنل اسمتھ کو جارحانہ حملے کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

حیدر علی بنگلور پہنچ گیا۔ جاتے جاتے وہ تین ہزار گھڑسوار فوج کرنل اسمتھ سے برسرپیکار رہنے کے لیے چھوڑ گیا تھا جو ایک ڈویژن انگریزی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم تھی۔ اس نے یہ قدم اس لیے اٹھایا تھا کہ انگریزی فوج کو بنگلور تک پہنچنے میں رکاوٹ ڈالی جائے۔

حکومت بمبئی نے مالابار ساحل پر اپنی فوج روانہ کی تاکہ اس ساحل پر واقع حیدر علی کے مقبوضات تسخیر کیے جاسکیں۔

انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ بنگلور کے محاصرے سے حیدر علی کو جنوب کی جانب سے رسد کی فراہمی کا سلسلہ کاٹ دیا جائے۔

ادھر کرنل اسمتھ کو یہ حکم ملا کر انگریز فوج میسور میں داخل ہوجائے۔ اس حکمت عملی کے مطابق میسوری علاقوں پر حملہ آور ہونا اور بنگلور کو محاصرے میں لینا تھا۔

کرنل وڈ ''ڈنڈی گل'' پر قبضہ کرچکا تھا اور اب اسے مطلع کیا گیا تھا کہ وہ جلد از جلد مرکزی فوج کے ساتھ آن ملے۔

گوئی کا مرہٹہ سردار مرار راؤ انگریزی افواج سے ملنے کے لیے چلا۔ اس کے پاس تین ہزار گھڑسوار اور 2 ہزار پیادہ سپاہ تھی۔ چند توپیں بھی ہمراہ لایا تھا۔ وہ انگریزی فوج سے نصف میل دور خیمہ زن تھا کہ نصف شب کے وقت حیدر علی اس پر حملہ آور ہوگیا لیکن ایک اتفاقی حادثے نے اسے ناکامی میں بدل دیا۔ حیدر علی کا گھوڑا ایک خیمے سے الجھ کر گر پڑا۔ چاروں طرف سے حملہ ہوگیا۔ حیدر علی کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ حیدر علی بھی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔

حیدر علی کو کسی اور مہم کی طرف جانے کے لیے تقریباً ایک ماہ انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ شب خون کے دوران زخمی ہوگیا تھا۔

اسی دوران انگریزی افواج مختلف علاقوں پر قبضے

کرتی رہیں اور اسے معلوم ہوا کہ کرنل وڈ اپنی مرکزی فوج سے ملنے کے لیے پیش قدمی کر چکا ہے۔ وہ ایک بڑی فوج لے کر کرنل وڈ کو روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ کرنل اسمتھ کو معلوم ہوا تو وہ ''ہوسکوٹ'' حیدر علی کے تعاقب کے لیے نکلا لیکن وہ حیدر علی کا مقابلہ نہ کرسکا اور اس بری طرح پسپا ہوا کہ اپنا تمام ساز و سامان حتیٰ کہ خیمے تک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ اس دوران کرنل وڈ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنی مرکزی فوج سے جا ملے۔

حیدر علی کی اس مہم جوئی کا مقصد اپنی فوج کے لیے نئی بھرتی کا اہتمام کرنے کے علاوہ اپنے ماتحت سرداروں پر اپنا رعب قائم کرنا تھا جو مسلسل شکستوں کی وجہ سے بددل ہوگئے تھے۔

یہ رعب اس کے سرداروں پر تو طاری ہونا ہی تھا، انگریزوں پر بھی طاری ہوا۔ مدراس پریذیڈنسی نے کرنل اسمتھ کی خراب کارکردگی کو جواز بنا کر واپس بلالیا۔ اب اعلیٰ قیادت کرنل وڈ کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ انگریز فوج پیش قدمی کرنے اور واپسی اختیار کرنے تک محدود رہی۔

کرنل اسمتھ کی واپسی نے حیدر علی کی فوج کے حوصلے مزید بڑھا دیے۔

حیدر علی نے اچانک کرنل وڈ پر حملہ کر دیا۔ اس کی فوج کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ کرنل کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

کرنل وڈ نے ابھی خیمے نصب ہی کیے تھے اور فوجی ترتیب درست کرنے میں مصروف تھا کہ حیدر علی کی فوج گولے برسانے لگی۔ یہ سلسلہ دوپہر سے شام تک جاری رہا۔ انگریز فوج کے دو سو سپاہی ہلاک ہوگئے۔ حیدر علی کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر واپس لوٹ آیا۔

اس حملے نے انگریزوں کو ایسی بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا کہ مدراس کی حکومت نے کرنل وڈ کو بھی واپس بلا لیا۔ وجہ؟ وہی خراب کارکردگی۔

کرنل اسمتھ پہلے ہی واپس بلایا جاچکا تھا۔ کرنل وڈ کی واپسی کے بعد فوجی قیادت کرنل لینگ کے سپرد کر دی گئی۔ اس نے کمان سنبھالتے ہی اپنی فوجوں کو وینکٹ گری میں مقیم کیا۔

اب حیدر علی جنوب کی طرف یلغار کرنے کے لیے آزاد تھا۔

اس نے تن تنہا انگریزوں کو اس حال پر پہنچا دیا۔ یہ اس کی بہادری کا بیّن ثبوت تھا۔

اس نے حسب توقع جنوب کا رخ کیا۔ دھرم پوری پر دوبارہ قبضہ جمانے کے بعد ان دیگر علاقہ جات کی جانب پیش قدمی کی جو کرنل وڈ نے فتح کر لیے تھے۔

اس کے باوجود کہ انگریزی فوج تعاقب میں تھی، اس نے اتنی تیزی سے راستے میں پڑنے والے تمام تر قلعے فتح کر لیے کہ انگریزی دستے اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

ڈنڈی گل پر بھی اس نے دوبارہ تسلط قائم کر لیا۔

انگریزوں کی تمام محنت پر پانی پھر گیا۔ اس نے جو علاقے ایک ہاتھ سے گنوائے تھے دوسرے ہاتھ سے چھین لیے۔ انگریز تمام مقبوضہ علاقوں سے محروم ہوگئے۔

اب حیدر نے کرناٹک کی جانب کوچ کیا۔

انگریز حکومت پھر بوکھلاہٹ کا شکار نظر آئی۔ انگریز فوج کی کمان دوبارہ کرنل اسمتھ کے حوالے کر دی گئی، بار بار کی یہ تبدیلیاں فائدے کے بجائے نقصان ہی پہنچا رہی تھیں۔

کرنل اسمتھ نے کمان سنبھالتے ہی حیدر علی کا تعاقب کیا جو پیش قدمی کرتا ہوا ''ترنا ملی'' تک پہنچ گیا تھا لیکن جب تک اسمتھ پہنچا حیدر علی ترکالور میں تھا۔

انگریز اتنے زچ ہوگئے تھے کہ مذاکرات پر مجبور ہوگئے۔ انگریز قیادت نے تجویز پیش کی کہ چالیس دن کے لیے جنگ بندی کی جائے۔ حیدر علی اس وقت کسی دباؤ میں نہیں تھا۔ اسے برابر فتوحات مل رہی تھیں لہٰذا یہ مذاکرات ناکامی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ حیدر علی زیادہ سے زیادہ سات دن کے لیے جنگ بندی پر تیار تھا۔

دونوں افواج پھر کوچ پر کوچ کرتی رہیں۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف۔

حیدر علی چاہتا تھا کہ تعاقب سے بچ کر میسور کی جانب جانے والی شاہراہ تک رسائی حاصل کرلے۔ کرنل اسمتھ بھی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

یہ آنکھ مچولی جاری رہی حتیٰ کہ انگریز ایک مرتبہ پھر صلح کے لیے رجوع کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس معاہدے کی رو سے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واپس کر دیے گئے۔ یہ شرط بھی طے پائی کہ معاہدے کے تحت فریقین ایک دوسرے پر کسی دشمن کے حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند ہوں گے۔

حیدر علی انگریزوں کے ساتھ دفاعی معاہدے میں شامل ہوچکا تھا لہٰذا حیدر علی کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کے وہ چند سردار بھی واپس آگئے تھے جو برے

وقتوں میں مجبوراً مرہٹوں سے مل گئے تھے۔

اب اس نے مرہٹوں سے معرکہ آرائیوں کا طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ مرہٹے تو یہ چاہتے تھے کہ سرنگا پٹم پہنچ جائیں لیکن حیدر علی کمال ہوشیاری سے انہیں مرہٹہ علاقوں میں لے کر گھومتا رہا اور ناکوں چنے چبانے پر مجبور کرتا رہا۔ پیشوا اس پر اپنی گرفت مضبوط کرنے سے محروم ہی رہا۔ یہاں تک کہ بیمار پڑ گیا۔ اب اس کا جانشین ترمیک راؤ حیدر علی کے مقابل تھا۔

حیدر علی بھی اپنے قلعوں کو خیرباد کہہ کر باہر نکل پڑا۔

معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مرہٹوں کے نزدیک روئے زمین پر حیدر علی سے بڑا ان کا کوئی دشمن نہیں۔ ایک موقع تو ایسا آیا کہ مرہٹہ فوج کا ایک حصہ کرشنا راؤ کی قیادت میں سرنگا پٹم پہنچنے ہی والا تھا۔ میسوری فوج کو شکست ہوئی اور حیدر علی محض چند سو گھڑسوار دستوں کے ہمراہ سرنگا پٹم پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

حیدر علی کو شکست ہو چکی تھی لیکن مرہٹے اس فتح کو فیصلہ کن نہ بنا سکے۔ وہ مال غنیمت کی تقسیم میں لگ گئے اور حیدر علی کو سرنگا پٹم پہنچ کر دفاع کا موقع مل گیا۔ اگر مرہٹے پہلے پہنچ گئے ہوتے تو سرنگا پٹم میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں تھا۔

سرنگا پٹم حیدر علی کا دارالخلافہ تھا۔

مرہٹوں نے سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا لیکن حیدر علی اردگرد کے علاقے کو کچھ اس طرح نیست و نابود کر چکا تھا کہ وہ قحط کا شکار ہو سکتے تھے۔ دوسری جانب کاویری میں سیلاب کی بھی آمد آمد تھی۔ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک سرنگا پٹم کا محاصرہ جاری رکھنے کے بعد بالآخر ترمیک راؤ نے محاصرہ اٹھا لیا اور سرنگا پٹم سے دس میل دور پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا۔ یہاں ترمیک راؤ کو یہ روح فرسا خبر ملی کہ حیدر علی کا بیٹا ٹیپو اپنی فوج کے ہمراہ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر ملی کہ حیدر علی کی کثیر تعداد فوج نے نرائن گڑھ کو..... اپنے محاصرے میں لے لیا ہے۔ یہ متضاد خبریں اس پر بجلی بن کر گریں۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا اور بالاپور پہنچ گیا۔

حیدر علی کے پاس اب صرف بنگلور، سرنگا پٹم اور بدنور رہ گیا تھا۔ ترمیک راؤ بدنور کی فتح اور تمام علاقے کی پامالی کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن پیشوا علیل تھا۔ اس نے ترمیک راؤ کو لکھا کہ جلد از جلد مہم ختم کر دے۔ ترمیک راؤ کو اس حکم کے سامنے مجبور ہونا پڑا اور اسے حیدر علی سے مذاکرات کرنے پڑے۔

اس معاہدے کے مطابق مرہٹے چند علاقوں کو چھوڑ کر باقی علاقے واپس کرنے کو تیار ہو گئے لیکن حیدر علی کو ساٹھ لاکھ کی ادائی کرنی پڑی۔

اس معاہدے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان معاہدہ ہو گیا اور مرہٹہ افواج نے گجرات سے جنوب کی جانب پیش قدمی کا آغاز کر دیا۔ اسی دوران نظام نے بھی مرہٹوں سے اتحاد کر لیا اور یہ طے پایا کہ مفتوحہ علاقے، پونا حکومت اور نظام کے درمیان مساوی تقسیم ہوں گے۔

ایک مرتبہ پھر معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حیدر علی نے مرہٹوں کے کئی علاقے فتح کر لیے۔ اس موقعے پر قدرت نے حیدر علی کی مدد کی۔ پونا میں سازشیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور مرہٹوں کو ان سازشوں کے خاتمے کے لیے واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔

حیدر علی کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے بتدریج تنگ بھدرا کے تمام علاقے اپنے قبضے میں کر لیے۔ تمام علاقے حیدر علی کی اطاعت قبول کر کے اس کے باجگزار بن گئے۔

اب حیدر علی کی فتوحات کی داستان مکمل ہو گئی تھی۔

ان فتوحات کے لیے حیدر علی کو اپنا دیرینہ خواب پورا کرنا تھا اور یہ خواب تھا مالابار کے ساحل کی فتح۔

بدنور اور سندا کی فتح کے بعد کم از کم چار بندرگاہیں اس کے تسلط میں آ چکی تھیں لیکن یہ اس وقت تک بے کار تھیں جب تک اس کے پاس بحری بیڑا نہ ہو۔ بحری بیڑے کے بغیر انگریزوں اور پرتگالیوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا اس نے جنگی جہاز تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

جب بحری بیڑا تیار ہو گیا تو وہ منگلور پہنچا۔ چار یوم کے قیام کے بعد اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا۔ پیدل فوج کے ساتھ ساتھ بحری بیڑا بھی پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس بحری بیڑے میں بحری جہاز، بادبانی جہاز، جنگی کشتیاں، دخانی کشتیاں اور دریا پار رسد لے جانے والی لاتعداد چھوٹی کشتیاں شامل تھیں۔

یہ مہم اس کی پہلی مہمات سے بالکل مختلف تھی۔ ایسی مہمات کا اس کی فوج کو پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انجام کیا ہو۔ سب سے زیادہ اس علاقے کی جغرافیائی حیثیت پریشان کن تھی۔ منگلور سے جو راستہ مالابار تک جاتا تھا۔ وہ دو میل تک تو ریت کی ایک پٹی تھی لیکن اس کے بعد راستہ بالکل تبدیل ہو جاتا تھا اور پہاڑ

شروع ہو جاتا تھا۔ آغاز میں پہاڑوں کی بلندی کم تھی اور پھر پہاڑوں کی اونچائی میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ میدانوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں جو کسی بھی حادثے کے لیے تیار تھیں۔ راستے اتنے ڈھلواں تھے کہ چلنا مشکل تھا۔

حیدر علی غارت گری، لوٹ مار، آتش زدگی کرتا ہوا پیش قدمی کرتا رہا۔ ایک دن نائروں نے (مقامی باشندے) مدافعت کی لیکن توپ خانے کی گولہ باری کامیاب رہی اور نائر بھاگ نکلے۔ چھوٹی کشتیوں نے سامان دوسری طرف پہنچا دیا۔ نائروں نے چرکل کا قلعہ چھوڑ دیا جس پر حیدر علی نے فوراً قبضہ کر لیا۔ چرکل سے میسوری فوج نے کوئیم پر قبضہ کرنے کے لیے کوچ کیا۔ اس کے لیے انہیں ایک دریا عبور کرنا تھا۔ دریا کے کنارے کافی بلند تھے اس لیے توپ خانے اور گھوڑوں کے لیے کافی دقت کا سامنا تھا۔ اس کے مقابلے میں نائروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ حیدر نے تمام قسم کی 26 توپوں سے گولہ باری شروع کر دی۔ نائر پسپا ہو گئے۔ ایک ہزار مارے گئے کچھ جنگلوں میں چھپ گئے۔

نائر ہر جگہ مزاحمت کر رہے تھے اور ہر جگہ پسپا ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ حیدر علی کالی کٹ پہنچ گیا۔ یہاں کا حاکم زمورن تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جنگ کے بعد مطیع ہو گیا لیکن اس کے بھتیجے اور جانشین نے مزاحمت جاری رکھی۔

زمورن اس مزاحمت کو نہ روک سکا اور خراج ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس نے غیرت کے مارے اپنے گھر کو آگ لگا دی اور خود بھی اس میں کود کر جل مرا۔

حیدر علی نے اس کے جانشین کو بھاگنے پر مجبور کر دیا اور کالی کٹ کا انتظام سنبھال لیا۔ جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کیں تاکہ کوئی بغاوت رونما نہ ہو۔ اس نے مالابار کی شہری حکومت کا سربراہ مقرر کیا اور خود کوئمبٹور کوٹ آیا۔

اسے کوئمبٹور آئے ایک مہینا بھی نہیں گزرا تھا کہ مالابار کے نائروں نے بغاوت کر دی۔ نائر ایک جنگجو قوم تھی۔ وہ کسی طرح حیدر علی کا تسلط تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔

برسات کا موسم عروج پر تھا لیکن اس بغاوت کو کچلنا بھی ضروری تھا۔ حیدر علی نے راستوں کی دشواری کی پروا نہیں کی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ ننگے گھوڑوں پر سوار ہوں۔ اپنے ساتھ کمبلوں کے سوا کوئی سامان نہ رکھیں، ضروری اسلحہ بھی ساتھ نہ لیں۔ اسلحہ اور سامان رسد ہاتھیوں پر لدا ہوا تھا۔

مالابار میں حیدر علی کی جو فوج تھی اسے نائروں نے گھیر رکھا تھا۔ اگر حیدر علی ذرا بھی سستی کا مظاہرہ کرتا تو یہ تمام فوج لقمۂ اجل بن چکی ہوتی۔

حیدر علی کے پہنچتے ہی نائروں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ اس علاقے میں چونکہ گھوڑے نہیں ہوتے تھے اس لیے نائر نہ تو خود گھوڑوں پر سوار ہو سکتے تھے؛ نہ گھڑسواروں سے مقابلہ کر سکتے تھے لہٰذا وہ ہر جگہ حیدری فوج کے گھڑسواروں کے سامنے عاجز ہو جاتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ ایک گھڑسوار ایک سو نائروں کے لیے کافی تھا۔

نائر بھاگ کر جنگلوں میں چھپ گئے تھے۔ حیدر علی کی فوج جنگلات میں بکھر گئی اور چن چن کر نائروں کا صفایا شروع کر دیا حتیٰ کہ ان کی عورتیں اور بچے بھی ہلاکت سے نہ بچ سکے۔

حیدر علی تقریباً ایک ماہ تک مالابار میں مقیم رہا اور پھر شہری اور فوجی نظام سرداروں کے سپرد کر کے مالابار کو خیرباد کہہ دیا۔

مالابار پر اس کا تسلط ہو چکا تھا۔ اب اس کے دل میں یہ خواہش کروٹیں بدل رہی تھی کہ کوچین اور ٹراونکور پر بھی قبضہ کر لے۔

اس خواہش کے پیدا ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ ٹراونکور کے راجا مرتندا ورما نے کولچل کے مقام پر ولندیزیوں کو شکست دے کر ان کی طاقت کو کم کر دیا تھا لیکن کوچین اور کرنگانور میں وہ اب بھی بڑی طاقت سمجھے جاتے تھے۔ ان علاقوں میں ان کے جہاز اور قلعے موجود تھے۔ ولندیزی یہ چاہتے تھے کہ ٹراونکور کے راجا سے ان کے دوستانہ مراسم ہو جائیں کیونکہ انہوں نے ٹراونکور میں سیاہ مرچ کی خریداری کے لیے بھاری رقوم لگا رکھی تھیں۔ انہوں نے حیدر علی کو ٹراونکور پر حملہ آور ہوتے دیکھ کر حیدر علی سے مذاکرات کیے۔ ان مذاکرات میں ولندیزیوں نے حیدر علی سے یہ طے کیا کہ وہ کوچین کے راجا کو ہراساں نہ کرے کیونکہ کوچین سے کمپنی کا مفاد وابستہ ہے۔ یہ ضمانت بھی لی کہ اگر حیدر علی ٹراونکور پر اپنا تسلط قائم کرتا ہے تو ان کی رقم کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

ابھی حیدر ٹراونکور پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے نظام اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ طے پانے کا علم ہوا۔ یہ خبر بھی آئی کہ مادھو راؤ میسور پر حملہ آور ہوا ہے۔ اسے اپنی توجہ اس طرف مبذول کرنی پڑی۔ وہ دور دراز مقام پر تھا۔ اس کا بیٹا اور دوسرے سردار ان مہمات

سے نمٹ رہے تھے لیکن حیدر علی اس وقت خود کو کسی جنگ میں الجھانا نہیں چاہتا تھا تا کہ ضرورت پڑے تو وہ یہاں سے بہ آسانی کوچ کر سکے۔ اس کے باوجود اس نے ٹراونکور کے سات گاؤں تاخت و تاراج کر ڈالے۔

انہی دنوں یہ خبر آئی کہ حیدر کو مشغول دیکھ کر نائروں میں آزادی کے جذبے نے سر اٹھایا ہے۔ انہوں نے حیدر کے کئی قلعے چھین لیے۔ دوسری طرف یہ خبر آئی کہ انگریزوں نے منگلور کی جانب کوچ کر دیا ہے۔ ان خبروں نے اسے مالابار کو نظر انداز کرنے پر اکسایا۔ اس نے سوچا موقع ملتے ہی وہ مالابار کو دوبارہ فتح کر لے گا۔ اس وقت تو اس سے جان چھڑانی چاہیے۔ اس نے یہاں کے سرداروں کو مطلع کیا کہ میں مالابار کو چھوڑ دوں گا اگر مجھے اخراجات ادا کر دیے جائیں جو اس سلسلے میں ہوئے ہیں۔ مالابار کے سرداروں نے یہ رقم ادا کر دی۔

حیدر نے بڑی ہوشیاری سے اپنی فوج کو صحیح سلامت مالابار کے بکھیڑے سے نکال لیا۔

30 اگست 1773ء کو نرائن راؤ کے قتل اور مرہٹہ حملے کے خاتمے کے بعد حیدر نے مالابار کو دوبارہ فتح کرنے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

حیدر کے دو افسر آگے بڑھے اور کالی کٹ پر حملہ آور ہوئے جس نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔ زمورن اندرون ملک کسی پہاڑ میں روپوش ہو گیا۔

کرنگانور اور کوچین کے حکمرانوں نے بہ عجلت حیدر علی سے صلح کر لی اور کسی بڑی تباہی سے بچ گئے۔

حیدر علی نے مالابار میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہاں پرتگالیوں کی تجارت خوب پنپ رہی تھی۔ حیدر نے ان سے اچھے تعلقات استوار کیے تا کہ انگریزوں اور پرتگالیوں کا گٹھ جوڑ نہ ہو سکے لیکن جن دنوں انگریزوں نے منگلور پر حملہ کیا تو پرتگالیوں نے حیدر علی کے احسانات کا یہ بدلہ دیا کہ انگریزوں سے ساز باز کر لی۔ اس ساز باز کے نتیجے میں انگریز بہ آسانی علاقے میں آن وارد ہوئے چنانچہ حیدر علی نے مالابار پر دوبارہ قابض ہوتے ہی پرتگالیوں کو تمام مراعات سے محروم کر دیا۔

⊖⊖⊖

میسور کی پہلی لڑائی کے اختتام کے وقت انگریزوں کے ساتھ حیدر علی کا یہ معاہدہ ہوا تھا کہ دشمن کو مار بھگانے میں دونوں فریق ایک دوسرے کی مدد کریں گے لیکن جب مادھو رائے نے 1770ء میں حیدر علی کے خلاف میدان جنگ گرم کیا اور حیدر علی نے اپنا سفیر انگریزوں کی جانب روانہ کیا اور معاہدہ یاد دلایا تو انہوں نے آنکھیں پھیر لیں اور غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سخت قسم کی بدعہدی تھی۔ مادھو رائے سے اسے اکیلے لڑنا پڑا۔ یہ طویل جنگ تباہ کن مراحل کے بعد بالآخر صلح کے معاہدے پر ختم ہوئی۔

اس واقعے کے بعد حیدر علی کا انگریزوں سے بدظن ہونا لازمی تھا۔ اس نے مجبور ہو کر اور بار بار کی کوششوں میں ناکامی کے بعد فرانسیسیوں کی جانب رجوع کیا۔

انگریز وقت پڑنے پر حیدر علی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تھے لیکن وقت گزرنے کے بعد یہ معاہدے پھر تعطل کا شکار ہو جاتے تھے۔ اسی دھوپ چھاؤں میں وہ مرہٹوں سے جنگیں کرتا رہا۔

ان پے در پے واقعات نے حیدر علی کو انگریزوں کی طرف سے مکمل طور پر بدظن کر دیا۔ اس نے اب کسی بھی مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فورٹ سینٹ جارج حکومت کو صاف لفظوں میں لکھ دیا۔

"ڈنڈی گل سے لے کر کڈپہ تک آپ کی حدود میری حدود کے ساتھ ملحق ہیں اور آپ میرے علاقے میں مسلسل ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں۔ تیل چری کا حکمران میرے علاقے میں شورش اور بدامنی پھیلاتا ہے اور میرے ماتحت نائروں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ان حالات میں جبکہ آپ بے اصولی کے مرتکب پائے جا رہے ہیں تب ہمارے درمیان کون سا معاہدہ برقرار ہے اور ہم میں سے کون معاہدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے؟"

اب حیدر علی کی خواہش تھی کہ وہ انگریزوں پر کاری ضرب لگائے اور انہیں ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دے، اس خواہش کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ وہ مرہٹوں، نظام اور نواب ارکاٹ کے ساتھ اتحاد کر لے۔

خوش قسمتی سے مرہٹوں کو بھی صورت حال کا ادراک ہو گیا تھا لہٰذا ان کا جھکاؤ بھی حیدر علی کی طرف ہوا۔ مرہٹوں سے اس کا اتحاد ہو بھی گیا لیکن دونوں فریقوں کے الگ الگ مقاصد تھے اس لیے لگتا تھا کہ یہ دیرپا نہیں ہو گا۔

حیدر علی، مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ سرنگاپٹم سے نکلا اور بنگلور میں 22 یوم گزارنے کے بعد پیش قدمی جاری رکھی۔

انگریز اس کی پیش قدمی سے بے خبر نہیں تھے لیکن انہوں نے کسی قسم کی کوئی فوجی تیاری نہیں کی۔ ان کی فوجیں

ادھر ادھر بکھری رہیں۔ پیش قدمی کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں لیکن برطانوی حکام کوئی موثر اقدام انجام نہیں دے رہے تھے۔ حیدر علی انگریزوں کی اس بے فکری پر حیرت زدہ تھا۔ حیدر علی کے الفاظ میں "انگریزوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔"

وہ برطانوی علاقے میں حملے کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے مدراس اور ویلور کے علاوہ اردگرد کے ان علاقوں کو تاراج کر ڈالا جو فوجی نقل و حرکت کے لیے بروئے کار لائے جا سکتے تھے۔ اس نے کڈالور اور پنگاپٹم کے ساحلی علاقے سے آگے تک کے علاقے نذر آتش کر دیے۔

وہ طوفانی پیش قدمی کرتا ہوا ترنا ملی جا پہنچا۔ یہاں پہلی مرتبہ انگریزوں کی توپوں نے اس پر گولہ باری کی لیکن جوابی کارروائی کے بعد انگریز توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

وہ ایک مقام "چٹ پٹ" پہنچا تو اس کی مزاحمت ہوئی لیکن مقابلے میں صرف تین سو سپاہی تھے۔ یہ مقام اسی دن حیدر علی کے قبضے میں آ گیا۔ دیکھتے دیکھتے ڈولی گڑھ، چمبر گڑھ، ارنی وغیرہ کو سرنگوں کرتا ہوا وہ ارکاٹ شہر کے عین سامنے نمودار ہوا۔

اتنی تباہی کے بعد انگریزوں کی نقل و حرکت کا آغاز ہوا۔ معلوم ہوا کرنل مزد آ رہا ہے۔ پھر چاروں طرف سے فوجیں آنے لگیں۔ معرکہ آرائی ہوئی اور حیدر علی کی بہترین فوجی حکمت عملی نے اسے عظیم فتح سے ہمکنار کیا۔ انگریز فوج کی شکست حیدر علی کا ایک یادگار کارنامہ تھا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی تھی۔

مدراس حکومت کی انتظامی مجلس کئی دن تک سوگ مناتی رہی۔

حیدر علی کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کرنل اسمتھ کو اس کے مقابل لایا گیا لیکن حیدر علی کسی جان لیوا طوفان کی طرح مدراس حکومت کو ہراساں کرنے میں کامیاب ہوا۔ ایوانوں میں ہلچل مچی اور مدراس حکومت کے سفیر صلح کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

انگریزی علاقوں میں حیدر علی کے جھنڈے لہرا رہے تھے پھر وہ صلح کیوں کرتا۔ اس نے سفیروں سے سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور پیش قدمی جاری رکھی۔ کرنل اسمتھ اس کے تعاقب میں تھا لیکن جہاں جاتا تھا۔ میسوری فوج کی اڑائی ہوئی گرد کے سوا اسے کچھ نہ ملتا تھا۔ دراصل حیدر علی نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ لہٰذا انگریز یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس سمت سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ

قادرِ مطلق

ابوبکر سعدؒ ایک نیک اور سعادت مند فرزند تھے وہ زمانے کے لوگوں کی فریادیں سنتے، بے سہاروں کو سہارا دیتے اور مظلوموں پر شاہانہ انعام و اکرام کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی مہربانیوں کا شکر ادا کرنا ناممکن ہے۔ سومنات سے مجھے جو نصیحت ملی ہے وہ آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ میں جب بھی علیم و خبیر اللہ تعالیٰ کے آگے دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتا ہوں تو مجھے وہ چینی جیسابت یاد آ جاتا ہے جو میری خود بینی کو شکست دے دیتا ہے مجھے احساس ہوتا ہے کہ اگر خدا مجھے ہاتھ اٹھانے کی توفیق نہ دیتا تو یہ ہاتھ کبھی نہ اٹھ پاتے۔ نیکی اور عبادت کا دروازہ یوں تو ہر ایک کے لیے کھلا ہے مگر عبادت وہی کرتا جسے اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ دربار شاہی میں حاضری اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے طلبی کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ قادر مطلق خدا کی ذات ہے اور تقدیر کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی لیے کسی راہ راست کو بھی گھمنڈ اور تکبر نہیں کرنا چاہیے یہ سمجھ کر کہ میں راستی پر ہوں کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے تو راہ راست پر چل رہا ہے۔ ورنہ تمہارے جیسے کتنے گمراہ ہو چکے ہیں اور ان کو ہوش بھی نہیں ہے۔

نصیحت: "عبادت اللہ تعالیٰ کی توفیق کے باعث ہے۔"

قلمی تعاون: محمد امین۔ کراچی

معرکہ آرائی کریں۔

حیدر علی کی حکمت عملی کی پیروی کرتے ہوئے انگریزوں نے بھی اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا لیکن ابتدا ہی میں ایک حصے کا کمان دار کرنل فرچمین پیش قدمی کرتے ہوئے حیدر علی کی فوج کے ہتھے چڑھ گیا اور شکست کھا کر کہیں روپوش ہو گیا۔ کئی انگریز ہلاک ہوئے اور

جنگی قیدی بھی بنا لیے گئے۔
ایک مرتبہ پھر انگریز سفیر صلح کے پیغام کے ساتھ حیدر علی کے دربار میں آن پہنچا۔ حیدر علی نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔
''ہم بذات خود مدراس میں داخل ہو رہے ہیں اور گورنر اور کونسل کی زبانی صلح کی شرائط اپنے کانوں سے سننے کے متمنی ہیں۔''
اس جواب سے یہ مطلب اخذ کرنا لازمی تھا کہ حیدر علی کا ارادہ مدراس کا محاصرہ سرانجام دینے کا ہے۔ لہٰذا مدراس کی تمام انگریز افواج کو حکم دیا گیا کہ مدراس کے قرب و جوار میں جمع ہو جائیں۔
حیدر علی نے مدراس کی جانب اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا۔ اس نے پہلا پڑاؤ پانڈیچری میں کیا پھر گوڈیولر پہنچا۔ یہاں سے کویز پہنچ گیا۔ اب وہ مدراس کے قریب پہنچ گیا تھا۔
اب انگریزوں کو یہ فکر ہوئی کہ اسے سینٹ تھامس کے دریا کو عبور کرنے سے روکا جائے لیکن اس وقت تک وہ پالی لٹ کے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مدراس کے دروازے پر تھا۔ اب اسے روکنے کا حل فوجی کارروائی میں نہیں سیاسی بات چیت میں تھا۔ انگریز کونسل نے اپنا اجلاس فوراً منعقد کیا۔ بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ گورنر مدراس ڈوپری حیدر علی کے دربار میں حاضری دیں گے اور صلح کی درخواست کریں گے۔
صلح کی اولین شرط کے مطابق ''ہوسکٹہ'' کا تمام تر اسلحہ، توپ خانہ اور دیگر سامان حرب جسے اہل دکن، انگریزوں اور نواب ارکاٹ نے وہاں ذخیرہ کیا تھا، حیدر علی کے قبضے میں جائے گا۔
نواب ارکاٹ اور انگریز حیدر علی کو سالانہ چھ لاکھ خراج ادا کریں گے اور اطاعت گزاری کریں گے۔
فریقین ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنے سے گریز کریں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔
اس معاہدے کے مطابق حیدر علی ان تمام مقبوضات اور علاقوں کا مالک ہوگا جن پر وہ قبضہ کر چکا تھا۔
حیدر علی پر یہ راز کھل چکا تھا کہ انگریزوں کو مکمل شکست سے دوچار کرنا مشکل ہے۔ طویل دورانیے پر مشتمل یہ جنگ کسی بھی وقت بے نتیجہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ خدشہ بھی برابر لاحق تھا کہ اس کی شمالی سرحد مرہٹوں کی جارحانہ کارروائیوں کے خطرے سے خالی نہیں۔
وہ انگریزوں کا غرور توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا لہٰذا اب صلح کرنے میں حرج نہیں تھا۔ اس کا یہ قول بھی سچ ثابت ہو گیا تھا۔
''ہم بذات خود مدراس میں داخل ہو رہے ہیں اور گورنر اور کونسل کی زبانی صلح کی شرائط اپنے کانوں سے سننے کے متمنی ہیں۔''
اب وہ اپنے کانوں سے صلح کا پیغام سن رہا تھا۔
مدراس میں انگریز گورنر کو اپنا مطیع بنانے کے بعد حیدر علی نے ہوسکٹہ کا رخ کیا اور معاہدے کے مطابق انگریزوں کے اسلحہ کے ذخیرے پر اپنا قبضہ جمایا۔
وہ پچاس ہزار سواروں، ساٹھ ہزار پیادہ سپاہ اور پانچ سو ہاتھیوں کے جلوس میں فاتح عالم کی طرح سرنگا پٹم میں داخل ہوا تو دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی حیدر علی ہے لیکن چہرے پر ناقابل بیان تھکن تھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔

⊖⊖⊖

حیدر علی جس وقت انگریز کمانڈروں کے لیے دہشت کا نشان بنا ہوا تھا، اس سے مقابلے کے لیے سر آئرکوٹ کو انگلستان سے مدراس بلایا گیا۔ یہی وہ لائق کمانڈر تھا جس کی اہمیت کو حیدر علی نے بھی تسلیم کیا۔ حیدر علی بستر مرگ پر تھا جب اس نے آئرکوٹ کی موت کی خبر سنی۔
وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ ''یہ ایک اہل شخص تھا۔ اس نے خوب ہمارا مقابلہ کیا۔''
آئرکوٹ جب ہندوستان پہنچا تو حیدر علی نے امبور، ویلور، ونڈی واش، پرم آکل اور چنگل پٹ وغیرہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔
آئرکوٹ کے ہندوستان پہنچتے ہی حیدر علی سے اس کی معرکہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ اولین محاذ چنگل پٹ پر قائم ہوا۔
پھول چری کے مقام پر آئرکوٹ نے پیش قدمی ترک کر کے کڈلور کا رخ کیا جہاں حیدر علی محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس کی توپیں قلعہ پر گولہ باری کر رہی تھیں۔
حیدر علی کو معلوم ہوا کہ آئرکوٹ اس سے پہلو تہی کرتے ہوئے محمود بندر کی جانب کوچ کر گیا ہے۔ اس خبر کو سن کر حیدر علی نے محاصرہ ختم کیا اور محمود بندر کا رخ کیا۔
اسی وقت مدراس کے سمندر میں ایک فرانسیسی بحری بیڑا دیکھا گیا لہٰذا آئرکوٹ مدراس پہنچا۔ حیدر علی اس کے تعاقب میں تھا اس لیے وہ راستہ تبدیل کر کے کڈلور چلا گیا تا کہ حیدر علی مدراس تک نہ چلا آئے۔
آئرکوٹ نے حیدر علی سے معرکہ آرائی کا فیصلہ کر لیا۔

حیدر علی ایک شاطر تھا۔ اس نے راتوں رات سڑکیں اپنے قبضے میں کر لیں تا کہ آئرکوٹ کو رسد نہ پہنچ سکے۔ لیکن بحری راستے سے رسد کے ذخائر انگریزوں تک پہنچ چکے تھے۔
آئرکوٹ اور حیدر علی کی افواج میں معرکہ آرائی ہوئی اور آئرکوٹ نے حیدر علی کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ حیدر علی نے پسپا ہوتے ہوئے ''پرموکل'' کے قلعے کا رخ کیا جو انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ قلعہ نہایت مضبوط تھا لیکن دشمن محض چھ دن ہی اس کا دفاع کر سکا۔ ساتویں روز قلعہ حیدر کے ہاتھ میں تھا۔
اس کے بعد بھی آئرکوٹ کے ساتھ حیدر علی کے کئی معرکے ہوئے۔ ارکاٹ، ڈنڈی واش، کڈلور وغیرہ میں دونوں کا خوب آمنا سامنا ہوا۔ یہاں تک کہ مدراس کی صلح کا وقت آ گیا۔
اس صلح سے بے خبر حیدر علی کا بیٹا ٹیپو انگریزوں کے خلاف بہ دستور نبرد آزما تھا۔

⊖⊖⊖

حیدر علی ایک عرصے سے سرطان کے مرض میں مبتلا تھا۔ ہر سال اس کی پیٹھ پر سرطان کا زہریلا پھوڑا نکلتا تھا۔ نشتر زنی کے ذریعے اس پھوڑے کا فاسد مادہ نکال دیا جاتا تھا۔ حیدر علی گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے۔
نومبر 1782ء کو پھر ایسا ہی پھوڑا نکلا۔ مسلمان اور فرانسیسی معالجوں نے اس مرتبہ صاف کہہ دیا کہ اب اس پھوڑے کا زہر جسم میں سرایت کر چکا ہے۔ سلطان کا بچنا اب محال ہے۔ اس وقت اس کی عمر اس کے کارناموں کے سامنے بہت کم یعنی ساٹھ سال تھی۔
اس کا کمرا اس کے امرا اور طبیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب کا اصرار تھا کہ اس نازک وقت میں ٹیپو کو محاذ جنگ سے واپس بلا لیا جائے۔ حیدر علی ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔
''وہ انگریزوں سے جہاد میں مصروف ہے۔ میں اسے کیسے واپس بلا لوں۔ محض ایک نظر دیکھنے کے لیے اسے واپس بلا لوں، نہیں ہرگز نہیں۔ بس تم اتنا کرنا کہ اگر میرا انتقال ہو جائے تو تم لوگ اسی طرح ٹیپو کے وفادار رہنا جس وفاداری سے میری خدمات انجام دی ہیں۔''
اس کی حالت روز بہ روز بگڑتی جا رہی تھی۔ امرا کا اصرار بھی بڑھتا جا رہا تھا بالآخر اس کی شفقت پدری نے شور مچایا اور وہ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔
''جان پدر! اگر تمہیں اس علاقے سے ذرا بھی فرصت مل گئی ہو جہاں تم ہو تو میری آنکھیں اپنے دیدار سے منور کرنے کے لیے چلے آؤ۔ اگر ممکن نہیں تو مجھے لکھو۔ میں تمہاری مدد کے لیے مزید فوج بھیجنے کو تیار ہوں۔ میں نے تمہیں اپنی سلطنت کا مختار بنایا ہے لہٰذا ذرا بھی تغافل نہ برتنا۔''
ٹیپو ان دنوں مالا بار کی طرف گیا ہوا تھا اور اس وقت بالا گھاٹ میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ بالا گھاٹ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ ٹیپو ان پر دباؤ بڑھاتا رہا یہاں تک کہ انگریز پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور پسپا ہوتے ہوتے دریائے یونانی کے کنارے تک پہنچ گئے۔ اسی مقام پر جبکہ وہ انگریزوں پر بڑے حملے کی تیاری کر رہا تھا اسے حیدر علی کا خط ملا۔
اس خط کو پڑھ کر وہ یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آج تک اس کے باپ نے اسے کسی محاذ جنگ سے واپس نہیں بلایا اب ایسی کیا بات ہو گئی۔ یہ جملے بھی اس کے دل میں کھٹک پیدا کر رہے تھے کہ ''ہم تمہیں امور سلطنت کا مختار بناتے ہیں۔''
کہیں وصیت تو نہیں؟ کہیں...... اس کے بعد اس کے سوچنے کے لیے کچھ اور نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے تقریباً جیتی ہوئی مہم ادھوری چھوڑی اور اپنا لشکر لے کر میسور کی طرف روانہ ہو گیا۔
حیدر علی کی صحت برابر گرتی چلی گئی اور 17 دسمبر 1782ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔
مورخین کے بیان کے مطابق وہ ترائن پٹ میں جو چتوڑ کے قریب ہے خیمہ زن تھا۔
مرنے سے پہلے حیدر علی نے خزانے کے منہ کھول دیے اور اپنی سپاہ اور فوجی افسران کو ایک ایک ماہ کی اضافی تنخواہ کا تحفہ دیا۔
موت سے دو دن پہلے اپنے تیمارداروں کو حکم دیا۔
''میرے لیے غسل کا پانی گرم کیا جائے۔''
حکما ہاتھ باندھے سامنے آ گئے۔ ''حضور، غسل آپ کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔''
''اب میری روانگی کا وقت آ گیا ہے، مجھے کون روک سکتا ہے۔''
تیمارداروں کو باہر نکال دیا۔ غسل کیا اور خوشبو وغیرہ لگائی۔ حفاظ کرام کو حکم ہوا کہ وہ مسلسل تلاوت کرتے رہیں۔ اس دوران تکلیف میں قرار واقعی اضافہ ہو چکا تھا۔ حیدر علی برداشت کرتے رہے۔ ہونٹوں کو مسلسل جنبش تھی۔ کان لگا

کر سننے والوں نے سنا کہ وہ اپنے رب سے مغفرت طلب کر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے ان کی زبان پر ٹیپو کا نام بھی آجاتا تھا جو اب تک نہیں آیا تھا۔

⊖⊖⊖

جیسے ہی حیدر علی کا انتقال ہوا اس کے اعلیٰ عہدے داروں نے فیصلہ کیا کہ حیدر کی وفات کو مخفی رکھا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹیپو کے آنے سے قبل کوئی بغاوت رونما ہو جائے۔

حیدر کی لاش کو ایک پالکی میں رکھا گیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ حیدر علی اس میں موجود ہے اور سفر کر رہا ہے۔ اس کی فوج اس کے ساتھ تھی۔

لاش کچھ عرصے کے لیے کولار میں فتح محمد کے مقبرے میں رکھی گئی۔ پھر بعد میں اسے سرنگا پٹم منتقل کر کے اس عالی شان مقبرے میں دفن کر دیا گیا جو ٹیپو نے بنوایا تھا۔

ہر قسم کی احتیاط کے باوجود حیدر کی موت کی خبر سرنگا پٹم پہنچ گئی۔ بعض شر پسندوں نے اس خبر سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ان میں حیدر علی کا چچازاد بھائی پیش پیش تھا۔ اس کے تحت چار ہزار سوار تھے۔ اس نے بخشی شمس الدین سے ساز باز کی۔ کئی دوسرے امرا بھی شامل ہو گئے۔ ان سب نے مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ ٹیپو کے چھوٹے بھائی عبدالکریم کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ وہ کم عقل ہے۔ اس کی آڑ میں حکومت کی باگ ڈور خود ان کے ہاتھوں میں رہے گی۔ لیکن اس سازش کا انکشاف ہو گیا۔ ایک فرانسیسی افسر جو اس سازش میں شریک تھا، جاں بخشی کے وعدے پر سازش کا سارا راز افشا کر دیا۔ محمد امین اور شمس الدین کو بھی اقبال جرم کرنا پڑا۔ انہیں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ فرانسیسی افسر کو بھی گرفتار کر لیا گیا کہ کہیں وہ مدراس سے خط کتابت نہ کرے۔

اسی طرح چند اور فتنہ پردازوں نے سر اٹھانے کی کوشش کی لیکن ان سب کو ٹیپو کی حامی فوج نے دبا دیا۔

فوج ٹیپو کی وفادار تھی اور اسے حکمرانی کا اہل سمجھتی تھی۔ اسی لیے یہ سازشیں دم توڑ گئیں۔

ٹیپو کو اپنے باپ کا خط 11 دسمبر 1782ء کو مل گیا تھا اور وہ اگلے دن سرنگا پٹم کے لیے روانہ ہو گیا تھا لیکن اس کی فوج نے سفر میں زیادہ تیزی نہیں دکھائی کیونکہ معلوم تھا کہ فوج کے بڑے بڑے عہدہ دار ٹیپو کے وفادار ہیں، کسی بغاوت کا کوئی اندیشہ نہیں۔

28 دسمبر کو وہ اس کیمپ میں پہنچ گیا جو مرکزی فوج سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر اس کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اس کے خیر مقدم کے لیے تزک واحتشام کا اہتمام نہ کیا جائے۔ وہ نہایت سادہ انداز میں کیمپ میں داخل ہوا اور قالین پر بیٹھ گیا اور خاص خاص عہدہ داروں کو شرف باریابی بخشا اور ان سے سرنگا پٹم کے حالات پر بات چیت کرتا رہا تاکہ یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے شہر میں داخل ہونا ہے یا انتظار کرنا ہے۔

جب وہ سرنگا پٹم کے حالات سے مطمئن ہو گیا اور کسی قسم کی فوج کشی کی ضرورت محسوس نہیں کی تو اگلے دن سرنگا پٹم میں داخل ہوا جہاں تخت شاہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نواب ٹیپو سلطان بہادر کا لقب اختیار کر کے باپ کے تخت پر بیٹھا۔

ٹیپو کو ایک وسیع سلطنت وراثت میں ملی۔ اس کے علاوہ سرنگا پٹم کا خزانہ بھی ملا جس میں تین کروڑ روپے اور لاتعداد جواہرات تھے۔ مزید براں حیدر علی نے اٹھاسی ہزار نفوس پر مشتمل ایک بڑی فوج چھوڑی۔ محافظ فوجیں اور صوبہ داری فوجیں اس کے علاوہ تھیں۔

اس زمانے میں قطعی طور پر یہ ہندوستان میں بہترین فوجی طاقت تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ حیدر علی نے ٹیپو جیسا لائق فرزند چھوڑا جس نے حیدر علی کے مشن کو پورا کرنے کی قسم کھائی۔

حیدر علی کی موت کی خبر انگریزوں نے بڑی خوشی سے سنی لیکن وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سلطنت میسور کی تخت نشینی بہت پرامن طریقے سے ہوئی۔ نہ تو ٹیپو اور کریم میں تخت کے لیے کوئی جھگڑا ہوا اور نہ فوج کے سرداروں نے بغاوت کی جس کی انگریزوں کو توقع تھی۔ حیدر علی کو ٹیپو جیسا وارث بھی مل گیا جس نے تخت پر قدم رکھتے ہی جنگی معاملات کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔

اسے خبر ملی کہ انگریزی فوج جنرل اسٹورٹ کی قیادت میں ونڈی واش کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ سرنگا پٹم سے نکلا اور لامتناہی جنگوں کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

ماخذات

حیدر علی، نریندر کرشن سنہا۔ حیدر علی، مسعود مفتی۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خاں۔
کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد V، ڈبلیو۔ ایچ۔ ہٹن۔ کمپنی کی حکومت، باری علیگ۔

اندر کی آگ

کاشف زبیر

جب بھی کوئی بات پہلی بار ہوئی اردگرد بے شمار لوگوں کو چونکا گئی اور پھر دھیرے دھیرے یادداشت سے اتر گئی... یہ روایت دنیا میں ابتدا سے چلی آرہی ہے۔ اس آگ نے بھی سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے سب کو جلا کر بھسم کر رہی تھی پھر... محبت کی پھوار نے اس کے شعلے ٹھنڈے کرنے شروع کیے لیکن اتنی دیر میں کوئی زندگی ہار گیا اور کوئی جیتے جی مر گیا... اس اندر کی آگ کا انجام بالآخر یہی ہونا تھا جس کے بھڑکنے کا سبب انسان کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔

خوفناک اور پراسرار طاقتوں کا کربناک تماشا

کوئن پیلس کے سامنے والے حصے سے محل کے بالکل سامنے زیر تعمیر بُدھا کا مجسمہ آسمان سے باتیں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ لوہے سے تیار کیا جانے والا یہ مجسمہ زمین سے کوئی ایک سو ستر میٹرز اونچا تھا۔ مجسمے کا جسم تقریباً مکمل ہو گیا تھا اور اب تیاری کا کام آخری مرحلے میں تھا۔ جنوب مشرقی چین میں دوسری صدی عیسوی میں اس چھوٹی سی ساحلی ریاست میں ملکہ ماشی زو کی حکومت تھی۔ ماشی زو کا شوہر ریاست کا سابق حکمران کیرگائی جگر کی بیماری میں اچانک جواں عمری میں



وفات پا گیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور امرا اس کے بھائی شیر گائی کو حکمران بنانا چاہتے تھے لیکن ماشی زو نے فوج کے بڑے حصے کی حمایت حاصل کر کے ایک خونریز لیکن مختصر لڑائی کے بعد ریاست کا قبضہ حاصل کر لیا اور تاج اپنے سر پر سجا لیا، اس وقت اس کی عمر صرف تیس برس تھی۔

اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے مخالفین کو بے دریغ قتل کیا۔ سب سے پہلے اس نے شیر گائی اور اس کے حامی امرا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اپنے جبر سے اس نے مخالفین کے حوصلے پست کر دیے اور بالآخر انہوں نے ملکہ ماشی زو کی حکومت تسلیم کر لی۔ اس کے بعد ماشی زو نے سب سے پہلے ملک کی معاشی اور فوجی حالت کی طرف توجہ دی۔ ملکہ نے تاجروں کو محصول کے بدلے سہولتیں دیں کہ وہ یہاں کی بندرگاہ سے سامان لائیں اور لے جائیں۔ ملک میں صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ہنر مندوں کو قرضے مہیا کیے گئے۔ پورے ملک میں زمین آباد کرنے کا حکم دیا۔ ملک میں جاگیرداری نظام تھا اور یہ جاگیردار ہی ملکہ کی اصل طاقت تھے لیکن اس نے حکم دے رکھا تھا جو زمین پورے ایک سال تک کسی کام میں نہ لائی گئی اسے ضبط کر کے کسی اور کو دیدیا جائے گا۔ اس حکم کی وجہ سے یہ چھوٹی سی ریاست اتنا اناج پیدا کرنے لگی کہ آس پاس کے ملکوں کو بھی اناج فروخت کیا جانے لگا اور یہ ریاست کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔

ملکہ بدھ مت کی پیروکار تھی، جب اس کی تخت نشینی کی بیسویں سالگرہ قریب آنے لگی تو اس نے محل کے بالکل سامنے بُدھا کا عظیم مجسمہ بنانے کا حکم دیا۔ لوہے، جست اور تانبے سے بنا یہ مجسمہ ایک سو ستر میٹرز بلند تھا اور اس کا وزن دس ہزار ٹن سے بھی زیادہ تھا۔ مجسمے کے چاروں طرف بانس کی مدد سے سہارے بنائے گئے تھے جو اسے مکمل ہونے تک مضبوطی سے پکڑے رکھتے۔ جب مجسمہ مکمل ہو جاتا یعنی اس کے اندر کے تین فولادی ستون مکمل ہو جاتے تو بانسوں کا سہارا ہٹا لیا جاتا۔ اس وقت مجسمے کے اندر آخری ستون کی تیاری کا کام جاری تھا۔ ایک ایک کر کے بڑے فولادی کڑے لوہے کی راڈوں پر چڑھائے جا رہے تھے اور انہیں یکجان کرنے کے لیے ان پر پگھلا ہوا فولاد ڈالا جا رہا تھا۔ ملکہ ماشی زو نے حکم دیا تھا کہ مجسمہ بہر صورت اس کی تخت نشینی کی بیسویں سالگرہ سے پہلے مکمل کر لیا جائے۔ صبح سورج کی پہلی کرن طلوع ہوئی تو ماشی زو محل کے ٹیرس میں موجود تھی۔ روشنی پڑتے ہی سیاہی مائل مجسمہ چمک اٹھا تھا۔ بلاشبہ چینی کاری گروں نے کمال کر دکھایا تھا۔ ملکہ ماشی زو بھی مبہوت رہ گئی۔ اگرچہ مجسمہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ماشی زو سے ذرا پیچھے اس کی معتمد خاص کم ہوائے کھڑی تھی۔ کم بہت دل کش نقوش اور چھریرے جسم کی خوب صورت عورت تھی۔ اس کی عمر تیس کے آس پاس تھی اور وہ بہت کم عمری سے ملکہ کے ساتھ تھی۔ اسے ملکہ ماشی زو کی فوج طاقت کے بل پر اور دوسرے بچوں کو ایک باغی گاؤں سے لائی تھی۔ جب انہیں ملکہ ماشی زو کے سامنے پیش کیا گیا تو کم نے ملکہ کی توجہ حاصل کر لی۔ اس نے کم کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ وہ محل میں بڑی ہوئی تھی اور اس نے سپہ گری سمیت بہت سارے علوم حاصل کیے تھے، اپنی ذہانت اور وفاداری کی وجہ سے وہ ماشی زو کی معتمدِ خاص بن چکی تھی۔

''کم۔'' اچانک ماشی زو نے اسے پکارا۔

''جی میری ملکہ؟'' کم مستعد ہو گئی۔

''یہ خوب صورت ہے نا؟''

''جی میری ملکہ۔''

''پورے چین... بلکہ پوری دنیا میں بُدھا کا ایسا کوئی مجسمہ نہیں ہوگا۔'' ماشی زو سرخوشی کے عالم میں بولی۔

''جی میری ملکہ۔''

''لیکن یہ مکمل کیوں نہیں ہو رہا ہے؟'' اس بار ملکہ کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔ ''کام کرنے والے سستی سے کام لے رہے ہیں۔''

''میں آج ہی انچارج سے پوچھتی ہوں۔''

''ٹھیک ...... مجھے معلوم کر کے بتاؤ۔'' ماشی زو نے تحکمانہ انداز میں کہا اور پلٹ کر محل کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد کم اپنے مخصوص محافظ دستے کے ساتھ محل سے نکل کر بدھا کے مجسمے کی طرف بڑھی تو اس کی آمد کی خبر پہلے ہی کام کرنے والوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ گھوڑے سے اتر کر مجسمے میں داخل ہوئی تو ہر شخص یوں جوش و خروش سے کام میں جتا ہوا تھا جیسے آج آخری بار کام کر رہا ہو۔ اس کام کا انچارج فینگ من خود دوڑا آیا۔ وہ تقریباً ساٹھ برس کا گول چہرے والا شخص تھا خوشامد اور خوش اخلاقی جیسے اس کے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ کم کے سامنے بچھ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کم نہیں خود ماشی زو وہاں آ گئی ہو۔ ''خوش آمدید... عظیم ملکہ کی معتمد خاص... خوش آمدید۔''

مجسمہ اندر سے کسی ہال کی طرح کھلا اور بلند تھا۔ درحقیقت اندر یہ کھوکھلا ہی تھا اور اس کے تین ستون تھے۔ وسطی ستون جو سب سے پہلے بنا تھا اور فولاد پگھلانے والی بھٹی اسی کے نیچے تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو مزید

ستون تھے۔ مجسمے میں یہ آگے اور پیچھے کے ستون تھے۔ مرکزی ستون مجسمے کے سر تک گیا تھا جب کہ آگے پیچھے والے ستون سینے اور کمر کے اوپری حصے تک گئے تھے۔ مجسمہ جتنا باہر سے پُرشکوہ تھا اتنا ہی اندر سے بھی تھا۔ کم فینگ من کے ساتھ مرکزی ستون کے نیچے موجود بھٹی تک آئی جس میں فولاد پگھلایا جا رہا تھا۔ بھٹی کی وجہ سے اندر گرمی کا احساس شدید تر ہو گیا۔ کم نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور تحکمانہ انداز میں بولی۔

''عظیم ملکہ جاننا چاہتی ہے کہ مجسمے کی تکمیل میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟''

فینگ من کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ملکہ ماشی زو نے پہلے ہی وارننگ دیدی تھی کہ تاخیر کی صورت میں اسے اور سپروائزروں کو سزا ملے گی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''معتمد خاص... بالکل تاخیر نہیں ہو رہی ہے۔ مجسمہ تاج پوشی کی سالگرہ سے پہلے مکمل ہو جائے گا۔''

تیسرا ستون تقریباً ستر فیصد مکمل ہو چکا تھا۔ ابھی تاج پوشی کی تقریب میں ایک مہینے کا وقت تھا۔ کم کا بھی یہی اندازہ تھا کہ کام مقررہ وقت پر مکمل ہو جائے گا لیکن اس نے پھر بھی فینگ من کو خبردار کیا۔ ''عظیم ملکہ کام کی رفتار سے خوش نہیں ہے۔''

چرب زبان فینگ من اسے یقین دلانے لگا کہ مجسمہ وقت سے پہلے مکمل ہو جائے گا پھر اس نے کم سے کہا کہ وہ مجسمے کے اوپری حصے میں چلے، یہاں گرمی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ کم تیار ہو گئی ویسے بھی وہ مجسمے کی بلندی سے محل اور شہر کا نظارہ کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مرکزی ستون کے ساتھ لگی لفٹ سے اوپر جا رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ مجسمے کے اوپری حصے میں پہنچ چکے تھے، یہ مجسمے کا سر تھا۔ اس کی آنکھوں والے حصے میں خلا تھا۔ درحقیقت یہ دو عدد بالکونیاں تھیں جن سے بالکل نیچے محل اور سامنے دور تک پھیلے شہر اور بندرگاہ کا منظر ناقابلِ یقین حد تک واضح اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ کم حیران ہوئی اور اس منظر میں اتنا کھوئی کہ اسے احساس نہیں ہوا کہ فینگ من کا چیف سپروائزر کائی منگ اسے ذرا دور لے گیا ہے، وہ اسے کچھ بتا رہا تھا اور فینگ من اسے ٹال رہا تھا، شاید کوئی مسئلہ تھا جس پر وہ کم کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے چیف سپروائزر کو ٹال کر کم کے پاس آیا تو اس کے چہرے پر پسینا آیا ہوا تھا۔ یہاں بلندی پر ہوا بہت تیز اور خنک تھی اس کا پسینا خشک ہو جانا چاہیے تھا لیکن باہر آتے ہی اس کا پسینا مزید تیزی سے بہنے لگا۔ کم نے اس کی طرف دیکھا اور پھر پیچھے ہوئی۔ فینگ من کا چہرہ پگھلے فولاد کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور پھر اچانک اس کے جسم اور لباس میں شعلے سے بھڑک اٹھے۔ اس کے آس پاس موجود لوگ چونک کر پیچھے ہٹے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے چیختا چلاتا فینگ من راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

☆☆☆

ماشی زو کا چہرہ پُرتفکر تھا۔ اس نے کم کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تم پر پورا اعتماد ہے، تم نے جو کہا ہے مجھے اس پر پورا یقین ہے۔''

''اس اعتماد کے لیے میں شکرگزار ہوں میری ملکہ۔''

''لیکن فینگ من کے ساتھ کیا ہوا... پولیس چیف کیا کہتا ہے؟''

''اس کا کہنا ہے فینگ من کو کسی نے آگ نہیں لگائی بلکہ یہ آگ اس کے اندر سے ابھری تھی۔ اس کی ہڈیاں تک اندر سے جل گئی ہیں۔ میں نے خود دیکھا پہلے اس کے جسم سے شعلے اٹھے اور پھر اس کے لباس کو آگ لگی۔''

''حیرت انگیز!'' ماشی زو نے کہا۔ ''کیا اسے بُدھا کی بددعا لگی ہے؟''

''میری ملکہ... کیا آپ ایسا ہی سمجھتی ہیں؟'' کم نے غور سے ماشی زو کو دیکھا۔ وہ مسکرانے لگی۔

''نہیں... میرا خیال ہے یہ کسی انسان کا کام ہے اور اس کا مقصد مجسمے کی تعمیر میں تاخیر کرنا ہے۔''

''مجسمے کی تیاری کا کام جاری ہے اور آخری مرحلے میں ہے۔ فینگ من کا کام سپلائی اور کام کی نگرانی تھا۔ مجسمے کا چیف آرکیٹیکٹ اور چیف سپروائزر کائی منگ ہے۔ مجسمہ درحقیقت اس کی نگرانی میں بن رہا ہے اس لیے فینگ من کے مرنے سے کام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''تب اس موت کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے؟'' ماشی زو بولی۔ ''کیا میرے آدمیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو معمے کو حل کر سکے۔''

''پولیس چیف بہت ذہین آدمی ہے۔''

ماشی زو سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ''ہاں لیکن ایک اور شخص ہے میرا خیال ہے وہ اس معمے کو حل کر سکتا ہے۔''

''میں اس کا نام جان سکتی ہوں میری ملکہ؟''

ماشی زو نے سر ہلایا۔ ''جاسوس لی کوائے... اسے میں نے خود جیل بھیجا تھا۔''

کم چونک گئی۔ ''آپ نے اسے جیل بھیجا تھا؟''

''ہاں اس نے مجھے اپنی ملکہ تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ دوسرے باغیوں کو سزائے موت ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے لی کوائے پر رحم آ گیا اور میں نے اسے صرف قید کی سزا دی۔ وہ دس سال سے جیل میں ہے۔''

کم سوچ رہی تھی کہ جو شخص دس سال سے جیل میں ہو کیا وہ کسی قابل رہ گیا ہوگا اس کی سوچ پڑھ لی گئی ملکہ نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ ''کم اسے تم راضی کرو گی۔''

''میری ملکہ۔'' کم اس کے آگے جھک گئی۔

ماشی زو مسکرانے لگی۔ ''تم جانتی ہو دنیا میں سب سے بڑی طاقت کیا ہے؟''

''نہیں، میری ملکہ۔''

''ایک عورت۔۔۔ ایک حسین عورت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے۔''

☆☆☆

کیو آئن کا یہ قید خانہ بہ ظاہر بڑی حسین جگہ تھی۔ ساحل سے کوئی سو میل دور اونچے پہاڑ پر بنی سرخ رنگ کی یہ جیل خزاں کے آغاز میں جنگل کے سرخ ہو جانے والے پتوں کی وجہ سے بالکل پاس آنے پر دکھائی دیتی تھی۔ کم اپنے محافظ دستے کے ساتھ جیل پہنچی تو جیل کا نگران اس کے آگے بچھ گیا۔ کم کا خیال تھا کہ لی کوائے کوئی معمر شخص ہوگا جسے دس سال کی قید نے مخبوط الحواس کر دیا ہوگا۔ اس لیے وہ سیاہ بالوں اور ڈاڑھی والے اس شخص کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا رنگ زردی مائل سفید اور جسم ورزشی تھا۔ نقوش کسی قدر کھڑے تھے جو چینیوں میں بہت خوب شمار کیے جاتے ہیں۔ اس نے جیل کا معمولی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں پڑی تھیں۔ کم نے نگران کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے دفتر سے نکل کر چلا گیا۔ اب وہاں صرف لی کوائے اور کم تھے۔ وہ قیدی ہونے کے باوجود اسے پوری دلچسپی اور بے باکی سے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے بہت عرصے بعد کوئی عورت دیکھی ہے اس لیے تم مجھے خوب صورت لگ رہی ہو۔''

کم کی آنکھوں میں غصہ دہک اٹھا لیکن اس نے اپنے تاثرات سے ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔''

''تمہیں ماشی زو نے بھیجا ہے۔'' لی کوائے نے اسے پھر حیران کر دیا۔ وہ یوں بے ادبی سے ملکہ کا نام لینے پر غصہ کرنا بھی بھول گئی تھی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اس ملک میں ایک عورت کی حکومت ہے اور جب کوئی عورت اتنے اختیار سے کہیں آئے، اس کے ایک اشارے پر اس جیل کا نگران اٹھ کر اپنے دفتر سے چلا جائے تو صاف ظاہر ہے وہ ماشی زو کی فرستادہ ہی ہو سکتی ہے۔''

''ادب سے نام لو، وہ عظیم ملکہ ہے۔''

لی کوائے نے بے ساختہ ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا پھر وہ سنجیدہ ہو گیا اور حقارت سے بولا۔ ''اے عورت۔۔۔ اگر میں اسے ملکہ تسلیم کرتا تو اس قید خانے میں پڑا کیوں سڑ رہا ہوتا؟''

کم نے خود کو لاجواب محسوس کیا پھر اسے اپنی حیثیت کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے سنبھل گئی۔ اس نے کسی قدر آگے جھک کر کہا۔ ''سنو میں تمہارے لیے ایک موقع لائی ہوں۔''

''ماشی زو کو مجھ سے کوئی کام ہوگا۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''کوئی ایسا کام جو صرف لی کوائے کر سکتا ہے کوئی ایسا کیس جو کوئی دوسرا حل نہیں کر سکتا۔''

کم نے محسوس کیا کہ لی کوائے خطرناک حد تک ذہین ہے اور شاید اسی لیے ماشی زو نے اس کا نام لیا تھا۔ ''کیا تمہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں ہے۔'' لی کوائے نے اپنے ہاتھ کی زنجیروں کی طرف دیکھا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ کام کیا ہے اور اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟''

کم اسے فینگ من کی پراسرار موت کے بارے میں بتانے لگی۔ لی کوائے غور سے سن رہا تھا۔ جب کم خاموش ہوئی تو اس نے کہا۔ ''تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ مجھے کیا ملے گا؟''

''شاید آزادی۔''

''یا شاید زندگی سے آزادی؟'' لی کوائے کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''کیا یہی موقع ہے میرے لیے؟''

''ہاں اگر تم اسے لینا پسند کرو؟''

''اگر تم جیسی خوب صورت عورت مجھ سے کہے گی تو میں انکار نہیں کروں گا۔''

کم جھنجلانے لگی۔ ماشی زو کی معتمد خاص کی ایک حیثیت تھی اور کسی کی جرأت نہیں تھی کہ اس سے یوں بے تکلفی سے بات کرتا۔ مذاق کرنا تو دور کی بات لیکن یہ شخص اسے بالکل سنجیدہ نہیں لے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے پاس ایک پیشکش لائی ہوں اسے قبول کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔''

''بعض اوقات آدمی اپنے اختیار سے دست بردار بھی ہو جاتا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو میں یہ پیشکش قبول کر لوں؟''

کم نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں سے دبا لیا۔ ''کیا تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہے؟''

''ممکن ہے ہو اور ممکن ہے نہ ہو۔'' لی کوائے کا لہجہ پھر طیش دلانے والا ہو گیا۔ اس بار کم نے اپنا ہونٹ کچل ڈالا تھا۔ وہ سوچتی رہی اگر ماشی زو نے اسے یہ ذمے داری نہ سونپی ہوتی تو وہ اب تک واپسی کے لیے روانہ ہو چکی ہوتی۔ بالآخر اس نے گہری سانس لی۔

''لی کوائے، میں چاہتی ہوں تم یہ پیشکش قبول کر لو۔''

اس کا خیال تھا کہ لی کوائے مسکرائے گا اس کی شکست اور اپنی فتح پر لیکن وہ بالکل سنجیدہ رہا۔ اس نے کہا۔ ''تب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

کم نے جیل کے نگران کو طلب کیا اور لی کوائے کو آزاد کرنے کا شاہی حکم نامہ اس کے سپرد کیا۔ نگران نے شاہی مہر دیکھتے ہی گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کرتے ہوئے حکم نامہ لیا۔ ایک گھنٹے بعد لی کوائے گھوڑے پر سوار کم اور اس کے محافظ دستے کے ہمراہ دارالحکومت کی طرف جا رہا تھا۔ لی کوائے نے جیل کا لباس اتار کر عام لباس پہن لیا تھا۔ اس نے اپنی تفتیش ابھی سے شروع کر دی تھی۔ اس نے کم سے پوچھا۔ ''فینگ من کس قسم کا آدمی تھا؟''

''جیسا کہ اس عہدے کے حامل شخص کو ہونا چاہیے۔ بہ ظاہر بہت نرم اور پر اخلاق لیکن اندر سے وہ شاطر اور ہر چیز پر نظر رکھنے والا تھا۔''

''کسی سے اس کی ایسی دشمنی کہ وہ اسے قتل کرا دے؟''

''پولیس کی تحقیق کے مطابق کسی سے اس کی ایسی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے بتایا نا وہ بہ ظاہر نرم مزاج اور ہر ایک سے اخلاق سے پیش آنے والا شخص تھا اندر کی بات ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔''

''ایسا شخص دوغلا اور خطرناک ہوتا ہے، اس کا اصل روپ اس شخص کے سامنے آتا ہے جسے وہ اپنے ماتحت سمجھتا ہے۔''

''میں اتنا زیادہ نہیں جانتی۔۔۔۔۔ ممکن ہے پولیس چیف کورے ماؤ نے مزید کچھ معلوم کیا ہو۔''

لی کوائے دس سال بعد دارالحکومت آیا تھا اور اس دوران میں شہر کی شان و شوکت ہی بدل گئی تھی۔ لی کوائے کے قیام کا انتظام بھی تھا۔ لی کوائے کا خیال تھا کہ کم اسے یہاں پہنچا کر واپس چلی جائے گی لیکن اس کی توقع کے خلاف وہ وہیں رک گئی۔ ''مجھے میری ملکہ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں۔''

''میں نہیں جانتا تم کیا کر سکتی ہو اس لیے میں تم سے کس طرح کام لے سکتا ہوں۔''

''میری مدد سے تم ہر کام کر سکتے ہو، ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی، ہر راستہ کھل جائے اور ہر شخص تم سے تعاون کرے گا۔''

لی کوائے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس طرح کام نہیں کر سکتا۔ مجھے ملکہ کی طرف سے شاہی مہر لگا حکم نامہ چاہیے کہ ہر شخص مجھ سے تعاون کرے اور میرے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہ کرے۔''

کم نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا اور ایک رول کیا ہوا سنہری کاغذ نکالا۔ ''وہ حکم نامہ میں نے پہلے ہی ملکہ سے حاصل کر لیا تھا۔''

لی کوائے نے حکم نامہ دیکھا اور اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہاں بڑا شاندار قسم کا غسل خانہ تھا جس میں بھاپ سے غسل کا انتظام بھی تھا۔ وہ برسوں بعد کھل کر نہایا، اس نے شیو بنائی اور سر کے بال ترشوائے۔ یہاں اس کے لیے دوسرے لباس کا بندوبست بھی تھا۔ وہ باہر آیا تو کم اسے دیکھ کر ایک لمحے کو حیران رہ گئی لیکن فوراً ہی اس نے اپنے تاثرات پر قابو پا لیا۔ لی کوائے مسکرانے لگا۔ ''اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ سرکاری خرچ پر عیاشی کا اپنا ہی الگ مزہ ہے۔ ویسے کیا ماشی زو نے تمہیں مکمل طور پر میرے سپرد کر دیا ہے؟''

کم کی سیاہ آنکھوں میں پھر غصہ چمکنے لگا لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ نرم تھا۔ ''تم اجڈ اور بدتمیز آدمی ہو۔ تمہیں عورتوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' لی کوائے بے پروائی سے بولا۔ ''اسی لیے تو ماشی زو نے مجھے جیل میں ڈال دیا تھا۔''

''کیا خیال ہے، کام کی بات نہ کی جائے؟''

''کام مجھے کرنا ہے اور اس کی ہر بات بھی مجھے کرنی ہے۔'' وہ بولا، اسی لمحے اسے باہر کوئی آواز سنائی دی اور وہ چوکنا نظر آنے لگا۔ اس نے کم سے کہا۔ ''کیا باہر محافظ موجود ہیں؟''

''نہیں، میں نے اپنا دستہ واپس بھیج دیا ہے بس اس رہائش گاہ کے دو محافظ ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے اب وہ بھی نہیں ہیں۔'' لی کوائے نے کہا اور اسی لمحے سامنے والی کاغذ کی دیوار سے تیروں کی ایک بوچھاڑ آئی اور وہ بال بال بچے۔ لی کوائے کم کو سمیٹتا ہوا فرش پر گرا اور اس نے چھوٹی لیکن موٹی سطح والی میز سامنے کر لی، کئی تیر آ کر اس میز میں ترازو ہو گئے۔ کم اس کے بہت قریب تھی، لی کوائے نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''یہ کون ہے، کیا ماشی زو نے یہاں بلا کر مجھے قتل کرنا چاہا ہے؟''

"احمقانہ باتیں مت کرو۔ میری ملکہ تمہیں قید خانے میں مروا دیتی اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" لی کوائے نے سر ہلایا۔ اس وقت تک باہر موجود تیر انداز دوسری سمت پہنچ گئے تھے اور اب تیروں کی بوچھاڑ دوسری طرف سے آئی۔ وہ دونوں لپک کر لکڑی کے ستونوں کی آڑ نہ لیتے تو مارے جاتے۔ "لیکن محل کے کمپاؤنڈ کے بالکل پاس ایسی جرأت کون کرسکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔" اب کم گھبرا گئی تھی۔ "ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

لی کوائے نے اوپر دیکھا اور پھر لکڑی کے ستون کو پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا، اس کا انداز بندر جیسا تھا کم نے اس کی تقلید کی۔ وہ دونوں چھت پر پہنچ گئے۔ اسی لمحے تیر اندازی رک گئی۔ انہوں نے شور سنا اور جب وہ چھت سے پھسلتے ہوئے نیچے آئے تو انہوں نے عمارت کے سامنے والے میدان میں گھڑسواروں اور پیدل مسلح افراد کا ایک ہجوم دیکھا۔ ایک معمر شخص اس ہجوم میں بڑی شان سے لکڑی کی منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ کم نے زیرلب کہا۔

"ودمنگ!"

لی کوائے آگے بڑھا۔ "سردار ودمنگ... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے یوں خاموشی سے قتل کرنے کی کوشش کروگے۔"

ودمنگ ماشی زو کا مخالف تھا لیکن اس کے پاس دس ہزار سے زیادہ تربیت یافتہ مسلح جنگجو تھے اس لیے ماشی زو نے اسے نظر انداز کیا ہوا تھا۔ ودمنگ سرد نظروں سے لی کوائے کو گھور رہا تھا۔ "میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ یہاں آکر تمہاری جان بچائی ہے وہ دوسرے لوگ تھے جو مجھے اور میرے ساتھیوں کو دیکھتے ہی فرار ہوگئے۔"

"میں مان لیتا ہوں وہ دوسرے لوگ تھے لیکن عظیم سردار، اس طرح رات کی تاریکی میں تمہارے یہاں آنے کا مقصد ...... اور کس نے تمہیں اطلاع دی کہ میں یہاں موجود ہوں گا؟"

"مجھے کوئی اطلاع نہیں دیتا، میرے اپنے ذرائع ہیں۔" ودمنگ نے ناگواری سے کہا۔ "اور یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تمہاری اس سرکاری عمارت میں موجودگی کا سبب پوچھ سکوں۔"

کم آگے آئی اور بولی۔ "تم اس سوال کے مجاز نہیں ہو۔"

"لی کوائے کسی زمانے میں میرا ساتھی تھا اس لیے مجھے حق ہے۔"

"میں بدھا کے مجسمے کی تعمیر کے انچارج فینگ من کے قتل کی تفتیش کرنے آیا ہوں۔" لی کوائے نے کہا۔

"کیوں، کیا ماشی زو کے پاس یہاں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو اس قتل کی تحقیق کرسکے؟"

"شاید...... ورنہ وہ مجھے جیل سے کیوں بلاتی؟"

"اور تم آگئے۔" ودمنگ نے حقارت سے کہا تو لی کوائے کا چہرہ تن گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"سردار، دس سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے خاص طور سے جب دوست پلٹ کر نہ پوچھیں لیکن رہائی کی وجہ پوچھنے رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح چلے آئیں۔"

ودمنگ کا سرخ وسفید چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اس کی طرف دیکھے بغیر گھوڑے پر سوار ہوکر روانہ ہوگیا۔ اس کے آدمی اس کے پیچھے تھے۔ کم نے اس کے جاتے ہی کہا۔ "یہ جھوٹ کہہ رہا ہے، حملہ اس کے آدمیوں نے کیا ہے اسے جواب دینا ہوگا۔"

"نہیں وہ سچ کہہ رہا تھا، اتنے آدمیوں کے ساتھ اسے چھپ کر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ اندر آکر بھی میرا خاتمہ کرسکتا تھا۔"

کم سوچ میں پڑ گئی تھی۔ لی کوائے بھی سوچ رہا تھا کہ اس کی جان کا ایسا کون سا گاہک تھا جو جیل سے باہر آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گیا۔ جواب بھی موجود تھا۔ جن لوگوں نے فینگ من کو قتل کیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس راز سے پردہ اٹھے۔ اس لیے وہ بہرصورت راز کھلنے سے پہلے اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ لی کوائے نے کم سے کہا۔ "اب میں پہلے پولیس چیف سے ملوں گا۔"

☆☆☆

پولیس چیف کورے ماؤ جوان آدمی تھا۔ وہ ذہین بھی تھا ورنہ اتنی جلدی اس عہدے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اپنے لمبے بال جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ وہ گرم جوشی اور خلوص سے لی کوائے سے ملا۔ حالانکہ ماشی زو نے لی کوائے کو جیل سے بلوا کر ایک طرح سے اسے نااہل قرار دیا تھا۔ لی کوائے نے کہا۔ "دوست، میں تمہارے تفتیشی عمل میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گا لیکن تمہیں بھی میری مدد کرنا ہوگی۔"

"میں تمہاری ہر مدد کے لیے حاضر ہوں۔" کورے نے اسے یقین دلایا۔ اس نے لی کوائے کو تفتیش کے نتائج سے آگاہ کیا۔ سرکاری کیمیادانوں نے جلی ہڈیوں کا تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ آگ کا آغاز اندر سے ہوا تھا۔ ہڈیوں کا فاسفورس کسی وجہ سے جل اٹھا تھا اور اس نے فینگ من کے پورے جسم کو جلا کر خاکستر کردیا تھا۔ ماہر کھوج نہیں لگا سکے تھے لیکن ان کا شبہ تھا کہ موت کسی انوکھی طرز کے زہر سے ہوئی تھی۔ جسم میں جانے کے بعد یہ زہر کسی طرح سے فاسفورس کو جلا دیتا تھا اور جسم بھی جل جاتا تھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ فینگ من کو ختم ہونے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ اس کے جسم کی باقیات موقع پر موجود تھیں اور وہاں کورے کے آدمی پہرا دے رہے تھے۔ لی کوائے، کورے کے ساتھ بُدھا کے مجسمے کے اندر پہنچا تو وہاں کام بہ دستور جاری تھا اسے بعد میں پتا چلا کہ فینگ من کے مرنے کے بعد کام ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکا تھا اور جب تک ملکہ ماشی زو کی طرف سے نئے انچارج کا اعلان نہ ہوتا چیف سپروائزر کائی منک عارضی انچارج تھا۔ کورے ماؤ کو دیکھ کر کائی منک دوڑا چلا آیا پھر وہ لی کوائے کو دیکھ کر چونکا اور بے ساختہ اس کی طرف بڑھا اور اس کے گلے لگ گیا۔

"لی، یہ تم ہو میرے دوست... میں نے سوچا بھی نہیں تھا، اس زندگی میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔"

"مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ تم ہی یہاں کے چیف سپروائزر اور بُدھا کے آرکیٹیکٹ ہو۔"

کورے ماؤ نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟"

"ہاں، ہم بچپن کے دوست ہیں۔" لی کوائے نے بتایا۔ "ہم نے ایک ہی درس گاہ سے تعلیم حاصل کی ہے۔"

کائی منک نے فینگ من کے جل جانے کا واقعہ سنایا۔ "میں ایک ضروری مشورہ کرنے فینگ من کے پاس آیا تھا لیکن وہ اس وقت معتمد خاص کے ساتھ تھا، اس نے مجھے ٹال دیا۔ میں لفٹ سے واپس جارہا تھا جب میں نے فینگ من کو بدھا کی آنکھ میں جلتے دیکھا۔ وہ بس ایک جھلک تھی پھر لفٹ نیچے چلی گئی۔"

"اس حادثے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" لی کوائے نے پوچھا۔ "یہاں دوسرے کارکن کیا کہتے ہیں؟"

کائی منک ہچکچایا۔ "کارکنوں کا خیال ہے کہ فینگ کو بُدھا کی طرف سے سزا ملی ہے۔"

"سزا، وہ کیوں...؟"

"وہ بُدھا کو نہیں مانتا تھا، اس کا مذاق اڑاتا تھا۔"

گفتگو کے دوران کورے بہ دستور مشکوک نظروں سے کائی منک کی طرف دیکھ رہا تھا، اچانک اس نے جھپٹ کر کائی کا ہاتھ پکڑ لیا جو اس کے کرتے کی آستین کے اندر تھا۔ "کیا ہے تمہارے اس ہاتھ میں تم چھپا کیوں رہے ہو؟" کورے نے کہتے ہوئے آستین الٹ دی۔ وہ اور لی کوائے ششدر رہ گئے کیونکہ کائی منک کے ہاتھ کی جگہ دھات اور چمڑے کے خول کے اوپر بنا ایک ہک نما آلہ تھا۔ کلائی کے اوپر سے اس کا بازو غائب تھا۔ کورے نے جھٹکے سے دھاتی خول اتار دیا، اندر کائی منک کی کٹی کلائی تھی اور اس پر ایک نمبر ٹیٹو کی مدد سے کھدا ہوا تھا۔

"یہ کیا، تم سزا یافتہ قیدی ہو؟" کورے درشت لہجے میں بولا۔ "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔" کائی منک سہم گیا۔ "ویسے عظیم ملکہ جانتی ہیں میں سزا یافتہ ہوں۔ میری کلائی کاٹنے کے بعد مجھے آٹھ سال جیل میں بھی گزارنے پڑے تھے۔ پھر مجھے رہائی ملی تو میں اس کام پر آگیا۔ عظیم ملکہ کو میرا ڈیزائن کیا ہوا مجسمہ پسند آیا اور اس نے مجھے چیف سپروائزر اور چیف آرکیٹیکٹ بنا دیا۔ صرف سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے میں اس منصوبے کا انچارج نہیں بن سکا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے دوست۔" لی کوائے نے اس کا شانہ تھپکا۔ "تم جاکر اپنا کام کرو۔"

کائی منک وہاں سے چلا گیا تو کورے اور لی کوائے لفٹ سے مجسمے کے اوپری حصے میں روانہ ہوئے۔ مجسمے کو اندر سے دیکھ کر لی کوائے کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ کتنا بڑا کام ہے۔ اس پر یقیناً کثیر سرمایہ خرچ ہو رہا تھا مجسمے کا جسم ایسی فولادی پلیٹوں سے تیار کیا گیا تھا جنہیں مٹی کی ڈائی میں پگھلا فولاد ڈال کر تیار کیا گیا تھا۔ یہ سارا کام ہنرمندی اور محنت والا تھا، اس میں ذرا سی غلطی پورے مجسمے کو کمزور کرسکتی تھی۔ وہ مجسمے کے سر میں پہنچے تو وہاں فینگ من کی باقیات ایک میز پر سجی ہوئی تھیں۔ لی کوائے نے انہیں قریب سے چھوئے بغیر دیکھا۔ واقعی ہڈیاں یوں کھوکھلی ہو رہی تھیں جیسے وہ اندر سے جلی ہوں۔ لی کوائے جانتا تھا فاسفورس کی آگ کتنی شدید ہوتی ہے، یہ پتھر اور دھات کو بھی چاٹ جاتی ہے، انسانی جسم اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہڈیوں سے جلے بارود جیسی بو آرہی تھی جو فاسفورس کی نشانی تھی۔ کورے نے تنہائی پاتے ہی اس سے کہا۔

"مجھے لگ رہا ہے یہ نہیں کے کسی شخص کا کام ہے۔"

لی کوائے نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس طرح سے قتل کرنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

کورے نے اس سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ لی کوائے اس کے ساتھ کچھ دیر وہاں رکا تھا۔ اس نے مجسمے کی تعمیر کا جائزہ لیا اور کارکنوں سے الگ الگ سوال کرتا رہا۔ اس کے سوال بھی عجیب نوعیت کے تھے، وہ کارکنوں سے ان کے جذبات پوچھ رہا تھا اور یہ کہ وہ یہاں کام سے اور اس کے معاوضے سے مطمئن ہیں یا نہیں۔ کورے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے یہ سب گراں گزر رہا تھا اور وہ اسے وقت کا زیاں سمجھ رہا تھا۔ مگر لی کوائے کی حیثیت اس سے زیادہ تھی اس لیے وہ مجبور تھا۔ واپسی کے سفر میں لی کوائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے کورے سے کہا۔ "سنو ہمیں شہر سے باہر جانا ہے۔"

کورے دنگ رہ گیا۔ "شہر سے باہر کیوں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" لی کوائے نے کہا اور گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔ مجبوراً کورے نے بھی اس کی تقلید کی اور دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتا ہوا پیچھے گھوڑا دوڑانے لگا۔ وہ مرکزی شاہراہ سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر آئے۔ شہر کی فصیل سے نکل کر لی کوائے نے گھوڑے کا رخ شمال کی طرف موڑ دیا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں داخل ہوئے۔ لی کوائے ایک چھوٹے سے خستہ حال مکان کے سامنے رکا۔ کورے نے پوچھا۔ "یہاں کون رہتا ہے؟"

"ایک مکار شخص جیری یونگ۔" لی کوائے نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا اور مکان کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ایک سالخوردہ بوڑھے نے دروازہ کھولا۔ اس نے پھٹا پرانا جبہ پہن رکھا تھا۔ اس نے لی کوائے کو دیکھتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران میں وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ کورے اس کے پیچھے تھا۔ جیری بہت بوڑھا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں زندگی کی حرص کی مکاری موجود تھی۔ لی کوائے کے اندر آتے ہی وہ اس کے آگے جھک گیا۔

"ماسٹر کوائے میری بوڑھی آنکھیں کتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ رہی ہیں۔"

لی کوائے نے اس کی گردن دبوچ لی۔ "ممکن ہے تمہاری آنکھیں آخری بار کسی کو دیکھ رہی ہوں۔"

جیری ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور گھٹی آواز میں بولا۔ "ماسٹر میرا قصور؟"

اس چھوٹے سے مکان میں عجیب و غریب چیزوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ان میں حنوط شدہ جانور اور پرندے، دیواروں پر آویزاں جانوروں کی ہڈیاں اور کھالیں، مرتبانوں میں بے شمار اقسام کی چیزیں اور ایسا کاٹھ کباڑ جو بہ ظاہر کسی کام کا نہیں لگتا تھا۔ لی کوائے نے سرد لہجے میں کہا۔ "بدھا کے مجسمے کی تعمیر کا نگران فینگ من اچانک اندر سے لگنے والی آگ میں جل مرا۔"

جیری دکھاوے کا شور مچا رہا تھا۔ نہ وہ اتنا ناتواں تھا اور نہ لی کوائے نے اتنی سختی سے اس کی گردن دبائی تھی۔ اس نے انجان بن کر کہا۔ "اچھا، میں نے اس بارے میں سنا ہے۔"

"صرف سنا ہے ...... کیا تم نہیں جانتے کہ وہ کس طرح مرا؟"

"میں...؟ کیسے جان سکتا ہوں؟"

"ٹھیک ہے تم فینگ من کے بارے میں نہیں جانتے۔" کورے نے کہا اور اچانک اپنی تلوار نکال کر اس کی نوک جیری کی گردن پر رکھ دی۔ "مگر اپنی موت کے بارے میں ضرور جان جاؤ گے۔"

جیری کی آنکھوں میں دہشت نظر آنے لگی۔ وہ کورے ماؤ کو جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ کوئی اس سے جیری کے خون کا حساب طلب نہیں کرے گا۔ اس نے کانپتے لہجے میں کہا۔ "اسے ہٹا لو... میں سچ کہتا ہوں میں نہیں جانتا لیکن ایک جگہ سے تمہیں پتا چل سکتا ہے۔"

"کون سی جگہ ہے؟"

"تاریک بازار۔" بوڑھے جیری نے جواب دیا۔ "وہاں میکناؤ کا پوچھ لینا۔"

کورے نے تلوار پیچھے کر لی اور غرا کر بولا۔ "خبیث بڈھے، اگر تیری بات درست نہ نکلی تو اپنی قبر خود کھود کر ہماری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"میں نے سچ کہا ہے ماسٹر۔" جیری اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی جان چھوٹنے پر خوش نظر آ رہا تھا مگر لی کوائے کے سوال نے اس کی خوشی چھین لی۔

"ہم میکناؤ سے کیا معلوم کر سکتے ہیں؟"

"یہ... یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" اس نے بدک کر کہا لیکن جب لی کوائے کا ہاتھ اور کورے کی تلوار اس کی گردن کی طرف بڑھی تو اسے اگلنا ہی پڑا تھا۔ "اچھا رکو بتاتا ہوں... تم اس سے آتشیں کچھوے کے بارے میں پوچھنا۔"

"آتشیں کچھوا... یہ کیا چیز ہے؟"

"میں نہیں جانتا لیکن میں نے اس کے بارے میں سنا ہے۔ صحیح تمہیں میکناؤ ہی بتا سکتا ہے۔"

لی کوائے نے محسوس کیا کہ جیری واقعی اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس لیے وہ باہر آ گیا۔ کورے نے باہر آتے ہی کہا۔ "تاریک بازار کہاں ہے؟"

لی کوائے نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم نہیں جانتے... بندرگاہ سے مشرق کی طرف ایک کھاڑی ہے جس کے اوپر شائن شی نامی شہر ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"یہ تاریک بازار اسی شہر کے نیچے ہے، اس میں سرنگوں میں سمندر کا پانی موجود رہتا ہے اور بہت سارے لوگ یہاں رہتے اور کام کرتے ہیں۔ یہاں ہمہ وقت تاریکی رہتی ہے اس لیے اسے تاریک بازار کہتے ہیں۔"

☆☆☆

وہ چاروں کشتی میں شائن شی کی کھاڑی میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ چٹانی ساحل تھا۔ سمندر کے بالکل ساتھ بہت اونچی پہاڑی تھی اور شہر اسی پہاڑی پر آباد تھا۔ سمندر کے پانی نے چٹان کے نچلے حصے کو کاٹ کر کھاڑی کی صورت دیدی تھی اور کسی وجہ سے چٹان کے نیچے بے شمار سرنگیں وجود میں آ گئی تھیں۔ تاریک بازار ان ہی سرنگوں میں تھا۔ یہاں زیادہ تر جرائم پیشہ اور چوری کا مال بیچنے والے بیٹھے تھے اور کسی سرکاری آدمی کا وجود ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ کم نے تجویز پیش کی کہ وہ سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر چلتے ہیں جو راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دے گا لیکن لی کوائے نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ "ممکن ہے اس طرح ہم مطلوبہ آدمی تک نہ پہنچ سکیں اور وہ فرار ہو جائے۔ یہ کام صرف خاموشی سے ہو سکتا ہے۔"

اس لیے وہ ایک جنگی جہاز سے ایک کشتی میں سوار ہوئے اور انہوں نے اس طرح کے چوغے پہن رکھے تھے جن سے ان کا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ چوتھا فرد کورے ماؤ کا نائب لی ہان تھا۔ وہ نوجوان اور مستعد آدمی تھا۔ کشتی وہ اور کورے چلا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کھاڑی کے ایک ڈاک پر تھے، یہ ڈاک بھی چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا اور مدو جذر سے نمٹنے کے لیے لکڑی کی اوپر نیچے ہو جانے والی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس وقت پانی چڑھا ہوا تھا اس لیے انہیں اوپر آنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک چوغہ پوش کسی بھوت کی طرح نمودار ہوا اور اس نے ان کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ لی کوائے نے اسے ایک سکہ دیا۔

"کشتی کا خیال رکھنا، ہم ابھی آتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں آقا۔"

لی کوائے نے اپنی تھیلی سے ایک سکہ اور نکالا اور یوں رکا جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ "شاید تم جانتے ہو میکناؤ کہاں ملے گا؟"

چوغہ پوش کی حریص نظریں چاندی کے سکے پر مرکوز تھیں۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ "میں جانتا ہوں۔"

لیکن اس نے جو پتا بتایا وہ کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ کم نے تجویز پیش کی کہ اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔ چوغہ پوش جانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن جب لی ہان نے تلوار کے ایک ہی وار سے ڈاک پر نصب بانس کاٹ کر دکھایا تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔ نہایت پیچیدہ قسم کی سرنگوں اور راستوں سے گزار کر وہ انہیں ایک بلند جگہ لایا، یہاں ایک گنبد نما ہال تھا جس میں چاروں طرف پتھر کاٹ کر چھجے بنائے گئے تھے اور ان چھجوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی تھیں۔ میکناؤ ان میں سے ایک کوٹھری میں رہتا تھا۔ وہ جیری سے بھی زیادہ بوڑھا اور مکار لگ رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی جس پر اس نے کپڑا باندھ رکھا تھا۔ لی کوائے نے جیری کا حوالہ دیا تو اس نے انہیں اندر آنے کی اجازت دیدی۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"ہم آتشیں کچھوؤں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔" لی کوائے بولا۔

میکناؤ چونکا۔ "آتشیں کچھوے... تم ان کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"تم جو جانتے ہو اس بارے میں، وہ سب بتا دو۔" کورے نے بھدے پن سے کہا جس پر لی کوائے نے اسے گھورا۔ پھر اس نے میکناؤ کی طرف دیکھا۔

"تمہیں عظیم بدھا کے مجسمے میں ہونے والے حادثے کا علم ہے؟"

"نہیں۔" میکناؤ نے انجان بن کر کہا۔ "کیا وہاں کچھ ہوا ہے؟"

لی کوائے نے جان لیا، وہ جھوٹ بول رہا تھا لیکن اس نے تحمل سے جواب دیا۔ "فینگ من جو مجسمے کی تعمیر کا انچارج تھا وہ اچانک از خود آگ بھڑکنے سے جل کر خاکستر ہو گیا۔"

میکناؤ نے اپنی اکلوتی آنکھ سے ان سب کو دیکھا۔ "تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم ہمیں آتشیں کچھوؤں کے بارے میں بتا سکتے ہو۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں...۔" میکناؤ بولتے

بولتے رک گیا، اس کی نظر اس تھیلی پر مرکوز ہوگئی جو کم کے ہاتھ میں تھی اور اس کے ہلنے سے کھنکنے کی جو آواز آرہی تھی اس سے صاف پتا چلتا تھا اس میں چاندی کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ کم سرد لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے تمہیں کچھ یاد آیا ہے۔"

میکناؤ چونکا۔ "اوہ... ہاں... ذرا رکنا۔" وہ کہتے ہوئے اٹھا اور ایک طرف لگے پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ جب وہ کچھ دیر تک واپس نہیں آیا تو سب سے پہلے لی کوائے کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا، اس نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو اس کے عقب میں دیوار میں ایک سوراخ دکھائی دیا اور میکناؤ غائب تھا۔ اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"وہ بھاگ گیا ہے۔"

کورے جھپٹ کر پاس آیا۔ پھر اس نے لی کوائے سے کہا۔ "تم یہاں سے پیچھے جاؤ، میں اور لی ہان سامنے سے جاتے ہیں، وہ بھاگ کر نہیں جاسکے گا۔"

"میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔" کم نے لی کوائے سے کہا۔ وہ سرنگ میں گھسا، جو بس اتنی تھی کہ اس میں آدمی جھک کر چل سکے۔ یہ سرنگ میکناؤ نے یقیناً کسی ایسے ہی وقت کے لیے چھپا رکھی تھی۔ کم اس کے پیچھے تھی۔ اس نے عقل مندی کی اور آتے ہوئے ایک چھوٹی لالٹین اٹھالی اور اب وہ مکمل تاریکی میں نہیں تھے۔ لی کوائے کو احساس ہوا کہ سرنگ نیچے جارہی تھی اور بالآخر وہ پانی سے بھری ایک بڑی سرنگ کی چھت تک پہنچ گئے۔ مسئلہ نیچے اترنے کا تھا۔ اسے دیوار کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی دکھائی دی جو دور تھی لیکن لی کوائے لٹک کر اس تک پہنچ گیا اور وہ نیچے اترا تو کم کو پہلے سے موجود پاکر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ ملکہ کی معتمد خاص تھی۔ فنونِ حرب اور مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔

"میرا خیال ہے وہ اس طرف گیا ہوگا۔" کم نے اشارہ کیا اور وہ دونوں پانی کے ساتھ بنے ہوئے چھجے پر چلنے لگے۔ یہاں پانی اتنا گہرا ضرور تھا کہ اس میں کشتی چل سکتی۔ لی کوائے بہت تیز جارہا تھا اچانک اسے احساس ہوا کہ کم اس کے ساتھ نہیں ہے اور وہ اکیلا ہے۔ یہاں کئی سرنگیں آکر ایک بڑی ہال نما جگہ مل رہی تھیں۔ یہاں چھت کو سہارا دینے کے لیے لکڑی کے دیو قامت ستون لگائے گئے تھے۔ ہال میں آتے ہی لی کوائے کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ وہاں کوئی موجود تھا۔ وہ محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے ایک سرخ چیز اس پر جھپٹی۔ اگر وہ پھرتی سے کام نہ لیتا تو مارا جاتا۔ حملہ کرنے والا سرخ پوش نہایت پھرتیلا تھا۔ وہ اوپر ستونوں سے آیا اور حملہ کرتے ہی وہیں کہیں غائب ہوگیا۔ اس نے لی کوائے کو تلوار مارنے کی کوشش کی مگر وہ بروقت جھکنے کی وجہ سے بچ گیا۔

اسی لمحے ایک طرف سے ایک کشتی نکلی جسے میکناؤ چلا رہا تھا اور وہ بہت عجلت میں تھا۔ لی کوائے لکڑی کے ستونوں کو پکڑتا اس کی طرف بڑھا تھا کہ سرخ لباس والے نے پھر حملہ کیا۔ اس بار لی کوائے نے جوابی کارروائی کی اور اس کی لات نے سرخ پوش کو پانی کی طرف اچھال دیا مگر حیرت انگیز طور پر وہ پانی میں گرنے کے بجائے قلابازی کھا کر لکڑی کے ایک ستون سے چمٹ گیا اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ یہاں روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ چھت صاف دکھائی دیتی۔ لی کوائے نے یہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ وہ اس سرنگ کی طرف لپکا جس میں میکناؤ غائب ہوا تھا۔ پھر وہ رک گیا۔ میکناؤ کی کشتی رکی ہوئی تھی اور وہ کشتی میں ساکت پڑا تھا کیونکہ لی ہان کی تلوار اس کی گردن سے لگی تھی۔ کورے اس کے پیچھے کھڑا تھا، اس نے کم کے بارے میں پوچھا۔ لی کوائے نے شانے اچکائے۔ "مجھے نہیں معلوم وہ میرے پیچھے تھی پھر غائب ہوگئی۔"

"کچھ سیاہ پوشوں نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی مگر ہم نے دو کو مار گرایا۔" کورے بولا۔

"کوئی زندہ ہاتھ آیا؟"

"یہ ہے نا۔" کورے نے میکناؤ کی طرف اشارہ کیا۔

لی کوائے مایوس ہوا تھا سیاہ پوشوں کا نکل جانا اچھا شگون نہیں تھا۔ سرخ پوش بھی یقیناً ان کا ساتھی تھا۔ درحقیقت اسے میکناؤ سے اتنی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ آتشیں بچھوؤں کے بارے میں یقیناً اور لوگ بھی جانتے ہوں گے لیکن سیاہ پوش جو اس کے درپے تھے وہ یقیناً فینگ من کی موت سمیت بہت سے رازوں سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔ کم سامنے سے نمودار ہوئی تھی۔ وہ میکناؤ کو دوبارہ اس کی کوٹھری تک لائے۔ لی کوائے نے ایک رسی کا پھندا بنا کر اسے چھت سے لگے کنڈے سے باندھا اور پھر پھندا میکناؤ کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"اب۔" لی کوائے سرد لہجے میں بولا۔ "انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے موت یا زندگی...؟"

"وہ مجھے ماردیں گے۔" وہ چلایا۔

"کون؟"

"میں نہیں جانتا لیکن وہ ان تمام لوگوں کو ختم کررہے ہیں جو آتشیں بچھوؤں کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"کیا جانتے ہیں؟" لی کوائے نے پوچھا اور میکناؤ کو ایک اسٹول پر کھڑا کر کے رسی کھینچ لی۔ پھندا اس کے گلے میں فٹ ہوگیا۔

"یہی کہ آتشیں بچھوے منگ ٹیمپل میں پالے جاتے ہیں۔"

لی کوائے نے اسے اسٹول سے اتارا میکناؤ نے ایک قدیم چرمی کتاب نکالی، اس نے اس میں ایک صفحہ نکال کر ان کے سامنے کردیا، اس پر عجیب سی جونکیں بنی تھیں جن کی پشت بچھوے جیسی تھی۔ میکناؤ نے کہا۔ "اگر انہیں پانی میں ڈال دیا جائے تو یہ پانی میں اپنا زہر چھوڑتی ہیں اور اگر وہ پانی کوئی انسان پی لے یا اس کے جسم پر ڈال دیا جائے تو یہ زہر سورج کی روشنی پڑتے ہی جسم کی ہڈیوں میں موجود فاسفورس کو جلا دیتا ہے اور انسان خود اپنی آگ میں جل کر مر جاتا ہے۔"

واپسی کے سفر میں وہ بہت محتاط تھے۔ کورے کسی قدر پرجوش تھا، اس کے خیال میں یہ بہت بڑی دریافت تھی لیکن لی کوائے کے خیال میں اصل چیز منگ ٹیمپل تھا جہاں آتشیں بچھوؤں کی پرورش کی جاتی تھی۔ یہ ٹیمپل شہر سے باہر تھا۔ منگ نامی بدھ راہب نے دو سو سال پہلے یہ خانقاہ بنائی تھی اور یہاں بدھ مت کے ساتھ مارشل آرٹ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس بار انہوں نے کم کے اصرار پر محافظ دستہ ساتھ رکھا تھا اس لیے خانقاہ کا سربراہ ان کے ساتھ شرافت سے پیش آیا اور اس نے ان سے پورا تعاون کیا۔ اس نے تصدیق کی کہ آتشیں بچھوے اس خانقاہ میں پالے جاتے تھے لیکن چند سال پہلے یہ سلسلہ ترک کردیا گیا کیونکہ غلطی سے نہانے کے تالاب میں چند آتشیں بچھوے چلے گئے اور اس تالاب میں نہانے سے پندرہ زیر تعلیم بچے جل کر ہلاک ہوگئے تھے۔ کم نے سوال کیا۔

"جب یہ اتنی خطرناک چیز ہے تو اسے کیوں پالا جا رہا تھا؟"

"یہ کیڑے صرف ہمارے پاس تھے۔" سربراہ نے وضاحت کی۔ "ہمارا مقصد ان کی نسل برقرار رکھنا تھا لیکن جب بچے مارے گئے تو ہمیں مجبوراً انہیں تلف کرنا پڑا۔"

"تمہیں یقین ہے سارے آتشیں بچھوے تلف کر دیے گئے تھے؟" لی کوائے نے پوچھا۔ سربراہ نے اثبات میں جواب دیا۔

"میں نے انہیں خود تلف کیا تھا۔"

اب سوال یہ تھا کہ اگر خانقاہ کے سربراہ نے انہیں خود تلف کیا تھا تو فینگ من کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟

واپسی میں کورے نے لی کوائے سے اتفاق کیا۔ "یہ کیڑے اب بھی کہیں موجود ہیں۔"

"لیکن کہاں ہیں؟" کم نے سوال کیا۔

اس کا جواب فی الحال کسی کے پاس نہیں تھا۔ لی کوائے خاموش اور کسی قدر فکر مند تھا۔ کچھ لوگ اس کے درپے تھے، پہلے انہوں نے اسے سرکاری رہائش گاہ میں مارنے کی کوشش کی اور پھر تاریک بازار میں قتل کرنا چاہا۔ اسے اپنی زندگی کی اتنی پروا نہیں تھی اسے فکر یہ تھی کہ اس کے سپرد جو کام کیا گیا وہ بہر صورت پورا ہو اور صاف لگ رہا تھا کچھ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ حقیقت سے پردہ اٹھے۔ اس کے لیے وہ لی کوائے کو ختم کرنے پر آمادہ تھے۔ تاریک بازار میں حملہ آوروں کی پہلے سے موجودگی ظاہر کررہی تھی کہ وہ اس کی نقل و حرکت پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایسا صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھا کہ جب لی کوائے کے ساتھیوں میں سے کوئی دشمن سے ملا ہوا ہو۔ اس نے کم یا کورے سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت محتاط تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین تھا جتنا بہ ظاہر نظر آتا تھا۔ یہاں پردے کے پیچھے کوئی کھیل کھیلا جارہا تھا۔ واپسی کے سفر میں اس نے کم سے کہا۔

"میں ہاشی زو سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں عظیم ملکہ تک تمہاری خواہش پہنچا دوں گی۔"

شہر میں داخل ہوتے ہی کم محل کی طرف چلی گئی اور لی کوائے کورے کے ہمراہ اپنی سرکاری رہائش گاہ کی طرف جانے لگا۔ جب وہ رہائش گاہ کے سامنے پہنچا تو بازار والی گلی میں وو منگ اپنے درجنوں مسلح ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ لی کوائے اسے دیکھ کر رک گیا اور پھر اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کورے نے جلدی سے کہا۔ "یہ عظیم ملکہ کا مخالف ہے اور تمہارا اس سے ملنا کسی صورت درست نہیں ہے۔"

"مشورے کا شکریہ۔" لی کوائے نے خشک لہجے میں کہا اور گھوڑے سے اتر کر وو منگ کی طرف بڑھا۔ اس کے بالکل پاس پہنچ کر اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف وو منگ سن سکا تھا۔ "اس طرح بیچ بازار میں مجھے روک کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وو منگ نے جوابی سرگوشی کی۔ "میں تمہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں خبردار ہوں۔"

"وہ کتیا ہے... جیسے ہی اس کا کام نکلے گا وہ تمہیں دوبارہ جیل میں ڈال دے گی۔"

"میں جانتا ہوں۔" لی کوائے کا لہجہ بہ دستور خشک تھا۔ "کیا تم اس کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہے ہو؟"

وومنگ نے شانے جھٹکے۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے میں اپنی جگہ خود اپنا حکمران ہوں۔"

"تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

وومنگ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ فینگ من کی موت کا معما حل ہو۔"

"وہ میں نہیں ہوں۔"

"مجھے یقین ہے اسی لیے تمہیں محتاط ہونے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

وومنگ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میرے دوست، میرے دس ہزار سپاہیوں کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ کیا تمہیں معلوم ہے اس نے اپنے شوہر کو بھی زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔" اس نے کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ لی کوائے نے محسوس کیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار تھا۔ وومنگ کے انکشاف نے اسے ہلا دیا تھا اور اب وہ پہلے سے زیادہ ماشی زو سے ملاقات کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کم صبح سورج نکلنے سے پہلے آ گئی اور اس نے لی کوائے کو مطلع کیا کہ ملکہ اس کی منتظر ہے۔ وہ فوری روانہ ہو گیا۔ ملکہ ماشی زو محل کے ٹیرس میں اس کی منتظر تھی سامنے بُدھا کا مجسمہ کھڑا تھا۔ سورج نمودار ہونے والا تھا اور اس کی روشنی کی پہلی کرنیں بُدھا کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ ماشی زو نے سرد مہری سے اس کا استقبال کیا۔

"لی کوائے کو خوش آمدید... لیکن کیا تم اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے آئے ہو؟"

"اس کے برعکس میں ابھی بتا نہیں سکتا کہ میں کامیابی کے پاس ہوں۔" لی کوائے نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "میں آپ سے کچھ سوال کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

"تم مجھ سے سوال کرو گے؟" ماشی زو کے لہجے میں حقارت تھی۔

"یہ اس معمے کو حل کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔"

ماشی زو سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ "تمہیں اجازت ہے۔"

"آپ کے خیال میں آپ نے اپنے مخالفین پر مکمل قابو پا لیا ہے؟"

ماشی زو کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا اس نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔ "یہ تو کوئی حکمران نہیں کہہ سکتا... مخالف ایک بھی ہو تو مخالف ہی ہوتا ہے۔"

"میں ایسے مخالفین کی بات کر رہا ہوں جو آپ کے اقتدار کے لیے خطرہ ہوں۔"

"میں نے شمال کے بارے میں کچھ سنا ہے۔"

ماشی زو کا لہجہ مبہم تھا لیکن لی کوائے سمجھ گیا۔ ریاست کا شمالی حصہ ہمیشہ سے باغیوں کا گڑھ رہا تھا۔ وومنگ کا تعلق بھی وہیں سے تھا۔ یہ حصہ ایک اور چینی ریاست سے ملا ہوا تھا جو شروع سے ماشی زو کی ریاست کی دشمن تھی۔ وہ باغیوں کو اکسا سکتی تھی۔ ماشی زو مخالفوں کو سخت سزا دیتی تھی اور پھر انہیں معاف کر دیتی تھی۔ لی کوائے نے اگلا سوال کیا۔

"فینگ من کی موت کے پیچھے آپ کے مخالفوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"شاید... میں یقین سے نہیں کہہ سکتی... اسی معمے کو حل کرنے کے لیے ہی میں نے تمہیں جیل سے نکلوایا ہے۔"

"میں اس عنایت کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔" لی کوائے نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ "آپ سابق شہنشاہ پر بھی مہربان تھیں۔"

ماشی زو نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"آپ جانتی ہیں، فینگ من کی موت ایک قسم کے زہر سے ہوئی ہے۔ ویسے یہ بے ضرر ہے لیکن اگر اس کا شکار سورج کی روشنی میں چلا جائے تو یہ زہر ہڈیوں کے فاسفورس کو جلا دیتا ہے اور آدمی اپنے اندر کی آگ میں جل کر ہلاک ہو جاتا ہے۔"

ماشی زو نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اس کے بجائے وہ یک ٹک لی کوائے کو گھورتی رہی۔ "تم نے شہنشاہ کا حوالہ کیوں دیا؟"

لی کوائے نے سوچا اور سچ بول دیا۔ "آپ کے مخالفین کا خیال ہے کہ مرحوم شہنشاہ کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔"

"یہ بکواس وومنگ نے کی ہو گی۔" ماشی زو خلاف توقع مشتعل نہیں ہوئی تھی۔ "تمہیں معلوم ہے کل رات وہ اپنے گھر میں شطرنج کھیل رہا تھا کہ نامعلوم سمت سے آنے والے تیر نے اس کا کام تمام کر دیا۔"

لی کوائے ہل کر رہ گیا۔ وومنگ کی موت کا خطرہ تو تھا لیکن یہ اتنی جلدی حقیقت بن جائے گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ پھر اسے غصہ آنے لگا۔ "قتل ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے۔"

ماشی زو نے ہاتھ اٹھایا۔ "نتیجہ اخذ کرنے میں جلدی مت کرو۔ یہ قتل میرے اشارے پر نہیں ہوا ہے۔"

لی کوائے نے ماشی زو کی بات کا یقین نہیں کیا تھا اس لیے جب وہ محل سے روانہ ہوا تو بہ دستور غصے میں تھا۔ وہ سیدھا کورے ماؤ کے دفتر پہنچا اور اس نے کورے سے کہا۔ "کیا تم کئی دن کے لیے میرے ساتھ چل سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔" وہ بولا۔ "سچی بات ہے، تمہارے ساتھ رہ کر میں بہت کچھ سیکھتا رہا ہوں۔"

لی کوائے سوچ میں تھا، اس نے کہا۔ "دوست، میں تم سے کوئی بات چھپاؤں گا نہیں... ممکن ہے میری تفتیش کے نتائج ماشی زو کو پسند نہ آئیں اور میرے ساتھ تم بھی اس کے عتاب کا شکار ہو جاؤ۔"

کورے نے سر ہلایا۔ "اس کا خطرہ تو ہمیشہ سے ہے لیکن میں حقیقت تک پہنچنا زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔"

"ہمیں شمال کی طرف جانا ہو گا۔ وہاں کچھ ہو رہا ہے، ماشی زو اس سے کسی حد تک باخبر ہے لیکن اس نے ابھی تک کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ ممکن ہے اس میں اس کا کوئی مفاد ہو۔" لی کوائے نے کہا اور اچانک پوچھا۔ "تم جانتے ہو سابق شہنشاہ کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟"

کورے جھجکا اور پھر یقین سے عاری لہجے میں بولا۔ "اسے جگر کا مسئلہ تھا جو بگڑ گیا تھا۔"

"یہ وہ کہانی ہے جو عوام کو سنائی گئی ہے۔"

"میں بھی اس وقت عوام میں تھا۔" کورے نے دامن بچایا۔

لی کوائے نے گہری سانس لی۔ "سچی بات ہے کہ میں نے بھی اس بات پر یقین نہیں کیا۔"

"کیونکہ تم ملکہ کے مخالفوں میں سے تھے۔"

"ہاں شاید اس وجہ سے بھی... لیکن رہائی کے بعد میرے خیالات بدل گئے ہیں۔"

"یعنی تم ملکہ کے مخالف نہیں رہے ہو؟"

"اگر شہنشاہ زندہ ہوتا تب بھی لوگ اس کے غلام ہوتے تو اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ ایک ملکہ کے غلام ہیں۔ اس نے ملک اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔"

کورے خوش نظر آنے لگا۔ "دوست، یہ تبدیلی خوش آئند ہے مجھے امید ہے کہ تم یہ معما حل کر کے ملکہ کی نظروں میں جگہ بنا لو گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم اپنی سابق حیثیت میں بحال کر دیے جاؤ۔"

"شاید۔" لی کوائے نے بے دلی سے کہا۔ "ایک بات کا خیال رکھنا یہ سفر خفیہ ہو گا، ہم رات کی تاریکی میں چھپ کر نکلیں گے اور تم کسی سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔"

رات ہوئی تو شہر کے شمالی دروازے سے دو چوغہ پوش گھڑ سوار نکلے اور شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ لی کوائے نے اب تک کورے کو اپنی منزل کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ کورے نے پوچھا تو اس نے کہا۔ "ہمیں شان ہو کے قلعے تک جانا ہے۔"

"شان ہو۔" کورے نے تعجب سے کہا۔ "وہ تو ویران پڑا ہے۔"

"ہاں لیکن ایک زمانے میں یہ جگہ باغیوں کا گڑھ ہوتی تھی۔"

شان ہو کا قلعہ شمال کے پہاڑوں کے درمیان واقع تھا اور یہ سرحد سے بس چند میل کے فاصلے پر تھا۔ دو دن کی مسافت پر تھا۔ انہوں اطمینان کر لیا تھا کہ ان کا تعاقب نہیں ہو رہا ہے اس لیے وہ پہلی رات قیام کر کے بے فکری سے سو گئے تھے۔ اچانک لی کوائے کی آنکھ کھلی اور اس نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان کوئی حرکت ہو رہی ہے، وہ چوکنا ہو گیا۔ اچانک کوئی تیزی سے آگے آیا اور لی کوائے قلابازی کھا کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو کئی تلواریں بیک وقت اس کے جسم میں اتر جاتیں۔ وار کرنے والے پہلی ناکامی کے بعد اس کی طرف لپکے تھے۔ لی کوائے نے اپنی تلوار نکالتے ہوئے چیخ کر کورے کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، وہ اپنی جگہ نہیں تھا، اگرچہ اس کا گھوڑا موجود تھا۔ حملہ آور نصف درجن تھے اور وہ سب ماہر تلوار باز لگ رہے تھے۔

لی کوائے دو ساتھ ملے تنوں والے درختوں کو پشت پر رکھتے ہوئے حملہ آوروں سے نمٹنے لگا۔ وہ تعداد میں زیادہ اور ماہر لڑاکا تھے لیکن اس کی مہارت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ چند منٹ میں ان میں سے تین زخمی ہو چکے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ لی کوائے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اچانک ہی وہ ایک طرف بھاگ نکلے۔ لی کوائے نے ان کا پیچھا کرنے کے بجائے کورے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا سامان موجود تھا لیکن وہ خود غائب تھا۔ اگر حملہ آوروں نے پہلے اسے قتل کیا تھا تب بھی اس کی لاش تو موجود ہونی چاہیے تھی۔ لی کوائے کے ذہن میں شبہ سر اٹھانے لگا۔ کہیں کورے ہی تو دشمنوں کا مخبر نہیں ہے ورنہ اس کے یوں غائب ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اب آرام کا موقع نہیں تھا، وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور شان ہو قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ صبح سے پہلے قلعے کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایک جگہ باندھا اور خود قلعے میں داخل ہو

گیا۔قلعہ کھنڈر..... میں بدل گیا تھا بس اس کی مرکزی عمارت کا ایک حصہ سلامت تھا۔ سورج طلوع ہونے والا تھا۔ وہ محتاط انداز میں دبے قدموں چلتا عمارت تک آیا۔ اس نے مرکزی ہال کا دروازہ کھولا تو اسے سامنے مشرق کے رخ پر واقع گیلری میں ایک سرپوش عورت نظر آئی وہ ساکت کھڑی تھی۔ لی کوائے بے ساختہ اس کی طرف بڑھا اور جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا کوئی تار جیسی چیز اس کے پیروں سے ٹکرائی اسی لمحے عورت کے جسم پر موجود کپڑے تیزی سے ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ چند لمحے میں تمام کپڑے اتر گئے تو نیچے سے کورے برآمد ہوا۔ وہ زمین میں گڑے ایک فولادی ستون سے زنجیروں کی مدد سے بندھا ہوا تھا اور اب سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ یہ ٹریپ تھا۔ کورے چلایا تو لی کوائے تلوار نکالتا ہوا اس کی طرف بھاگا، اس نے ایک ہی وار سے ایک زنجیر کاٹ دی۔ کورے کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا پھر یہ آگ اس کے چہرے سے نکلنے لگی۔ لی کوائے دیوانہ وار زنجیریں کاٹ رہا تھا لیکن جب تک وہ تمام زنجیریں کاٹتا کورے کے جسم نے یوں آگ پکڑ لی تھی جیسے وہ روئی کا بنا گڈا ہو جسے تیل میں بھگو کر آگ لگا دی گئی ہو۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا اور اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"لی..... بھاگ جاؤ..... یہ تمہیں..... بھی ماردیں..... گے۔"

لی کوائے رک گیا، وہ کورے کو نہیں بچا سکتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کورے وہ کون تھے؟"

"ماشی..... ماشی زو..... کی....." اس سے آگے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ آگ نے اس کا جسم خاکستر کر دیا تھا۔ چند منٹ بعد یہ آگ بھی بجھ گئی اور اب وہاں سوائے راکھ اور جلی ہوئی ہڈیوں کے کچھ نہیں تھا۔ لی کوائے ساکت کھڑا تھا اور اس کے چہرے کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اس کا اندازہ تھا کہ اسے شان ہو کے قلعے میں کوئی سراغ ملے گا مگر یہاں کورے اپنی جان سے گیا تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے ماشی زو اور اس کی کسی چیز کا ذکر کیا تھا۔ کیا وہ سیاہ پوشوں کو ملکہ کی فوج قرار دے رہا تھا۔ مگر ماشی زو کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے کورے کی راکھ سمیٹ کر ایک خالی مرتبان میں رکھی اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سامان میں رکھ لیا۔ یہ اس کے وارثوں کا حق تھا۔ پھر وہ سارا دن قلعے اور اس کے آس پاس گھومتا رہا لیکن اسے وہاں کسی انسان کی جھلک تک نظر نہیں آئی۔

اس دن وہ اکیلا تھا اور اسے اب تک کی صورت حال پر غور کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ وومنگ کی موت بتا رہی تھی کہ لی کوائے پر حملوں کے پیچھے وہ نہیں تھا۔ اسی طرح کورے کی موت بھی اشارہ تھا۔ ان لوگوں نے اسے خبردار کیا تھا کہ وہ اپنی تفتیش روک دے ورنہ ایسی ہی موت کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ ماشی زو پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر کورے کے آخری الفاظ نے اس کی شفافیت کو دھندلا دیا تھا۔ لی کوائے اس معمے کے ٹکڑے آپس میں فٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات ہوئی تو وہ قلعے کے اس حصے میں آیا جہاں اس قلعے پر حکومت کرنے والوں کے مجسمے نصب تھے۔ یہاں سناٹا تھا، آسمان پر پورا چاند تھا مگر نیچے تالاب سے اٹھنے والی بھاپ ماحول کو دھندلا رہی تھی۔ وہ ایک مجسمے کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ ایک رات اور یہاں گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے بے شمار مجسمے کھڑے تھے۔ ایک بار اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے ایک مجسمے کے اوپر دوسرا مجسمہ کھڑا نظر آیا۔ لی کوائے بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجسمہ نہیں بلکہ وہی سرخ پوش تھا جس نے اس پر تاریک بازار میں حملہ کیا تھا۔

"تم.....؟"

"ہاں لی کوائے۔" سرخ پوش نے کہا، اس کی آواز کسی قدر بھاری تھی لیکن وہ جوان ہی لگ رہا تھا۔ "تمہیں خبردار کیا گیا لیکن تم باز نہیں آئے۔"

"ہاں۔" لی کوائے نے سکون سے کہا۔ "کیونکہ میں ایک بار پھر تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا تم یہاں ضرور آؤ گے تمہارے سیاہ پوش ساتھیوں سے میں راستے میں مل چکا تھا۔"

سرخ پوش نے قلابازی کھائی اور نیچے اتر آیا، اس کے انداز سے لی کوائے کا شبہ بڑھ گیا تھا۔ "تم یقیناً موت کے آرزومند ہو۔"

"یہ بات درست ہے کم..... میں ہمیشہ سے موت کا آرزومند رہا ہوں۔" لی کوائے نے کہا تو سرخ پوش لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔

"کیا بک رہے ہو؟"

"کم تم یہ سب ماشی زو کے اشارے پر کر رہی ہو یا اس کے دشمنوں سے مل گئی ہو۔"

سرخ پوش کم چند لمحے ساکت کھڑی رہی پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ "تم نے مجھے پہچان لیا؟"

"شک تو اسی دن ہو گیا تھا جب تم نے تاریک بازار میں مجھ پر حملہ کیا، آج بات کر کے تم نے تصدیق کر دی۔"

کم کا حسین چہرہ تن گیا اور اس کی سیاہ آنکھوں میں غصہ چمکنے لگا۔ "مگر تم یہ بات کسی کو بتانے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔"

"کیسے.....؟ کیا ملکہ ماشی زو کو؟"

کم نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اچانک تلوار کی نیام اس کی طرف گھمائی۔ نیام سے ایک سفوف نما چیز نکلی اور لی کوائے کے چہرے تک آئی، اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہوتا، وہ سانس لے چکا تھا اور یہ سفوف نما چیز سانس کے ساتھ اس کے جسم میں اتر گئی۔ لی کوائے کو جھٹکا لگا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لیے اندھیرا آ گیا۔ یہ خواب آور سفوف تھا جو اس کے جسم میں اتر گیا تھا اور اس کا اثر لازمی تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور تیزی سے پیچھے ہٹا۔ کم نے اس پر تلوار سے وار کیا تھا۔ وہ ماشی زو کی معتمد خاص تھی اور اس نے اس فن کے ماہر ترین استادوں سے تربیت حاصل کی تھی، اس کی مہارت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اندھیرا چھٹا تو لی کوائے کم کے وار اپنی تلوار سے روکنے لگا۔ کم کے تاثرات نہایت خوفناک ہو رہے تھے اور وہ بجلی کی طرح لپک لپک کر وار کر رہی تھی۔ لی کوائے چکراتے ذہن کے ساتھ نہایت مشکل سے خود کو بچا رہا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری تھی ورنہ زندگی ہار جاتا۔ ایک بار اس نے کم کی تلوار کو اس طرح اپنی تلوار پر روکا کہ کم کی تلوار چھناکے سے دو ٹکڑے ہو گئی۔ اب وہ اس کے سامنے آدھی تلوار لیے کھڑی تھی لیکن لی کوائے نے اس پر وار نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے اپنی تلوار نیچے کر لی۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

جواب میں کم نے اچانک ہی ٹوٹی تلوار اس کے سینے میں اتار دی۔ لی کوائے لڑکھڑا کر پیچھے گرا تو کم اس پر چھا گئی۔ لی کوائے نے ڈوبتی آنکھوں سے اس کے ہاتھ میں اس کی تلوار کا ٹوٹ جانے والا حصہ دیکھا جسے وہ اس کے دل میں اتارنے جا رہی تھی اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ کم اس کے سینے پر سوار تھی اور لی کوائے بے بسی سے اس کے سامنے پڑا تھا۔ کم نے ایک کربناک چیخ کے ساتھ ہاتھ گھمایا لیکن ٹوٹی تلوار کو لی کوائے کے سینے کے بجائے زمین میں اتار دیا۔ لی کوائے کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ایک لمحے کو بھی نہ ہچکچاتی مگر لی کوائے کے معاملے میں اس کے اندر کی عورت نے ہار مان لی تھی۔ وہ رو دی تھی پھر اس نے لی کوائے کے شانے میں اتری اپنی ٹوٹی تلوار کھینچ کر نکالی اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگی۔

☆☆☆

لی کوائے کو ہوش آیا تو وہ اجنبی جگہ زمین پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی کم بے سدھ پڑی تھی۔ پہلے وہ سمجھا کہ وہ سو رہی ہے لیکن اچانک لی کوائے کو احساس ہوا کہ اس کا سرخ لباس اصل میں خون میں بھیگا ہوا ہے۔ لی کوائے نے بے تابی سے اس کی نبض دیکھی وہ چل رہی تھی۔ کم کراہی اور آہستہ سے بولی۔ "میں ابھی زندہ ہوں۔"

"کیا میں نے تمہیں زخمی کیا ہے؟" لی کوائے نے اس کے زخموں کو دیکھتے ہوئے کہا اور یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ بائیں طرف بغل میں ایک زخم عین دل کے اوپر تھا۔ اس کے علاوہ بھی زخم تھے لیکن معمولی نوعیت کے تھے۔ کم کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ لی کوائے نے سوال جواب میں وقت ضائع نہیں کیا اور گھوڑا لے آیا۔ اس نے کم کو سینے سے لگا کر کپڑے کی مدد سے خود سے باندھ لیا تا کہ وہ گرے نہیں اور فوری روانہ ہو گیا۔ راستے میں کم نے اسے بتایا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے قتل نہ کر سکی تھی۔ وہ اسے لے کر دارالحکومت کی طرف روانہ ہوئی لیکن جب وہ دارالحکومت کے پاس پہنچی تو سیاہ پوشوں نے حملہ کر دیا۔ وہ لی کوائے کو مارنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن انہوں نے کم کو شدید زخمی ضرور کر دیا تھا، اپنے کئی ساتھی گنوانے کے بعد بالآخر وہ ہمیشہ کی طرح بھاگ نکلے۔

"تو سیاہ پوش اصل میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں؟"

"نہیں..... لیکن تمہارے دشمن سب ہیں۔" کم نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی تمہیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم جانتے ہو، میں تمہارے پیچھے کیوں آئی؟..... کیونکہ ماشی زو نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہیں قتل کر دوں، اس سے پہلے کہ تم اس کے دشمنوں سے جا ملو۔"

"تم صرف ملکہ کے حکم پر مجھے قتل کرنا چاہتی تھیں؟"

"نہیں..... میں نہیں چاہتی تھی کہ تم فینگ من کی موت کا معما حل کرو۔"

"تم ماشی زو کے دشمنوں سے مل گئی ہو؟"

"میں ماشی زو کے کسی دشمن سے نہیں ملی ہوں لیکن

کوشش

جج۔ "تمہارے بے شمار جرائم کے واضح اور قطعی ثبوت مل جانے کے بعد میں تمہیں مجموعی طور پر سو سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔"

مجرم۔ "سو سال قید بامشقت! اتنے طویل عرصے تک تو میں زندہ بھی نہیں رہ سکوں گا۔"

جج۔ "مگر اپنی سی کوشش تو کر ہی سکتے ہو۔"

میں اسے زندہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے سارے خاندان اور پورے گاؤں کی قاتل ماشی زو ہے۔"

"وہ ایک حکمران ہے۔" لی کوائے نے نرمی سے کہا۔ "ہر حکمران اپنے مخالفوں کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔"

کم کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ لی کوائے کی بات سے متفق ہے۔ کورے یقیناً اسے ماشی زو کی معتمد خاص کے بارے میں بتانے جا رہا تھا لیکن موت نے اسے مہلت نہیں دی تھی۔ کم نے آہستہ سے کہا۔ "سنو تم مجھے شہر کے پاس چھوڑ کر چلے جاؤ، اگر تم شہر گئے تو ملکہ کے آدمی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں شہر جاؤں گا اور اس معمے کو حل کروں گا۔" لی کوائے نے قطعی لہجے میں کہا۔ "میں ڈر کر میدان چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

دارالحکومت میں داخل ہونے سے پہلے لی کوائے نے ایک چادر اپنے اور کم کے گرد لپیٹ لی تاکہ کوئی انہیں شناخت نہ کر سکے۔ یوں بھی ابھی صبح کا اندھیرا تھا۔ محل کے پاس آکر وہ گھوڑے سے اترا اور اس نے کم کو یوں گھوڑے پر لٹا دیا کہ وہ گر نہ سکے۔ وہ آخری دموں پر لگ رہی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے وہ ماشی زو سے کچھ باتیں کر سکے۔ لی کوائے نے گھوڑے کو تھپکی دی تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے کم سے پوچھا نہیں کہ اس نے اسے کیوں قتل نہیں کیا۔ گھوڑا محل کے سامنے پہنچا اور محافظوں نے اسے دیکھ لیا تو لی کوائے تیزی سے ایک طرف چل پڑا تھا۔ اس کے پاس مہلت کم تھی، اسے آج ہی یہ معما حل کرنا تھا۔

ماشی زو کو خادماؤں نے اطلاع دی کہ کم شدید زخمی حالت میں محل کی سیڑھیوں پر پائی گئی ہے۔ اس دوران میں کچھ خادمائیں کم کو اٹھا کر اندر لے آئیں۔ ماشی زو نے بے تابی سے اسے دیکھا اور پھر زخموں کی نوعیت سمجھتے ہی چیخ کر طبیب کو بلانے اور سب لوگوں کو دور جانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے کم کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور لرزتی آواز میں بولی۔ "یہ کیسے ہوا؟"

"لی کوائے کو بچاتے ہوئے۔" کم نے سچ بول دیا۔

"وہ زندہ ہے؟"

کم نے سر ہلایا۔ "میری ملکہ، میں شرمندہ ہوں میں اسے نہیں مار سکی۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔"

"میری ملکہ میں ایک سوال کر سکتی ہوں؟"

ماشی زو جانتی تھی جو لڑکی اس کی آغوش میں دم توڑ رہی تھی اس کے سارے خاندان کی قاتل وہ تھی اور پھر اس نے بہت خلوص سے اس لڑکی کی پرورش کی تھی، وہ اس سے محبت کرتی تھی اور آج یہ محبت ملکہ کی پتھر آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا تو کم نے کہا۔

"آپ نے کبھی کسی سے محبت کی؟"

"ہاں میری بچی!" ملکہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ "اور میں نے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کی۔۔۔ تمہاری طرح۔۔۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے محبوب کی خاطر جان دیدی اور میں نے اقتدار تک پہنچنے کے لیے محبوب کی جان لے لی۔"

"میری ملکہ ایک التجا ہے۔۔۔"

ماشی زو سمجھ گئی۔ "تم فکر مت کرو میری بچی، لی کوائے اب میری ذمے داری ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

یہ سن کر کم نے سکون سے جان دیدی تھی۔

☆☆☆

بدھا کے مجسمے کی آنکھ میں کائی منک کھڑا ہوا ملکہ ماشی زو کے محل کی طرف دیکھ رہا تھا جو مجسمے سے بہت نیچے کسی کھلونے جیسا لگ رہا تھا۔ کائی منک کے چہرے پر اس وقت نرم اور دبے ہوئے تاثرات نہیں تھے، وہ بڑی خشمگیں نظروں سے محل کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک اسے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لی کوائے سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے اوپر آنے کے لیے لفٹ استعمال نہیں کی تھی۔ کائی منک اس کے تاثرات دیکھتے ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ "میرے دوست، تم اچانک۔۔۔"

"ہاں مجھے اچانک آنا پڑا۔" لی کوائے نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ کائی کی طرف بڑھا تو وہ اس سے دور ہونے لگا۔ "میں نے جان لیا ہے کہ فینگ من کو کس طرح زہر دیا گیا۔ یہ زہر اسے اس پانی میں دیا گیا تھا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اور زہر دینے والے تم تھے۔" لی کوائے نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

"یہ بھی درست ہے۔" کائی منک بدستور اس سے دور ہٹتے ہوئے بولا اور لی کوائے نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔

"ہم زہر کے چکر میں پڑ گئے اور اس کی کھوج کے لیے مارے مارے پھرتے رہے حالانکہ اصل کام تو یہاں ہو رہا ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو؟"

"میرا خیال ہے تم نے مجسمے کی تعمیر میں کوئی نقص چھوڑا ہے ایسا نقص کہ یہ ایک مخصوص وقت پر اچانک گر جائے اور کہاں گرے گا۔۔۔؟ عین شاہی محل پر، یہاں سے شاہی محل کا فاصلہ اتنا ہے کہ مجسمہ پورے محل کو تباہ کر سکتا ہے۔"

"کس موقعے پر گرے گا؟" کائی منک نے سرد لہجے

میں پوچھا۔

"ظاہر ہے...... جب ملکہ ماشی زو کی تاجپوشی کی سالگرہ منائی جارہی ہوگی۔"

"تم نے ٹھیک اندازہ لگایا لیکن اب میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتا۔ مجھے خطرہ تھا کہ تم بالآخر حقیقت تک پہنچ جاؤ گے اس لیے میں نے یہ کام جلد نمٹانے کا فیصلہ کیا ہے ذرا نیچے دیکھو۔"

لی کوائے نے نیچے جھانکا تو اسے فولاد پگھلانے والی بھٹی سے نالی میں پگھلا فولاد بہتا ہوا، مجسمے کے وسطی ستون کی بنیاد کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اچانک اسے حرکت کا احساس ہوا، کائی منک بھاگتا ہوا لفٹ میں گھس گیا تھا اور اب لفٹ نیچے جارہی تھی۔ لی کوائے نے آس پاس دیکھا، مشرقی زیر تعمیر ستون کو سہارا دینے کے لیے بانس کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ شانے کے زخم کی پروا کیے بغیر اس جال کی مدد سے نیچے اترنے لگا۔ کائی منک نیچے جاتے ہوئے تلوار کی مدد سے بانسوں کے جال کو سہارا دینے والی رسّیاں کاٹ رہا تھا۔ بانس ہلنے لگے تھے۔ لی کوائے ہر ممکن تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ کائی منک نے چلّا کر کہا۔

"تم اسے روک نہیں سکتے۔"

خود لی کوائے بھی محسوس کررہا تھا کہ وہ مجسمے کے انہدام کو نہیں روک سکتا۔ اچانک اوپر سے بے سہارا ہوجانے والے بانس گرے اور وہ ان کے جال میں پھنس گیا، کائی منک نے قہقہہ مارا۔ "میرے دوست، تمہاری موت یہاں ہوگی۔"

"مجھ پر قاتلانہ حملے تم نے کروائے تھے؟"

"ہاں۔" کائی منک جنونی انداز میں بولا۔ "ماشی زو نے مجھے یہ دیا۔" اس نے کٹے ہاتھ کا ہک اٹھا کر دکھایا۔ "جواب میں، میں نے اسے اس کے محل میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو میرے راستے میں آیا وہ بھی میرا دشمن تھا اس لیے میں نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔"

لی کوائے نے اس جال سے نکلنے کا راستہ تلاش کرلیا۔ عارضی لفٹ جو ستون کی بلندی پر پگھلا فولاد لاتی تھی، کچھ نیچے تھی۔ لی کوائے نے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ اب بھی فرش سے کوئی سترفٹ کی بلندی پر تھا، اس نے کائی منک سے کہا۔ "میں مجسمے کو گرنے سے نہیں بچا سکتا لیکن یہ وہاں نہیں گرے گا جہاں تم اسے گرانا چاہتے ہو۔" اس نے کہتے ہوئے وہ رسے کاٹنا شروع کردیے جن سے لفٹ لٹکی ہوئی تھی۔ دوسرا رسا کٹتے ہی لفٹ بے قابو ہوکر ترچھی فرش کی طرف بڑھی اور جیسے ہی فرش قریب آیا، لی کوائے چھلانگ لگا کر لفٹ سے الگ ہوگیا، لفٹ نے لوہے کی اس نالی کو ٹکر ماری جس میں پگھلا ہوا فولاد بہہ کر وسطی ستون کی بنیاد میں جا رہا تھا۔ مغربی ستون ناقص تھا اور مشرقی ستون مکمل نہیں ہوا تھا ایسے میں مجسمہ وسطی ستون پر کھڑا تھا اس کی بنیاد پگھل جاتی تو مجسمہ گر جاتا۔ نالی ٹوٹ جانے سے پگھلا فولاد فرش پر بہنے لگا۔ کائی منک کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ لفٹ سے نکل کر لی کوائے کی طرف جھپٹا۔ اس نے لباس سے ایک خنجر نکال لیا تھا اور اسے دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ کائی منک لڑائی میں تیز نہیں تھا، وہ تعلیم میں تیز تھا لیکن اس نے اپنی تعلیم کو منفی مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ لی کوائے نے سکون سے اس کے وار روکتے ہوئے اس سے کہا۔ "تم نے کبھی سوچا ایک عورت سے انتقام لینے کے لیے تم نے کتنے عام لوگوں کی جان لی اور وہ عورت مرجاتی ہے تب بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، اس کی جگہ ایسا ہی کوئی دوسرا بادشاہ آجائے گا اور وہ بھی سچ بولنے والوں کو جیل میں ڈالے گا یا ان کے ہاتھ کاٹ دے گا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" کائی منک نے چلا کر کہا۔ "مجھے ماشی زو سے انتقام لینا ہے۔"

اس نے اچانک ہی پاس لٹکی ہوئی کچھ رسیاں کھینچ لیں اور اوپر سے پانی برسنے لگا۔ یہ انتظام حادثاتی طور پر لگنے والی آگ بجھانے کے لیے تھا۔ اچانک پانی کے ساتھ کوئی چیز لی کوائے کی گردن سے ٹکرائی اور وہیں چپک گئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ مار کر دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک آتشیں کیچوا تھا۔ اس نے اسے دور پھینک دیا۔ پانی کائی منک پر بھی گرا تھا لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لی کوائے نے جلد خود پر قابو پالیا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ اب سورج کی روشنی میں جانا موت ہوگا۔

"کائی، تم کیا سمجھتے ہو تم کامیاب ہوجاؤ گے... نہیں، کل کوئی دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھے گا۔"

کائی مسکرایا۔ "کوئی بادشاہ نہیں بیٹھے گا... جلد پڑوسی ریاست کی بیس ہزار فوج یہاں حملہ کرے گی۔ اس کے بعد ریاست کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔"

لی کوائے کے لیے یہ انکشاف فکر انگیز تھا۔ "لیکن کیوں... یہ وطن تمہارا ہے؟"

"وطن اور ماشی زو۔" کائی منک نے نفرت سے کہا اور کٹا بازو اٹھا کر دکھایا۔ "ان دونوں نے مجھے یہ دیا ہے۔"

لی کوائے نے محسوس کیا کہ کائی منک ہوش و حواس کی حد سے گزر چکا تھا۔ اس سے بحث فضول تھی، اسے ماشی زو کو خبردار کرنا تھا۔ وہ مجسمے کے دروازے تک آیا تھا کہ اوپر سے عجیب سی گڑگڑاتی آواز آئی۔ اس نے دیکھا چیزیں گر رہی تھیں، مجسمے کی بنیاد کمزور پڑنے سے اس کا ڈھانچا تباہ ہورہا تھا۔ مجسمے کے باہر ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ سورج کی روشنی اوپری مجسمے تک پہنچ گئی تھی لیکن ابھی نیچے میدان میں سایا تھا۔ وہ گھوڑا لے کر شاہی محل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک گھڑسوار کو یوں آتے دیکھ کر محل کے محافظ چوکنا ہوگئے تھے۔ مجسمے کی طرف سے گڑگڑاہٹ سنائی دی تو لی کوائے نے پلٹ کر دیکھا۔ مجسمہ آگے جھک رہا تھا۔ لی کوائے نے چلا کر محافظوں سے کہا۔ "ملکہ کو محل سے نکالو مجسمہ گر رہا ہے۔ وہ محل پر گرے گا۔"

شروع میں تو محافظ اس کی بات نہیں سمجھے لیکن پھر گڑگڑاہٹ کی آواز نے انہیں متوجہ کیا اور انہیں گرتا مجسمہ نظر آگیا اس کے بعد وہ لی کوائے کو بھول کر افراتفری میں محل کی طرف بھاگے۔ ماشی زو ٹیرس میں موجود تھی، اس نے کم کو اندر بھجوا دیا تھا اور خود اس کا سوگ منا رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ کی آواز اور پھر محافظوں کے شور نے اسے متوجہ کیا۔ بدھا کا مجسمہ گر رہا تھا اور اس کے اوپری حصے کا رخ محل کی طرف تھا۔ وہ اتنی محو ہوئی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب لی کوائے اس تک پہنچ گیا۔ اس وقت مجسمے کا سر الگ ہوکر ٹھیک محل کی طرف آرہا تھا۔ پھر وہ راستے میں ہی دو ٹکڑے ہو گیا۔ چہرے کا خول الگ ہوگیا تھا اور کھوپڑی والا حصہ الگ گر رہا تھا۔ لی کوائے نے اندازہ لگایا کہ کھوپڑی والا حصہ کہاں گرے گا۔ اس کے نیچے خلا تھا اور صرف اسی خلا کے اندر آنے والی چیز بچ سکتی تھی۔ وہ ماشی زو کو کھینچ کر اس طرف لے گیا اور اگلے ہی لمحے ایک خوفناک آواز کے ساتھ مجسمے نے محل کو تباہ کردیا۔ گرد و غبار کا ایک طوفان اُٹھا گرد کی وجہ سے سانس لینا بھی محال لگ رہا تھا۔ لی کوائے نے ماشی زو کو اپنے جسم کی اوٹ میں چھپا لیا تھا اور ملبا اس کے اوپر گرا تھا مگر اسے نقصان نہیں ہوا تھا، یہ سب لکڑی اور دھول مٹی تھی۔ کچھ دیر بعد جب شور اور گرد کا طوفان تھم گیا تو لی کوائے نے اپنے اوپر سے چیزیں ہٹائیں اور ماشی زو کو دیکھا۔

"ملکہ، آپ ٹھیک ہیں؟"

ماشی زو اس افتاد کو بھول گئی تھی۔ "تم نے مجھے ملکہ کہا ہے؟"

"ہاں میری ملکہ۔" لی کوائے گھٹنے کے بل بیٹھ گیا۔ "اب آپ میری ملکہ ہیں کیونکہ آپ اس ملک کی ملکہ ہیں۔ پڑوسی ریاست کی بیس ہزار فوج ہم پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوچکی ہوگی۔"

یہ سنتے ہی ماشی زو کے اندر کا حکمران بیدار ہوگیا۔ اس نے بدھا کے مجسمے اور محل کی تباہی نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سپہ سالار اور فوج کے کمانڈر جنرل آئی زیگ کو طلب کیا اور فوری دفاعی اقدامات کرنے کا حکم دیا۔ اس دوران میں لی کوائے ملبے سے ایک ایسی چادر تلاش کرچکا تھا جس میں وہ خود کو پوری طرح چھپا سکتا تھا۔ ماشی زو جنرل آئی زیگ سے بات کرکے اس کے پاس واپس آئی تھی۔ اس دوران میں فوج کے ایک دستے نے محل کے کمپاؤنڈ کو گھیر کر امدادی کارروائیاں شروع کردی گئی تھیں۔

"تم کہاں جارہے ہو؟"

"جہاں میں زندہ رہ سکوں گا میری ملکہ۔" لی کوائے نے جواب دیا۔ "کیونکہ میرے جسم میں بھی وہ زہر آچکا ہے جو سورج کی روشنی پڑتے ہی مجھے جلا ڈالے گا۔"

ماشی زو کے لیے یہ ایک اندوہناک خبر تھی، اس نے لی کوائے کو کم کی موت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ اس نے لی کوائے کے لیے زندگی طلب کی تھی۔ "تم نے مجھے بچا کر احسان کیا لیکن اگر تم ایسا نہ بھی کرتے تب بھی میں کم سے وعدہ کرچکی تھی۔ وہ تم سے..."

لی کوائے نے رخ پھیر لیا۔ "میں جانتا ہوں میری ملکہ۔"

ماشی زو کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ "تو اب تم چلے جاؤ گے؟"

"ہاں میری ملکہ... تمام سازشی مارے جاچکے ہیں، ان کا سرغنہ کائی منک تھا، وہ آپ سے اپنی سزا کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ دومنگ اس کا آلۂ کار تھا لیکن غدار نہیں تھا، اس لیے اسے بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔ فینگ من جان جاتا کہ مجسمے کا مغربی ستون کمزور ہے، اس لیے اسے پہلے نشانہ بنایا گیا۔ مجھے کورے ماؤ کا افسوس ہے اس نے نہایت بہادری سے جان دی اور مجھے سازشیوں کے بارے میں اشارہ دے گیا۔"

"اس کے گھر والوں کو اس کی خدمت کا شایان شان صلہ دیا جائے گا۔"

"میری ملکہ!" لی کوائے گھٹنوں کے بل جھکا۔ "مجھے افسوس ہے اب میں اپنے وطن اور عظیم ملکہ کی مزید کوئی خدمت کرنے سے قاصر ہوں۔"

"تم پہلے ہی جو کرچکے ہو وہ کافی سے زیادہ ہے۔" ماشی زو نے کہا۔

کچھ دیر بعد لی کوائے گھوڑے پر سوار تاریک بازار کی طرف جارہا تھا۔ صرف وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ سورج کی روشنی سے بچ کر رہ سکتا تھا۔



کشکول

انوار صدیقی

اٹھارھویں قسط

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیرِ اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور

ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈرورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی ''بلیک ٹائیگر'' تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈرورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ''بلیک ٹائیگر'' کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور نگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ

لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے۔ لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر تو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈرورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائشی گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے بچارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کو آمادگی پر منتج ہوگی۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواستگار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویز دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگزیب ادا کر رہا تھا جبکہ بعض معاملات میں سراج بھی لاعلم تھا، ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مختلف الجھنوں کا شکار تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شیخ حامد کا ذہن ان سوالوں کو حل کرنے میں الجھتا رہا پھر اس نے اچانک کچھ سوچ کر ایک عرصے بعد ڈی ایس پی لودھی کے نمبر ڈائل کیے، دوسری جانب سے کال فوراً ہی اٹینڈ کی گئی۔

''تابعدار اب بھی آپ کا خادم ہے جناب۔ اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''میں نے سنا ہے کہ دوبارہ تعیناتی کے بعد تمہیں سزا کے طور پر دور دراز علاقے کی ایک ویران ساحلی چوکی پر تعینات کیا گیا ہے جہاں تم مچھیروں کے رحم و کرم پر ہو؟''

''آپ کی اطلاع غلط نہیں ہے لیکن...... میرے ساتھ جو بھی ہوا وہ آپ سے وفاداری نبھانے کا انعام ہی ہے۔'' اس بار قدرے معنی خیز انداز میں جواب ملا۔

''کیا باور کرانا چاہتے ہو؟'' شیخ حامد نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔

''سوری سر...... میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' لجاجت سے کہا گیا۔ ''میں کل بھی آپ کا پروردہ تھا، آج بھی آپ کی نظرِ کرم کا محتاج ہوں۔''

''میری بات غور سے سنو...... فوری طور پر براہ راست ڈی آئی جی سے رابطہ کر کے کسی ذاتی ضرورت کے تحت دو ماہ کی رخصت کی درخواست کرو۔ میں ابھی آغا منظور سے بات کر لوں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے زیادہ بھونکنے والے کتے پسند نہیں ہیں۔''

⁂

لیاقت حسین نے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ سیٹھ عثمان کا بلاوا آگیا۔ ایک منٹ بعد وہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''تمہیں اب دفتر کے کام میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آرہی؟''

''جب آپ مہربان ہیں تو پھر پریشانی کیسی......؟'' لیاقت حسین نے انکساری سے جواب دیا۔ ''کام زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔''

''آج تمہارے والد کا فون آیا تھا۔ کاروباری باتوں کے علاوہ میں نے ان سے یہاں آنے کی بھی درخواست کی تھی۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ سردار سرفراز خان نے اس بار میری دعوت قبول کر لی ہے۔ دو ہفتے بعد آنے کا پکا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ تمہاری والدہ بھی ساتھ ہوں گی۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے......''

''تمہارے لیے ایک اہم اطلاع اور بھی ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہیں بلایا ہے۔'' سیٹھ عثمان نے بات جاری رکھی۔ ''ابھی سراج کا فون آیا تھا۔ اسے کسی وجہ سے

تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔''

''آپ کا جو حکم ہو.....''

''تم جانتے ہو کہ سراج سے ہمارے کتنے قریبی اور گھریلو تعلقات ہیں لیکن اس بار سراج نے تمہارے لیے جو ہدایت دی ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آسکیں۔''

لیاقت حسین جواب دینے کے بجائے سیٹھ عثمان کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

''تمہیں آج رات دو بجے کے بعد سینٹرل ٹیلی گراف آفس کے سامنے پہنچنا ہے، وہاں سے تمہیں کوئی شخص سراج کے حوالے سے پک کرلے گا لیکن..... تمہیں کس کام کے لیے اور کتنے دنوں کے لیے جانا ہے اس کی وضاحت نہیں کی۔''

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے.....؟'' لیاقت حسین نے کسمسا کر کہا۔ ''سراج صاحب کے مجھ پر بھی بہت سارے احسانات ہیں، میں ان کے کسی کام آسکا تو یہ بھی بڑی خوش قسمتی کی بات ہوگی۔''

''ایک اہم بات اور بھی ہے..... تم اس کا کوئی ذکر فرحین سے بھی نہیں کرو گے۔''

''اوہ.....'' لیاقت حسین نے کچھ توقف سے کہا۔ ''میں اچانک اسے بغیر بتائے چلا گیا تو وہ.....''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' راحیلہ اس کا ہر طرح خیال رکھے گی اور میں..... یہ بہانہ بنادوں گا کہ میں نے تمہیں کسی فوری ضرورت کے تحت کسی اہم کام کے لیے بھیجا ہے..... اور یہ بھی کہ تمہاری واپسی میں دو چار دن بھی لگ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... یہ مناسب رہے گا۔'' لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے آفس میں آگیا۔ اس کا ذہن بھی سراج کے پیغام کی اہمیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی سراج نے فون پر ہونے والی گفتگو کے دوران کہا تھا کہ ہوسکتا ہے اسے اورنگ زیب کو اس کی ضرورت پیش آئے۔ وہ ضرورت کیا تھی کہ جس کے پیش نظر اس قدر احتیاط اور رازداری کے ساتھ اسے براہ راست نہیں بلکہ سیٹھ عثمان کے ذریعے رات کو دو بجے اور فرحین کو مطلع کیے بغیر ایک مخصوص مقام بلایا جارہا تھا؟

رستم علی آغا خانی اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا، اسٹینو کو ایک اہم کاروباری ڈرافٹ لکھوا رہا تھا جب انٹرکام کے بزر نے اس کی توجہ اپنی سمت مبذول کرلی۔

''یس.....'' اس نے ریسیور اٹھا کر ناگواری کا اظہار کیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اس وقت مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔''

''سوری سر..... لیکن ایس پی مسٹر اورنگ زیب میرے آفس میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے فوری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

رستم علی آغا خانی کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا پھر اس نے ریسپشنسٹ کو ہدایت کی کہ ایس پی کو دو منٹ بعد اندر بھیج دیا جائے۔ انٹرکام کا ریسیور رکھ کر اس نے اسٹینو کو جانے کی ہدایت کی پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اورنگ زیب کی آمد کے مقصد کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ایک سیدھا سادا اور صلح پسند کاروباری ہونے کی وجہ سے وہ پولیس سے زیادہ میل ملاپ پسند نہیں کرتا تھا لیکن اورنگ زیب نے اسے پچھلی دو ملاقاتوں میں بے حد متاثر کیا تھا اس لیے دو منٹ بعد اورنگ زیب جیسے ہی آفس میں داخل ہوا اس نے بڑی خندہ پیشانی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرنے سے گریز بھی نہیں کیا۔

''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' اورنگ زیب نے بیٹھتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس وقت دراصل مسٹر دارا سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ چونکہ موجود نہیں تھے اس لیے.....''

''کیسے ہم غریبوں کا خیال آگیا۔'' رستم علی آغا خانی نے بے تکلفی سے کہا۔ ''اچھا ہوا جو دارا نہیں تھا ورنہ شاید آپ مجھ سے ملے بغیر ہی چلے جاتے۔''

''میں آپ کے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔''

''خیریت تو ہے.....؟'' اس بار وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب کے جواب نے اسے کچھ الجھا دیا تھا۔

''دراصل میں دارا سے براہ راست اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ جو کام درپیش ہے اس میں آپ کو انوالو کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔''

''ایسی کیا بات ہوسکتی ہے؟'' رستم علی کی پریشانی اس کے لہجے سے عیاں ہونے لگی۔

''میں اس بات کا قائل ہوں کہ لوہے پر اسی وقت ضرب لگائی جائے جب وہ پوری طرح گرم ہو۔'' اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ''اب وہ وقت آگیا ہے اس لیے..... میں چاہتا ہوں کہ جس وجہ سے آپ نے اپنی ملازمہ گلابو کو خاموشی سے علاج کے لیے اسپتال میں داخل کرایا تھا۔ اب اس کی باقاعدہ شکایت قریبی تھانے میں درج کرادی جائے۔''

''اوہ.....'' رستم علی کے چہرے پر تشویش کے اثرات گہرے ہونے لگے۔ اس نے کچھ توقف سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ کے اس مشورے میں بھی ہماری کوئی بھلائی ہوگی لیکن ایک تو اس بات کو کچھ وقت گزر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں پولیس کے چکروں میں.....''

''ون منٹ مسٹر رستم علی۔'' اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''میں آپ کے دونوں سوال کا حل پیش کیے دیتا ہوں..... پہلی واردات کو آپ نے اپنے بزنس پوائنٹ آف ویو اور کاروباری ساکھ کو برقرار رکھنے کی خاطر درگزر سے کام لیا تھا لیکن اب کسی نامعلوم شخص نے اسی پچھلے حوالے سے دوبارہ بذریعہ فون کال ایک بڑی رقم فراہم کرنے کو کہا ہے۔ انکار کی صورت میں وہ آپ کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ رہا پولیس کا چکر..... تو میں آپ کو پہلے بھی اپنے تعاون کا پورا یقین دلا چکا ہوں۔ آپ مطمئن رہیں، آپ صرف ملحقہ تھانے میں اپنی خفیہ تحریری شکایت کسی طرح پہنچا دیں۔ تھانے کا کوئی آدمی اس سلسلے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وہ تھانہ بھی میرے ہی دائرہ اختیار میں ہے۔''

''آپ نے اس سلسلے میں دارا کا انتخاب کیوں کیا تھا؟''

''اس لیے کہ وہ نوجوان ہے اور حالات کو فیس کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر موجود ہے جبکہ آپ بہت زیادہ احتیاط اور دوراندیشی کے پیش نظر کچھ اہم ترین مسئلوں کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دینے کو بہتر خیال کرتے ہیں۔''

رستم علی نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی آنکھوں کی بدلتی رنگت اس بات کی غمازی کررہی تھی کہ اب وہ ''گڑے مردے اکھاڑنے'' کے حق میں نہیں تھا۔ کچھ دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھتا رہا پھر دبی زبان میں بولا۔ ''آپ کو اندازہ ہوچکا ہے کہ پچھلی پریشانی کا ذمے دار کون تھا۔ تھانے میں رپورٹ درج کرانے کی بات اگر اس کے علم میں آگئی تو..... تو..... آپ بھی جانتے ہیں کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اس کا دوسرا وار ہمارے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''کسی واردات کے سلسلے میں مجرم کے بارے میں صرف قیاس آرائی کافی نہیں ہوتی۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر دنیا کی کوئی عدالت کسی مجرم کو سزا سنانے کی حماقت بھی نہیں کرتی۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں مسٹر اورنگ زیب..... مجھے آپ پر ہر طرح سے پورا پورا اعتماد بھی ہے مگر دریا میں رہ کر مگر مچھ.....''

''او کے.....'' اورنگ زیب ایک سرد آہ بھر کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر آپ اس معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتے تو میرے پاس ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کے نام سے ٹائپ شدہ ایک فرضی شکایت بھی درج ہوسکتی ہے جس پر کوئی دستخط نہیں ہوں گے۔ ایسے معاملات میں پولیس بھی بلاوجہ ملوث ہونا پسند نہیں کرتی۔ بغیر کسی حوالے اور دستخط کے جو شکایتیں موصول ہوتی ہیں انہیں زیادہ تر تلف کردیا جاتا ہے، لیکن پولیس مناسب سمجھے تو خفیہ طور پر چھان بین بھی کرسکتی ہے۔'' اورنگ زیب نے ایک لمحہ رک کر رستم علی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ شاید میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے؟''

''جی ہاں لیکن..... میں اب بھی یہی درخواست کروں گا کہ اگر آپ.....''

''سوری مسٹر رستم علی۔'' اورنگ زیب نے پولیس والوں والا انداز اختیار کیا۔ ''میں ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہوں جو یہ بات آپ سے بہتر جانتا ہے کہ کس وقت کیا اقدام اٹھانے ضروری ہوتے ہیں۔ میں اب آپ سے اجازت.....''

''پلیز مسٹر اورنگ زیب.....'' رستم علی بڑے کرب کے عالم سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ ناراض نہ ہوں..... اگر آ..... آپ کسی خاص مصلحت کی بنا پر ایسا چاہتے ہیں تو میں انکار بھی نہیں کروں گا۔ آپ جو چاہتے ہیں، میں ویسا ہی کرنے پر تیار ہوں لیکن ایک درخواست کروں گا۔ دارا کو درمیان سے نکال دیں، وہ جوان بھی ہے اور جذباتی بھی..... میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی الجھن میں پڑے۔''

''او۔ کے، ایز یو وش۔'' اورنگ زیب دوبارہ بیٹھ گیا۔

''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟''

''ایک گلاس ٹھنڈا پانی اور اس کے بعد میں جس انداز میں یہاں سے واپس جاؤں گا اس کو آپ کے عملے کے افراد بھی ضرور محسوس کریں گے۔''

''ج..... جی!'' رستم علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اب مجھ سے کیا غلطی ہوگئی جو آپ.....''

''پریشان نہ ہوں۔'' اورنگ زیب نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''آپ کو میری درخواست پر ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔''

''وہ..... وہ..... کیا؟''

''میرے یہاں سے جاتے ہی آپ ڈی آئی جی مسٹر آغا منظور سے فون کرکے یہ شکایت کریں گے کہ میں بار بار آپ کو فون کرکے پریشان کرتا رہتا ہوں اور آج آپ کے

دفتر بھی پہنچ گیا۔"

"میں سمجھا نہیں؟...... آپ تو ایک آدھ بار پہلے بھی آ چکے ہیں...... اس کے علاوہ، میری شکایت کا مقصد بھی ضرور دریافت کیا جائے گا۔ میں اس سلسلے میں کیا کہوں گا؟"

"پولیس جب کسی بڑے مالدار آدمی کو پریشان کرتی ہے تو اس کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔" اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ماہانہ جبری الاؤنس۔"

"لیکن اس میں آپ کی......"

"قبل از وقت آپ مصلحت جاننے کی کوشش نہ کریں...... صرف یہ اعتماد رکھیں کہ میں ایک پولیس آفیسر ہونے کے علاوہ آپ کا ہمدرد بھی ہوں اور...... دوست بھی۔"

ملازم پانی لے کر آ گیا تو اورنگ زیب نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کیا پھر تیزی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر باہر نکلتے وقت غصے اور جھلاہٹ کے تاثرات نمایاں تھے جسے دفتری عملے نے بھی محسوس کیا تھا۔

آفس کی عمارت سے باہر آنے کے بعد اس نے سڑک کے دوسری جانب پارک ایک ایسی کار کا دروازہ کھولا جس کے شیشوں پر گہرے سیاہ رنگ کے باریک مخصوص پیپر لگے ہوئے تھے۔ سامنے کے گلاس بھی ایسی ہی ساخت کے تھے جس سے باہر دیکھا جا سکتا تھا لیکن باہر سے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اورنگ زیب نے گاڑی میں بیٹھتے ہی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ سراج پہلے سے اندر موجود تھا۔

"کیا اطلاع ہے؟" اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے سراج سے دریافت کیا۔

"مجھے ایک بیج کلر کی کار پر شبہ ہے جو دو بار چکر لگا چکی ہے۔" سراج نے مشتبہ کار کے نمبر بتاتے ہوئے جواب دیا۔

"فکر مت کرو...... وہ اپنے ہی آدمی تھے۔"

سراج نے اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ "میں بہر صورت آپ کے ساتھ ہوں لیکن ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا۔"

"کہو......"

"آپ جس انداز میں شیر کی کچھار میں گھس کر اس کا شکار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"اچھے برے نتائج کا امکان ہر کام میں ہوتا ہے۔ رہا شیر کا معاملہ تو میں مچان پر بیٹھ کر گولی داغ دینا، بڑے لوگوں کی عیاشی تو کہہ سکتا ہوں لیکن...... بہادری نہیں! دوسری بات یہ ہے کہ تم تنہا نہیں ہو، تم بھی میرے ساتھ ہو۔"

جواب میں سراج نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور اورنگ زیب بتدریج کار کی رفتار بڑھانے لگا۔

شبنم دوپہر کے کھانے میں مصروف تھی جب نگرانی کرنے والا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ پستہ قد، دہرے بدن کا مالک تھا۔ چہرے پر بائیں جانب کنپٹی کے قریب ایک پرانا مگر خاصا گہرے زخم کا نشان موجود تھا، غالباً گولی لگنے کا نشان تھا۔ صورت شکل سے پرانا پاپی ہی نظر آتا تھا۔ شبنم جانتی تھی کہ خفیہ ٹھکانوں پر پہرا دینے والے گارڈ ایک محدود حد سے تجاوز کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے مگر اس وقت وہ جس گھٹیا انداز میں شبنم کے عین سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا وہ اسے پسند نہیں آیا، اس کے گھورنے کا انداز بھی حد درجہ ناقابل برداشت تھا۔

"کیا بات ہے؟" شبنم نے کھانے سے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"کھانا جلدی ختم کر لو میڈم...... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" روکھے لہجے میں جواب دیا گیا مگر اس کی نظریں برابر شبنم کے جسمانی خطوط کا ناپ تول کرنے میں مصروف تھیں، تیور بھی کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے تھے۔

"کہاں جانا ہے؟"

"اسلم صاحب کے خفیہ ٹھکانے پر......" گارڈ نے کہا۔ "ابھی بڑے باس کا حکم ملا ہے۔"

"اسلم ڈنگا کیا خود یہاں نہیں آ سکتا تھا؟"

"میں سوائے بگ باس کے کسی کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں لیکن...... تمہاری بات اور ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ "شاید تمہیں خبر نہیں ہے کہ اسلم صاحب ایک مقابلے میں بہادری سے ٹھائیں ٹھوئیں کے دوران زخمی ہو گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے فرار ہو کر اپنے خفیہ ٹھکانے تک پہنچے ہیں۔"

"میں وہاں جا کر کیا......"

"انکار کی گنجائش نہیں ہے میڈم۔" گارڈ نے اس کی بات کاٹی۔ "بگ باس کے حکم پر صرف عمل کیا جاتا ہے۔ زبان ہلانے کی اجازت کسی کو نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم باہر ٹھہرو، میں دو منٹ میں آتی ہوں۔"

گارڈ نے کچھ کہنے کی خاطر منہ کھولا پھر خاموشی سے مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ شبنم نے کھانا چھوڑ دیا، واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا پھر بدن پر ایک چادر ڈال کر باہر آ گئی۔ گارڈ اس کا منتظر تھا اور پوری طرح محتاط بھی۔ اس

نے شبنم کو آگے چلنے کو کہا خود اس کے پیچھے پیچھے رہا۔ چھ سات سیڑھیاں طے کرنے کے بعد وہ اوپری ہال میں آگئے جہاں ایک پرانے قالین اور دو چار کرسیوں کے سوا زیادہ سامان نہیں تھا، وہ کسی غیر آباد علاقے میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ باہر ایک وین موجود تھی جس پر کسی تجارتی ادارے کے اشتہار لکھے ہوئے تھے۔ شبنم کو وین کی پشت میں بٹھانے کے بعد گارڈ نے دروازہ باہر سے لاک کیا پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اپنا آتشیں اسلحہ اس نے اپنے برابر والی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔ آدھے گھنٹے تک تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے کے بعد وین ایک کچی آبادی میں داخل ہوئی جہاں کے راستے کچے ہونے کے علاوہ زیادہ کشادہ بھی نہیں تھے، چھوٹے بڑے اور کچے پکے مکان بھی بغیر کسی پلاننگ کے تعمیر کرلیے گئے تھے۔ یہاں زیادہ تر غریب طبقہ رہتا تھا جو بڑے بڑے مکانوں اور بنگلوں میں دن بھر روزی کمانے کی خاطر محنت و مشقت کرتے تھے اور رات کو گھروں میں آکر پڑ رہتے تھے۔

وین مختلف پر پیچ اور ناہموار گلیوں سے گزر کر ایک ایسے مکان کے دروازے پر رکی جو آبادی کے دوسرے سرے پر خشک ندی کے دہانے پر بنا تھا۔ مکان کے ٹین کے دروازے پر ایک زنگ آلود تالا پڑا تھا۔ پستہ قد گارڈ نے پہلے دروازے کے اوپر سے اندر ہاتھ ڈال کر ایک مختصر بغلی دروازہ کھولا اور پھر اس نے ریوالور پر گرفت جما کر شبنم کو نیچے اتارا۔ شبنم کے پاس اس وقت حکم کی تعمیل کے سوا دوسرا راستہ بھی نہیں تھا لیکن کوئی بات ایسی ضرور تھی کہ اس کا دل کسی نادیدہ خوف سے دھڑک رہا تھا۔

آگے پیچھے اندر داخل ہونے کے بعد گارڈ نے بغلی دروازہ اندر سے بند کیا پھر مختصر کچے صحن کو چار چھ قدموں میں طے کر کے ایک بند دروازے پر دستک دی۔ دستک دینے کا انداز بھی مخصوص تھا۔

"کون ہے؟" اندر سے کھانسی کے ساتھ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"یہ میں ہوں اسلم صاحب، آپ کا نمک خوار عبدالجبار عرف جبرو۔"

اندر سے ایک منٹ بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک بوڑھی عورت تھی جو خاموشی سے باہر آگئی، شبنم اور جبرو نامی گارڈ نے آگے پیچھے اندر قدم رکھا۔ اسلم ڈنکا سامنے ایک تخت پر لیٹا تھا، اس کے بائیں شانے اور سینے پر پٹیاں بندھی تھیں، جبرو کے ساتھ شبنم کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں ایک چمک سی کوندی۔

"تم...... اس بٹیر کو کیوں ساتھ لائے ہو؟" اس نے شبنم پر نظر ڈالتے ہوئے جبرو کو تیز نظروں سے گھورا۔

"بگ باس نے یہی حکم دیا تھا اسلم صاحب۔"

"کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی؟"

"ہاں......" جبرو نے شبنم پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "ریس کے گھوڑے پرانے ہوجائیں یا زیادہ زخمی ہوں تو پھر انہیں گولی ماردی جاتی ہے۔ میڈم کو اسی لیے بھیجا گیا ہے۔ بگ باس کا حکم ہے کہ میڈم تمہیں دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا کر تمہارا مقام حاصل کرسکتی ہیں۔"

جبرو کے اس جملے پر اسلم ڈنکا کے علاوہ خود شبنم بھی چونکی تھی۔

"سچ کہہ رہا ہے تو......؟" اسلم نے جبرو کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"سوری اسلم صاحب۔" جبرو نے شبنم پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر جواب دیا۔ "میڈم اپنا کام پورا کرلیں تو پھر مجھے بھی میڈم کو اناشتفیل کرنے کے بعد ہی تمہاری سیٹ مل جائے گی۔ بگ باس کا مکمل حکم یہی ہے لیکن میں میڈم کو ٹھکانے لگانے سے پیشتر اپنا دل ضرور پشاوری کروں گا۔ تم چاہو تو مرنے سے پہلے تمہیں بھی یہی رعایت دی جاسکتی ہے۔"

شبنم بری طرح حالات کے بھنور میں پھنس گئی تھی۔ اسلم ڈنکا کی نظریں بہ دستور جبرو پر مرکوز تھیں پھر اس نے تھوڑا سا کراہ کر اپنی پوزیشن بدلی۔ ہاتھ تکیے تک لے جانے کی کوشش کی تو جبرو یکلخت غرا کر بولا۔

"نہیں اسلم صاحب...... جلدی میں کوئی حماقت نہ کرنا ورنہ میڈم سے پہلے تم میرے ہی ہاتھوں ضائع ہوجاؤ گے۔" جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ جبرو نے ہاتھ اٹھا کر ریوالور بھی تان لیا۔

شبنم کو سینے کی گہرائیوں میں اپنا سانس گھٹتا محسوس ہوا۔ وہ جس صورت حال سے دوچار تھی، بہ ظاہر اب اس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں نظر آرہی تھی۔ اس نے دل میں ایک مصمم ارادہ کرلیا کہ مرجائے گی لیکن ایک گھٹیا آدمی کے ساتھ زندگی بچانے کا سودا نہیں کرے گی۔

"جبرو......" کمرے کی گھٹن میں اسلم ڈنکا کی ٹھوس آواز گونجی۔ "ایک بات پر اچھی طرح غور کرلے۔ جو ولدالحرام مجھے اور میڈم کو راستے سے ہٹا کر اپنے خلاف کچھ شہادتیں ضائع کرنے کی ٹھان چکا ہے، وہ بعد میں تیرے کانٹے کے کھٹکے کو بھی دور کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

"تم نے ابھی زندگی میں دوستی اور دشمنی کا زیادہ تجربہ نہیں کیا اسلم صاحب۔ میرا نام بھی جبرو ہے...... جبر کرنے کے علاوہ جبر سہنا بھی جانتا ہوں۔"

"کیا مطلب......؟"

"جبرو، کل بھی تمہارا یار تھا اور آج بھی تمہارے اس احسان کو فراموش نہیں کرے گا جو تم نے کبھی مجھے پولیس کی دسترس سے نکال کر کیا تھا۔" جبرو نے اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی ہاتھ میں دبا ہوا آتشیں اسلحہ بھی اسلم کی طرف اچھال دیا۔

شبنم کے علاوہ اسلم ڈنکا بھی حیران رہ گیا پھر اس نے اطمینان کا سانس لے کر شبنم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب ہمارا یہاں رکنا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس خنزیر نے کسی اور کو بھی تمہارے پیچھے لگا دیا ہو مگر......" اس نے کراہ کر اٹھتے ہوئے شبنم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کا کیا کرنا ہے؟"

"مل بانٹ کر پیٹ پوجا کرلو پھر ہمیں زمین میں دبا کر نکل چلیں گے۔"

"اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پپ...... پپ......"

اسلم ڈنکا اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا، سب نے ایک ساتھ ہی دروازے پر ہونے والے دھماکے کو محسوس کیا پھر جو کچھ ہوا اتنی برق رفتاری سے ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ سر سے گردن تک ماسک چڑھائے ہوئے تین افراد بجلی کی سرعت سے اندر داخل ہوئے۔ ایک نے ناپ تول کر فائر کیا تو اسلم ڈنکا کا وہ ہاتھ کسی کٹی ہوئی شاخ کی طرح جھول گیا جس میں اس نے جبرو کا آتشیں اسلحہ پکڑ رکھا تھا، دوسرے نے فضا میں چھلانگ لگا کر جبرو کو دبوچ لیا...... تیسرا لپک کر شبنم کے قریب پہنچ گیا۔

"مم...... میں، ان لوگوں کی س...... سا...... تھی......"

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکی، ماسک والے کا نپا تلا ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا تو وہ بھی بے ہوش ہوکر اسی کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

اسلم ڈنکا پر گولی چلانے والے نے بھی بڑی پھرتی سے اس کی مزاج پرسی کرنے کے بعد کسی قیمتی بوری کی طرح اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا تھا، تینوں آگے پیچھے باہر نکلے اور پر پیچ گلیوں میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ان کے باہر نکلتے ہی آس پاس سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آوازیں بھی گونجنے لگی تھیں۔ گلیوں میں موجود دھڑنگ بچے اور دوسرے افراد بھی گھروں میں گھس کر شور مچانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید پولیس کے اسپیشل اسکواڈ نے پھر کسی مطلوبہ مجرم کی تلاش میں ریڈ کیا ہوگا۔ پہلے بھی کئی بار ایسے ہی ہنگامے ہوچکے تھے۔

شیخ حامد کی ذہنی الجھنیں بڑھتی جارہی تھیں۔ وشنو نے ایک بار فون کر کے اور اپنی کتھا سنا کر پھر چپ سادھ لی تھی البتہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایس پی اورنگ زیب کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ شیخ حامد کو اس کی پچھلی ہسٹری کا بخوبی علم تھا۔ موجودہ حالات میں وہ اس کے لیے سب سے اہم مہرہ تھا لیکن لوچن؟ نہ جانے وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اسے لوچن کے قریب کردیا تھا؟ اس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ شاید اس نے جیل سے فرار کا پلان بھی لوچن ہی کے ساتھ مل کر مرتب کیا تھا۔ ابھی تک پولیس ان دونوں کو دوبارہ گرفتار نہیں کرسکی تھی۔

شیخ حامد کو ان فضول باتوں سے کوئی لگاؤ بھی نہیں تھا، وہ وشنو کی صلاحیتوں کو اپنے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنی بولی بول کر لائن کاٹ دی تھی۔ بہر حال اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید لوچن بھی کسی وجہ سے اپنے دوسرے گروپ سے کٹ گیا ہو۔ نہ بھی علیحدہ ہو تو کم از کم وشنو کے ساتھ مل کر اورنگ زیب کا خطرہ درمیان سے نکال دے، جو کسی کتے کے گلے کی ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گیا۔ اوپر سے اس کے قریبی ہوتے سوتے اگر ہتھیلی نہ لگاتے تو شیخ حامد بھی اس سے نجات حاصل کرنے کی خاطر بے شمار جائز و ناجائز طریقے اختیار کرسکتا تھا لیکن اس وقت وہ بہر حال نصف رات گزر جانے کے باوجود پوری طرح بیدار تھا۔ فی الحال اسے جبرو کے فون کا انتظار تھا۔ اس کی پلاننگ تھی کہ اسلم ڈنکا اور شبنم کی لاشوں کو بھی کسی طرح اورنگ زیب کے کھاتے میں ڈال دے گا۔

شبنم کے اغوا اور اسلم ڈنکا کے پولیس کی نظروں میں آجانے کے بعد حالات شیخ حامد کے لیے کسی وقت خطرے کی گھنٹی بھی ثابت ہوسکتے تھے، وہ ان دونوں ثبوتوں کو ہمیشہ کے لیے دفن کردینا چاہتا تھا، بعد میں کچھ دن جبرو کو تھپکی دینے کے بعد اس کے بارے میں بھی سوچا جاسکتا تھا لیکن...... اس وقت اسے بڑی شدت سے جبرو کی کال کا انتظار تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بتدریج بڑھتی جارہی تھی جب اس کے موبائل پر سگنل ملا، روشن اسکرین پر جبرو کے بجائے نامعلوم ہمدرد کا حوالہ دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی لیکن اس نے جبراً موبائل آن کرلیا۔

''خیریت...... اس وقت تمہیں کیا مشکل پیش آگئی......؟'' وہ خشک لہجے میں بولا۔

''مشکل نہیں مائی ڈیئر بگ شیخ، اس وقت تمہیں ایک خوش خبری سنانے کی خاطر کال کی تھی۔'' پھر معنی خیز انداز میں کہا گیا۔ ''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اتنی رات گئے تمہیں کیا تکلیف لاحق ہے۔''

''خوش خبری کیا ہے؟'' اس نے بات کاٹ کر بہ دستور سرد لہجے میں دریافت کیا۔

''میں نے تم سے جگا کے سلسلے میں دو دن کی مہلت چاہی تھی مگر...... کام ایک دن بعد ہی ہوگیا۔''

''کیا مطلب؟'' شیخ حامد جگا کے حوالے پر چونکا۔

''وہ ملٹری کے شکنجے سے نجات پا کر پولیس کی تحویل میں آگیا ہے۔'' بات جاری رکھی گئی۔ ''استاد کی چھان پھٹک میں فوجیوں نے کسی رعایت کا مظاہرہ نہیں کیا، اس کی گلوخلاصی اس وجہ سے ہوئی کہ ایک بار سزا پوری کرنے کے بعد اس کا اکاؤنٹ بالکل صاف تھا۔ اب شاید پولیس بھی اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے گی۔ ویسے پولیس کے محکمے میں بکاؤ بھیڑوں کی تعداد کچھ کم بھی نہیں ہے۔''

''کیسے یقین کرلوں کہ تم سچ بول رہے ہو؟''

''اپنے زرخرید بل ڈاگ ڈی آئی جی کو فون کھڑکاؤ۔ وہ میری اطلاع کی تصدیق کردے گا۔''

''تم...... تم آخر ہو کیا چیز؟'' شیخ حامد نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''پارس پتھر...... جو کسی چیز سے چھو جائے تو اسے بھی کندن بنادیتا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں لیکن......'' اس نے کچھ توقف سے کینچلی بدل کر دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ''اگر میں اس پارس پتھر کو اپنے پاس رکھوں تو کیا تم آمادہ ہوجاؤ گے؟...... میں ہر قیمت دے سکتا ہوں، یہ بات تم بھی ضرور جانتے ہوگے۔''

''اور تم بھی واقف ہو کہ میں استاد کا کھرا ہمدرد ہوں، اس کے ساتھ غداری کا تصور بھی حرام سمجھتا ہوں۔''

''میں جگا کو بھی اپنے ساتھ ملانے کو تیار ہوں۔ پھر پولیس جگا کی طرف بھول کر بھی آنکھ اٹھانے کی جرأت کبھی نہیں کرے گی۔''

''مجھے یقین ہے بگ شیخ...... لیکن کچھ جنگلی جانور قید و بند میں رہنا پسند نہیں کرتے۔''

''جانتا ہوں، پھر بھی تم جگا کو میری طرف سے آفر دے سکتے ہو۔'' شیخ حامد نے حالات کے پیش نظر اپنی مرضی کے خلاف بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

''دیکھوں گا حالات اور موقع پا کر، وعدہ نہیں کرتا...... ویسے بائی دی وے، تم اس وقت رات گئے تک کیسے جاگ رہے ہو؟'' معنی خیز انداز میں سوال کیا گیا۔ ''کیا کنول کے بعد کوئی نئی چکوری تمہارے جال میں پھنس گئی ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' شیخ حامد نے زبردستی مسکرا کر جواب دیا۔

''میں جو سمجھ رہا ہوں میری جان تم بھی ابھی تک اس سے بے خبر ہو۔'' دوبارہ دوسری جانب سے بڑی پراسرار سنجیدگی سے جواب ملا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ نیند خراب کرنے کے بجائے آرام سے سینے پر صبر کا پتھر رکھ کر سو جاؤ۔ جاگتے رہے تو تمہارا سکون مزید تباہ ہوجائے گا۔''

''اب کیا کوئی نئی خبر سنانا پسند کرو گے؟'' شیخ حامد کے لہجے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

''میں اس وقت تمہیں صرف پہلا مصرع سنا سکتا ہوں۔ دوسرے مصرعے کی جستجو میں کچھ وقت لگے گا۔''

''مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''ترنم میں نہ سہی...... تحت اللفظ میں سن لو۔ عرض کیا ہے کہ تم جس کا انتظار کررہے ہو، اب وہ خود بھی اپنے اختیار میں نہیں ہے۔'' بات جاری رکھی گئی۔ ''تمہارے ٹوٹے پھوٹے آدمی اور جبرو کے علاوہ اس خوب صورت چڑیا کو بھی اٹھالیا گیا ہے جو ابھی تک شاید تمہارے بازوؤں کے حلقے میں نہیں پھڑ پھڑا سکی۔''

''کون لوگ تھے وہ......؟'' شیخ حامد اس اطلاع پر بوکھلا گیا۔

''ابھی دوسرا مصرع ادھورا ہے مائی ڈیئر...... جیسے ہی مکمل ہوا تمہیں بھی ضرور سنادوں گا۔ بائی۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کردیا گیا۔ شیخ حامد نے جھلا کر محفوظ نمبروں کو دوبارہ آزمایا جسے دوسری جانب سے پاورڈ آف کیا جاچکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اندر ہی اندر بل کھاتا رہا پھر اس نے ڈی آئی جی کے نمبر ڈائل کیے۔

''ہیلو......'' چوتھی گھنٹی پر نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔

''شیخ حامد بول رہا ہوں۔ ایک اہم خبر کی تصدیق کرنی ہے۔ کیا جگا اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے؟''

''آپ کو کیسے علم ہوا......؟'' حیرت سے دریافت کیا گیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری اطلاع غلط نہیں ہے۔''

''جی ہاں۔ اور میں آپ کے پرائیویٹ نیٹ ورک

کی تعریف بھی کروں گا جو آپ کو دوسروں کے مقابلے میں پہلے پولیس کی اندرونی باتوں سے باخبر کردیتا ہے۔''

''اس کے علاوہ اور کوئی خبر بھی ہے تمہارے پاس؟'' شیخ حامد نے اسے جبرو اور اسلم ڈنکا کے سلسلے میں ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''جی نہیں، لیکن آپ کے پاس دوسری کیا خبر ہے؟'' تجسس سے سوال کیا گیا۔

شیخ حامد نے ایک لمحے کو سوچا کہ جبرو اور اسلم ڈنکا کی خبر سے بھی اسے آگاہ کردے لیکن اسے اس کا موقع نہیں ملا۔ باہر سے اچانک کئی رائفلوں سے ایک ساتھ برسٹ مارا گیا۔ نتیجتاً برابر والے سٹنگ روم کے کئی شیشے ایک ساتھ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی، شیخ حامد نے پلک جھپکتے میں لائٹ آف کی۔ فرش پر لیٹ کر حالات کا جائزہ لینے لگا، موبائل بہ دستور آن تھا۔

''ہیلو...... ہیلو...... شیخ صاحب، یہ آوازیں کیسی تھیں؟'' موبائل پر ڈی آئی جی کی آواز بہت دور سے ابھرتی سنائی دی۔ شیخ حامد نے اسے منہ کے قریب لاتے ہوئے غرا کر کہا۔ ''کچھ حرامیوں نے کوٹھی پر حملہ کردیا ہے۔ فوراً پہنچنے کی کوشش کرو۔'' اس نے نادر شاہی حکم دے کر موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ رینگتا ہوا بیڈ روم کی مخصوص الماری تک پہنچ کر اس نے ایک ریپڈ فائر کرنے والی خاص رائفل کا انتخاب کیا پھر کسی ربر کی گیند کے مانند قلابازیاں کھاتا ہوا دوسرے کمرے کی جانب لپکا۔

دوسری جانب سے کھڑکیوں اور قیمتی فانوس ٹوٹنے کی آوازوں کا سلسلہ دونوں منزلوں سے جاری ہوگیا۔ حملہ آوروں نے غالباً کوٹھی کو چاروں اطراف سے گھیر کر گولیاں برسانی شروع کردی تھیں۔ نچلی منزل سے ایک دو زخمیوں کی کراہتی ہوئی دردناک چیخ کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ ایک لمحے کو فرش پر چت لیٹا صورت حال پر غور کرتا رہا پھر دبیز قالین پر کرالنگ کرتا ہوا اوپر جانے والے زینوں کے قریب پہنچ گیا۔ زینے کی بیرونی سائڈ پر بلٹ پروف شیشے لگے تھے۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے آہنی دروازہ لاک کیا پھر شیشوں کے قریب جا کر باہر کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں صرف تھوڑے تھوڑے وقفے سے شعلے لپکتے نظر آرہے تھے پھر جلد ہی سکون ہوگیا۔ شاید حملہ آور اسے ہراساں کرنے کی مہم پوری کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ ''کون تھے وہ لوگ؟...... کس کے اشارے پر کام کررہے تھے؟ خوفزدہ کرنے میں ان کا کیا مقصد تھا؟''

خاصی دیر تک وہ ان سوالات پر غور کرتا رہا پھر دروازہ کھول کر ہال کے چوبی فرش پر آگیا۔ دور سیڑھیوں سے کئی ملے جلے بوٹوں کی آوازیں ابھریں...... کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

''اندر کوئی ہو تو باہر آجائے...... پولیس کی کمک آگئی ہے۔''

شیخ حامد نے لپک کر ایک پاکھے کی آڑ لی پھر زینوں کی لائٹس آن کی تو پولیس کے باوردی افراد بھی نظر آگئے۔ سب سے آگے ملحقہ تھانے کا اسٹیشن ہاؤس آفیسر ہاتھ میں سرکاری پستول لیے دکھائی دیا تو شیخ حامد غصے میں بھرا سامنے آگیا۔

''اتنی دیر سے تم سب کہاں مرے ہوئے تھے؟'' اس نے ایس ایچ او کو حقارت سے گھورا۔

''ہم دوسرے ایریا میں راؤنڈ پر تھے سر، جب ڈی آئی جی صاحب کی کال موصول ہوئی۔''

''کوئی گرفتاری عمل میں آئی یا نہیں......؟''

''وہ...... ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی جاچکے تھے۔''

''نیچے کی کیا پوزیشن ہے......؟'' شیخ حامد نے جھلا کر دریافت کیا۔

''سر...... آپ کے دو گارڈز زخمی ہیں اور ایک ملازم فوت ہوچکا ہے۔ میں نے زخمیوں کے لیے ایمبولینس کو کال کردیا ہے۔''

''پورے مکان کی ٹوٹ پھوٹ اور نقصان کا تفصیلی اندازہ لگاؤ، مجھے تمہاری تحریری رپورٹ درکار ہوگی۔'' شیخ حامد کا انداز تحکمانہ تھا۔ ایس ایچ او کسمسا کر رہ گیا پھر ڈی آئی جی کے آجانے سے اس کی جان بچ گئی۔

''بہت احتیاط سے ہر چیز کا تفصیلی جائزہ لو۔'' اس نے ایس ایچ او سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ مجرموں کا سراغ ہاتھ آجائے۔''

ایس ایچ او دوبارہ اپنی ٹیم کے ساتھ باہر چلا گیا تو ڈی آئی جی نے شیخ حامد سے پوچھا۔ ''آپ کا شبہ کن لوگوں پر ہے؟''

''میں اس وقت کھل کر کسی پر شبہ ظاہر نہیں کروں گا لیکن وہ جو بھی ہے، اس کا پتا چل جائے گا۔''

''ایک اہم بات دریافت کرنا چاہوں گا۔ جگا کے پولیس کی تحویل میں واپس آنے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟''

''اس سے کیا نتیجہ اخذ کرو گے؟''

''یہ بات ٹاپ سیکریٹ تھی، شیخ صاحب...... ایک

بات اور بھی قابل غور ہے۔"

"وہ کیا......؟"

"ہوسکتا ہے کہ اس وقت جو حملہ کیا گیا ہے وہ بھی اسی سلسلے کی کوئی اہم کڑی ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو......؟" شیخ حامد نے ڈی آئی جی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"فی الحال میرا کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ بہر حال، خدا کا شکر ہے کہ آپ پوری طرح محفوظ ہیں۔"

"تم نے لودھی کی چھٹی والی درخواست پر کیا فیصلہ کیا......؟" شیخ حامد نے موضوع بدل دیا۔

ڈی آئی جی ایک لمحے کو کسمسایا پھر اس نے دبی زبان میں کہا۔ "آپ کے فون کے بعد میں نے لودھی کی چھٹی کی درخواست منظور کردی تھی لیکن اس پر عمل روک دیا گیا۔"

"میں سمجھا نہیں......؟" شیخ حامد نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "تمہیں کس بات کی مجبوری تھی؟"

"اوپر سے اچانک یہی احکامات ملے تھے کہ لودھی کے سلسلے میں کوئی نئے آرڈر نہ جاری کیے جائیں۔" ڈی آئی جی نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی آپ کے دشمن کا ہاتھ شامل ہو۔"

"اورنگ زیب کے بارے میں تم کیا کہو گے؟"

"وہ......وہ...... ایسا کیوں کرے گا؟" ڈی آئی جی نے چونک کر شیخ حامد کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر ایک کریہہ مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔

"اور کوئی بات کرو......" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے زخمی لہجے میں کہا پھر ڈی آئی جی کے ساتھ قدم اٹھاتا نیچے آگیا جہاں ہر طرف افراتفری میں ٹوٹے ہوئے شیشے بکھرے پڑے تھے۔ بیشتر کھڑکیاں، روشن دان کے علاوہ اور بھی کئی قیمتی اشیا گولیوں کی بوچھاڑ کے سبب ضائع ہوگئی تھیں۔ پولیس کا عملہ ایک ایک کونے میں مجرموں کے نشانات تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ شیخ حامد کی پیشانی پر آڑی ترچھی لکیریں ابھرنے لگیں، وہ جانتا تھا کہ حملہ کرنے والے کوٹھی کے اندر داخل نہیں ہوسکے تھے ورنہ اوپر بھی ضرور آتے۔ اس نے پولیس عملے کے کام میں مداخلت بھی نہیں کی لیکن اس کے دل و دماغ میں اس وقت انتقام کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

☙☙☙

گالف کلب، ڈیفنس کی آبادی سے بھی تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر دور واقع تھا۔ وہاں صرف ممبر یا ان کے خاص مہمانوں، جن کا پاس کلب کے جنرل سیکریٹری نے جاری کیا ہو، صرف وہی افراد جاسکتے تھے۔ البتہ ایک میدانی علاقہ شادیوں کے لیے بھی وقف تھا جہاں صرف وہی لوگ شادی کی تقریب کرسکتے تھے جن کے پاس دولت کی فراوانی ہو اور ذاتی کار ہو۔ ٹیکسی، رکشا اور دوسری سواریوں کو بھی اس ایریا میں داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ کبھی کبھی وہاں کے کانفرنس ہال میں حکومت وقت کی خفیہ کانفرنس کی گنجائش نکال لی جاتی۔ دوسرے مخصوص وی آئی پیز بھی اسے بک کرا سکتے تھے جس کی کچھ مخصوص شرائط تھیں۔

بہر حال، اس روز سر شام ہی ڈیفنس کے آبادی والے علاقے سے گالف کلب کی طرف جانے والی سڑک کو کلب کے بورڈ کے قریب سے بلاک کردیا گیا تھا جہاں فوج کی بکتر بند گاڑیوں کے علاوہ ملٹری کے کچھ افسران بھی موجود تھے، کلب تک سڑک کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اسلحہ بردار فوجی جوان بھی تعینات تھے۔ فوجی جیپ پر موجود چاق و چوبند عملہ بھی چکر لگاتا پھر رہا تھا۔

کلب کو قطر تصور کرکے اس کو تقریباً چاروں اطراف سے تین فرلانگ کے فاصلے تک گھیرے میں لے لیا گیا تھا، تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک مخصوص طیارہ بھی فضا میں چکر لگا رہا تھا۔ ملک کی صورت حال ان دنوں معمول کے مطابق تھی اس لیے ملک سے قریب تر بنگلوں میں رہنے والے یا تو سکون سے اپنے اپنے روزمرہ کے مشغلوں میں مگن تھے یا پھر ان کا خیال تھا کہ کلب میں فوجی سربراہوں کی کوئی میٹنگ ہو رہی ہوگی۔ شہری آبادی کو اس کا کوئی علم نہیں تھا لیکن......

ٹھیک اسی وقت رات کے دس بجے ایس پی اورنگ زیب اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج ایک بڑی وین کے پچھلے ایئر کنڈیشنڈ حصے میں بیٹھے پورٹیبل ٹی وی اسکرین پر گالف کلب کی عمارت کے باہر چاروں اطراف کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر لیاقت حسین ریڈی میڈ میک اپ کیے مخصوص لباس میں پوری طرح محتاط نظر آرہا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر اعشاریہ تین آٹھ کا آٹو میٹک پستول بھی موجود تھا۔ اس کی عقابی نظریں بار بار دائیں بائیں لگے بیک ویو مرر کا پوری طرح توجہ سے جائزہ لے رہی تھیں۔

وین کے اندر سراج اور اورنگ زیب کی نظریں پورٹ ایبل ٹی وی پر مرکوز تھیں جس پر کلب کے چاروں اطراف کا صرف بیرونی منظر نظر آرہا تھا۔

"کیا ہم اندر ہال کا منظر نہیں دیکھ سکتے......؟" سراج نے خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔

"نہیں...... جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کی اجازت بھی خاصی تگ و دو کے بعد ملی ہے۔"

"کیا یہ کوئی فوجی تقریب ہے جس کا کچھ تعلق ہماری اس وقت یہاں موجودگی سے بھی ہے؟"

"اتنی جلدی کوئی اندازہ نہ لگاؤ۔" اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ "کچھ دیر بعد تم خود ہی اس کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ لگا لو گے۔"

سراج نے مزید کوئی وضاحت نہیں چاہی لیکن کچھ دیر بعد جب ایک گاڑی کلب کے مرکزی دروازے کے سامنے رکی اور اس میں سے برآمد ہونے والی چاروں شخصیات کو دیکھ کر وہ چونکا تھا۔ ان سب کا تعلق صوبے کی ہائی کورٹ سے تھا، اس وقت انہوں نے اپنی اپنی پسند کے مختلف لباس پہن رکھے تھے۔ گاڑی سے اتر کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے عمارت میں داخل ہوگئے، گاڑیاں بھی وہاں سے ہٹا لی گئیں۔ اس کے بعد دس منٹ بعد ایک لمبی گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے برآمد ہونے والی شخصیت صوبے کی چیف جسٹس کی تھی جس کے ساتھ اس کا باوردی گارڈ بھی تھا۔ چیف جسٹس کی گاڑی کے ہٹتے ہی دو تین گاڑیاں اور آئیں جن میں سے ملٹری کے اعلیٰ عہدیدار برآمد ہوکر جلدی جلدی کلب کی عمارت میں داخل ہوگئے۔

"یہ سب کیا ہے......؟" سراج نے پھر کسمسا کر سوال کیا۔ "آج اس عمارت میں کیا کسی خاص مقدمے کی پیشی ہے جو اسے اتنا خفیہ رکھا گیا ہے؟"

"اگر ایسا ہوتا تو فوجی عملے کا عمل دخل ہی کافی تھا۔ ہماری کیا ضرورت تھی؟"

"اوہ......" سراج نے بیزاری کا اظہار کیا۔ "آپ شاید ڈراپ سین تک کچھ باتیں مجھ سے بھی چھپانا چاہتے ہیں۔"

اورنگ زیب جواب دینا چاہتا تھا لیکن پھر اس کی نظریں بھی ٹی وی اسکرین پر جم کر رہ گئیں جہاں ایک بکتر بند گاڑی رکی تھی، اس میں سے چار افراد اترے تھے جن میں سے دو کو سراج نے ایک نظر میں شناخت کرلیا، ان میں دو پولیس کو مطلوب اشتہاری دہشت گرد تھے۔ باقی دو نے اپنے چہرے کے اوپر مفلر لپیٹ رکھے تھے۔ ایک بکتر بند گاڑی کے ہٹتے ہی دوبارہ فوکس میں آگئی۔ اس میں سے بھی چار افراد نیچے اترے جنہیں دیکھ کر سراج کے لہو کی گردش پھر تیز ہوگئی۔ اس نے افضل خان، جگا اور امداد علی کو شناخت کرلیا۔ وہ اتنی تیزی سے عمارت میں داخل ہوئے کہ سراج کو پوری طرح چوتھے فرد پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے بعد دو بکتر بند گاڑیاں اور بھی آئیں، ان میں سے بھی چار چار افراد اتر کر اندر چلے گئے تو سراج کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، اس نے بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اورنگ زیب سے پوچھا۔

"یہ سب یہاں کس مقصد سے لائے گئے ہیں؟"

"آکٹوپس کے لمبے لمبے بازوؤں کو پوری طرح جکڑنے کی خاطر اتنے ہی ثبوت بھی درکار ہوں گے سراج صاحب۔" اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی کچھ چہرے اور بھی سامنے آئیں گے جنہیں دیکھ کر تمہیں اپنے ان سوالوں کا جواب بھی مل جائے گا جو میں نے تمہیں قبل از وقت مصلحتاً نہیں بتائے تھے۔"

"شبنم اور کنول کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟" سراج نے تجسس بھرے انداز میں سوال کیا لیکن اورنگ زیب کے کچھ کہنے سے پہلے اسے اگلی بکتر بند گاڑی سے اترنے والی چار برقع پوش شخصیتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا کہ اس میں سے ایک شبنم اور دوسری کنول بھی ہوسکتی تھی۔ باقی دو کون تھیں؟ اس نے ان کے بارے میں زبان کھولنے کا ارادہ کیا لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا، اورنگ زیب کے موبائل پر سگنل ملا تو اس نے فوری طور پر روشن نمبروں کو دیکھا اور آن کرکے بولا۔

"کیا خبر ہے......؟"

"مجھے ایک گاڑی پر شبہ ہے جناب۔ اگر اجازت ہو تو یہ کانٹا بھی درمیان سے نکال دوں؟"

"نہیں...... تم اسے ڈاج دینے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ دوسری کار کو اس کا نمبر نوٹ کرادو۔" اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "اگر مشتبہ لوگ ہیں تو انہیں زندہ گرفتار کرنا ہمارے لیے زیادہ اہم ہوگا۔"

"رائٹ سر......"

دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوگیا تو سراج نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"کیا ہمارے ڈی آئی جی یا وزیر داخلہ بھی اندر موجود ہوں گے؟"

"نہیں...... تمام کارروائی کو صرف کرنل احتشام اور اس کے مخصوص افراد کور کررہے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" سراج نے کچھ توقف سے دوسرا سوال کیا۔ "کیا آپ کے آکٹوپس کو اس تمام کارروائی کے بارے میں کوئی بھنک نہیں ملی ہوگی؟"

''تم شاید بھول رہے ہو کہ کچھ دنوں پہلے تم نے مجھ سے کہا تھا کہ شیر کی کچھار میں گھس کر اس کا شکار کرنا اکثر و بیشتر جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔''

''اب بھی میں یہی کہوں گا...... اس لیے کہ درندوں کی حس انسانوں کی بو بہت دور سے محسوس کر لیتی ہے۔''

''یو آر رائٹ......'' اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''لیکن ایک بات بھول رہے ہو، ہمارا مقابلہ چار پیروں والے کسی درندے سے نہیں ہے۔''

سراج اور کوئی سوال کرنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ ٹی وی کی روشن اسکرین پر مچھر اڑنے لگے۔ اسی لمحے اورنگ زیب کا موبائل دوبارہ جاگ اٹھا۔

''یہ رابطہ کیسے ختم ہو گیا؟'' اس نے تیزی سے سوال کیا۔

''جس میجر نے رسک لے کر ہمارا راستہ ہموار کیا تھا۔ اب اسی کی ہدایت پر پورا سسٹم خاموشی سے ہٹا لیا گیا ہے۔''

''مگر، کیوں؟''

''میجر کا کہنا ہے کہ اندر کارروائی شروع ہونے سے پیشتر کرنل احتشام بذاتِ خود حساس ڈیٹیکٹر سے اندر اور باہر کے تمام حفاظتی نظام کو چیک کرے گا۔ ابھی تک جو مرغے اور مرغیاں اندر گئے ہیں انہیں ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا ہے جہاں کسی بھی بیرونی رابطوں کو ناممکن بنانے کی خاطر پاور فل جامر لگا دیے ہیں۔ اصل کارروائی کرنل کے اشارے کے بعد ہی شروع ہوگی۔''

''اوکے...... اب تم بھی خاموشی سے نکل جاؤ۔'' اورنگ زیب نے کہا پھر اس نے بھی موبائل ٹی وی سمیت دیگر آلات سمیٹ کر گتے کے ایک کارٹن میں رکھ دیے۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' سراج نے سوال کیا۔

''تمہارے گھر چلتے ہیں جہاں الماس یقیناً جاگ رہی ہوگی۔'' اورنگ زیب نے جواب دیا پھر اس نے لیاقت حسین کو واپس چلنے کے بارے میں ہدایت دینے کی خاطر اپنے ساؤنڈ پروف حصے اور اگلی نشست کے درمیانی مختصر خلا کو کھولنے کی خاطر ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس سے پیشتر ان کی گاڑی تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ اورنگ زیب نے فوری طور پر خلا کھولنے کے بعد سوال کیا۔

''کیا بات ہے لیاقت حسین۔ تم نے اچانک گاڑی کیوں چلا دی؟''

''جب ہمارا کام یہاں روک دیا گیا تو اب کوئی خطرہ مول لینے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

لیاقت حسین کے جواب نے اورنگ زیب کے علاوہ سراج کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ شاید وہ کوئی پراسرار قوت ہی تھی جو اب بھی لیاقت حسین کی رہنمائی کر رہی تھی۔ کچھ فاصلہ خاموشی سے طے ہو گیا پھر سراج نے کسی خیال سے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''لوچن اور وشنو کے بارے میں ابھی تک آپ نے کچھ نہیں بتایا؟''

''فکر مت کرو۔ وہ بھی بہت جلد ہماری لپیٹ میں آ جائیں گے۔''

''درست جواب دینے میں کیا پھر کوئی مصلحت آڑے آ رہی ہے؟''

''میں تمہارے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔'' اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں مسکرا کر کہا تو سراج نے مزید کوئی کرید مناسب نہیں سمجھی۔

ایک ایک کر کے سارے پانسے الٹے پڑ رہے تھے۔ شیخ حامد کے پاس حالات کے جہنم میں جھونکنے کے لیے فرنٹ لائن ختم ہو جانے کے بعد بھی دوسرے درجے کے بے شمار جاں نثار موجود تھے لیکن حالات کی روشنی میں وہ انہیں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ وشنو مل جاتا تو وہ اس کی صلاحیتوں پر انحصار کر سکتا تھا لیکن وہ جیل سے فرار ہونے کے بعد کسی چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا، وشنو اور لوچن کے سلسلے میں اس کو ملنے والی پولیس ذرائع کی اطلاعات بھی کچھ حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ پولیس کے علاوہ خفیہ ایجنسیاں بھی اب تک کئی چھاپے مار چکی تھیں لیکن انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

کنول کے اغوا کا مسئلہ بھی کسی معمے سے کم نہیں تھا، اسے ایک ایسے فرد نے اغوا کیا تھا جو اغوا کی واردات سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ کسی نے اسے مرنے والے کے بھیس میں اٹھا لیا تھا۔ وہ کون تھا؟ اس ایک سوال کے عقب میں کئی امکانات اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے، جس نامعلوم مخبر نے جگا کو ملٹری کے چنگل سے نکالنے کا دعویٰ کیا تھا اور کامیاب بھی ہو گیا تھا، وہ بھی شبے کی زد میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ جگا کے سلسلے میں شیخ حامد پر دباؤ ڈالنے اور اسے حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور کرنے کی خاطر کنول ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی، دوسرا شبہ اورنگ زیب کی شخصیت کو بھی کسی قدر مشکوک بنا رہا تھا۔ وہ خاصی دیر تک مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا، پھر اس نے ہونٹ چباتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور اورنگ زیب کے نمبر ڈائل

کرنے لگا۔

''ہیلو...... ایس پی اورنگ زیب آن لائن!'' دوسری جانب سے سنجیدگی سے جواب ملا۔

''میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

''اوہ...... شیخ حامد صاحب! سوری، میں اس وقت ایک ضروری فائل کا مطالعہ کر رہا تھا اس لیے ہیڈسیٹ پر آپ کا نام نہیں پڑھ سکا، فرمائیے، اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''میں اس وقت تم سے ایک ذاتی سلسلے میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں لیکن...... فون پر نہیں۔'' شیخ حامد نے سرسراتے انداز میں کہا۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟''

''گھر پر...... اگر ممکن ہو تو ابھی آ جاؤ۔'' اس کا انداز بہ دستور تحکمانہ تھا۔

''او۔ کے۔'' دوسری جانب سے مختصر جواب دینے کے بعد لائن کاٹ دی گئی لیکن آدھے گھنٹے بعد ہی اورنگ زیب اس کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

''کیا پینا پسند کرو گے؟''

''کچھ ضروری کام نمٹانے میں مصروف تھا۔ آپ کا فون ملا تو حکم کی تعمیل میں فوری آ گیا۔ چائے ڈیو رہی۔'' اورنگ زیب نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔ ''آپ فرمائیں۔ میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟''

''میں جگا کے سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' شیخ حامد نے کچھ توقف سے کہا۔ ''سنا ہے کہ وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ہاتھوں سے نکل کر پولیس کی تحویل میں آ گیا ہے؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اورنگ زیب نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''ایک بار گرفتاری اور رہائی کے بعد اس کا ریکارڈ بالکل صاف تھا، میرا خیال ہے کہ ملٹری انکوائری کے بعد اب پولیس بھی اسے جلد ہی رہا کر دے گی۔''

''اور اگر میں یہ چاہوں کہ اسے رہائی نہ ملے تو؟''

''اس سلسلے میں شاید میں آپ کی کوئی براہ راست مدد نہ کر سکوں۔ اس لیے کہ جگا کی مزید چھان بین ڈائرکٹ ڈی آئی جی کو سونپی گئی ہے۔''

''کیا ڈی آئی جی تمہاری بات کو ٹال سکتا ہے؟'' شیخ حامد نے اورنگ زیب کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈی آئی جی صاحب میری تجویز کے بجائے آپ کے حکم کا زیادہ خیال کریں گے۔''

''آئی۔ سی...... گویا اب تم اس کی گڈ بکس میں نہیں رہے۔''

''شاید......'' اورنگ زیب کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ ''ویسے میں کسی کی پسند ناپسند سے زیادہ اپنے فرائض پر زیادہ نظر رکھتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں...... تمہاری پہنچ براہ راست......''

''یہ بھی وقتی باتیں ہیں۔'' اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''وقت اور حالات کسی وقت بھی موسم کی طرح بدل سکتے ہیں۔''

شیخ حامد کی نظریں بہ دستور اورنگ زیب کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں، جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوا۔ روشن اسکرین پر پراسرار مخبر کے نمبر دیکھ کر وہ ایک لمحے کو سوچ میں گم ہو گیا پھر موبائل آن کر کے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں اس وقت مصروف ہوں، تم پھر کسی وقت......''

''لائن ڈس کنکٹ کرنے کی غلطی نہ کرنا، ہو سکتا ہے کہ پھر میں بھی تمہیں اس خطرے سے بروقت آگاہ نہ کر سکوں جو تمہارے سر پر کسی بھوکے آدم خور گدھ کی طرح منڈلا رہا ہے۔''

''کیا خاص ضرورت پیش آ گئی ہے؟'' شیخ حامد نے الجھ کر سوال کیا۔

''ایک دو روز میں تمہارا زرخرید بل ڈاگ...... ڈی آئی جی جو میڈیا اور افسران کی مشترکہ کانفرنس منعقد کر رہا ہے، وہ تمہارے وجود کے ناپسندیدہ تابوت میں آخری کیل بھی ثابت ہو سکتی ہے۔''

''پھر؟...... میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''اور کچھ نہیں تو فوری طور پر اپنے فرار کا کوئی معقول بندوبست قبل از وقت کر لو ورنہ...... پھر شاید فرعون کی طرح تمہاری لاش کو سمندر کی مچھلیاں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیں گی۔''

''ڈونٹ ڈسٹرب می...... میں اس وقت تمہارے لیے مزید وقت نہیں نکال سکتا۔''

''میں جانتا ہوں کہ اس وقت تمہاری مصروفیت کیا ہے۔'' دوسری جانب سے سرد لہجے میں کہا گیا۔ ''تم جس کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہے ہو...... اس کی اپنی زندگی بھی اس پریس کانفرنس میں خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' شیخ حامد چونکا۔

''شارٹ ہینڈ میں فی الحال یہی بتا سکتا ہوں کہ اس پریس کانفرنس کے سنگین حالات سے دوچار ہونے کے بعد کئی ایجنسیاں مل کر تمہاری تلاش میں ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑیں گی۔''

''ربش......'' شیخ حامد نے تلملا کر کہا۔
''یہی خوش فہمی تمہارے وجود کو چاٹ جائے گی، میری آخری بات کان کھول کر سن لو...... تمہارے خلاف جو ثبوت اور تمہارے خاص حرامیوں کے جو بیانات ریکارڈ ہو چکے ہیں وہ تمہاری موٹی گردن میں پھانسی کا پھندا ہی ثابت ہوں گے۔ باقی اطلاعات تمہاری روح کو پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ اب اجازت چاہتا......''
''ون منٹ......'' شیخ حامد نے تیزی سے کہا۔ ''ایک اہم بات جاننا چاہوں گا...... تمہیں ان معاملات سے کیا دلچسپی ہے؟''
''تم نے جگا کے سلسلے میں ملٹری انٹیلی جنس میں ہونے کی جو تصدیق کی تھی وہ میری گردن پر پہلا اور آخری احسان تھا جس کی ادائی کی آخری قسط اس وقت ادا کر رہا ہوں...... بائی۔''
دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوگیا تو شیخ حامد نے اورنگ زیب پر توجہ دی جس نے اس کے کال میں مصروف ہونے کے بعد درمیانی میز پر پڑا ایک فیشن میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی تھی۔ اس کے چہرے پر اس وقت سنجیدگی اور بے نیازی کے ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے۔
''مسٹر اورنگ زیب...... کیا تمہارا ڈی آئی جی میڈیا اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی کوئی پریس کانفرنس کال کرنے والا ہے؟''
''وہاٹ......؟'' اورنگ زیب نے میگزین رکھ کر شیخ حامد کو حیرت سے دیکھا پھر سکون سے بولا۔ ''میرے پاس ابھی تک ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔''
''اوہ...... تم شاید کسی وجہ سے اس خبر کی تصدیق مناسب نہیں سمجھ رہے۔''
''یہ محض آپ کا ذاتی خیال ہے۔''
''اس ذاتی خیال کے تحت ایک مشورہ دے رہا ہوں۔'' شیخ حامد نے اسے کریدنے کی خاطر ایک اور طریقہ آزمایا۔ ''تم اس کانفرنس سے دور ہی رہنا ورنہ......''
''ورنہ کیا ہوگا؟''
''اس کا اندازہ تمہیں کانفرنس میں شرکت کے بعد ہی ہوسکے گا۔''
''تھینکس فار یور ایڈوائس۔'' اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر آپ نے صرف جگا کے سلسلے میں مجھے طلب کیا تھا تو ایک بار پھر آپ کو یقین دلانا چاہوں گا اس بارے میں آپ براہ راست ڈی آئی جی سے اپنے پرانے اور پرسنل تعلقات کو آزمانے کی کوشش کریں...... میں معذرت چاہوں گا۔''
''او۔ کے......'' شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے اٹھ کر اورنگ زیب سے رخصتی مصافحہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر نامعلوم اور پراسرار مخبر کی فون کال کے بارے میں سوچتا رہا جو اس کے لیے حیرت انگیز بھی تھی اور ناقابل یقین بھی...... پھر بھی اس نے حفظ ماتقدم کی خاطر اپنے اس تیز رفتار ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو فون کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں محسوس کی جو مہینے دو مہینے میں محض اس کی تفریح کے عوض گھر بیٹھے خاصی معقول تنخواہ ہر مہینے وصول کر رہا تھا۔
فون کال سے نمٹنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک اسی کال کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے غور کرتا رہا۔ نامعلوم مخبر نے اس سے پیشتر اسے جو اطلاعات فراہم کی تھیں وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی تھیں لیکن ایک فرق ضرور تھا۔ پہلی اطلاعات شیخ حامد کی زندگی سے متعلق ہوا کرتی تھیں لیکن...... اس بار اسے اس کی موت کے خدشات سے آگاہ کیا گیا تھا۔

میونسپل کمیٹی کے کانفرنس ہال میں اس وقت خاصی گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ دائیں جانب پولیس کے محکمے کے آٹھ دس سینئر آفیسر سادے لباس میں موجود تھے جبکہ بائیں جانب اردو، انگریزی اخباری اداروں کے رپورٹرز اور مشہور تجزیہ نگار بھی موجود تھے جو آپس میں صرف اسی ایک موضوع پر بحث کرنے میں مشغول تھے کہ شہر کے حالات میں ہونے والی سنگین نوعیت کی وارداتیں آخر کب اور کس طرح ختم ہوں گی اور پولیس کی بھاری نفری ابھی تک حالات کو کنٹرول کرنے میں کیوں ناکام ہو رہی ہے؟ یہ چہ میگوئیاں خاصے دنوں سے گردش کر رہی تھیں۔ مختلف اخبار اس موضوع پر گرما گرم خبریں بھی شائع کر رہے تھے۔ یہاں تک لکھ دیا گیا تھا کہ غالباً پولیس ان وارداتوں کے عقب میں نظر آنے والے مخصوص اور سیاسی حلقوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے چشم پوشی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ کچھ کاروباری بڑوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا جنہوں نے اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کی خاطر جرائم پیشہ افراد پال رکھے تھے اور برملا اپنی برتری منوانے کی خاطر اپنے مخالفین کے خلاف آئے دن غنڈا گردی کا بڑے دھڑلے سے ارتکاب کرتے تھے۔ کئی افراد کو اغوا بھی کیا گیا پھر نشان عبرت بنا کر اس یقین دہانی کے بعد چھوڑ دیا گیا کہ وہ آئندہ نہ اپنی زبان کھولیں گے نہ اپنے سے زیادہ طاقت ور پارٹی سے مقابلے

کی کوشش کریں گے۔

سنگین حالات کا گراف روز بڑھتا جارہا تھا جبکہ پولیس کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان وارداتوں کے بارے میں اخبارات نے کھل کر لکھنا شروع کردیا تھا۔ کئی بار یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ پولیس کو مطلوب خطرناک جرائم پیشہ افراد کی پرورش کون کررہا ہے؟ ان کی گرفتاری عمل میں کیوں نہیں آئی......؟ پولیس مفت کی تنخواہ کیوں ہڑپ کررہی ہے؟ پھر اچانک کسی روز انہی مطلوب جرائم پیشہ افراد کی سرد لاشوں کا کچرا کنڈی سے برآمد ہونا اور سفید پوشوں کا اغوا ہونا کس کے کھاتے میں درج ہورہا ہے؟ اس کی ذمے داری اگر پولیس اور اس کے ذیلی اداروں پر نہیں رہی تو پھر کون ان کا سدباب کرے گا؟

اخبارات کے ان سرخ حاشیوں کے بارے میں پولیس مختلف وضاحتیں دیتی رہتی۔ بات کسی نہ کسی طرح دبا دی جاتی لیکن گزشتہ دنوں شیخ حامد جیسے بڑے کاروباری شخص کی کوٹھی پر بار بار حملے۔ ان کے دفتر کو نذر آتش کردینے کی جو وارداتیں ہوئی تھیں اس نے مرکز کے ذمے داروں کو بھی سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اخبارات نے برملا اس شبہے کا اظہار کیا کہ پولیس کے ذمے دار افسران بھی مختلف گروپس کے ہاتھوں بک چکے ہیں۔ جو سر اٹھانے کی کوشش کرکے اپنی ذمے داری پوری کرنے کی خاطر میدان میں آتے ہیں۔ انہیں بھی کسی نہ کسی دباؤ کی خاطر خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ پولیس نے ان خبروں کی تردید کرنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران دو ایسے انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والے خطرناک افراد جو گرفتار ہونے کے بعد بہ طور خاص پولیس کی بھاری نفری کی خاص نگرانی میں تھے۔ ان کا اچانک اس طرح فرار ہوجانا کہ نہ ان کے اور پولیس کے درمیان مقابلہ ہوا۔ نہ ہی کسی کو ان کے فرار کی بو محسوس ہوئی اور...... کئی دنوں کے بعد بھی ان کی دوبارہ گرفتاری عمل میں نہ آنا...... یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب محض نگرانی کرنے والے عملے کو عارضی طور پر معطل کردینا، اخبارات کے لیے ناکافی تھا۔ مرکز افراد کی طرف سے بھی صوبائی ذمے داروں سے بازپرس شروع ہوگئی تھی۔ اخبارات نے متواتر شہ سرخیاں لگانی شروع کردی تھیں۔ یہ بھی کھل کر لکھا جارہا تھا کہ نگرانی کا انتظام کرنے والے بڑے پولیس افسران نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی ہے اور میڈیا کے نمائندوں سے ملاقات سے گریز کررہے ہیں، آخر کیوں؟...... اس وقت ڈی آئی جی کرائمز، آغا منظور نے اسی ضمن میں بڑے پیمانے پر پریس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا جس میں ذمے دار افسران بھی ان کے روبرو موجود تھے۔

دونوں ہی گروپس اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے لیکن پولیس کی جانب سے اورنگ زیب اور سراج بالکل خاموش تھے۔ اخباری نمائندوں کا سب سے سینئر اور تجربہ کار رپورٹر جس کا تعلق بھی ایک بڑے اخبار سے تھا وہ بھی خلاف توقع کسی گہری سوچ میں تھا جب اس کے برابر بیٹھے ہوئے نمائندے نے سوال کیا۔ ''کیا بات ہے صفدر صاحب! آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟''

''میں اہم سوالات کو ذہن میں ترتیب دے رہا ہوں۔''

''آپ نے ایس پی اورنگ زیب اور ڈی ایس پی سراج پر غور نہیں کیا۔ وجود میں آنے والی یہ نئی جوڑی بھی گم صم نظر آرہی ہے جبکہ فرار ہوجانے والے دونوں خطرناک مجرم براہ راست اورنگ زیب کی نگرانی میں تھے۔''

ٹھیک اسی وقت ڈی آئی جی کرائمز اپنی باقاعدہ یونیفارم میں ہال میں داخل ہوا تو سب افراد اٹھ کھڑے ہوگئے، ہال میں خاموشی طاری ہوگئی۔ حسب روایت پہلے ڈی آئی جی نے بلائی جانے والی کانفرنس اور اس کی ضرورت پر مختصر تقریر کی پھر اس کے برابر بیٹھے ہوئے سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ نے اخباری نمائندوں سے مخاطب ہوکر کہا۔

''اب آپ حضرات باری باری سوالات کرسکتے ہیں۔''

سب سے پیشتر ایک انگریزی اخبار کے نمائندے نے اٹھ کر چبھتے ہوئے انداز میں ڈی آئی جی سے مخاطب ہوکر سوال کیا۔ ''میں یہ جاننا پسند کروں گا کہ جب آپ حضرات تمام خامیوں کا دبی زبان میں اعتراف کررہے ہیں تو پھر یہ بھی عرض کریں کہ اس کی ذمے داری کس پر عائد ہوتی ہے؟...... میں خاص طور پر حال میں فرار ہونے والے ان دو بین الاقوامی مجرموں کے بارے میں معلوم کرنا چاہوں گا جو ابھی تک دوبارہ گرفتار نہیں ہوسکے اور یہ بھی کہ اس کی براہ راست ذمے داری کس کے اوپر عائد ہوتی ہے؟'' سوال کرتے ہوئے اس کی نظریں دوبار بڑے معنی خیز انداز میں اورنگ زیب کی جانب اٹھی تھیں۔

ڈی آئی جی نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ''پولیس کے ذمے دار افسران ان کی تلاش میں شب و روز چھاپے مار رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ انہیں بہت جلد گرفتار کرلیا جائے گا۔ رہا براہ راست ذمے داری کا سوال تو اس کے بارے میں پہلے ہی وضاحت کی جاچکی ہے۔''

''وہ وضاحت ایک سرسری بیان تھا۔'' اسی نمائندے نے دوبارہ اٹھ کر ایک بار پھر اورنگ زیب کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے ڈی آئی جی سے کہا۔ ''میں چاہوں گا کہ اس وقت مسٹر اورنگ زیب کو موقع دیا جائے کہ وہ وضاحت کرسکیں، ان خرابیوں کی جس کی وجہ سے مجرموں کو فرار ہونے کا موقع ملا۔''

جواب میں ڈی آئی جی نے اورنگ زیب کی طرف اپنا ہاتھ اٹھایا تو اورنگ زیب نے اپنا مائک آن کرتے ہوئے نہایت سکون سے بڑی ٹھوس آواز میں کہا۔ ''میں مجرموں کے فرار ہونے کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ ان کی تمام تر ذمے داری میرے اوپر تھی اور میں اس وقت بھی کسی آنا کانی کے بغیر اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔ اس امر کی وضاحت اس وقت کرنا پسند نہیں کروں گا کہ ان کے فرار میں کن عوامل کو دخل تھا۔''

''بہت خوب......'' ایک دوسرے نمائندے نے تیزی سے اٹھ کر کہا۔ ''آپ اپنی کوتاہی قبول کرنے کے باوجود ان کی وجوہات کو چھپانا چاہتے ہیں...... کیا اس کی وجہ کوئی خاص ذاتی مقصد ہے؟''

''جی ہاں......'' اورنگ زیب نے اطمینان سے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''سوال جس انداز میں شروع کیا گیا اس کے پیچھے بھی ایک ایسا ہاتھ ہے جو انڈر گراؤنڈ لین دین میں بڑی فیاضی سے کام لیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے ہی نادیدہ ہاتھ نے نگرانی کرنے والے کسی عملے کو بھی خرید لیا ہوگا جس کی وجہ سے ہمیں تمام نگرانی کرنے والے عملے کو معطل کرنا پڑا۔ میں ان ہی خاص وجوہات کی بنا پر اس وقت کچھ کہنے سے گریز کروں گا۔''

''آپ نگرانی کرنے والے جس عملے کی بات کررہے ہیں اس میں آپ کی حیثیت ایک سربراہ کی تھی۔ پھر آپ کو کوئی سزا کیوں نہیں ملی؟'' گجراتی اخبار کے منہ پھٹ نمائندے نے اپنے مخصوص انداز میں دریافت کیا۔

''اس کی وضاحت میں کرتا ہوں۔'' ڈی آئی جی نے اورنگ زیب کے بولنے سے پیشتر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بات پولیس کے ذمے داروں کے علاوہ آپ بھی ضرور جانتے ہیں کہ مسٹر اورنگ زیب ایک دیانتدار افسر ہیں۔ میں جانتا ہوں مسٹر اورنگ زیب بہت جلد دونوں مجرموں کو دوبارہ پولیس کٹہرے تک لانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔''

تیز و تند انداز میں سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا جب صفدر علی نے کھڑے ہوکر کہا۔ ''شیخ حامد کی کوٹھی پر دوبارہ حملہ ہوا۔ ان کے دفتر کے ایک بڑے حصے کو خاک کر دیا گیا۔ کئی جانیں بھی ضائع ہوچکی ہیں۔ آخر وہ کون سا گروپ ہے جو خاص طور پر ایک خاص اور بڑے کاروباری شخص کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے؟''

''اس سلسلے میں کچھ گرفتاریاں بھی عمل میں آئی تھیں جنہیں ضروری تفتیش کے بعد بے قصور سمجھ کر چھوڑ دیا گیا لیکن...... مجھے یہ یقین ہے کہ فرار ہونے والے دونوں مجرم گرفتاری کے بعد اس کی بہتر طور پر وضاحت کرسکیں گے۔''

سوال اور جواب کے دوران مختلف پولیس افسران اور پریس کے علاوہ تجزیہ نگار بھی اپنی اپنی بولیاں بولتے رہے لیکن سراج کی نظریں اس دوران بار بار صفدر علی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ وہ ذاتی طور پر اس کو بہت قریب سے جانتا تھا لیکن اس وقت اس کے بولنے کا انداز اور اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اسے مختلف نظر آرہے تھے۔ وہ کئی بار اسے بے حد توجہ سے دیکھ چکا تھا، اس وقت بھی اس کی نظریں صفدر علی پر مرکوز تھیں جب اورنگ زیب نے اسے ایک مخصوص انداز میں کہنی ماری۔ سراج نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا لیکن اورنگ زیب اس وقت سوال کرنے والے ایک اخباری نمائندے کی طرف متوجہ تھا۔ سراج اس کہنی مارنے والے عمل کو اتفاقیہ نہیں کہہ سکتا تھا چنانچہ اس کا ذہن کئی امکانات کے بارے میں غور کرنے لگا، اس کی نظریں دوبارہ صفدر علی کا جائزہ لے رہی تھیں جب اس نے ڈی آئی جی کی ایک وضاحت کے بعد تیزی سے اٹھتے ہوئے ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔

''میں آپ کی وساطت سے مسٹر اورنگ زیب اور مسٹر سراج سے ایک اہم بات کی وضاحت چاہوں گا۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شیخ حامد کے علاوہ سیٹھ عثمان اور رستم علی آغا خانی گروپس کو بھی بڑے صنعت کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شیخ حامد کی کوٹھی پر دوبار ہونے والا حملہ بھی کسی کاروباری رنجش کا کوئی ردعمل ہو۔ میں ذاتی طور پر اس بات کی چھان بین کرچکا ہوں کہ سیٹھ عثمان کا خاص ڈرائیور لیاقت حسین جسے اب ترقی دے کر دفتری عملے میں بھی شامل کرلیا گیا ہے اکثر و بیشتر مسٹر سراج کے بنگلے پر کئی کئی دن قیام کرتا ہے۔ اس دوران مسٹر اورنگ زیب بھی وہاں اکثر موجود پائے گئے ہیں۔ میں یہ دریافت کرنا پسند کروں گا کہ ایک ڈرائیور کا دو پولیس افسروں سے اتنا گہرا ربط و ضبط کیا معنی رکھتا ہے؟''

سراج صفدر علی کی زبان سے لیاقت حسین کا حوالہ سن کر

بری طرح چونکا۔ کچھ دوسرے پولیس افسروں کی نظریں بھی ان دونوں کی طرف گھوم گئیں۔ سوال چونکہ ڈی آئی جی کی وساطت سے کیا گیا تھا اس لیے اس کے ہاتھ کا اشارہ پاکر اورنگ زیب نے کچھ توقف کے بعد کھسیا کر کہا۔ ”میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں لیاقت حسین نامی شخص سے اس حد تک واقف ہوں کہ وہ سیٹھ عثمان کا ڈرائیور ہے۔ سراج صاحب سے چونکہ یہ آفیشل تعلق ہے اس لیے میں ان کے گھر بھی اکثر و بیشتر آتا جاتا رہتا ہوں جہاں کئی بار لیاقت حسین سے بھی سرسری گفتگو کا موقع ملا۔ رہا یہ سوال کہ مسٹر سراج کے گھر پر لیاقت حسین کا آنا جانا۔ تو اس کے جواب میں صرف یہی کہوں گا کہ مسٹر عثمان اور مسٹر سراج کسی زمانے میں ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں، اب بھی ان کے درمیان فیملی ٹرمز ہیں اس لیے لیاقت حسین کو اس کانفرنس یا موجودہ حساس معاملات میں شامل کرنا میرے نزدیک ایک قطعی غیر ضروری بحث ہوگی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی بتانا پسند کروں گا کہ مجھے اور مسٹر سراج کو بھی ایک دو موقعوں پر ٹارگٹ بنایا جاچکا ہے۔“

”پھر...... آپ کو اس حملے کے پیچھے کس کا ہاتھ نظر آتا ہے؟“ دوسرے نمائندے نے سوال کیا۔

”نو کمنٹس......“ اورنگ زیب نے مختصر جواب دیا۔

”میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ کسی ڈرائیور کو اس وقت اس کانفرنس میں ڈسکس کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“ ڈی آئی جی نے صفدر علی کو مخاطب کیا پھر میڈیا گروپس پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”رہا حملوں کا معاملہ تو موجودہ پیچیدہ صورت حال کے پیش نظر حملہ کسی وقت...... کسی پر اور کسی جگہ بھی ہوسکتا ہے اور...... پولیس کو اس وقت انہی نامعلوم ذمے داروں اور حملہ کرنے والوں کو تلاش کرنا ہے جو شہر کے امن وسکون کو بھی برباد کررہے ہیں۔“

”ان کی تلاش کون کرے گا، سر......؟“ شام کو شائع ہونے والے ایک اخبار کے نمائندے نے اپنی زبان میں کہا۔ ”پولیس کا عملہ تو ایک عرصے سے ناکام ہورہا ہے اور صرف وضاحتوں پر گزارا کررہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ شام کو شائع ہونے والے اخبارات گرما گرم سرخیاں لگانے میں زیادہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کی بے بنیاد خبروں میں کتنی صداقت ہوتی ہے اس سے اب عوام بھی واقف ہوگئے ہیں۔ اغوا، زنا بالجبر اور اسی قسم کی دوسری چٹ پٹی خبریں، من گھڑت بنیادوں پر مرچ مسالا لگا کر عوام کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں لیکن فی الحال میں اس موضوع پر بحث نہیں کروں گا۔ فوری طور پر مجھے اور پولیس کے دوسرے ذمے دار افسران کو خاص طور پر ان دو مجرموں کو فوکس کرنا ہے جو بڑی دلیری سے نگرانی کرنے والوں کی نظروں میں دھول جھونک کر فرا...... ار...... ار......“

ڈی آئی جی کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر باہر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی ابھرنے والی آوازوں نے سب ہی کی نظریں مرکزی دروازے کی طرف پھیر دیں۔ ایک منٹ بعد ہی دو نقاب پوش جدید ریپڈ فائرنگ کرتے والی خطرناک رائفلوں سے لیس اندر داخل ہوئے، ایک نے خطرناک آواز میں سب کو للکارا۔ ”خبردار، کوئی اپنی جگہ سے اٹھنے یا ہلنے کی حماقت نہ کرے ورنہ باہر موجود ہمارے دوسرے ساتھی خودکش حملے کے ساتھ پوری عمارت کو اڑا دیں گے۔“

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی دوسرے نقاب پوش نے براہ راست اورنگ زیب اور سراج کو للکارا۔ ”تم دونوں خاموشی سے ہاتھ اوپر اٹھا کر ہمارے ساتھ چلو۔ انکار کی صورت میں تمہارے علاوہ کچھ دوسرے بھی موت کی لپیٹ میں آجائیں گے۔“

”تم ایسا مت کرنا۔“ اورنگ زیب اپنی جگہ سے اٹھا۔ ”میں تم دونوں کو نقاب میں ہونے کے باوجود پہچان گیا ہوں۔ میں اور سراج تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہیں۔ ہماری وجہ سے تم بلاوجہ دوسروں کو نشانہ بنانے کی غلطی نہ کرنا۔“

اورنگ زیب کی سنجیدگی دیکھ کر سراج نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی پھر وہ دونوں اپنی نشستوں سے اٹھ کر صرف دو چار ہی قدم آگے بڑھا سکے تھے کہ سادہ لباس میں ملبوس وہ چار ماہر کمانڈوز جو اوپر گیلری میں چھپے کھڑے تھے، انہوں نے بلائے ناگہانی کی طرح ایک ساتھ اوپر سے چھلانگ لگا دی، دونوں نقاب پوش لڑکھڑائے لیکن کمانڈوز کی گرفت میں پوری طرح آتے آتے بھی انہوں نے رائفل کے ٹریگر کو دبا دیا۔ ایک ساتھ کئی خوفناک شعلے لپکے، ایک دو افراد کے زخمی ہوکر چلانے کی آوازیں بھی بلند ہوئیں لیکن اسی وقت انتظامی امور پر تعینات عملے کے کسی آدمی نے دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے پوری عمارت کا مین سوئچ آف کردیا۔ کانفرنس میں افراتفری کے سبب بھاگنے والے افراد کے قدموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ دس منٹ بعد کمانڈوز نے ایک مخصوص انداز میں گرین سگنل دیا تو تمام لائٹس دوبارہ روشن ہوگئیں۔

کمانڈوز نے دونوں نقاب پوشوں کو پوری طرح گرفت میں لینے کے بعد ان کے چہروں سے نقاب ہٹایا تو کئی اخباری فوٹوگرافرز کے کیمروں کی فلش لائٹس ایک

ساتھ چمک اٹھیں۔ جن دو حملہ آوروں کی تصویریں ان کے میموری کارڈز پر محفوظ ہوئیں، وہ پولیس کو مطلوب خاص مفرور مجرم...... لوچن اور وشنو کے سوا کوئی اور نہیں تھے۔ ان دونوں کو فوری طور پر گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے جایا گیا، پولیس کے مسلح افراد بھی وہاں پہنچ گئے۔ ڈی آئی جی اور دوسرے پولیس افسران بھی ان کے اردگرد جمع ہونے لگے لیکن...... لوچن یا وشنو کے چہروں پر خوف کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی، پولیس نے ان دونوں کو جکڑ کر ہتھکڑیاں پہنا دیں، پھر بھی ان کی خوفناک آنکھوں میں انتقام کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کا ذہن بہ دستور صفدر علی کی تحلیل نفسی کرنے میں الجھا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ لائٹس دوبارہ آن ہونے کے بعد صفدر علی بھی کمانڈوز کے شانہ بشانہ ہی نظر آیا تھا؟

لوچن اور وشنو کی دوبارہ گرفتاری کے آدھے گھنٹے بعد ملٹری کا ایک ٹرک کمانڈوز کے ساتھ میونسپل کمیٹی کے کانفرنس ہال کے باہر پہنچ گیا۔ کرنل احتشام کی بلٹ پروف گاڑی بھی ٹرک کے ساتھ ہی آگئی، لوچن اور وشنو دونوں کو ملٹری والوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ڈی آئی جی نے اس سلسلے میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دوراندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ڈی آئی جی کے جانے کے بعد دوسرے پولیس افسران بھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے، اورنگ زیب نے کانفرنس ہال سے باہر آکر سراج سے کہا۔ ”تم گھر پہنچ کر میرا انتظار کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں، لیاقت حسین کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”اب ہم کو کہاں جانا ہے......؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہمیں آج ہی آکٹوپس کو ہر قیمت پر گرفتار کرنا ہے۔ دیر ہوگئی تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”اوہ......“ سراج چونکا۔ ”تو کیا وشنو اور لوچن کا اچانک حملہ بھی آپ ہی کے اشارے پر......“

”وقت کم ہے......“ اورنگ زیب نے بات کاٹ کر کہا۔ ”باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“

اورنگ زیب کے جانے کے بعد سراج بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا، اس کے ذہن میں اس وقت بھی صفدر علی کا خیال گردش کررہا تھا، اس کے گھر پہنچنے کے دس منٹ بعد لیاقت حسین بھی آگیا۔ اس کا چہرہ کسی قسم کے

جذبات سے یکسر عاری تھا۔

''تم کچھ دیر پہلے کہاں تھے؟'' سراج نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''اپنے کمرے میں...... ابھی ایس پی صاحب کا فون آیا تھا۔ آپ کے ساتھ کہیں جانے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔''

سراج نے اسے باہر انتظار کرنے کو کہا۔ خود تیار ہونے کے دوران میں بھی وہ لوچن اور وشنو کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اسے علم تھا کہ اورنگ زیب کسی مخبر کی حیثیت سے شیخ حامد کو اعتماد میں لے کر ٹریپ کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ لیاقت حسین کا صفدر علی کے روپ میں نظر آنا بھی اورنگ زیب ہی کی کسی خفیہ مہم کا ایک حصہ ہوسکتا تھا، وہ جس اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوا تھا اس کے مالکان اور اورنگ زیب کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے علاوہ کمانڈوز کے ساتھ ہی صفدر علی کا بھی وشنو اور لوچن کے قریب نظر آنا...... اس کے علاوہ بھی بے شمار خیالات سراج کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

حسب وعدہ اورنگ زیب پچیس منٹ بعد ہی پہنچ گیا۔ وہ اس وقت خلاف توقع بہت زیادہ سنجیدہ اور جذباتی نظر آرہا تھا۔ اسٹیئرنگ سیٹ لیاقت حسین کے حوالے کرکے وہ سراج کے ساتھ پچھلی نشست پر آ گیا۔ لیاقت حسین کو اس نے شیخ حامد کی کوٹھی کی طرف چلنے کو کہا تھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوپس آسانی سے گرفتاری دیدے گا؟''

''انکار کی صورت میں ہم زبردستی بھی کر سکتے ہیں۔'' اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کے بیشتر آدمیوں کی گواہیاں پہلے ہی اس کے خلاف ریکارڈ ہو چکی ہیں، اب وشنو اور لوچن کے اقراری بیان کے بعد اس کے بچاؤ کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔''

''گویا وہ حملہ......''

''ہاں۔ وہ بھی میری پلاننگ کا ایک حصہ تھا ورنہ ان دونوں کو اتنی آسانی سے گرفتار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔''

''کیا ڈی آئی جی کو بھی آپ کی پلاننگ کی خبر ہوگئی......؟''

''نہیں...... آکٹوپس کی گرفتاری کے سلسلے میں تمام قانونی کارروائی کرنل احتشام نے خفیہ طور پر کی ہے اور......''

موبائل پر سگنل موصول ہوا تو اورنگ زیب نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے آن کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا خبر ہے؟...... کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ گھر پر ہی ہوگا...... آئی، سی...... ٹھیک ہے، تم لوگ آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کرو، میں دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔''

''کوئی نئی خبر؟'' سراج نے بات ختم ہونے کے بعد سوال کیا۔

''مجھے حیرت ہے کہ شیخ حامد ابھی تک اپنی کوٹھی میں ہی موجود ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں نے اسے دفتر سے روانہ ہوتے وقت نامعلوم مخبر کی حیثیت سے اطلاع دے دی تھی کہ پولیس اس کی گرفتاری کے لیے کسی وقت بھی ریڈ کرسکتی ہے اس کے باوجود آکٹوپس کا کوٹھی پر ہونا سمجھ سے باہر ہے۔'' اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ وہ کوئی چور راستہ اختیار کرلے۔''

''چور راستہ......'' سراج چونکا۔ ''میں آپ کا مقصد نہیں سمجھا۔''

''تم حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہو......'' اورنگ زیب نے پہلی بار دبی زبان میں کہا۔ ''اس شہر میں میرا تبادلہ ایک انتہائی خفیہ اسکیم کے تحت ہوا تھا جس میں ملٹری انٹیلی جنس کا اشارہ بھی شامل تھا۔ جانتے ہو کیوں؟...... ملٹری کی سیکریٹ انفارمیشن اگر غلط نہیں ہے تو شیخ حامد انڈر گراؤنڈ ورلڈ مافیا کا دوسرا سب سے بڑا فرد ہے جس کی گرفتاری میں انٹرپول بھی ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکی۔ ہم اسے جس چہرے میں دیکھ رہے ہیں وہ اس کا اصل چہرہ بھی نہیں ہے۔ مافیا کے سربراہ ایک ہی وقت میں کئی ایسے چہرے بدل لیتے ہیں کہ جس کی شناخت ان کے گھر کے افراد بھی نہیں کرپاتے اور اگر شیخ حامد کے سلسلے میں کرنل احتشام کا اندازہ درست ہے تو پھر آکٹوپس کے آٹھ خطرناک اور زہریلے ہاتھوں کی طرح اس کے فرار کے بھی کئی ایسے خفیہ راستے موجود ہوں گے، ہمیں جن کا علم ابھی تک نہیں ہوسکا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی خفیہ راستے سے نکل چکا ہو۔ اگر ایسا ہوگیا تو ہمارا یہ مشن بھی کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ یہ ناکامی خود میرے لیے بھی بے حد اذیت ناک ثابت ہوگی۔ میں نے اب تک اس کے گرد جو مضبوط شکنجے تیار کیے تھے وہ سب ایک خواب ہو کر رہ جائیں گے پھر...... شاید ہمیں اپنے مطلوبہ شکار پر ہاتھ ڈالنے کا موقع اتنی آسانی سے......''

اورنگ زیب اپنا جملہ مکمل کرتے کرتے چونکا۔ اس نے لیاقت حسین کو کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔ ''یہ تم کس

راستے پر جا رہے ہو......؟'' اورنگ زیب کے سوال کے بعد ہی سراج نے بھی محسوس کیا کہ گاڑی شیخ حامد کی رہائش گاہ کی سمت جانے کے بجائے کسی سنسان راستے پر فراٹے بھر رہی تھی۔ لیاقت حسین پوری طرح سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اورنگ زیب نے دوسری بار پشت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنا سوال دہرایا تو لیاقت حسین نے عجیب انداز میں بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''فرعون وقت ساحلی علاقے کی چٹان سے آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن قدرت ایسے گناہ گاروں کو آسانی سے قبول نہیں کرتی۔''

''تم...... تم کیا بکواس کر رہے ہو......؟'' اورنگ زیب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ سراج نے دبی زبان میں کہا۔

''صبر و تحمل سے کام لیں...... ہوسکتا ہے کہ کوئی روحانی قوت لیاقت حسین کی زبانی آپ کے کشکول میں کامیابی کا تحفہ ڈالنا چاہتی ہو۔''

اورنگ زیب نے پلٹ کر سراج کو دیکھا پھر کسی خیال کے تحت اس نے فوری طور پر گاڑی کے رخ کا اندازہ لگاتے ہوئے کرنل احتشام سے رابطہ قائم کیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''سر...... میری اطلاع کے مطابق ہمارا مطلوبہ شکار کسی خفیہ راستے سے نکل کر گڈانی کے ساحل کی طرف جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں چٹانوں پر کہیں اس کا ہیلی کاپٹر موجود ہو۔ ہمیں اس کی ناکا بندی بھی کرنی ہوگی، میں اسی طرف جا رہا ہوں...... یس سر، میں جانتا ہوں کہ ناکامی کی صورت میں مجھے جواب دینا ہوگا لیکن آپ بھی میری ایمانداری سے واقف ہیں...... یہ میری گزارش ہے سر...... رائٹ، میں ہر صورت حال کو فیس کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کا فیصلہ درست ہے سر، ہمیں اس کی قیام گاہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے...... او۔ کے سر...... تھینک یو۔'' اورنگ زیب نے رابطہ ختم کیا تو اس کے چہرے پر کامیابی اور ناکامی کے ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے۔

''کرنل نے کیا کہا......؟'' سراج نے دبی زبان میں معلوم کیا۔

''ناکامی کی صورت میں مجھے ذاتی طور پر حکومت کے سامنے جواب دینا ہوگا۔''

سراج جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔ لیاقت حسین حیرت انگیز طور پر گاڑی کی رفتار بڑھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گڈانی کے ساحل پر پہنچے تو وہاں ملٹری کے نوجوان پہلے سے موجود تھے۔ کرنل احتشام کی بلٹ پروف گاڑی بھی نظر آرہی تھی۔ اورنگ زیب گاڑی سے اتر کر سراج کے ساتھ اس کے قریب گیا تو کرنل احتشام بھی نیچے آگیا۔

''مسٹر اورنگ زیب...... تمہاری انفارمیشن پر میں نے فوری طور پر ایک ہیلی کاپٹر بھی طلب کرلیا ہے۔ میرے کچھ خاص کمانڈوز دور مار رائفلوں کے ساتھ چٹان پر پہنچ رہے ہوں گے لیکن...... اگر تمہاری انفارمیشن فیک (FAKE) ثابت ہوئی تو پھر شاید میں بھی تمہارے لیے......''

کرنل کا جملہ مکمل نہ ہوسکا، بلند چٹانوں سے کسی ہیلی کاپٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے ان کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، اس تیز شور کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر بھی چٹانوں سے بلند ہوکر سمندر کی طرف پرواز کرتا نظر آیا تو کرنل نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''اوہ!...... اوہ!...... شاید میرے آدمیوں کو وہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔''

اورنگ زیب کی حسرت بھری نظریں ہیلی کاپٹر پر مرکوز تھیں پھر...... جو کچھ ہوا اس نے کرنل کے علاوہ اورنگ زیب اور سراج کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز کردیں۔

سمندر کی طرف جاتے ہوئے ہیلی کاپٹر پر اچانک سرچ لائٹس کی تیز روشنی پڑی پھر ہیوی ڈیوٹی، دور مار رائفلوں کے شعلے بھی لپکتے دکھائی دیے۔ سب کی نظریں اسی طرف جمی تھیں جب ہیلی کاپٹر سے دو افراد سمندر میں چھلانگ لگاتے نظر آئے۔ اس کے بیس سیکنڈ بعد ہی ہیلی کاپٹر ایک دھماکے سے پھٹ گیا وہ یقیناً فائرنگ کی زد میں آگیا تھا۔

کرنل کے علاوہ اورنگ زیب کے ساتھ سراج بھی ساحل کی طرف دوڑ پڑے۔ چٹان کے اوپر سے سرچ لائٹس کا فوکس بھی اس طرف کر دیا گیا جہاں دونوں افراد گرے تھے۔ چٹان کے اوپر سے ملٹری کے کئی ماہر تیراک بھی سمندر میں چھلانگ لگاتے نظر آئے۔

''یو آر رائٹ مسٹر اورنگ زیب۔'' کرنل نے جاری آپریشن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اطلاع غلط نہیں تھی...... کاش تم کچھ دیر پہلے مجھے انفارم کردیتے تو ہم اسے راستے میں ہی دبوچ لیتے، باؤ اور، آئی ایم، پراؤڈ آف یو۔''

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرنل کے کچھ اور ماتحت بھی اس کے قریب جمع ہونے لگے۔ سب کی نظریں سرچ لائٹس کی تیز روشنی میں سمندر کی جانب مرکوز تھیں۔

دو گھنٹے تک سرچ آپریشن جاری رہنے کے دوران

کرنل نے موبائل پر احکامات جاری کر کے تازہ دم دستہ بھی طلب کرلیا۔ تقریباً صبح پانچ بجے تک سرچ آپریشن جاری رہا لیکن ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگانے والے دونوں افراد کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

''میرا خیال ہے کہ کچھ گولیاں ان دونوں کو بھی لگی ہوں گی جس کے بعد وہ مر کر سمندر کی تہ میں غرق ہو گئے ہوں۔'' کرنل نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ آپ کا اندازہ درست ہو......'' اورنگ زیب نے مضمحل لہجے میں جواب دیا۔

سرچ آپریشن کے بعد شیخ حامد کی کوٹھی پر باقاعدہ ریڈ کی گئی جہاں سے ایسے بے شمار کارآمد ثبوت ملے جو شیخ حامد کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتے تھے۔ اسی روز اس کے تمام بینک لاکرز کو بھی جن کی نشان دہی گرفتار ہونے والے ایک فرد نے کی تھی، توڑ کر ایسے مزید ثبوت حاصل کر لیے گئے جو ناقابل تردید تھے۔ ایسی متعدد فلمیں اور تصاویر بھی ملیں جن کے ذریعے بڑے آدمیوں کو بلیک میل کیا جاتا تھا۔

چوبیس گھنٹوں کے طویل آپریشن سے فارغ ہونے کے بعد کرنل احتشام نے اورنگ زیب سے کہا۔ ''آپ بھی اب گھر جا کر دو تین گھنٹے مکمل ریسٹ کریں پھر فریش ہو کر میرے آفس آجائیں، ہمیں اپنی رپورٹ تیار کر کے اوپر بھی روانہ کرنی ہے۔''

''رائٹ سر......'' اورنگ زیب نے اس وقت بھی افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

گھر واپس جاتے وقت سراج نے محسوس کیا کہ اورنگ زیب بہ دستور کسی سوچ میں غرق ہے۔

''میرا مشورہ ہے کہ اب آپ بھی شیخ حامد کو ذہن سے نکال دیں جو سمندر کی تہ میں کہیں مچھلیوں کو اپنے جسم کی غذا فراہم کر رہا ہوگا۔ خس کم جہاں پاک......''

''تم ایک بات فراموش کر رہے ہو......'' اورنگ زیب نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ''میں نے اس کا نام آکٹوپس رکھا تھا اور...... آکٹوپس سمندر کا ایسا خطرناک عذاب ہے جو اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب......؟''

''وقتی طور پر ہوسکتا ہے کہ تمہارا خیال درست ہو لیکن...... جب تک مجھے شیخ حامد کی لاش کا سراغ نہیں مل جاتا میرے وجود کے اندر ایک نامعلوم سا تجسس باقی رہے گا۔''

سراج نے اسے غور سے دیکھا لیکن کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ لیاقت حسین بڑے سکون سے ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ واپسی کے وقت اورنگ زیب نے اسے ساحل کی طرف جانے کے سلسلے میں کریدنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ سراج کو گھر چھوڑنے کے بعد اورنگ زیب دروازے ہی سے واپس لوٹ گیا۔

اسی دن شام کے اخبارات نے شیخ حامد کی تصویروں کے ساتھ اس کے خلاف ہونے والے آپریشن کی تفصیلات مختلف انداز میں شائع کی تھیں، ملٹری کے علاوہ ایس پی اورنگ زیب کی کارکردگی کے بارے میں کئی سرخیاں لگائی گئی تھیں۔

سراج کا ذاتی خیال بھی کرنل احتشام کے مطابق یہی تھا کہ شیخ حامد جو انڈر ورلڈ مافیا کا نمبر ٹو تھا، اپنے انجام کو پہنچ گیا ہوگا، اس خیال کے بعد تمام باتیں بھی دفن ہو گئی تھیں۔ کچھ کرداروں کی تفصیل اور چند واقعات کی وضاحتیں ضرور تشنہ رہ گئی تھیں...... لیکن......

ایس پی اورنگ زیب کو کئی ہفتے گزر جانے کے بعد بھی شیخ حامد اور اس کے ساتھی کے سمندر برد ہو جانے پر یقین نہیں آیا تھا، وہ ذاتی طور پر بہ دستور اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے آکٹوپس کے بچ نکلنے کے امکانات کی چھان بین کراتا رہا تھا......

ایس پی اورنگ زیب اور سراج اس وقت بھی ایک ساتھ ہی ڈی آئی جی کے دفتر میں داخل ہوئے تھے۔ ڈی آئی جی نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا، وہ کسی سے فون پر گفتگو میں مصروف تھا۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اچھے موڈ میں ہے۔

''میں نے اس وقت آپ دونوں کو ایک خوشخبری سنانے کے لیے بلایا ہے۔'' فون کریڈل پر رکھنے کے بعد اس نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا شیخ حامد کی لاش بالآخر برآمد ہو گئی؟'' اورنگ زیب نے تیزی سے دریافت کیا۔

''ڈونٹ بی سینٹی مینٹل مسٹر اورنگزیب۔'' ڈی آئی جی نے پہلو بدلا۔ ''ملٹری کے غوطہ خوروں کے علاوہ ہمارے آدمی بھی سمندر کے اس حصے کو چھان چکے ہیں لیکن......''

''کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے سر کہ ان دونوں میں کوئی ایک بھی ہمارے ہاتھ نہیں لگا؟'' اورنگ زیب کسمسا کر رہ گیا۔

''ہوسکتا ہے کہ اب تک وہ مچھلیوں کے پیٹ میں ہضم ہو چکے ہوں یا کسی طاقتور خوراک منتقل ہو چکے ہوں۔ آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ گڈانی کے ساحل پر زیادہ تر شارک اور آدم خور مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کا بڑا مجرم کسی بڑی شارک کا نشانہ بن گیا ہو؟''

''آپ کسی خوشخبری کا ذکر کر رہے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ شاید......''

''پلیز......'' ڈی آئی جی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''اب آپ شیخ حامد اور اس کے ساتھ چھلانگ لگانے والوں کو بھول جائیں۔''

اورنگ زیب نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے ابھی تک آکٹوپس کی موت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ سراج اپنی کرسی پر بہ دستور خاموش بیٹھا رہا۔

''اس وقت میں نے آپ دونوں کو اس لیے طلب کیا ہے کہ یہ خوشخبری سنا دوں کہ بہت جلد ملٹری ہائی کمان، ایک تقریب کا بندوبست کر رہی ہے جس میں آپ دونوں کو ملٹری ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔''

''یہ ہم سب کے لیے ایک اعزاز ہوگا سر۔'' سراج نے خوشی کا اظہار کیا۔

''جی ہاں لیکن...... اس کا سہرا مسٹر اورنگ زیب کے سر ہوگا۔'' ڈی آئی جی کی نظریں پھر اورنگ زیب پر مرکوز ہو گئیں اس نے ایک پل کے وقفے سے کہا۔ ''وی آر پراؤڈ آف یو مسٹر اورنگ زیب۔''

''شکریہ سر......'' اورنگ زیب نے سرسری انداز میں جواب دیا پھر بولا۔ ''ہمارے لیے یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ بڑی مچھلی کے ساتھ ساتھ اس کے گروپ کی چھوٹی مچھلیاں بھی انڈر گراؤنڈ ہو گئی ہیں۔ ہمارے آدمی ابھی تک ان مطلوبہ اشتہاری مجرموں کو گرفتار نہیں کر سکے جن کو شیخ حامد نے پناہ دے رکھی تھی۔''

''کم آن مسٹر اورنگ زیب۔'' ڈی آئی جی نے بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ''میرا مشورہ مانیں تو آپ کچھ دنوں کسی پرفضا مقام پر جا کر اچھی طرح ریلیکس کریں تاکہ آپ کے ذہن سے آکٹوپس اور اس کے گروپ کا خیال محو ہو سکے۔''

اورنگ زیب کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی آئی جی نے ریسیور اٹھا لیا۔ اس کی نظریں بہ دستور اورنگ زیب پر جمی ہوئی تھیں جن میں ستائش کے تاثرات نظر آرہے تھے لیکن...... دوسری جانب سے جو گفتگو ہوئی اس کے بعد ڈی آئی جی کا موڈ ایک دم ہی آف نظر آنے لگا۔

ریسیور واپس کریڈل پر رکھنے کا انداز بھی ایسا ہی تھا جیسے وہ اندر ہی اندر جھلس رہا ہو۔

''کیا بات ہے سر......؟'' اورنگ زیب نے دبی زبان میں پوچھا۔ کس کی کال تھی......؟''

''مرکزی وزارت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ذمے دار لوگ بھی جب غیر ذمے داری کی بات کریں گے تو پولیس کا محکمہ بھی عضو معطل بن کر رہ جائے گا۔''

''کوئی خاص حکم......؟''

''آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ڈی ایس پی لودھی کی سزا کم کرنے کی خاطر اسے دوبارہ شہری حدود میں تعینات کرنے کے احکام جاری کیے تھے لیکن اوپر سے روک دیا گیا اور آج......آج پھر اس کو آپ ہی کے کسی پولیس اسٹیشن پر تعینات کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔'' ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ''کیا آپ اسے خوشی سے قبول کرلیں گے؟''

''یہ لودھی کی کارکردگی پر منحصر ہوگا۔'' جواب بڑی صاف گوئی سے کھردرے لہجے میں دیا گیا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے اصولوں پر کسی قسم کا سودا کبھی نہیں کرتا۔ آپ اسے جس پولیس اسٹیشن پر دل چاہے تعینات کردیں پھر میں اسے ذاتی طور پر دیکھ لوں گا۔''

''لیکن اس طرح اختیارات کا غلط اور بے جا استعمال کب تک ہوتا رہے گا؟'' ڈی آئی جی ہونٹ چبانے لگا۔

''میں آپ کی سوچ سے متفق ہوں سر......خاص طور پر لودھی کا نام بھی ہمارے لیے اہم ہے۔ سب ہی جانتے ہیں وہ شیخ حامد کا خاص آدمی ہے۔'' اورنگ زیب نے ایک لمحہ توقف کے بعد سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''شیخ حامد اگر واقعی مرچکا ہے تو پھر لودھی کو خاص طور پر میرے انڈر کیوں دیا جارہا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں......'' ڈی آئی جی نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔ آپ کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟''

''لودھی کے ٹرانسفر کی بات ایک بار پھر میرے اس شبہے کو تقویت دے رہی ہے کہ آبی مخلوق میں آکٹوپس کی حیثیت بھی خاص اہمیت کی حامل ہے، اس کے آٹھ ہاتھ بڑے سے بڑے خطروں سے بھی ٹکرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں مرتا سر......''

''پلیز مائی ڈیئر......'' ڈی آئی جی نے زیرلب مسکرا کر کہا۔ ''آپ اپنے ذہن سے اب شیخ حامد کو کھرچ کر نکال دیں، کرنل احتشام کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ خس کم جہاں پاک ہوچکا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر لودھی کو خاص طور پر میرے سر کیوں نتھی کیا جارہا ہے؟''

''ڈونٹ وری......'' ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ لودھی کے لیے اور کیا صورت نکالی جاسکتی ہے۔''

''نو سر......'' اورنگ زیب نے بڑی گہری سنجیدگی اور ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ لودھی کو میرے پاس آنے دیں......میں خود ہی دیکھ لوں گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔''

ایک لمحے کو کمرے میں پھر خاموشی طاری ہوگئی پھر ڈی آئی جی نے موضوع بدل کر کہا۔

''جہانگیر بٹ (جگا) اور امداد علی کو ان کا ریکارڈ صاف ہونے کی وجہ سے رہائی کے آرڈر جاری کردیے گئے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں سر......''

''وشنو اور لوچن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''وہ دونوں انڈر ورلڈ کے خطرناک لوگ ہیں۔ خاص طور سے رام دیال عرف وشنو زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ انٹرپول کے لوگ اب بھی اس کی تلاش میں ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے کہ ان کی گرفتاری کے بعد کرنل احتشام نے ان دونوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ورنہ پولیس کے لیے وہ دردسر بھی بن سکتے تھے۔''

''سر......'' سراج نے پہلی بار ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ہماری حکومت ذاتی طور پر ان دونوں کے خلاف قانونی ایکشن لے گی یا انہیں انٹرپول کے سپرد کردیا جائے گا؟''

''اس کا فیصلہ بھی مرکزی حکومت کرے گی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ایک سابقہ معاہدے کے تحت کم ازکم وشنو کو ضرور انٹرپول کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔''

چائے آجانے کی وجہ سے گفتگو کا رخ تبدیل کردیا گیا، ڈی آئی جی نے ایک بار پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔ اورنگ زیب بھی بہ ظاہر ریلیکس نظر آرہا تھا جب کچھ دیر بعد ڈی آئی جی کے ڈائریکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فوری طور پر کال ریسیو کی لیکن دوسری جانب سے جو اطلاع ملی اسے سن کر وہ بھی پریشان نظر آنے لگا۔

''ڈونٹ وری سر......'' اس نے ملنے والی اطلاع کے جواب میں بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ابھی سارے علاقے کے ایس پیز کو مطلع کیے دیتا ہوں......رائٹ

او، کے......جیسا آپ کہہ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔''

''کیا بات ہے سر......'' ڈی آئی جی کے فون ریسیو کرنے کے بعد اورنگ زیب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ''کس کی کال تھی......کوئی اہم اطلاع ہے؟''

''جی ہاں......'' ڈی آئی جی نے کرسی پر کسمساتے ہوئے جواب دیا۔ ''وشنو اور لوچن دونوں کرنل احتشام کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ یہ اس روز کی بات ہے جس روز ان دونوں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ ہیڈ کوارٹر جاتے ہوئے کچھ لوگوں نے اچانک ہنگامہ کرکے ان دونوں کو فرار کا موقع فراہم کردیا تھا۔''

''اور اس اہم خبر کی اطلاع ہمیں اب دی جارہی ہے؟'' اورنگ زیب نے تلملا کر کہا۔ ''اب تک وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئے ہوں گے۔''

''کرنل احتشام نے اس خبر کو اب تک کیوں خفیہ رکھا یہ وہی بہتر جانتے ہیں۔ بہرحال، اب ہمیں سارے تھانوں کو الرٹ رہنے کا حکم دینا ہوگا۔''

ڈی آئی جی نے تمام علاقے کے ایس پیز سے رابطے کا سلسلہ شروع کردیا۔ وشنو اور لوچن کے فرار کی خبر نے اسے خاصا پریشان کردیا تھا۔ فون کالز سے فرصت پانے کے بعد اس نے اورنگ زیب اور سراج کو مخاطب کیا۔ ''آپ دونوں کو بھی مفرور مجرموں کی تلاش میں فوری ضروری اقدام کی ضرورت ہے۔''

''ہم غافل نہیں رہیں گے سر......'' اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا پھر چند رسمی جملوں کے بعد وہ اور سراج باہر آگئے۔ دونوں ایک ساتھ ہی آئے تھے اس لیے واپسی بھی ایک ساتھ ہی ہوئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر اورنگ زیب تھا جس کی نظریں سامنے سڑک پر مرکوز تھیں۔ اس نے ڈی آئی جی آفس سے باہر آنے کے بعد ابھی تک وشنو اور لوچن کے فرار کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ سراج خاصی دیر تک اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا پھر دبی زبان میں پوچھا۔

''کیا لوچن اور وشنو کے فرار کی اطلاع نے آپ کو زیادہ متاثر نہیں کیا؟''

''خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔'' اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا پھر سراج سے مسکرا کر پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''آئی سی......'' سراج نے مزید کریدنے کی خاطر ایک شبہے کا اظہار کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ملٹری ہیڈ کوارٹر پہنچ جانے کے بعد وشنو اور لوچن کو فرار ہونے کا ایسا موقع نہیں مل سکتا تھا جو راستے میں فراہم کردیا گیا۔''

''میں فی الحال تمہارے اس خیال پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔'' اورنگ زیب نے شانے اچکا کر کہا۔ اس کا جواب مبہم ہونے کے باوجود بہت واضح تھا۔

☆☆☆

شبنم کی بے ہوشی کی کیفیت آہستہ آہستہ دور ہورہی تھی۔ ذہن میں گھپ اندھیروں اور شائیں شائیں کی آوازیں کم ہوئیں تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کو اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جس ٹھکانے پر اسے رکھا گیا تھا وہاں سے جبرو اسے ساتھ لے کر اسلم ڈنکا کے پاس گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے سن کر شبنم کا ذہن بھک سے اڑ گیا تھا۔ بگ باس کے حکم کے مطابق شبنم کو گولی مار کر اسلم ڈنکا کو جہنم رسید کرنا تھا۔ اس کے بعد جبرو شبنم کو بھی ختم کردیتا۔ لیکن اس سے پیشتر اسلم ڈنکا اور جبرو کے درمیان شبنم کو مل بانٹ کر کھانے کی جو بات ہوئی وہ شبنم کے لیے موت کے کرب سے زیادہ اذیت ناک تھی، اس نے طے کرلیا تھا کہ مرجائے گی لیکن خود کو برباد نہیں ہونے دے گی پھر......کھیل کا پانسا اچانک پلٹ گیا تھا، کچھ نامعلوم افراد عین وقت پر درمیان میں آگئے تھے۔ اسلم ڈنکا اور جبرو، دونوں کو دبوچ لیا گیا۔ شبنم کو کسی نے اس کی کنپٹی پر ایک آزمودہ کاری ضرب لگا کر بے ہوش کردیا تھا اور اب......آنکھ کھلنے پر وہ اپنے فلیٹ میں موجود تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نظر اس کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو اس کے سینے پر رکھا تھا۔ پیغام مختصر مگر بے حد معنی خیز تھا۔

''خود کو صرف اپنے فلیٹ تک محدود رکھنے کی کوشش کرنا۔ ہوا میں اڑنے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بھیانک ہی ہوگا۔ اپنی زبان بند رکھنا، اسی میں تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔ تمہارا موبائل تکیے کے نیچے موجود ہے، اس پر کسی کو کال کرنے کی حماقت نہ کرنا۔ جو کال بگ باس کے حوالے سے موصول ہو اس پر بلا کسی چوں وچرا عمل کرنا۔''

اس پیغام کو پڑھ کر اس کی عقل دنگ رہ گئی۔ بگ باس کی موت کی اطلاع وہ بھی اخباروں میں تفصیل سے پڑھ چکی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے خود کو اپنے فلیٹ تک ہی محدود رکھا۔ اورنگ زیب کے پاس سے نکلنے کے بعد وہ جن حالات سے گزر چکی تھی اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ خود کو

ایک ہی خول میں بند رکھے۔
ایک ہفتے تک اس کے موبائل پر کسی نے کال نہیں کی، اس دوران وہ افضل خان اور میڈم روبی کے بارے میں صرف ذہنی جمناسٹک کرتی رہی۔ وہ ایک ہی ماحول میں رہتے رہتے اکتا گئی تھی جب اس وقت موبائل گنگنانے لگا جبکہ وہ ایک پرانے اخبار کو الٹنے پلٹنے میں مصروف تھی۔ موبائل کی گھنٹی سن کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ ایک لمحہ وہ خالی نظروں سے موبائل کو دیکھتی رہی پھر تیسری گھنٹی پر اس نے موبائل اٹھا کر آن کر لیا۔
"شبنم بول رہی ہوں......" اس نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔
"تم نے میرا پیغام پڑھ لیا ہوگا؟" دوسری جانب سے ایک غیر مانوس آواز ابھری۔
"میں ابھی تک اسی پر عمل کر رہی ہوں لیکن......"
"لیکن...... اگر...... مگر...... کون اور کیوں کے چکر میں مت پڑو۔" جھڑک کر سرد لہجے میں کہا گیا۔ "جو کچھ کہا جائے صرف اسی پر عمل کرو۔"
"ٹھیک ہے......" شبنم نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ زبان کھولنے کی جرأت کر سکتی۔
"کنول کو جانتی ہو؟"
"جی ہاں......"
"وہ آج کسی وقت بے ہوشی کی حالت میں تم تک پہنچا دی جائے گی۔ ہوش آنے پر تم کل اسے اس کے گھر پہنچا دینا۔ یہ بھی سمجھا دینا کہ اسے بھی زبان بند ہی رکھنی ہوگی۔ دوسری شکل میں زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"
"او۔ کے۔"
"میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہیں اپنے فلیٹ پر زیادہ سکون مل رہا ہوگا۔"
"جی...... جی ہاں۔"
"یہ سکون بھی اسی وقت تک قائم رہے گا جب تک ہر ملنے والی ہدایت پر عمل کرتی رہو گی۔ دوسری صورت میں حالات تمہارے لیے پہلے سے زیادہ بدصورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔"
"میں سمجھ رہی ہوں۔" شبنم نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔
"تم کچھ سوال کرنا چاہتی تھیں......" اس بار قدرے نرم لہجے میں پوچھا گیا۔
"جو خبریں اخبارات میں آ چکی ہیں اس کو پڑھنے کے بعد بگ باس کا حوالہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔" شبنم ڈرتے ڈرتے کہا۔
"اخبارات ہمیشہ مرچ مسالا لگا کر عوام کو خبریں سنا رہتے ہیں۔ فی الحال اس چکر میں مت پڑو...... اور کچھ۔"
"افضل خان کے بارے میں......"
"تمہاری زبان سے افضل خان کا نام سن کر تعجب نہیں ہوا۔" اس کی بات کاٹ کر سوال کیا گیا۔ جاننا چاہتی ہو؟"
"وہ...... بس یونہی خیال آ گیا تھا۔" اس نے کر جواب دیا۔ "بہت دنوں سے وہ نظر نہیں آیا۔"
"فی الحال وہ اسپتال میں ہے۔ اسے ایس اورنگ زیب نے گولی مار کر زخمی کیا تھا۔"
"کس جرم کی پاداش میں؟"
"تم جانتی ہو کہ مجھے کرید کرنے والے لوگ پسند نہیں ہیں......" دوسری جانب سے ناگواری کا اظہار کیا گیا۔
"سوری سر......"
"آئندہ احتیاط رکھنا۔" کچھ توقف سے کہا گیا۔ "ویسے تم چاہو تو افضل خان سے مل سکتی ہو، ہو سکتا ہے تمہیں پھر کسی وقت اس کی ضرورت پڑے۔"
"سر...... کیا میں کسی اہم ضرورت کے وقت آپ کو فون کر سکتی ہوں؟"
"نہیں...... فی الحال ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔"
دوسری طرف سے کال منقطع کر دی گئی تو شبنم بڑی اضطراری کیفیت میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ بگ باس کے حوالے سے وہ کال اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اگر وہ زندہ تھا تو کیا پولیس اور ملٹری کے افسران کو اس کی اطلاع نہیں تھی اور...... اگر وہ مر چکا تھا جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوتی رہی تھی تو پھر بگ باس کے حوالے سے فون کرنے والا کون تھا؟

⁂⁂⁂

والدین کے آ جانے سے جہاں لیاقت حسین اور فرحین خوش تھے وہاں سرفراز خان بھی بہت زیادہ مسرور تھا۔ اس کے اور سیٹھ عثمان کے کاروباری تعلقات خاصے پرانے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا جب وہ شہر آیا تھا۔ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہونے کی وجہ سے وہ اسی ماحول میں رہنا پسند کرتا تھا۔
لیاقت حسین اور فرحین بہ دستور دوسرے بنگلے کی انیکسی میں تھے جبکہ راحیلہ بیگم نے شوہر کے مشورے کے بعد سردار سرفراز خان اور اس کی بیوی کے لیے اپنے بنگلے کے مہمان خانے میں رہنے کا بندوبست کیا تھا۔ راحیلہ بیگم کو لیاقت حسین کی والدہ بے حد پسند آئی تھی۔ وہ سیدھی سادی نیک اور عبادت گزار عورت تھی جبکہ سرفراز خان اپنی ریاستی حیثیت کے مطابق رکھ رکھاؤ قائم رکھنے کا عادی تھا۔ لیاقت حسین اور فرحین کا بھی زیادہ وقت سیٹھ عثمان کے بنگلے میں گزرتا تھا۔
سرفراز خان چونکہ پہلی بار شہر آیا تھا اس لیے وہ ان کاروباری افراد سے بھی ملتا رہا جن سے اس کا لین دین تھا۔ ذاتی ملاقاتوں کے سبب اس کو اندازہ بھی ہوا کہ شہر کے تاجر اس سے کس حساب سے مال خریدتے ہیں اور بیرونی منڈیوں میں کس قدر مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سرفراز خان نے براہ راست سیٹھ عثمان کو اعتماد میں لے کر بات کی تو سیٹھ عثمان نے اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ بھی براہ راست بیرونی منڈیوں سے رابطہ قائم کرے جس میں منافع کی گنجائش مقامی منڈیوں سے دو تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس پرخلوص مشورے کے ساتھ ہی سیٹھ عثمان نے اسے ایسے مخلص کارندے بھی فراہم کر دیے جو اس کام کا پرانا تجربہ رکھتے تھے۔
اس وقت بھی سرفراز خان اسے ایک کاروباری شخص سے ملاقات کے لیے لے جا رہا تھا۔ لیاقت حسین نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا، وہ باپ کے سامنے حسب عادت بہت لیے دیے رہتا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر سرفراز خان نے گفتگو کی ابتدا کی۔
"عثمان سیٹھ واقعی ہیرا آدمی ہے، تمہارا اماں بھی بہت خوش ہے۔"
"میرے ساتھ بھی سب بالکل اپنے سگے رشتہ داروں کی طرح پیش آتے ہیں۔" لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بیگم صاحب نے تو فرحین کو بہن بنا رکھا ہے۔"
"تم خوش قسمت ہے جو تم کو ایسے بھلے لوگ مل گئے ورنہ شہر میں کاروباری لوگ اپنا نفع و نقصان سے زیادہ کسی بات کا خیال نہیں رکھتے۔"
"ایک بات پوچھوں بابا......؟" لیاقت حسین نے دبی زبان میں کہا۔ "کیا آپ باہر کی منڈیوں میں کاروبار شروع کرنے کے بعد سیٹھ صاحب کے ساتھ لین دین ختم کر دیں گے؟"
"یہ بات تمہارا دماغ میں کیوں آیا؟" سرفراز خان نے تیز آواز میں کہا۔ "کیا میں اتنا خود غرض ہوں کہ جس بھلے آدمی نے مجھے زیادہ منافع کمانے کا راستہ دکھایا ہے میں اسی کے ساتھ دغا کروں گا۔"
"میرا مطلب بھی یہی تھا کہ......"
"تم غلط سوچ رہا ہے میری جان۔" اس بار سرفراز خان نے قدرے محبت بھرا انداز اختیار کیا۔ "تمہارا سیٹھ عثمان یہی بول رہا تھا کہ میں ذاتی طور پر اپنا کاروبار کروں لیکن میں نے اسے اپنا شریک بنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اس طرح ہم دونوں کو پہلے کے مقابلے میں دوگنا سے بھی زیادہ منافع ہوگا۔"
"کیا یہ بات پکی ہو گئی ہے؟"
"وہ شریف آدمی ہے۔ تم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی وجہ سے وہ مشترکہ کاروبار سے ہچکچا رہا ہے لیکن میں اسے تیار کر لوں گا۔"
باپ بیٹے کے درمیان گفتگو کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ان کی منزل نہیں آ گئی، لیاقت حسین نے فینسی ماربلز کے شوروم کے سامنے پہنچ کر گاڑی پارک کر دی، یہ شہر کا سب سے بڑا تاجر تھا جو صرف اور صرف ماربل کا کاروبار کرتا تھا، سرفراز خان کا سب سے زیادہ لین دین بھی اسی سے تھا۔
لیاقت حسین گاڑی پارک کر کے تیزی سے نیچے اترا۔ پھر باپ کے ساتھ شوروم کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جب سرفراز خان اچانک لڑکھڑا گیا، لیاقت حسین کا خیال تھا کہ غالباً اس کا پاؤں الجھ گیا تھا لیکن جب اس نے باپ کے بائیں شانے سے خون بہتے دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا، خون جس رفتار سے بہہ رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ کسی نے بے آواز ریوالور یا رائفل سے اس پر فائر کیا تھا۔
ماربل کے شوروم پر کھڑے ہوئے ملازم بھی دوڑ پڑے، وہاں کا مالک بھی تیزی سے باہر آ گیا، فوری طور پر لیاقت حسین اپنے باپ کو ایک قریبی اسپتال لے گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کے شبہے کی تصدیق کر دی۔ ڈاکٹر نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔
"یہ تمہارے باپ کی خوش قسمتی تھی کہ گولی ہڈی سے نہیں ٹکرائی ورنہ اس کا ہاتھ کسی کام کے لائق نہ رہتا۔"
لیاقت حسین نے بچوں کی طرح سسکتے ہوئے پوچھا۔
"ڈاکٹر صاحب...... کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟"
"پریشان مت ہو، ہم نے گولی جسم سے نکال لی ہے۔ ضروری بینڈیج کے بعد اسے کمرے میں منتقل کر دیا

جائے گا۔ ویسے اگر مریض دو چار روز اسپتال میں رہے تو ہم اس کی بہتر طور پر دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔"

حادثے کی اطلاع پا کر سیٹھ عثمان نے بھی اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ شاید ماربل کمپنی کے مالک نے انہیں خبر دی تھی، انہوں نے ڈاکٹر سے مل کر سرفراز خان کو وی آئی پی روم میں منتقل کرا دیا۔ سیٹھ عثمان کے آجانے سے اسپتال کا عملہ بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

سرفراز خان کو سکون کی خاطر نیند کا انجکشن لگا دیا گیا۔ سیٹھ عثمان لیاقت خان کو تسلی دے رہے تھے۔

"فکر مت کرو، میں نے سرجن سے بھی براہ راست بات کر لی ہے۔ سرفراز خان کو دو روز بعد گھر منتقل کر دیا جائے گا۔ البتہ زخم بھرنے میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔ خدا کا شکر ہے، گولی ہڈی سے نہیں ٹکرائی۔"

"کیا ماں کو بھی خبر ہو گئی ہے؟"

"نہیں......" سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں نے فی الحال مصلحتاً اس حادثے کی اطلاع سوائے سراج کے اور کسی کو نہیں دی، تم بھی ہمت سے کام لو، گھر والوں کو خبر ہوتی تو وہاں بھی ایک کہرام مچ جاتا۔"

پندرہ منٹ بعد سراج بھی آگیا تو تینوں دوسرے کمرے میں آگئے۔ سرفراز خان کے پاس ایک میل نرس تعینات تھا۔ "کیا یہ پتا نہیں چلا کہ گولی کس نے چلائی تھی؟" سراج نے ایک ضمنی سوال کیا۔

"اگر پتا چل جاتا صاحب تو میں اس کو بھی جہنم رسید کرنے میں دیر نہ کرتا۔" لیاقت حسین کا جذباتی ہونا قدرتی امر تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" سراج نے سیٹھ عثمان سے پوچھا۔

"یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن بہ ظاہر میں اسے کاروباری رقابت ہی سمجھ رہا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں......؟"

"سرفراز خان بیرونی منڈیوں سے براہ راست کاروبار کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے فیصلہ کر رہا تھا جس سے بہت سارے مقامی تاجر بھی متاثر ہوتے اس لیے کہ ماربل کے ایکسپورٹ میں مارجن آف پرافٹ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ تاجروں کو یہ بات پسند نہ آئی ہو۔"

"لیکن میرا باپ مر جاتا تو پھر ان کو مال کون سپلائی کرتا؟" لیاقت حسین نے تلملا کر سوال کیا۔

"ہمت سے کام لو لیاقت حسین......" سراج نے اسے سمجھایا۔ "تمہارے والد کے کچھ رقیب تمہارے علاقے میں بھی ضرور ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے اپنے مفاد کی خاطر اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔"

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ قدم اٹھا کر دوبارہ باپ کے کمرے میں چلا گیا۔

"سرفراز خان کو پیش آنے والا حادثہ میرے لیے بڑی شرمندگی کا باعث ہے۔" سیٹھ عثمان نے لیاقت کے جانے کے بعد کہا۔ "میری ذاتی خواہش ہے کہ تم اس معاملے کی خاص طور پر چھان بین کرو۔ مجرم اگر بچ کر نکل گیا تو وہ دوبارہ بھی اپنی کمینگی کا ثبوت دینے سے دریغ نہیں کرے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ سرفراز خان کے اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد ہی اسے کچھ دنوں میں سمجھا بجھا کر رخصت کر دوں۔"

"مجھے تمہاری پوزیشن کا اندازہ ہے لیکن ابھی جلدی نہ کرنا ورنہ لیاقت حسین کو اس کا احساس ہوگا۔"

سراج نے اپنا جملہ ختم کر کے اس علاقے کے ایس ایچ او کو فون کیا جہاں حادثہ پیش آیا تھا لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی، ایس ایچ او نے یہی جواب دیا تھا کہ اس نے بھی محض اس حادثے کی خبر سنی ہے لیکن...... ابھی تک باقاعدہ رپورٹ نہیں درج کرائی گئی۔

"ٹھیک ہے، آپ باقاعدہ رپورٹ درج ہونے کا انتظار کرتے رہیں۔" سراج نے اپنی خفگی کے اظہار کے ساتھ ہی رابطہ ختم کر دیا۔

"تمہارے تھانے والوں کو آخر اپنی ذمے داری کا احساس کب ہوگا؟" سیٹھ عثمان نے سراج کو چھیڑا۔

"جس علاقے کا معاملہ ہے وہ میرے انڈر نہیں ہے ورنہ ایس ایچ او ابھی خود بھاگا چلا آتا۔" سراج نے بڑی سنجیدگی سے وضاحت کی۔ "ہمارے تھانے کی نفری ہمیشہ متعلقہ اور غیر متعلقہ کے اصولوں پر دم ہلانے کی عادی ہوتی ہے۔ جب تک اوپر کا نظام نہیں سدھرے گا نچلی سطح پر بھی لوگ اپنا اپنا راگ الاپتے رہیں گے۔"

سراج نے ذاتی طور پر آپریشن کرنے والے سرجن سے ملاقات کر کے اپنا تعارف کرایا پھر وہ گولی اپنی تحویل میں لے لی جو کسی رائفل ہی کی ثابت ہوئی تھی۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



جھوٹ

تحریر: تنویر ریاض

اپنے پیار اور احساسات کی محافظ ایک حسینہ کا امتحان

جیسے ایک بدفطرت انسان کے لیے کوئی بھی اچھا کام بنا کسی ذاتی مفاد کے کرنا مشکل ہوتا ہے ایسے ہی کسی نیک سیرت انسان کے لیے کسی برے کام کا ارادہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ کئی رشتوں کے لیے بھی ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ اس کی فطرت میں جھوٹ بولنا شامل نہیں تھا مگر اب اسی بے ساکھی کے ساتھ اسے باقی زندگی گزارنا تھی اور یہ بوجھ آہستہ آہستہ کسی کی زندگی کا روگ بنتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک روز وہ بے ساکھی ٹوٹ گئی۔

میں کافی ہاؤس میں بیٹھا گرم گرم کافی کی چسکیاں لے رہا تھا کہ اچانک میری نظر میز پر پڑے ہوئے اخبار پر گئی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے اس کے صفحات پلٹنا شروع کیے اور ایک تصویر پر میری نظریں گویا جم کر رہ گئیں۔ میرے حلق سے ایک سرد آہ برآمد ہوئی اور میں خبر کو غور سے پڑھنے لگا۔

"کیا بات ہے سارجنٹ۔ کافی تو ٹھیک ہے نا؟" میرے پاس سے گزرتی ہوئی ویٹریس کیٹ بولی۔ ایک بار

میں نے اسے ایک بدتمیز گاہک سے بچایا تھا تب سے ہی وہ میرا خاص خیال رکھنے لگی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اس کی وجہ سے اس کافی ہاؤس میں جایا کرتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

''کافی بہت اچھی ہے۔'' میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا لیکن میں ابھی تک اپنی اعصابی کیفیت پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ اخبار میں شائع ہونے والی خبر کی سرخی نے مجھے بے چین کردیا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ''بارہ برس پہلے دفن ہونے والی لاش کی شناخت ہوگئی۔'' اس کے ساتھ ہی ڈیم کی تصویر چھپی ہوئی تھی جسے میں نے فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ مجھے اس تصویر کے نیچے اس کا پورا نام ڈی میٹرو کاربل پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس چہرے کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ وہی بے ترتیب بال، آنکھوں میں ناچتی ہوئی وحشت، بائیں گال پر زخم کا نشان اور سختی سے بھنچے ہوئے ہونٹ، وہ سو فیصد ڈیم ہی کی تصویر تھی۔

میں نے کچھ روز پہلے سنا تھا کہ جنگل کے قریب درختوں کے جھنڈ میں کھدائی کے دوران ایک لاش برآمد ہوئی تھی۔ اس میدانی حصے میں ایک نئے مکان کی تعمیر کے لیے بنیادوں کی کھدائی ہورہی تھی کہ وہاں سے ایک انسانی ڈھانچا ملا۔ پولیس کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق اس لاش کو بارہ سال پہلے دفن کیا گیا تھا۔ موت کی وجہ نہیں معلوم ہوسکی تھی۔ البتہ ماتھے پر ایک گولی کا سوراخ تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے اسے قتل کرکے جنگل میں دفن کردیا تھا۔

گوکہ میں بوسٹن کے مضافات میں پوٹنم کے علاقے میں رہتا ہوں لیکن فال ریور میرا آبائی شہر ہے اور میں اس جگہ کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں جہاں سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ میرے تجسس کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ میں ایک پولیس سراغ رساں تھا اور ان دنوں میری تعیناتی پوٹنم میں تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ ڈیم بارہ سال پہلے اچانک ہی غائب ہوگیا تھا لیکن جب میں نے کھدائی کے دوران ملنے والی ناقابلِ شناخت لاش کے بارے میں سنا تو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ لاش ڈیم کی ہوسکتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی کو قتل کرکے جنگل میں دفن کرسکتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ خود بھی ان مقتولین کی صف میں شامل ہوگیا ہے۔

کیٹ خالی برتن اٹھانے آئی تب بھی میں اسی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

''سارجنٹ، کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں، جانتا ضرور ہوں لیکن یہ میرا دوست نہیں تھا۔'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

اس نے میری پیالی میں گرم گرم کافی انڈیلی اور تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کس قدر خوفناک چہرہ ہے، میں تو کبھی اسے یہاں دیکھنا پسند نہ کروں۔''

''ہاں کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہی خوف آنے لگتا ہے۔''

میں اسے ڈیم کے ماضی کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا...... ورنہ وہ مزید خوفزدہ ہوجاتی اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس خبر سے تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔

''اس کے چہرے پر زخم کا نشان کیسا ہے؟'' کیٹ بولی۔ ''تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

میں نے کندھے اچکا دیے اور وہ بھی سر ہلا کر رہ گئی جیسے جانتی ہو کہ ایسے لوگوں کو اس طرح کے زخم لگتے ہی رہتے ہیں۔ جب وہ چلی گئی تو مجھے یاد آیا کہ اسکول کے زمانہ میں ٹیچر زمیری اس عادت سے بہت نالاں تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ کندھے اچکانا اس بات کی علامت ہے کہ تم جانتے ہوئے بھی کچھ چھپا رہے ہو اور یہ ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ اس بات کو کئی برس گزر گئے اور میری یہ عادت پختہ ہوتی چلی گئی۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں دن میں کئی بار جھوٹ بولتا اور سنتا ہوں اور کندھے اچکا کر رہ جاتا ہوں لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈیم کو یہ زخم کیسے لگا کیونکہ یہ زخم میں نے ہی اسے لگایا تھا۔

❖❖❖

میں سارا دن ایک ٹیلی فون کال کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ اگر بوسٹن کے اخباروں میں یہ خبر چھپ سکتی ہے تو فال ریور کا میڈیا کیسے پیچھے رہ سکتا تھا جبکہ لاش بھی وہیں کے قریبی جنگل سے برآمد ہوئی تھی۔ اس رات میں نے اپنے والدین کو فون کیا اور اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ یہ خبر ہر اخبار اور ٹی وی پر آچکی ہے۔ ہمارے درمیان ڈیم کے بارے میں مختصر سی گفتگو ہوئی اور مجھے ان سے بھی جھوٹ بولنا پڑا کہ میں اسے نہیں جانتا۔ انہوں نے اس کا بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ اس بارے میں کچھ جانتے تھے۔

دوسری صبح تک بھی میں اس فون کال کا انتظار کرتا رہا جس کی مجھے توقع تھی۔ مجبوراً مجھے خود ہی فون کرنا پڑا۔ دوسری طرف سے میری کزن فلورا بول رہی تھی۔

''ہائے فلورا! کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک۔'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس بار میں نے اسے فون کیا تھا جبکہ وہی ہمیشہ مجھے فون کرتی تھی۔

''تم نے ڈیم کے بارے میں کچھ سنا؟''

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، تمام اخبارات اور ٹی وی چینلز پر یہ خبر آچکی ہے۔''

شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ یہ ظاہر کرے جیسے اسے اس خبر کے بارے میں معلوم نہ ہو لیکن وہ بہت سچی اور دیانت دار عورت تھی۔ میں بچپن میں اسے مذاق میں کہا کرتا تھا کہ تم سے تو شیطان بھی شرما جائے۔ یہ جملہ میں نے اسکول کی ایک ٹیچر سے سنا تھا جو ہمیشہ اپنے طالب علموں کو تلقین کیا کرتی تھی۔

''ہمیشہ سچ بولو کہ شیطان کو بھی شرم آئے۔''

''ہینری گھر پر ہے؟'' میں نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

''نہیں۔ وہ کام پر گیا ہوا ہے۔ کیا تم اس سے بات کرنا چاہ رہے تھے؟''

''مجھے تم سے ہی بات کرنا تھی، آج سہ پہر میں میرے پاس دو گھنٹے کا وقت ہے۔ کیا میں تم سے ملنے آسکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہوگی۔ اس بہانے تم اپنے والدین سے بھی مل سکو گے۔''

''شاید آج اس طرف نہ جاسکوں۔'' میں نے اسے جتادیا کہ خاص طور پر اس سے ہی ملنے آرہا ہوں۔

میں اکثر پچاس میل کا فاصلہ طے کرکے فال ریور جایا کرتا تھا جہاں میرے والدین، دادا دادی اور خاندان کے دیگر افراد رہائش پذیر تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کے مکانات شہر کے قدیم ترین گرجا کے گردونواح میں تھے جبکہ فلورا اپنے شوہر ہینری اور سات بچوں کے ساتھ پیرس میں رہا کرتی تھی گوکہ ہینری کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا لیکن بچوں کی پیدائش کے معاملے میں اس کا تعاون مثالی تھا اور یہی وجہ تھی کہ تیرہ سال میں ان کے یہاں سات بچے ہوچکے تھے۔ جب بھی وہ کام پر جانے کے بارے میں سوچتی تھی۔ اس کے یہاں ایک نیا مہمان آجاتا اور اس طرح اس کی آمدورفت صرف والدین کے گھر تک محدود ہوجاتی تھی جو اسی عمارت کی پہلی منزل پر رہتے تھے جبکہ فلورا کی رہائش دوسری منزل پر تھی۔

میں گزشتہ چند سالوں سے پوٹنم میں پولیس کی ملازمت کررہا تھا اور چار سال پہلے سراغ رساں بن چکا تھا۔ گوکہ ابھی تک مجھے اپنا ریوالور نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی اور اس سے میرا تعلق صرف صفائی کرنے یا نشانہ بازی کی مشق کرنے تک ہی محدود تھا لیکن سترہ سال کی عمر میں ایک لڑائی کے دوران مرتے مرتے بچا تھا۔ اس جھگڑے کی ابتدا فلورا سے گفتگو کے بعد ہوئی۔ اس وقت تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ پہلی منزل پر رہا کرتی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل پندرہ سال کی ہوگی جب اس کی ملاقات ڈیم سے ہوئی۔ وہ دو ماہ تک اس سے ملتی رہی لیکن جب ڈیم کی نیت خراب ہوئی تو اس نے قطع تعلق کرلیا کیونکہ ڈیم کا مطالبہ پورا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ڈیم جیسے آوارہ مزاج شخص کو اس کا یہ انکار گراں گزرا اور اس نے اسے آتے جاتے تنگ کرنا شروع کردیا۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتی۔ وہ اس کا پیچھا شروع کردیتا اور اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر رہ کر الٹی سیدھی بکواس کرتا رہتا۔

''میں تمہیں بتا نہیں سکتی گلبرٹ کہ وہ مجھے کیا کچھ کہتا رہتا ہے۔'' اسے کچھ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر بآسانی پڑھ سکتا تھا۔

معاملہ صرف باتوں یا آوازے کسنے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ڈیم نے اس کا راستہ روکنا شروع کردیا اور اس کے بازو کو اتنی مضبوطی سے پکڑا کہ اس پر نیل پڑ گئے۔ اس نے مجھے وہ نشان دکھاتے ہوئے التجا کی کہ میں اس کی مدد کروں اور ڈیم کو سمجھاؤں کہ اس کا پیچھا چھوڑ دے۔

''تم فکر نہ کرو، یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔'' میں نے فلورا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں واقعی یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اس گفتگو کے اگلے روز ہی وہ مجھے نظر آگیا۔ وہ تقریباً میری ہی عمر کا تھا لیکن میں اس سے قد میں لمبا اور کم از کم بیس پاؤنڈ زیادہ وزنی بھی تھا لیکن میں اس سے لڑنا نہیں چاہ رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے بآسانی سمجھا لوں گا کہ وہ فلورا کا پیچھا چھوڑ دے۔ وہ جانتا تھا کہ میں فلورا کا کزن ہوں لہٰذا مجھ

گیا کہ میں اس سے کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ ابھی میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ ''فلورا......'' کہ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا اور مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دھکا دیا۔ میں سڑک پر گر پڑا اور وہ مجھ پر سوار ہو گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ میرا گلا گھونٹنا چاہ رہا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اسے مکا رسید کیا اور ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ میں نے کسی دھاتی اوزار کے کھلنے کی آواز سنی۔ میں اسے سن کر اپنی جگہ منجمد ہو گیا، ڈیم ایک تیز دھار چاقو کے ساتھ مجھ پر جھکا ہوا تھا جیسے میرا گلا کاٹنا چاہ رہا ہو۔ چاقو اس کے بائیں ہاتھ میں تھا اور یہ میری غلطی تھی کہ میں نے پہلے اس بارے میں نہیں سوچا۔ خوش قسمتی سے میں سیدھے ہاتھ سے کام کرتا ہوں لہٰذا جب میں نے دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑی تو اسے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے باوجود میں گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ انتہائی طیش کے عالم میں مجھ پر حاوی ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اگر میرے دائیں ہاتھ کی گرفت ذرا بھی کمزور پڑتی تو اس کا بہت برا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ جب میں نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی تو چاقو کا پھل میرے چہرے کے بالکل قریب آ گیا۔ میں نے مایوسی کے عالم میں اپنا گھٹنا اس کے پیٹ کے نیچے دے مارا۔ اس کے حلق سے ایک درد بھری چیخ نکلی لیکن چاقو کا پھل بہ دستور میرے چہرے کے قریب ہی رہا۔ میں کسی طرح اپنا پاؤں اوپر اٹھانے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی مدد سے اسے دور دھکیل دیا۔

دوسرے لمحے مجھے اپنی چھاتی پر خون کے دھبے محسوس ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا آدھا چہرہ کسی خربوزے کی قاش کے مانند کٹ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں حیرت دیکھ کر اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا پھر اس نے اپنا ہاتھ چہرے پر پھیرا تو وہ خون میں تربتر ہو گیا۔ وہ زور زور سے چلانے لگا جیسے کوئی کتا بھونک رہا ہو پھر اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں خون میں ڈوب گئی تھیں اور اس کے قطرے زمین پر گر رہے تھے۔

میں کچھ دیر سکتے کے عالم میں وہاں کھڑا رہا اور اپنی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی پھر میں نے چاقو اٹھایا اور اس کی نوک کو سڑک پر دبا کر اسے بند کر دیا۔ جانتا تھا کہ اس طرح میری انگلیوں کے نشان اس کے دستے پر آ جائیں گے لیکن اس وقت میں اس بارے میں نہیں سوچ رہا تھا بلکہ میرے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ [ڈیم] نے مجھے مارنے کی کوشش کیوں کی۔ اگر میں اپنا دفاع کرتا تو وہ میری گردن پر چاقو پھیر چکا ہوتا۔

میں نے اپنی خون آلود قمیص اتاری اور اسے گولے کی شکل میں لپیٹ کر کارڈوزا مارکیٹ کی عقبی گلی میں رکھے ہوئے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس چاقو سے بھی جان چھڑا لی۔ یہ جگہ اسکول کے احاطے سے پچاس گز کے فاصلے پر تھی لیکن مجھے جلد بازی میں اس کا انتخاب کرنا پڑا۔ اس بار بھی میں نے کوئی اچھی تیاری نہیں کی تھی۔

میرے والدین کام پر گئے ہوئے تھے لہٰذا میں نے سب سے پہلے اپنے چہرے، ہاتھوں اور گردن پر سے خون کے دھبے صاف کیے پھر دوسری قمیص پہنی اور کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باہر جھانکنے لگا۔ اب مجھے انتظار تھا کہ کب پولیس کار سائرن بجاتی ہماری گلی میں آتی ہے یا ڈیم اپنے ہاتھ میں شاٹ گن لیے مجھے مارنے آتا ہے۔

ممی کے والدین یعنی میرے نانا اور نانی ایک بلاک کے فاصلے پر رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک پرانی شاٹ گن تھی، میرے دل میں خواہش ابھری کہ اپنا دفاع کرنے کے لیے کسی طرح وہ گن حاصل کر لوں لیکن ان کی گھر پر موجودگی کی وجہ سے یہ اتنا آسان نہیں تھا اور اگر میں کوئی چھوٹی سی کہانی سناتا، تب بھی وہ مجھے گن نہ دیتے اور اگر میں انہیں حقیقت بتا دیتا کہ ڈیم کس طرح فلورا کو تنگ کر رہا تھا تو شاید میری نانی خود ہی گن لے کر دوڑی چلی آتیں۔

میں، پولیس اور ڈیم، دونوں کا انتظار کرتا رہا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا اور میں ان کے انتظار میں گھر پر ہی بیٹھا رہا، تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ میں نے وقوعہ والے روز گھر آتے ہی فلورا کو فون کر کے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اخبارات میں بھی اس بارے میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی اور نہ ہی ٹیلی وژن نے کچھ بتایا۔ ایک طرح سے میرے حق میں یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ تیسرے دن اندھیرا پھیلنے سے پہلے میں گھر سے نکلا اور کارڈوزا مارکیٹ کی طرف چل دیا۔ مجھے اس ثبوت کے بارے میں پریشانی ہو رہی تھی جو تین دن پہلے میں کوڑے کے ڈرم میں پھینک آیا تھا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ میں نے پنجوں کے بل اپنے جسم کو اوپر اٹھا کر ڈرم میں جھانکا۔ وہ بالکل خالی تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ڈرم خالی ہونے

کا مطلب یہ تھا کہ وہ ثبوت اب شہر کے کوڑے کے ڈھیر میں منوں کچرے تلے دفن ہو چکا ہے اور اب اس کی برآمدی کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں۔

اتوار کی صبح میں نے ڈیم کو فون کیا تا کہ جان سکوں کہ وہ کس حال میں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ غصہ ٹھنڈا ہونے پر اسے احساس ہو گیا ہو گا کہ غلطی اسی کی تھی۔ اگر وہ چاقو نہ نکالتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ میں نے تو صرف اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ماں نے فون اٹھایا اور کہا کہ ڈیم اپنے چچا کے پاس نیو ہیڈ فورڈ میں ہے۔ وہ بالکل بھی پریشان نہیں لگ رہی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ ڈیم نے گھر والوں کو اس زخم کے بارے میں کیا کہانی سنائی ہو گی کیونکہ جب میں نے اس کی ماں کو اپنا نام بتایا تب بھی اس نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا بس اتنا کہا کہ اسے ڈیم کی واپسی کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے اور اگر میں چاہوں تو اس سے چچا کے نمبر پر بات کر سکتا ہوں۔ میں نے وہ نمبر لکھ لیا لیکن اس پر کبھی فون نہیں کیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں لیکن ڈیم واپس نہیں آیا۔ میں نے دوبارہ کالج جانا شروع کر دیا۔ بعد میں مجھے فلورا کا خط ملا جس میں اس نے ڈیم کی واپسی کی اطلاع دی تھی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ نیو ہیڈ فورڈ میں اپنے چچا کے ساتھ کشتی پر مچھلیاں پکڑتا رہا ہے۔ اس نے فلورا کو فون کر کے اپنے رویہ پر معافی مانگی اور کہا کہ وہ مجھے بھی بتا دے کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی برے جذبات نہیں ہیں۔

میں فلورا کی بات سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈیم جیسے بدطینت اور کینہ پرور شخص سے یہ امید کس طرح کی جا سکتی تھی کہ اس کے دل میں میرے لیے برے جذبات نہ ہوں۔ اگر وہ اتنا ہی نیک اور معصوم ہوتا تو فلورا سے ایسا مطالبہ نہ کرتا جسے پورا کرنا کسی بھی شریف لڑکی کے لیے ممکن نہیں۔

پانچ ماہ بعد اس نے نیو ہیڈ فورڈ میں ایک شخص سے جھگڑا کیا جس کے نتیجے میں وہ شدید زخمی ہو گیا اور مرتے مرتے بچا۔ ڈیم کو سزا کے طور پر چار سال کے لیے کیڈر جنکشن کے اصلاحی مرکز بھیج دیا گیا۔

٭٭٭

اب اس واقعہ کے سولہ سال بعد یہ خبر ملی کہ بارہ سال پہلے ڈیم کو کسی نے قتل کر کے اس کی لاش جنگل میں دفن کر دی تھی۔ فلورا نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔ وہ سات بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ایک بھرپور عورت تھی اور اس کی جسمانی دلکشی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کی چار سالہ بیٹی تھریسا، لونگ روم میں بڑے ٹی وی اسکرین پر کارٹون دیکھ رہی تھی۔ گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ فلورا نے خود ہی اس کی وضاحت کی اور بولی۔ ”جوزف سو رہا ہے اور بڑے بچے اسکول گئے ہوئے ہیں۔“

ہم دونوں کچن ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ فلورا نے کافی بنائی اور بولی۔ ”ایسی کیا خاص بات ہے گلبرٹ جس کے لیے تمہیں یہاں آنا پڑ گیا؟“

”ڈیم!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”اسے کیا ہوا؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”کیا اس نے کبھی تمہیں پریشان کیا۔ میرا مطلب ہے اس واقعہ کے بعد جب میری اس سے لڑائی ہوئی تھی؟“

”نہیں۔ اس نے دوبارہ کبھی پریشان نہیں کیا۔“

”کیا تم نے اس واقعہ کے بعد اسے کبھی دیکھا؟“

”یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے نہ دیکھتی۔ چچا کے یہاں سے واپس آنے کے بعد وہ اسی علاقے میں رہ رہا تھا۔ میں نے اسے چند مرتبہ دیکھا تھا پھر وہ کچھ عرصے کے لیے جیل چلا گیا۔“

”میں لفظوں سے نہیں کھیل رہا فلورا! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا کیا مطلب ہے؟“

”ہاں اور میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس لڑائی کے بعد اس نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا، لیکن تم یہ سب کچھ کیوں جاننا چاہ رہے ہو؟“

”اس جگہ کی وجہ سے جہاں سے اس کی لاش ملی ہے۔“

وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی اور بولی۔ ”اس جگہ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”خاص بات یہ ہے کہ اسکول کے زمانے میں میرا ایک دوست خرگوش اور گلہری کا شکار کھیلنے اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا جب مجھے پہلی بار بندوق ملی تھی۔“

اس نے سر ہلایا اور میری بات پوری ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”فلورا، میں تمہیں جو خاص بات بتانا چاہ رہا ہوں کہ ان میں سے ایک لڑکا ہینری تھا جو وہاں شکار کے لیے جاتا رہتا تھا اور اکثر تنہا ہی ہوتا تھا۔“

میں اس کے ردعمل کا بہ غور مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ حیران ضرور ہوئی لیکن اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

”ہینری کا اس معاملہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جبکہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ڈیم نے مجھے دوبارہ تنگ نہیں کیا۔“

”تم نے ہینری سے ملنا کب شروع کیا؟ غالباً اس وقت تم آخری سال میں تھیں۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں، تب میں سترہ برس کی تھی۔“

ہائی اسکول پاس کرنے کے فوراً بعد ہی اس کی شادی ہو گئی تھی۔ دس مہینے بعد اس کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ یہ تقریباً بارہ سال پرانی بات تھی۔

”کیا وہ ڈیم کے بارے میں جانتا ہے۔ میرا مطلب ہے ہینری۔“

”ہاں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں نے ڈیم سے قطع تعلق کیوں کیا۔ اسے شروع سے ہی معلوم تھا کہ میں اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں۔“

”ڈیم نے تمہیں کبھی دوبارہ دھمکی نہیں دی؟“ میں نے اسے کریدا۔ نہ جانے مجھے کیوں اس کی باتوں میں جھول محسوس ہو رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہی تھی۔

”جیل سے آنے کے بعد بھی اس نے تمہیں کچھ نہیں کہا؟“

”نہیں کبھی نہیں۔ یہ بات مجھے کتنی بار بتانا ہو گی۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔

”جب تک مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہ آ جائے۔“ میں نے دل میں سوچا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ بول رہی تھی لیکن کسی حد تک یہ بھی جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ جھوٹ بولنے اور کچھ چھپانے میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگر اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تو سب کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔

چار سالہ تھریسا لونگ روم سے باہر آ گئی تھی۔ فلورا مجھے نظر انداز کر کے اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”فلورا! یہ سب کیا ہے؟ تم مجھے پوری بات کیوں نہیں بتا رہی ہو؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو، تم مجھے سب کچھ بتا دو، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“

”تم بار بار ایک ہی بات دہراتے جا رہے ہو گلبرٹ! میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے اور یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں پریشان ہوں۔ کیا تم اسی لیے یہاں آئے تھے کہ میرے شوہر پر ڈیم کے قتل کا الزام عائد کر سکو۔ اب تم مجھ سے کیا توقع کر رہے ہو؟“

”سچ، میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں سچ سننا ہے تو سنو، ڈیم بہت برا شخص تھا۔ سر سے پاؤں تک برائی میں لپٹا ہوا۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک دوسرے شخص کو زخمی کرنے کے الزام میں اسے جیل بھی ہوئی لیکن اس کے باوجود میں نے کبھی نہیں چاہا کہ وہ مر جائے۔ اس نے کبھی مجھے دوبارہ تنگ نہیں کیا پھر میں کیوں اس کی موت کے بارے میں سوچتی۔ یہی سچ ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا۔“

ہاں وہ سچ بول رہی تھی لیکن یہ پورا سچ نہیں تھا۔

”میں نے کبھی تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے نہیں سنا۔ ایسا جھوٹ جس پر شیطان بھی شرما جائے۔“

میرا خیال تھا کہ اس جملے پر وہ مسکرائے گی مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”تم اپنے آپ کو بہت اسمارٹ سمجھتے ہو لیکن ایسا لگتا نہیں ہے۔“

اس کی ناراضی بجا، اس کے لیے میں اسے کوئی الزام نہیں دے سکتا تھا۔ میں اس کے غصہ سے بھی واقف تھا لیکن اب ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں کوئی اور احساس بھی شامل ہو گیا۔ شاید پچھتاوا یا ایسی ہی کوئی اور بات لیکن جب وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز میں ایک التجا تھی۔

”کیا کوئی ایسا قانون ہے جس میں بیوی کو اپنے شوہر کے خلاف گواہی دینے کی اجازت نہ ہو؟“

”نہیں، البتہ قانون یہ کہتا ہے کہ کبھی شادی شدہ شخص کو اس کے رفیق زندگی کے خلاف گواہی دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن تم اپنی مرضی کے مطابق بولنے میں آزاد ہو۔ یہ بتاؤ کہ ڈیم نے آخری بار تم سے کیا بات کہی تھی؟“

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ”میں نے ہینری کو بتا دیا تھا کہ ڈیم نے مجھے دھمکی دی ہے۔ کیونکہ میرے یہاں زچگی ہونے والی تھی اور اس طرح میرے ہونے والے بچے کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ البتہ تمہیں صرف یہ بتا رہی ہوں کہ میں نے اپنے شوہر سے کیا کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک ہی دفعہ ڈیم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوفزدہ کر دے گا۔“

”جب ڈیم اچانک غائب ہو گیا تو تم نے سوچا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہو گا؟“

”میں کیا سوچ سکتی تھی، اس کے بارے میں اچھی

طرح جانتی تھی کہ وہ کتنا خطرناک شخص ہے۔ اس نے تمہیں جان سے مارنے کی کوشش کی پھر نیو ہیڈفورڈ میں ایک شخص پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اسی لیے میں نے ہینری کو اس بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

مجھے اپنے تمام سوالوں کے جواب مل چکے تھے لیکن یہاں آکر میری حدود ختم ہوجاتی تھیں کیونکہ میرے پاس حقائق نہیں تھے۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ میں کسی اور شخص سے تحقیقات کے لیے رابطہ کرتا اور میرے پاس جو معلومات تھیں وہ اسے بتا دیتا۔

فلورا نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم کسی اور سے بھی اس بارے میں بات کرنے والے ہو؟“

”میں نہیں جانتا۔“

اور یہ سچ بھی تھا۔ میں ہینری کو صرف اس لیے موردالزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو ملنے والی دھمکی کو سنجیدگی سے لیا۔ ممکن ہے کہ اس نے اپنے دفاع میں ڈیم پر گولی چلائی ہو۔ ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا کہ اس نے یہ قتل کیا ہے۔ اس واقعہ کو کئی برس بیت چکے تھے۔ اس لیے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ یہ قتل کب اور کس وقت ہوا تھا۔ لہٰذا ہینری کی جائے وقوعہ سے دوری کے بارے میں بھی سوچنا بے کار تھا، ضروری نہیں کہ ہینری کے پاس کوئی ہتھیار ہو اور نہ ہی کوئی گولی برآمد ہوئی تھی لہٰذا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ سوائے اس یقین کے کہ ہینری نے ہی یہ قتل کیا ہوگا اور یہ میرا فرض تھا کہ اس معاملے کی تہ تک پہنچوں۔

میں یہ بات فلورا کو سمجھانے ہی والا تھا کہ وہ بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ ہینری نے تمہیں کبھی زیادہ پسند نہیں کیا۔“

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔“

”لیکن وہ نہیں جانتا کہ تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا کیونکہ میرا اپنا کوئی بھائی نہیں ہے۔ جب بھی مجھے کوئی مشکل پیش آئی۔ میں نے ہمیشہ تمہاری ہی طرف دیکھا اور تم نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔“

میں مسکرا دیا۔ ممکن ہے کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن یہ بات قابل غور تھی کہ جب ڈیم اسے دھمکانے آیا تب اس نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی اور اپنے شوہر کو مجھ پر ترجیح دی۔ ٹھیک ہے کہ ہینری اس کا شوہر تھا۔ اس کی بیوی اور ہونے والا بچہ خطرے میں تھے۔ میں تو اس وقت پ[illegible] مین بھی نہیں تھا۔

”تم نے ڈیم کے چہرے پر جو زخم لگایا تھا۔ ا[illegible] وجہ سے وہ بھی تم سے شدید نفرت کرنے لگا تھا اور اس[illegible] ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لے گا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسی کوشش ضرور کرے گا۔“

”تم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ میں کبھی جھوٹ نہ[illegible] بولتی۔ آج میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ میں نے ایک دفعہ[illegible] زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ بولا تھا۔ اس شخص سے جو[illegible] شوہر ہے۔“

کمرے سے ننھے جوزف کے رونے کی آواز[illegible] لیکن فلورا نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے دیکھا ا[illegible] کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”کیا ہوا فلورا؟“ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

اس نے اپنا سر ہلایا اور بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”[illegible] نہیں سمجھ سکو گے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بچے کو دیکھنے چلی گئی۔ اس [illegible] اپنے شوہر سے کیا جھوٹ بولا ہوگا۔ کیا اس نے ہینری [illegible] یہ بات چھپائی ہوگی کہ وہ شادی سے پہلے کنواری نہیں تھی۔ اس پر یقین کرنا بہت مشکل ہے پھر وہ کون سا جھوٹ ہے جس کے بارے میں وہ اس قدر پریشان ہو رہی ہے۔

وہ بچے کو لے کر واپس آئی تب بھی اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ”یہ بھوکا ہے۔ میں اسے لے کر لونگ رو[م] میں جا رہی ہوں۔“

دوسرے لفظوں میں وہ کہہ رہی تھی کہ اب مجھے بھ[ی] چلے جانا چاہیے۔

”ہاں۔ میں بھی اب چلتا ہوں۔ اس کافی کے لیے تمہارا شکریہ۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کے گالوں کو بوسہ دیا، بچے کو تھپکی دی اور تھریسا کو خدا حافظ کہا جس نے جواب میں اپنا ہاتھ اٹھا دیا لیکن ٹیلی وژن پر سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

”مجھے افسوس ہے۔“ فلورا بولی۔

میں نے جواب میں سر ہلا دیا لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پر اظہار افسوس کر رہی تھی۔ میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور کہا۔ ”اگر میں اس بارے میں کسی فیصلہ پر پہنچ سکا تو اس سے پہلے تمہیں فون کروں گا۔“

”اس کے پاس گن بھی تھی۔“

”تم ہینری کی بات کر رہی ہو۔“

”نہیں۔ ہنری کے پاس تو کئی بندوقیں ہیں۔ و[ہ] شکار کا شوقین ہے اور اب بھی شکار پر جاتا ہے۔ میں ڈیم کی بات کر رہی ہوں۔ اس نے مجھے وہ گن دکھائی بھی تھی۔“

”جب وہ تمہیں دھمکی دینے آیا تھا؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور جوزف کو لے کر لونگ روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

گاڑی چلانے کے دوران بھی میں اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ فلورا کی باتوں سے کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس کے جملوں کو یکجا کر کے کوئی مطلب نکالنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اچانک ہی جیسے میں کسی نتیجے پر پہنچ گیا لیکن یہ وہ نہیں تھا جس پر میں غور کرنا چاہ رہا تھا۔

میں نے ایک جگہ گاڑی روکی اور فلورا کا نمبر ملایا۔

”ہاں بولو۔“ اس کی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔

”تم نے دو باتیں ایسی کہی ہیں جن پر مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میری بات پوری ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

”جب ڈیم نے تمہیں اپنی بندوق دکھائی تھی تو کیا یہ وہی وقت تھا جب تم نے ہینری کو بتایا کہ وہ تمہیں دھمکی دے رہا ہے؟“

”ہاں، یہ بات میں تمہیں بتا چکی ہوں۔“

”تم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے پاس میری ایک تصویر بھی تھی۔ شاید یہ بھی اسی وقت کی بات ہے۔“

”یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ فلورا۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ بہتر ہوگا کہ میں بھی اسے بھول جاؤں۔“

”کیا تم نے اسی لیے فون کیا تھا؟“

ہاں یہی وجہ تھی لیکن ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بھولا۔ وہ میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی اور میں اس تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میرے گریجویشن کرنے کے بعد اخبار میں چھپی تھی اور ڈیم نے فلورا کو وہ تصویر دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مجھ سے اپنا بدلہ ضرور لے گا۔ اس وقت وہ جیل سے رہا ہو کر آچکا تھا۔ فلورا یہ دھمکی سن کر خوفزدہ ہوگئی کیونکہ ڈیم کے پاس پستول بھی تھا اور وہ جانتی تھی کہ میں غیر مسلح ہوں اور ہینری کے پاس کئی بندوقیں تھیں اور وہ ان کا استعمال بھی جانتا تھا۔

اب میں سمجھ گیا کہ اس نے شوہر سے سب سے بڑا جھوٹ کیا بولا ہوگا۔ یہی کہ ڈیم اسے دھمکا رہا ہے جبکہ اس نے مجھ سے بدلہ لینے کی بات کی تھی۔ فلورا جانتی تھی کہ میں غیر مسلح ہونے کی وجہ سے اپنا دفاع نہیں کر سکوں گا۔ چنانچہ اس نے ڈیم کو راہ راست پر لانے کے لیے ہینری کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ ہینری ڈرا دھمکا کر اسے سیدھا کر دے گا۔ اگر ڈیم اسے بتاتا کہ اس نے فلورا کو کوئی دھمکی نہیں دی بلکہ اس کا اصل نشانہ میں ہوں تب بھی وہ اس کی بات پر یقین نہ کرتا۔

”فلورا“ میں نے جذباتی آواز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ یہ سب کچھ کس طرح پیش آیا ہوگا اور اس کے لیے میں صرف تمہارا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔ ویسے تمہارے جھوٹ پر تو شیطان کو بھی شرم آگئی ہوگی۔“

مجھے اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تم مجھے بہت عزیز ہو گلبرٹ۔“

میں نے فون بند کر دیا اور فلورا کے بارے میں سوچنے لگا، وہ مجھے سب کچھ بتانا چاہ رہی تھی اور اس نے مجھے اس کی وجہ بھی بتا دی تھی یعنی یہ کہ میں اس کے لیے بڑے بھائی جیسا تھا اور اسے میری سلامتی ہر حال میں عزیز تھی۔ ممکن ہے کہ اس نے گرجا میں جا کر اپنے اس سب سے بڑے جھوٹ کا اعتراف بھی کر لیا ہو لیکن ڈیم کی لاش دریافت ہونے کے بعد وہ خوف زدہ ہوگئی اور اس نے محسوس کیا کہ اسے سب کچھ بتا دینا چاہیے کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور اس نے یہ مجھ پر چھوڑ دیا کہ میں اس بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہوں۔

میں نے سیٹ کی پشت سے کمر لگالی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں اس آخری منظر کا تصور کر رہا تھا جب ہینری کی انگلی ٹریگر پر تھی اور ڈیم کو اس وقت تک بھی مکمل یقین نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اسے ہینری کے کہے ہوئے آخری الفاظ بھی سمجھ میں نہ آسکے جو اس نے ڈیم کے احتجاج کے جواب میں اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہے تھے۔ شاید ان کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

”فلورا کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔“

اس جھوٹ کی وجہ سے مجھے ایک دشمن سے نجات مل گئی تھی لہٰذا میرے لیے یہی مناسب تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لوں۔



جزائے سزا

مرزا امجد بیگ

جس طرح ایک باشعور اور سلجھی ہوئی عورت کسی خاندان کا غرور ہوتی ہے اسی طرح بھٹکی ہوئی عورت پوری نسل کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے... زر کی ہوس اگر زن کے اندر پیدا ہوجائے تو آنکھ بند کرکے دلدل میں اتر جاتی ہے... بالآخر ان بیماریوں کا علاج مسیحا خانوں میں نہیں بلکہ تھانوں اور عدالتوں میں کیا جاتا ہے، کیونکہ مجرمانہ جرائم کسی بھی انسان کی دماغی حالت کو مشکوک بنا سکتے ہیں... لیکن اس دوران کئی بے گناہوں کو اتنی بڑی سزا مل جاتی ہے جس کی جزا سوائے اللہ کے کسی کے پاس ممکن نہیں۔ اسے بھی بنا کسی جرم کے جیل کی سلاخوں کے حوالے کر دیا گیا مگر ایسے میں مرزا صاحب کسی مسیحا کے روپ میں سامنے چلے آئے۔

دلیلوں کے ہتھیار کے ساتھ میدان میں اترنے والے

امجد بیگ کا منفرد انداز

وہ بہت عجیب و غریب، خطرناک بلکہ بھیانک کیس تھا۔ یہ ہما شما کے بس کی بات نہیں تھی۔ بڑے سے بڑا وکیل اس میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبرا رہا تھا، کیونکہ کیس کے پس منظر سے یہی دکھائی دیتا تھا کہ اس میں کامیابی کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

مسز سفیان کئی وکیلوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد میرے پاس آئی تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ کئی سال پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا۔ پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک صاحبِ ثروت خاتون تھی۔

میں نے حسبِ دستور پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور اپنی میز کی دوسری جانب بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تشریف رکھیں۔“

”شکریہ۔“ کہتے ہوئے اس نے تشریف رکھ دی۔

مسز سفیان کا اصل نام عطیہ بیگم تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ بہت ہی رکھ رکھاؤ والی خاتون نظر آتی تھی۔ خوش شکل اور جسم مائل بہ فربہی۔ اس نے قیمتی جیولری کے ساتھ عمدہ قسم کی ساری زیب تن کر رکھی تھی۔

”جی فرمایئے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”آپ کتنے بہادر وکیل ہیں؟“

”بہادر...... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

مجھے اس کے انداز سے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کسی خطرناک درندے کے شکار پر بھیجنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”مطلب یہ کہ آپ سیدھے سادے کیس لینا پسند کرتے ہیں یا پیچیدہ نوعیت کے کیسز میں آپ کو زیادہ دلچسپی محسوس ہوتی ہے؟“

”مجھے پیچیدہ اور الجھن زدہ مقدمات کو ڈیل کرکے

زیادہ خوشی ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''گڈ۔'' اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور بولی۔ ''اس کا مطلب ہے میں بالکل صحیح جگہ پہنچ گئی ہوں......''

اس کے بعد عطیہ بیگم نے مجھے بالتفصیل بتایا کہ وہ مجھ سے پہلے کتنے وکیلوں کے دفاتر کے چکر لگا چکی تھی اور کسی بھی جگہ سے اسے تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔ سب نے یہی کہا تھا کہ اس کیس میں کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہر حال، وہ کوشش کریں گے......!

عطیہ بیگم یقیناً یہی چاہتی تھی کہ جو بھی وکیل اس کے کیس میں ہاتھ ڈالے وہ کوشش کرے مگر اسے کامیابی کا سو فیصد یقین بھی دلائے۔ ایسا چونکہ ابھی تک نہیں ہوا تھا جبھی وہ بے حد مایوس اور پریشان نظر آرہی تھی۔ میرے حوصلہ بخش الفاظ نے اس کے چہرے پر اطمینان کی کرن چمکا دی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ ''لگتا ہے، آپ کا کیس بہت ہی گنجلک اور چکردار ہے؟''

''ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ کیس واقعی بہت پیچیدہ اور حساس ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''لیکن یہ کیس میرا نہیں ہے۔''

''آپ کا نہیں ہے۔'' میں نے الجھ کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''پھر کس کا کیس ہے؟''

''میرے چھوٹے بھائی ریحان کا۔''

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بھائی کو کیا ہوا ہے؟''

''ریحان بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔'' اس نے ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بتایا۔ ''اور اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''اس نے کون سے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے؟''

''یہی تو بات ہے کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولی۔ ''ریحان سو فیصد بے گناہ ہے۔''

''میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ پولیس نے اسے کس الزام کے تحت عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کیا ہے؟''

''اس پر آبروریزی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اوہ......!'' میں نے چونکتے ہوئے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''اس پر کس کو بے آبرو کرنے کا الزام ہے؟''

''شاہدہ کو۔''

''یہ شاہدہ کون ہے؟''

''سلمیٰ کی بیٹی۔''

''اور یہ سلمیٰ کون ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''سلمیٰ ریحان کی بیوی ہے۔'' مسز سفیان نے بتایا۔

''کیا مطلب؟'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ''کیا ریحان نے اپنی بیٹی کو......''

''نہیں۔'' اس نے بڑی قطعیت سے قطع کلامی کی۔

''پھر......؟'' میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''شاہدہ، سلمیٰ کی سگی اور ریحان کی سوتیلی بیٹی ہے۔'' اس نے معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''چار سال پہلے ریحان کی بیوی عالیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ عالیہ سے ریحان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ایک سال تک اس نے تن تنہا زندگی گزاری پھر سلمیٰ سے اس کے مراسم ہو گئے۔ سلمیٰ نے بہت کم وقت میں ریحان کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور ان مراسم کے دو ماہ بعد ہی ان کی شادی ہو گئی۔ شاہدہ، سلمیٰ کے پہلے شوہر قادر کی بیٹی ہے۔ سلمیٰ کے بہ قول قادر ایک اوباش اور شرابی شخص تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ لہٰذا اس نے قادر سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''سلمیٰ سینتالیس اڑتالیس سے کم کی نہیں لیکن بلاشبہ وہ ایک پرکشش اور حسین عورت ہے۔ ریحان اس کی خوب صورتی پر مرمٹا تھا اور سلمیٰ کی دکھ بھری کہانی نے اس کا دل کچھ زیادہ ہی موم کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تین سال پہلے ریحان نے سلمیٰ سے شادی کر لی اور شاہدہ کو ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھ لیا۔''

''لیکن پھر یہ واقعہ؟'' میں نے الجھن زدہ نظروں سے عطیہ بیگم کی جانب دیکھا۔

''میں حلفیہ کہتی ہوں کہ ریحان کا اس واقعے سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''وہ سرا بے قصور ہے۔ اسے بڑے منظم انداز میں اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''ریحان کے خلاف ایسی سازش کون کر سکتا ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''سلمیٰ۔'' اس نے بڑے دھڑلے سے جواب دیا۔

''لیکن سلمیٰ ایسا کیوں کرے گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''شاہدہ تو اس کی اپنی بیٹی ہے نا؟''

''ہاں شاہدہ، سلمیٰ کی سگی بیٹی تو ہے......'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

''پھر......؟''

''پھر یہ کہ......'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ ''سلمیٰ سے شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد ریحان پر یہ انکشاف ہوا کہ اس نے زندگی کی بھیانک غلطی کی ہے۔ سلمیٰ کردار کی کوئی اچھی عورت نہیں تھی اور وہ غیر محسوس انداز میں شاہدہ کو بھی اپنی راہ پر ڈال چکی تھی۔ ریحان سے شادی کا مقصد ایک مستحکم اور محفوظ آڑ حاصل کرنا تھا۔ ریحان کی مالی پوزیشن بھی مضبوط تھی اور اسے معاشرے میں ایک باعزت مقام بھی حاصل تھا۔ جب سلمیٰ کی خفیہ صلاحیتیں پوری طرح ریحان پر کھلیں تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس دوران میں اس کی سلمیٰ سے شادی کو لگ بھگ ڈھائی سال گزر گئے تھے اور وہ پوری طرح اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بعض تجربے کارانہ گر کی مدد سے ریحان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ عالیہ میں کوئی کمی تھی اور نہ ہی اس (سلمیٰ) میں کوئی خرابی ہے۔ اگر ریحان ابھی تک باپ نہیں بن سکا تو اس میں سراسر خود اس کی نالائقی کا دخل ہے۔ اس من گھڑت انکشاف کے بعد ریحان نفسیاتی طور پر سلمیٰ کے دباؤ میں آ گیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے فٹ تھا اور فٹ ہے مگر سلمیٰ نے اپنی چال بازی سے ریحان کے ذہن میں ایک مخصوص سوچ بھر دی تھی تاکہ وہ اس سے دبا رہے اور اسے اپنے مذموم مقاصد میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی تو میں نے پوچھ لیا۔ ''آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلمیٰ کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی لیکن پھر بھی یہ واقعہ کیا معنی رکھتا ہے؟''

''آپ کا اندازہ کسی حد تک درست ہے بیگ صاحب۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولی۔ ''جب تک صورت حال ریحان پر آشکار نہیں ہوئی تھی سلمیٰ اور شاہدہ کا کھیل بڑی کامیابی سے چل رہا تھا لیکن جب ریحان اس مکروہ سرگرمی سے پوری طرف واقف ہو گیا تو پھر گھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے تو سلمیٰ نے آئیں بائیں شائیں کر کے بات کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب ریحان نے اسے اپنی زندگی اور گھر سے نکال باہر کرنے کی خطرناک دھمکی دی تو سلمیٰ نے معافی تلافی کر کے ایک موقع حاصل کر لیا۔ اس نے ریحان سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دے گی۔''

''کیا سلمیٰ نے اپنا وعدہ نبھایا تھا؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''اگر نبھایا ہوتا تو پھر یہ نوبت ہی کیوں آتی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس بدمزگی کے بعد چند دن امن و سکون سے گزر گئے۔'' وہ ایک مضمحل سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''پھر یہ واقعہ پیش آ گیا۔''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

''میں سمجھتی ہوں، وہ چند روزہ امن و سکون کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھے۔'' وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ سلمیٰ کی ایک گہری چال تھی۔ وہ یہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ ریحان اس کا مقصد پورا نہیں ہونے دے گا۔ وہ ریحان جیسی اسامی کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی تھی اور ریحان کی مخالفت یا مداخلت بھی اسے گوارا نہیں تھی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر ایک خطرناک منصوبہ بنایا اور شاہدہ کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ ان دونوں کی ملی بھگت سے وہ ڈراما رچایا گیا ہے جس کے نتیجے میں میرا چھوٹا بھائی ریحان اس وقت تھانے کی حوالات میں بند ہے۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''سلمیٰ کو یقین ہے کہ اس کی سازش کے نتیجے میں ریحان ایک لمبے عرصے کے لیے جیل چلا جائے گا۔ وہ چونکہ اس کی منکوحہ ہے لہٰذا ریحان کے جیل چلے جانے کے بعد اس کی تمام جائداد، مال اور کاروبار پر سلمیٰ کا قبضہ ہو جائے گا اور وہ بڑے ٹھاٹ کے ساتھ اپنا کاروبار عیاشی جاری رکھ سکے گی لیکن......''

اس نے لمحے بھر کو تھم کر نفرت بھرے انداز میں دانت کچکچائے پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن میں اس نامراد کا منصوبہ کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ میں پیسا پانی کی طرح بہاؤں گی۔ نہ صرف ریحان کو اس کیس سے باعزت بری کرواؤں گی بلکہ اس بدکردار عورت کو بھی ریحان کی زندگی سے نوچ کر کسی غلاظت بھرے گڑھے میں پھینکوں گی۔ مجھے صرف ایک اچھے وکیل کی تلاش تھی اور وہ میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔''

عطیہ بیگم کے ایک ایک لفظ سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ جو کچھ پیش آچکا تھا اس کے ردعمل کے طور

پر اس کا رویہ غلط نہیں تھا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے پوچھا۔ ''مسز سفیان! یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''تیس اپریل کی رات کا۔'' اس نے جواب دیا۔

آج مئی کی چار تاریخ تھی۔ میں نے عطیہ بیگم سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ریحان کو پولیس کسٹڈی میں ابھی تین چار دن ہی ہوئے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ریمانڈ کی مدت کب پوری ہو رہی ہے؟''

''عدالت نے پولیس کو سات مئی تک کا ریمانڈ دے رکھا ہے۔'' عطیہ بیگم نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، پولیس آٹھ مئی کو چالان عدالت میں پیش کرے گی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر مسز سفیان سے استفسار کیا۔ ''کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ وقوعہ کی رات حالات کس انداز میں پیش آئے تھے؟''

یہ ایک انتہائی نازک سوال تھا لیکن حالات اور کیس کی نوعیت اس سوال کا تقاضا کرتی تھی۔ اس نے ایک لمحے گومگو کی کیفیت میں میرے چہرے کا جائزہ لیا پھر جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

''میں جتنا جانتی تھی وہ آپ کو بتا چکی ہوں۔ اگر آپ مزید تفصیل جاننا چاہتے ہیں تو تھانے جا کر ریحان سے ایک ملاقات کر لیں۔''

''وہ تو میں کروں گا ہی۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا بھائی کون سے تھانے کی حوالات میں بند ہے؟'' اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا پھر سوال کیا۔

''بیگ صاحب! آپ فیس ایڈوانس میں لیں گے یا......؟''

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔ تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''فیس تو میں ایڈوانس ہی میں لیتا ہوں خاتون، یہی میرا اصول ہے۔''

''اپنی فیس بتا دیں۔'' وہ اپنے ہینڈ بیگ کی زپ کھولتے ہوئے بولی۔ ''تاکہ مجھے اطمینان ہو کہ آپ نے ریحان کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔''

میں نے اسے اپنی فیس سے آگاہ کیا۔ اس نے میری فیس کے برابر، بڑی مالیت کے کرارے نوٹ گن کر میری جانب بڑھا دیے۔ میں نے اس رقم کو گنے بغیر اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا۔ وہ حیرت سے بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ نے پیسے گنے نہیں؟''

''گن لیے ہیں۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

''لیکن!'' اس کی حیرت میں الجھن بھی شامل تھی۔

''مسز سفیان!'' میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے زیر لب کہا۔ ''آپ مطمئن رہیں۔ میں نے رقم گن لی ہے۔ آپ کی انگلیوں کے ساتھ ہی میری نگاہ بھی مصروف ہو گئی تھی۔ یہ کام ہم دونوں نے ایک ساتھ کیا ہے۔''

''اوہ۔'' وہ بے ساختہ بولی۔ ''آپ تو بڑے کائیاں وکیل ہیں۔''

پتا نہیں عطیہ بیگم نے میری تعریف کی تھی یا مجھ پر تنقید۔ میں نے اس کے بے لاگ تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یہ تو ہو گئی میری فیس۔ اس کے علاوہ دیگر عدالتی، مختلف نوعیت کے اخراجات بھی ہوں گے۔ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیے گا۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب۔'' وہ تسلی بھرے انداز میں بولی۔ ''میں ریحان کی باعزت بریت کے لیے کسی بھی مرحلے پر بچت یا کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آئندہ پیشی پر ایک مسئلہ ملزم کی ضمانت کا ہو گا۔''

وہ بھویں سکیڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ذرا وضاحت کریں گے؟''

''آئندہ پیشی پر جب پولیس ملزم کے ساتھ اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کرے گی تو میں اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت دائر کروں گا۔'' میں نے عطیہ بیگم کی خواہش کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس موقع پر آپ کو شخصی ضمانت یا ذاتی مچلکے کے لیے بندوبست کرنا ہو گا۔'' پھر میں نے اسے دونوں نوعیت کی ضمانت کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں پوری کوشش کروں گی شخصی ضمانت کا انتظام ہو جائے بہ صورت دیگر ذاتی مچلکے والا معاملہ تو میرے ہاتھ میں ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''میں آج ہی متعلقہ تھانے جا کر آپ کے بھائی سے

ملاقات کر لیتا ہوں تاکہ ضمانت کے کاغذات کو تیار کیا جا سکے۔''

''آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

''ہوں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کیس کو بہ خیر و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے لگتا ہے کہ آپ کی عملی مدد کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ میں آپ کے توسط سے مختلف نوعیت کی معلومات حاصل کروں گا۔''

''مجھے آپ کی مدد کر کے بے انتہا خوشی ہو گی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیونکہ یہ تعاون میرے بھائی کی رہائی کا ضامن بن جائے گا۔''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

اس نے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! میں دوبارہ آپ کے پاس کب آؤں؟''

''اب ہماری ملاقات عدالت ہی میں ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اس دوران میں اگر کوئی خاص بات آپ کے علم میں آئے تو آپ بلا جھجک مجھے فون کر سکتی ہیں۔'' بات کے اختتام پر میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

''شکریہ۔'' اس نے کارڈ میرے ہاتھ سے لے کر اس کا بہ غور جائزہ لیا پھر اسے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔''

''ضرور...... لیکن ایک ضروری کام ابھی باقی ہے۔''

''کون سا کام؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں ایک رسید کاٹ کر اس کی جانب بڑھا دی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے رسید پر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ نے مجھے اس کیس کی جو فیس ادا کی ہے یہ اسی ضمن میں ہے۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے وضاحت کر دی۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔'' اس نے کوئی تبصرہ کیے بغیر اثبات میں سر ہلایا اور رسید کو اپنے بیگ میں رکھنے کے بعد میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

میں اسی شام دفتری مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔

پولیس کسٹڈی میں موجود عدالتی ریمانڈ پر کسی بھی ملزم سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ میں نے اپنے آزمودہ کار ہتھکنڈوں کی مدد سے حوالات تک رسائی حاصل کی اور لگ بھگ آدھا گھنٹا ملزم ریحان کے ساتھ گزار کر واپس آ گیا۔ ہماری یہ ملاقات خاصی کامیاب رہی تھی۔ میں نے وکالت نامے اور چند دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لیے اور وقوعہ سے متعلق ڈھیروں باتیں کیں۔ ریحان کی بعض باتیں انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں۔

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کی خدمت میں اس کیس کا پس منظر پیش کرنا چاہوں گا تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ واضح رہے کہ اس میں سے بہت ساری باتیں بعد میں مسز سفیان کی تحقیق کے نتیجے میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے میں انہیں ایک ساتھ بیان کروں گا۔

☆☆☆

ریحان کی رہائش گرین ٹاؤن کے علاقے میں تھی۔ وہ اس افسوس ناک واقعے سے پہلے سلمٰی اور شاہدہ کے ساتھ دو سو گز کے ایک صاف ستھرے بنگلے میں رہائش پذیر تھا۔ سلمٰی اور شاہدہ تو اب بھی اسی بنگلے میں تھیں مگر ریحان بیٹھے بٹھائے حوالات کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر پہنچ گیا تھا۔ حوالات نامی اس بندی خانے کی ہر شے اذیت رساں تھی۔ چاہے وہ کوٹھری کا سفاک اور سنگلاخ ٹھنڈا فرش ہی کیوں نہ ہو۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں مسز سفیان کی زبانی آپ جان چکے ہیں کہ ریحان کی پہلی بیوی کا نام عالیہ تھا۔ اس کے انتقال کے ایک سال بعد ہی ریحان نے سلمٰی سے شادی کی تھی جس کی قادر نامی پہلے شوہر سے ایک جوان بیٹی شاہدہ بھی تھی۔ ریحان کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہو گی۔ نرسری کی فرنیچر مارکیٹ میں اس کا ایک چلتا ہوا شوروم تھا جس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ وہ بڑے عیش و آرام سے زندگی گزار رہا تھا۔ یہی آرام اور عیش سلمٰی کی نگاہ کو بھا گئے تھے اور اس نے ریحان کو اکیلا پنچھی دیکھ کر اپنے حسن کے جال میں جکڑ لیا تھا۔ سلمٰی نے ریحان کو یہی بتایا تھا کہ اس کا شوہر قادر بہت ہی خبیث النسل اور عیاش شخص تھا۔ وہ شراب کے نشے میں وحشت ہو کر اس سے مار پیٹ کیا کرتا اور شاہدہ کو بھی غلیظ گالیاں دیتا تھا لہٰذا سلمٰی نے کوشش کر کے اس اوباش شخص سے جان چھڑا لی تھی۔

سلمٰی اور شاہدہ کا پس منظر ایسا تھا کہ ریحان کو ان

ماں بیٹی سے گہری ہمدردی ہوگئی پھر سلمٰی کے ناز و ادا اور پرکشش سراپا نے اسے چاروں خانے چت کردیا۔ اس شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلمٰی ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے گھر میں پہنچ گئی۔ شاہدہ کے سر پر بھی اس نے شفقت کا ہاتھ رکھا اور ریحان کا سونا گھر ایک مرتبہ پھر آباد ہوگیا۔

شادی کے بعد تو کچھ عرصہ امن و سکون سے گزر گیا پھر محلے والوں کی دبی دبی معنی خیز سرگوشیاں اس کی سماعت تک رسائی حاصل کرنے لگیں اور یہ سرگوشیاں بڑی عذاب ناک تھیں جن میں اس کی فیملی خصوصاً اس کی بیوی کے کردار کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔

پہلے تو اس نے اسے لوگوں کی بکواس سمجھ کر ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا لیکن جب یہ سلسلہ رکنے ہی میں نہ آیا تو وہ اس جانب توجہ دینے پر مجبور ہوگیا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے۔ ایک رات سلمٰی کو لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے نپے تلے الفاظ میں تمہید باندھی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''دیکھو سلمٰی! میں تم پر اندھا اعتماد کرتا ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی سنا ہے اس پر مجھے رتی برابر بھی یقین نہیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''میں کس بارے میں کیا کہوں؟'' وہ بالکل انجان بن گئی۔ ''مجھے کیا پتا، آپ نے کس سے کیا سن لیا ہے؟''

سلمٰی کے اس رویے پر ریحان نے نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے بتایا کہ باہر لوگ سلمٰی اور شاہدہ کے حوالے سے کس قسم کی چہ میگوئیاں کررہے ہیں۔ سلمٰی نے بدمزہ ہوکر ریحان کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر بھڑک اٹھی۔

''پتا نہیں، تم کیسے کیسے لفنڈروں کی باتیں سنتے رہتے ہو۔'' وہ مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے آپ سے تم پر اتر آئی تھی۔ ''لوگ تو پتا نہیں کیا کیا بکتے رہتے ہیں۔ کیا ضروری ہے ان کے کہے کو سنجیدگی سے لیا جائے۔''

''کسی ایک شخص کی بات ہو تو اسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔'' ریحان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کم از کم آٹھ دس افراد نے مجھے اس حوالے سے کچھ نہ کچھ بتایا ہے۔ میں کس کس کی زبان پکڑوں؟''

''تمہیں کسی کی زبان پکڑنے کی ضرورت نہیں۔'' سلمٰی ہاتھ نچا کر بولی۔

''پھر......؟'' ریحان نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم صبح جب گھر سے نکلتے ہو تو مین گیٹ کو باہر سے تالا لگا جایا کرو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ریحان کی الجھن میں جھنجلاہٹ بھی شامل ہوگئی۔

''مطلب صاف اور سیدھا ہے۔'' سلمٰی نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہاری نظر میں محلے والے سچے اور کھرے ہیں۔ ہم ماں بیٹی جھوٹی اور بدکردار ہیں لہٰذا لوگوں کا منہ بند کرنے کے بجائے تم ہمیں گھر کے اندر بند کرکے جایا کرو۔''

''میں نے ایک بار بھی تم دونوں کے کردار پر انگلی نہیں اٹھائی سلمٰی۔'' ریحان نے بات کو بنانے کی کوشش میں قدرے نرمی سے کہا۔ ''انسان ایک معاشرتی جانور ہے۔ وہ جہاں بھی بود و باش اختیار کرتا ہے اسے اپنے ماحول اور اردگرد رہنے والے دوسرے جانوروں اور جانداروں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''اگر یہ اتنی سی بات ہے تو ٹھیک ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم ہمیں جہنم میں ڈالو اور محلے والوں کا خاص خیال رکھو۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا سلمٰی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''تم خوامخواہ بات کو بڑھانے کی کوشش کررہی ہو۔''

''میں بات کو بڑھا رہی ہوں ...... واہ واہ...... سبحان اللہ!'' سلمٰی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اور تم تو اصلاحی وعظ کررہے ہو نا؟''

''اس کا مطلب ہے، مجھے تمہارے ساتھ اپنی کوئی پرابلم شیئر نہیں کرنا چاہیے۔'' ریحان نے غصیلے انداز میں کہا۔

''میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔ ''تم خود ہی پتا نہیں، کیا انٹ شنٹ کہے جارہے ہو۔''

''سلمٰی۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ ''میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

وہ بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ مستفسر ہوئی۔ ''مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہو؟''

''اس محلے میں اور بھی درجنوں گھر اور ان گھروں میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں افراد آباد ہیں۔'' ریحان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا نقطۂ نظر سلمٰی کی سمجھ میں انڈیلنے کی کوشش کی۔ ''ایسی باتیں کسی اور کے بارے میں گردش کیوں نہیں کررہیں؟''

''جو باتیں گردش میں ہوں انہیں افواہ کہا جاتا ہے۔'' سلمٰی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''اب یہ تم پر منحصر ہے کہ افواہوں پر کان دھرتے ہو یا ہمارے کردار پر بھروسا کرتے ہو۔''

''اللہ کرے...... لوگوں کا کہا اور دیکھا سب غلط ہو۔'' وہ مثبت طرزِ فکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بس تم دونوں کو میرا مشورہ ہے کہ ذرا احتیاط سے کام لو تاکہ لوگوں کو خوامخواہ باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔ انسان کی عزت خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

ریحان کے ان مصلحت آمیز الفاظ کے بعد سلمٰی نے بھی کسی بحث و تکرار کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بات آئی گئی ہوگئی لیکن ریحان نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ موقع نکال کر ان کی خفیہ نگرانی کرے گا اور اس اونٹ کو کسی نہ کسی کروٹ بٹھا کر ہی دم لے گا۔

اگر یہ معاملہ عام محلے داروں تک محدود ہوتا تو شاید ریحان ان تلخ اور سنگین اطلاعات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال باہر کرچکا ہوتا مگر اسے خبردار کرنے والوں میں دو ایسے افراد بھی شامل تھے جو نہایت ہی سنجیدہ اور معتبر شمار ہوتے تھے۔ انہیں کبھی لغو اور فضول نوعیت کی سرگرمیوں میں ملوث نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ دونوں حضرات ریحان کے سچے خیر خواہ تھے اور انہوں نے یہ سب کچھ ریحان کی بھلائی اور ہمدردی میں اسے بتایا تھا۔ ان معتبر شخصیات میں ایک تو کریم صاحب تھے جو ریحان کی گلی ہی میں رہتے تھے اور دوسرے تھے غفور چاچا۔

غفور چاچا کی رہائش تو شاہ فیصل کالونی میں تھی مگر وہ گرین ٹاؤن میں ریحان کے گھر کے قریب ہی پان اور سگریٹ وغیرہ کا کیبن چلاتے تھے۔ محلے والے غفور چاچا کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آیندہ ایک ماہ کی خفیہ کوششوں نے ریحان کی عقل کے کئی در وا کردیے۔ اس نے سلمٰی اور شاہدہ کی مشکوک سرگرمیوں کے بارے میں جو کچھ سن رکھا تھا اس کے چند عملی ثبوت بھی دیکھنے کو ملے۔ اس مشن میں صفدر نامی ایک نیا کردار بھی سامنے آیا تھا۔ سلمٰی اور شاہدہ کا صفدر سے واضح کنکشن تھا۔ ریحان کی تحقیق کے مطابق صفدر ایک اوباش اور بدکردار شخص تھا۔ اس کی شہرت بہت بری تھی۔ اس صورتِ حال نے گویا ریحان کے دماغ کا فیوز اڑا دیا۔ اس رات اس نے گھر میں ایک طوفان برپا کردیا۔

ریحان کے استفسار سے شروع ہونے والا قصہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آتشیں ہوتا چلا گیا۔ تو تو، میں میں بہت جلد تلخ کلامی میں بدل گئی پھر باقاعدہ لفظی جنگ کا آغاز ہوگیا۔ ریحان نے تپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ صفدر کون ہے؟''

''میں کسی صفدر کو نہیں جانتی۔'' سلمٰی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

ریحان نے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم تو جانتی ہو نا، میں کس صفدر کی بات کررہا ہوں؟''

جواب دینے سے پہلے شاہدہ نے کن انکھیوں سے اپنی ماں سلمٰی کی طرف دیکھا پھر بڑی ڈھٹائی سے نفی میں گردن ہلادی۔ ریحان کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ماں بیٹی نے آپس میں بڑا مضبوط گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ وہ قدرے سخت لہجے میں شاہدہ سے مخاطب ہوا۔

''شاہدہ...... ادھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ...... کیا تم واقعی کسی صفدر کو نہیں جانتی ہو؟''

شاہدہ کے...۔ جواب دینے سے پہلے ہی سلمٰی بول اٹھی۔ ''ہمیں کیا پتا، تم کس صفدر کی بات کررہے ہو۔ خوامخواہ بچی کو بھی پریشان کردیا ہے۔ شاہدہ......'' وہ اپنی بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولی۔ ''تم جاؤ دوسرے کمرے میں۔'' شاہدہ نے فوراً سے پیشتر وہاں سے کھسک لینے کے لیے پیش قدمی کی۔ ریحان نے کڑک دار آواز میں کہا۔

''رکو۔'' شاہدہ کے متحرک قدم رک گئے۔

ریحان نے کہا۔ ''آج جب تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہوجاتا کہ کون غلط ہے اور کون صحیح، میں تم لوگوں کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔''

''جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو ریحان۔'' سلمٰی نے برہمی سے کہا۔ ''بچی کو ہراساں نہیں کرو۔ جب اس نے کہہ دیا کہ یہ کسی صفدر کو نہیں جانتی تو اسے جانے دو یہاں سے۔''

''نہیں جاسکتی یہ یہاں سے۔'' ریحان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تک مجھے میرے سوال کا جواب نہیں مل جاتا، کوئی اس کمرے سے باہر نہیں جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' سلمٰی نے ہاتھ نچا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''شاہدہ، بیٹھ جاؤ تم ادھر۔'' اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا پھر ریحان کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں اب بتاؤ، تم کس صفدر کی بات کررہے ہو؟''

''میں اس صفدر کا ذکر کررہا ہوں جو ایک آوارہ اور اوباش شخص ہے۔'' ریحان نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''علاقے میں اس کی شہرت اچھی نہیں۔ وہ ایک بدکردار اور

جرائم پیشہ آدمی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے وہ عورتوں کی دلالی بھی کرتا ہے۔"

"میں تو صرف ایک ہی اوباش اور بدمعاش شخص کو جانتی تھی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں شاہدہ کے باپ قادر کی بات کررہی ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کمینے سے جان چھڑائی تھی......"

"قادر سے تو تم نے جان چھڑالی تھی۔" ریحان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "لیکن اب تم ماں بیٹی نے اس مردود صفدر کے ساتھ جان پھنسالی ہے۔ یہ خبیث، بدمعاش اور بدکرداری میں قادر کا بھی باپ ہے۔"

"کہہ دیا تو کہہ دیا......بس۔" سلمٰی حتمی لہجے میں بولی۔ "کسی بھی صفدر سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔"

"پھر تم دونوں محمود آباد کیا لینے جاتی ہو؟" ریحان نے تیکھے انداز میں استفسار کیا۔

"محمود آباد......!" سلمٰی نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں، ہاں......محمود آباد۔"

"میں تو منظور کالونی کبھی کبھار چلی جاتی ہوں۔" وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "تم جانتے ہو منظور کالونی میں میری بہن فریدہ رہتی ہے۔ اب اگر......" اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"محمود آباد، منظور کالونی کے راستے میں پڑتا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ گاڑی محمود آباد کے اندر سے گزر کر ہی تو منظور کالونی پہنچتی ہے ناں۔"

"تم مجھے محمود آباد اور منظور کالونی کے بس روٹ سمجھانے کی کوشش نہ کرو سلمٰی۔" ریحان نے چڑ چڑے انداز میں کہا۔ "سیدھے اور واضح الفاظ میں میرے سوال کا جواب دو۔"

"کون سا سوال؟" سلمٰی نے حیرت بھری نظر سے ریحان کی طرف دیکھا۔ ریحان اس کی ڈھٹائی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ تاہم ضبط کے بندھن کو مضبوطی سے تھامے تھامے اس نے اپنے سوال کو دہرادیا۔

"میں نے یہ پوچھا تھا کہ تم دونوں محمود آباد، صفدر کے پاس کیا لینے جاتی ہو؟"

"اچھا......تو یہ صفدر محمود آباد میں رہتا ہے۔" سلمٰی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"ہاں۔" ریحان نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"تمہیں یقین نہیں آرہا تو تمہاری مرضی۔" سلمٰی نے بے پروائی سے کہا۔ "میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ میں کسی صفدر کو جانتی ہوں اور نہ ہی کبھی ایسے شخص سے ملنے محمود آباد گئی ہوں۔"

"میں خالی خولی بات نہیں کررہا سلمٰی۔" ریحان نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ "میں جو بھی کہہ رہا ہوں اس کے ثبوت ہیں میرے پاس۔"

"ثبوت ہیں تو سامنے لاؤ۔" سلمٰی تڑخ کر بولی۔

"سب سے بڑا ثبوت تو میں ہوں۔"

"تم......؟"

"ہاں، میں۔" ریحان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ہمیں محمود آباد کسی صفدر کے پاس جاتے دیکھا ہے؟" سلمٰی نے ڈھٹائی کی آخری منزل کو چھوتے ہوئے سوال کیا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" ریحان نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"پھر تو میں تمہیں یہ مشورہ دوں گی کہ......" سلمٰی نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "کسی اچھے اور تجربہ کار آنکھوں کے ڈاکٹر سے اپنی نظر ٹیسٹ کراؤ۔"

سلمٰی کے ان زہریلے الفاظ کے بعد ریحان کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے بعد ان میں بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے تلخ اور ترش جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ ہر کوئی دوسرے کو چت اور جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس فساد کا انجام ریحان کے ان مصلحت کوش الفاظ پر ہوا۔

"بس......میں تم لوگوں کو سدھرنے اور سنبھلنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر اب بھی تمہیں عقل نہ آئی تو میرے پاس صرف دو آپشنز رہ جائیں گے۔" وہ لمحے بھر کو رکا ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"نمبر ایک، میں گھر سے نکلتے وقت تم دونوں کو اندر بند کرکے باہر سے گیٹ پر تالا ڈال کر جاؤں۔ نمبر دو، میں تم لوگوں کو اپنی زندگی، اپنے گھر سے رخصت کردوں......اور اگر ان آپشنز کو استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو پتا ہے، میں ان میں سے کون سا آپشن منتخب کروں گا۔"

شاہدہ اور سلمٰی نے بہ یک وقت متذبذب نظروں سے ریحان کی طرف دیکھا۔ تاہم ان میں سے کسی نے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ریحان نے فیصلہ کن اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ "سیکنڈ آپشن!" وہ دونوں بے یقینی سے اس کا چہرہ تکنے لگیں۔

اس کے چند روز بعد ہی وہ افسوس ناک واقعہ پیش آگیا تھا جس کے نتیجے میں ریحان عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں تھا اور میں اس کا کیس لڑنے کی تیاری میں مصروف تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کیا۔ میں نے اپنا وکالت نامہ مع ملزم ریحان کی درخواست ضمانت دائر کردیا۔ جج نے حیرت بھری نظر سے میری جانب دیکھا اور پوچھا۔

"بیگ صاحب! اس کیس میں آپ وکیل صفائی ہیں نا؟"

"یس......یور آنر۔" میں نے سر کی اثباتی جنبش سے شائستہ انداز میں جواب دیا۔

"ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

جج کے حکم پر عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے ملزم کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔

"جناب عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک معزز شہری ہے۔ کسی گہری سازش کے تحت اس بے چارے کو اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وقت آنے پر میں ثابت کردوں گا کہ ملزم بے گناہ ہے لہٰذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ ملزم کی ضمانت منظور کرتے ہوئے اسے رہا کردیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا کہ ملزم کی بہن مسز سفیان شخصی ضمانت کا بندوبست نہیں کرسکی تھی البتہ ذاتی مچلکے پر ضمانت کے قانونی انتظامات کے لیے پوری طرح لیس ہوکر وہ آج عدالت پہنچی تھی۔

وکیل استغاثہ میرے خاموش ہوتے ہی متحرک ہوگیا۔ "یور آنر! ملزم نے جس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا ہے اس سے اس کی ساری پارسائی اور معززپن کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے معاندانہ انداز میں میرے موکل کی طرف دیکھا پھر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔

"یہ شخص سخت سے سخت ترین سزا کا مستحق ہے جناب عالی۔"

میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "مائی ڈیئر کونسلر! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے موکل کے کسی گھناؤنے جرم کا ذکر کیا ہے۔ آپ مجھے اس فعل کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

"کمال ہے۔" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"آپ کو نہیں پتا، آپ کے موکل کو کس سنگین جرم کے الزام میں عدالت تک لایا گیا ہے؟"

"فرض کرلیں کہ نہیں پتا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"آپ کی معصومیت پر قربان جانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"آپ اپنا یہ شوق بعد میں کسی وقت پورا کرسکتے ہیں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "فی الحال میرے سوال کا جواب دیں۔"

"ملزم نے جس سنگین فعل کا ارتکاب کیا ہے......"

وکیل استغاثہ نے ان الفاظ کے ساتھ، میرے سوال کے جواب میں تفصیل بیان کرنا شروع کی۔ جب وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"میرے فاضل دوست! کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ زیرِ سماعت کیس حدود آرڈیننس کی کون سی دفعہ کے تحت آتا ہے؟"

"لگتا ہے، آپ نے اس کیس کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا اور بغیر کسی تیاری کے ہی عدالت پہنچ گئے ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "اگر آپ نے کیس فائل کو اچھی طرح دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو اس سوال کی نوبت ہی نہ آتی۔ وہاں سب کچھ درج ہے۔"

"یقیناً درج ہے۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔

"پھر آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وکیل استغاثہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا پھر امداد طلب نظروں سے جج کو دیکھنے لگا۔

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "اس سوال کا کوئی خاص مقصد؟"

"جی ہاں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وکیل صفائی کے سوال کا جواب دیا جائے۔"

وکیل استغاثہ نے برا سا منہ بنایا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ دفعہ چھ کا کیس ہے۔"

"آر یو شیور؟"

"یس، آئی ایم۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "دفعہ چھ زنا بالجبر کے ذیل میں لگائی جاتی ہے اور دفعہ چار زنا بالارادہ کے ذیل میں۔"

"اتنی اہم معلومات بہم پہنچانے کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وکیل استغاثہ متعجب نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں نے معلومات کے حوالے سے

اس کی تعریف کی تھی یا مذاق اڑایا تھا۔ میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی ایک اور سوال کر ڈالا۔
''اب لگے ہاتھوں ذرا یہ بھی بتادیں کہ حدود آرڈیننس کی مذکورہ متعلقہ دفعہ کے بارے میں قرآن کریم کا کیا حکم ہے؟''
''اس آرڈیننس کی بابت قرآن کریم میں ارشادِ باری ہے کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''زانیہ عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور تمہیں ان پر اللہ کے معاملے میں ترس نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کے ایک گروہ کو حاضر رہنا چاہیے۔ زانی مرد سوائے زانیہ عورت یا مشرکہ کے نکاح نہیں کرے گا اور زانیہ عورت سوائے زانی مرد یا مشرک کے نکاح نہیں کرے گی اور ایمان والوں پر ایسا کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
''ایک روایت کے مطابق، اگر کوئی کنواری عورت، کنوارے مرد سے زنا کرے تو ان دونوں کو سو، سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر کوئی شادی شدہ عورت، شادی شدہ مرد سے زنا کرے تو ان دونوں کو سنگسار کیا جائے۔''
''درست۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ نے جن قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے وہ سورۂ النور کا بیان ہے اور آپ کی آخر الذکر پیش کردہ روایت مشکوۃ شریف سے ہے۔''
''جی ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''لیکن زیرِ سماعت کیس میں ملزم ریحان نے ایک ظالم کا کردار ادا کیا ہے۔ ملزم کے ظالمانہ اور جابرانہ فعل میں شاہدہ کی مرضی شامل نہیں تھی۔ شاہدہ مظلوم ہے۔ اس ظلم کی سزا صرف اور صرف ملزم کو ملنا چاہیے۔''
''اس بات کا فیصلہ کرنا معزز عدالت کا کام ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست، یہ بتائیں کہ قرآنی بیان میں ترمیم کا حق آپ کو کس نے دیا ہے؟''
''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔
''مائی ڈیئر کونسلر!'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے سورۂ النور کے حوالے سے زانی مرد و زانیہ عورت کے لیے جہاں سزا کا ذکر کیا ہے وہاں سے ایک نہایت ہی اہم نکتہ تو آپ نے حذف ہی کر دیا ہے۔''
''کون سا نکتہ؟'' اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔
میں نے کہا۔ ''مذکورہ سزا کے بیان کے ساتھ ہی بلکہ اس ہی کے ذیل میں یہ بھی درج ہے کہ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسّی کوڑے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی لوگ نافرمان ہیں۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے کھوجتی ہوئی نظروں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''
''نہیں، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔
''میرے فاضل دوست۔'' میں نے قدرے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میرے موکل کی ضمانت رکوانے کے سلسلے میں آپ نے اس کے جرم کی تفصیل کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس جرم کے وقت آپ جائے وقوعہ پر موجود تھے لہٰذا......'' میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر حاضرینِ عدالت پر ایک نگاہ ڈالی پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''ایک گواہ تو اس جرم کے آپ ہی ہو گئے۔ آپ کو مزید تین گواہان کا بندوبست کرنا ہوگا۔ ایسے گواہان جو بالغ مسلمان مرد ہوں جن سے متعلق معزز عدالت کو تزکیۃ الشہود کی بنا پر پورا اطمینان ہو کہ وہ کبائر سے اجتناب کرنے والے صادق العقول ہیں؟''
''اس کی جب نوبت آئے گی تو دیکھا جائے گا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''جس کے ساتھ مجرمانہ کارروائی ہوئی ہے اس مظلوم کی گواہی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔'' پھر وہ روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔
''جنابِ عالی! ڈیفنس کونسلر غیر ضروری امور کو زیرِ بحث لا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں، میری عدالت سے درخواست ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے تا کہ عدالتی کارروائی کو نارمل انداز میں آگے بڑھنے کا موقع مل سکے۔ دیٹس آل یور آنر۔''
میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔ پندرہ بیس منٹ تک ہم دونوں کے درمیان گرم اور نرم مکالموں کا تبادلہ ہوتا رہا پھر جج نے ملزم کی درخواست ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے احکام صادر کر دیے۔

میں یہ تسلیم کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ اس دن میں اپنے موکل کی ضمانت کرانے میں ناکام رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے اپنے مخصوص دلائل کی مدد سے وکیل استغاثہ کو کافی حد تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے استغاثہ کی دیوار میں شگاف ڈالنے کے مترادف تھا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔
میں ملزم کی بڑی بہن مسز سفیان کے ساتھ عدالت کے کمرے سے باہر آیا تو اس نے راہداری میں میرے ساتھ چلتے ہوئے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔
''بیگ صاحب! میں تو توقع کر رہی تھی کہ آپ ریحان کو ضمانت پر رہا کروالیں گے لیکن......''
اس کے ادھورے جملے کے جواب میں، میں نے کہا۔ ''ضمانت کے حوالے سے تمام ملزمان کے لواحقین کی توقعات کچھ اسی نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ قتل اور حدود کے کیسز میں ملزم کی ضمانت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتی ہے۔''
''مجھے اس کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''ویسے میں مایوس نہیں ہوں بیگ صاحب۔ آج آپ نے وکیل مخالف کو خوب لتاڑا ہے۔''
میں نے مسز سفیان کے آخری جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کو مایوس ہونا بھی نہیں چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں، آج پہلی پیشی تھی اس حوالے سے کیس پر میری گرفت مضبوط ہے اور اگر آپ کا تعاون حاصل رہا تو مجھے پورا یقین ہے، یہ کیس ہم جیت کر ہی رہیں گے۔''
''ان شاء اللہ۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولی۔ ''بیگ صاحب، میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ آپ حکم کریں۔''
''دو تین چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ آپ کو ایک اہم کام بھی کرنا ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اور اس اہم کام کا تعلق سلمٰی کے پہلے شوہر اور شاہدہ کے باپ قادر سے ہے۔ مجھے اس شخص کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔''
''کس قسم کی معلومات؟'' مسز سفیان نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
''مثلاً یہ کہ......'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''وہ کس قسم کا شخص ہے۔ سلمٰی نے اس سے چھٹکارا حاصل کیا تھا یا قادر نے اس عورت سے جان چھڑائی تھی۔ ابھی تک تو ہمارے سامنے سلمٰی کا بیان ہے جس کی روشنی میں قادر ایک آوارہ اور بدقماش شخص تھا۔ عین ممکن ہے، وہ ریحان کی طرح کوئی شریف آدمی ہو اور اس نے سلمٰی کے کرتوت دیکھتے ہوئے اس سے جان چھڑائی ہو۔''
''ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے نہایت ہی اہم نکتے کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔ میں قادر کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''
''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ قادر سے ملاقات بہت سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اگر اتنا بھی معلوم کرلیں گی کہ وہ شخص کہاں رہتا ہے۔ اس سے کیسے ملاقات ممکن ہے تو باقی کے معاملات میں خود نمٹا لوں گا۔''
''میں بہت جلد آپ کو اس سلسلے میں کوئی خوشخبری سناؤں گی۔'' مسز سفیان نے بڑے وثوق سے کہا۔
میں نے اسے مزید دو تین باتوں کے حوالے سے چند اہم ہدایات دیں پھر وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔ میں پارکنگ کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر سب سے پہلے مظلوم شاہدہ کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔
آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ حدود آرڈیننس کے کیسز چاہے وہ جھوٹے ہوں یا سچے، بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں بلکہ اگر انہیں حساس نوعیت کے کیسز کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اور اس میں سب سے زیادہ نازک پوزیشن مجرمانہ کارروائی کا نشانہ بننے والی عورت کی ہوتی ہے۔ وکیل مخالف اس سے ایسے ایسے خطرناک سوالات کرتا ہے کہ جنہیں سن کر مردوں کو بھی پسینا آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوعیت کے کیسز میں سے اسّی فیصد کو تو رجسٹر ہی نہیں کروایا جاتا۔ اکثر والدین اور خود مظلوم اس عدالتی کارروائی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہی سوچ کر خاموشی اختیار کرلی جاتی ہے کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، رہی سہی عزت کا بھی جنازہ نکالنے سے فائدہ۔
مظلوم شاہدہ کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے اس کیس کو مضبوطی بخشنے کے چند مخصوص نوعیت کے سوالات کرنے کے بعد اپنی جرح موقوف کر دی۔
میں جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد شاہدہ

والے کٹہرے کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر مظلوم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاہدہ بی بی! ذرا سوچ کر بتائیں کہ جس روز آپ کا بیان کردہ واقعہ پیش آیا، اس دن کیا تاریخ تھی؟"

"اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "تیس اپریل۔"

"یعنی ماہ اپریل کی آخری تاریخ۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "آئندہ روز سے ماہ مئی شروع ہوگیا تھا؟"

"جی ...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" شاہدہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق، یہ افسوس ناک واقعہ تیس اپریل کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان پیش آیا تھا۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں؟"

"میں رپورٹ کے الفاظ سے اتفاق کرتی ہوں۔"

"وقوعہ کے روز آپ کے اور ملزم کے علاوہ گھر میں اور کون موجود تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"کوئی بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تمہاری والدہ؟" میں نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔ "وہ اس وقت کہاں تھی؟"

"وہ خالہ سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔"

"کون سی خالہ سے ملنے؟"

"خالہ فریدہ سے۔" اس نے بتایا۔ "جو منظور کالونی میں رہتی ہیں۔"

"رات کے گیارہ بجے تمہاری والدہ گرین ٹاؤن سے منظور کالونی کیا لینے گئی تھی؟" میں نے قدرے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ "کیا وہاں منظور کالونی میں کوئی ایمر جنسی ہوگئی تھی؟"

"وہ رات کو وہاں نہیں گئی تھیں۔"

"پھر......؟" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"امی کوئی چار بجے سہ پہر کو گھر سے نکلی تھیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور کہا تھا کہ دو تین گھنٹے میں واپس آجائیں گی لیکن انہیں آنے میں دیر ہوگئی اور......"

"واقعات کے مطابق، تمہاری والدہ اس وقت واپس آئی تھی جب گھر کے اندر یہ سانحہ چل رہا تھا۔ کوئی گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے۔" میں نے کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے تائیدی انداز میں جواب دیا۔

"تمہارا سوتیلا باپ یعنی اس کیس کا ملزم ریحان وقوعہ کے روز کتنے بجے گھر آیا تھا؟"

"لگ بھگ نو بجے۔"

"کیا وہ روزانہ اسی وقت گھر آیا کرتا تھا؟"

"جی، کم و بیش اسی وقت۔"

"جب تمہارا سوتیلا باپ گھر پہنچا، تم گھر میں اکیلی تھیں؟"

"جی ہاں، اکیلی تھی۔"

"ملزم نے تمہاری والدہ کے بارے میں پوچھا تو ہوگا، وہ کہاں ہے؟"

"نہیں پوچھا تھا۔" وہ بڑی سادگی سے بولی۔

"کیا مطلب، کیوں نہیں پوچھا تھا؟"

"چند روز پہلے امی اور انکل میں شدید نوعیت کا جھگڑا ہوگیا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ انکل سے اس کی مراد سوتیلا باپ یعنی اس کیس کا ملزم ریحان تھا۔ "ان دونوں میں بات چیت بند تھی اور دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتے تھے۔"

"تم اس جھگڑے کا ذکر تو نہیں کررہی ہو۔" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "جس کے اختتام پر ریحان نے کہا تھا کہ اگر آپ ماں بیٹی نہیں سدھریں تو اس کے پاس صرف دو آپشنز ہی رہ جائیں گے؟"

"جی وکیل صاحب، میں اسی جھگڑے کی بات کررہی ہوں۔"

"آپ ماں بیٹی کے لیے ملزم کے پاس کون سے دو آپشنز تھے؟"

"انکل نے کہا تھا کہ یا تو وہ گھر سے نکلتے وقت ہمیں گھر میں تالا بند کرکے جایا کریں گے یا پھر وہ ہمیں اپنے گھر سے باہر نکال دیں گے۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔

"اتنی سخت سزا؟" میں نے کندھے اچکائے۔ "آپ لوگوں نے ایسا کون سا سنگین جرم کرڈالا تھا جو ملزم نے اتنے خطرناک آپشنز استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی؟"

"یہ تو آپ انکل ہی سے پوچھیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تمہارے انکل سے تمہارے سامنے ہی میں بہت کچھ پوچھوں گا مگر اس کی باری آنے پر۔" میں نے کہا۔ "فی الحال تم معزز عدالت کو یہ بتاؤ کہ ملزم نے تم ماں بیٹی کو کس بات کے لیے سدھرنے اور سنبھلنے کے لیے کہا تھا؟"

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

”پھر کیا تھا؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے ناگواری سے ملزم کی جانب دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ اسے انکل کی گندی ذہنیت سمجھ لیں۔“

”فرض کرو کہ میں نے وہی سمجھ لیا جو تم کہہ رہی ہو لیکن تمہارے سمجھانے اور میرے سمجھ لینے سے بات نہیں بنے گی۔“ میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں معزز عدالت کے سامنے اپنے انکل یعنی اس کیس کے ملزم کی گندی ذہنیت کی وضاحت کرنا ہوگی۔“

شاہدہ نے کن انکھیوں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ وکیل موصوف سے مدد کی طلب گار ہو لیکن اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ کی زبان میں جنبش پیدا ہوتی، میں نے جلدی سے کہا۔

”شاہدہ بی بی، معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ملزم نے کس حوالے سے آپ کو سدھرنے اور سنبھلنے کی تاکید کی تھی۔ آخر آپ لوگوں میں ایسی کون سی خرابی یا برائی تھی؟“

”ہم میں کوئی خرابی یا برائی نہیں تھی۔“ وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ ”محلے والوں نے انکل کو ہمارے خلاف کر دیا تھا۔“

”کیا خلاف کر دیا تھا؟“

”انکل ہمیں بدکردار سمجھنے لگے تھے۔“

”محلے والوں کو آپ ماں بیٹی سے ایسی کون سی دشمنی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آپ لوگوں کے کردار کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے تھے؟“

”یہ تو آپ انہی سے جا کر پوچھیں۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”ہم نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا......“

”محلے والوں کو بھی عدالت میں بلا کر پوچھ گچھ کی جائے گی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اگر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی تو۔“ وہ منتظر نظروں سے مجھے دیکھنے لگی کہ اب میں کون سا سوال کرتا ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ”شاہدہ بی بی، اس کیس کے ملزم یعنی تمہارے انکل یا سوتیلے باپ ریحان کے ساتھ تم لوگ کب سے رہ رہے تھے؟“

”جب سے امی نے انکل سے شادی کی تھی۔“

”میں وہی تو جاننا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری امی سلمٰی اور ریحان کی شادی کب ہوئی تھی؟“

اس نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”اس شادی کو تین سال ہو گئے ہیں۔“

”اور......“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”ملزم اور تمہاری امی بلکہ تم ماں بیٹی اور ملزم کے درمیان وہ جھگڑا کب ہوا تھا جس میں ملزم نے دو آپشنز استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی؟“

”یہ تو چند روز پہلے کی بات ہے۔“ شاہدہ نے جواب دیا۔

”یعنی اس جھگڑے سے پہلے سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا؟“

”آں ہاں...... تن نہیں......“ وہ الجھ کر خاموش ہو گئی۔

”کیا مطلب؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

”بی بی، وکیل صاحب کے سوال کا ایک جواب دو۔“ جج نے مظلوم شاہدہ کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ہاں یا نہ؟“

”جی۔“ شاہدہ نے گردن کو اثباتی جنبش دی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جی...... میرا مطلب یہ تھا کہ چند ماہ پہلے بھی انکل نے ہمیں کھری کھری سنائی تھیں۔ وہ پہلا موقع تھا جب انکل کو ہمارے کردار پر شک ہوا تھا۔“

”یہ لگ بھگ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟“

”تین چار ماہ پہلے۔“

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ سے گھر کی فضا میں کشیدگی پیدا ہوئی تھی۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اس سے پہلے سب امن وامان تھا؟“

”جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”پچھلے ڈھائی سال میں ملزم، آپ ماں بیٹی کے کردار سے پوری طرح مطمئن تھا؟“ میں نے کہا۔ ”وہ سلمٰی کو ایک وفادار بیوی اور تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا تھا؟“

”جی...... جی ہاں۔“

”شاہدہ بی بی، تم نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے یہ کہا ہے کہ ملزم کی گندی سوچ کے نتیجے میں اس نے تم ماں بیٹی کے کردار کو نشانہ بنایا تھا۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم کی گندی سوچ کا سبب محلے والوں کا، اسے تم ماں بیٹی کے خلاف بھرنا ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ محلے والوں کو آپ ماں بیٹی سے کیا دشمنی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ جب تک ملزم کو آپ دونوں کے کردار کے حوالے سے شک نہیں ہوا تھا۔ اس کا رویہ آپ لوگوں کے ساتھ نارمل تھا اور زندگی بڑے آرام وسکون کے ساتھ گزر رہی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟“

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”شاہدہ بی بی!“ میں نے اپنے لہجے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم تمہیں ہوس بھری نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا تھا؟“

”جب سے انہیں شک ہوا تھا کہ ہم ماں بیٹی کا کردار صاف نہیں۔“ شاہدہ نے جواب دیا۔ ”امی تو ان کی بیوی تھیں، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن وہ جس انداز میں مجھے دیکھتے تھے اسے شریفانہ یا بزرگانہ انداز بالکل نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ایک شیطان کی نظر تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے، ملزم تمہارے لیے بری نیت رکھتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں اس امر کی وضاحت بھی کی ہے کہ تمہارے لیے ملزم کی نیت میں فتور پیدا ہو چکا تھا اور پھر جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے اپنی گندی ذہنیت پر عمل کر ڈالا؟“

”جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”اپنی گندی ذہنیت کے ساتھ پانچ چھ ماہ تک انتظار کرنا ملزم کی منصوبہ بندی کا حصہ تھا یا اس سے پہلے اسے موقع نہیں ملا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے، اس سے پہلے انہیں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کا موقع نہیں ملا تھا۔“ شاہدہ نے جواب دیا۔

”تم نے ملزم کی بدنیتی کو پانچ چھ ماہ پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو رفتہ رفتہ سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے اپنی امی کو اس بارے میں بتا دیا تھا؟“

”جی، ہاں بتا دیا تھا۔“

”یعنی سلمٰی اس بات سے واقف تھی کہ ملزم تمہارے لیے، اپنے دل میں کس قسم کے گندے جذبات رکھتا تھا؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”جی امی کو ایک ایک بات کا پتا تھا۔“

”پھر بھی...... پھر بھی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”سلمٰی تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کر اپنی بہن سے ملنے منظور کالونی چلی گئی تھی، کیوں؟“

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی پھر جواب دیا۔ ”امی مجھے یہی بتا کر گئی تھیں کہ وہ سات یا زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک واپس آجائیں گی لیکن انہیں آنے میں دیر ہو گئی اور انکل کو اپنی شیطانیت دکھانے کا موقع مل گیا۔“

اتنا کہہ کر شاہدہ نے گردن جھکا لی۔ میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”شاہدہ بی بی، تمہارے اصل یعنی سگے باپ کا کیا نام ہے؟“

”غلام قادر۔“ اس نے جواب دیا پھر ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ میں نے اس سے یہ سوال کیوں کیا تھا۔

”تمہیں غلام قادر سے بچھڑے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”کوئی پانچ سال۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی؟“

”ساڑھے تیئس سال۔“

”اس کا مطلب ہے جب تم غلام قادر سے جدا ہوئیں تو اس وقت تمہاری عمر کم وبیش ساڑھے اٹھارہ سال تھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی...... آپ کا اندازہ درست ہے۔“

”اٹھارہ، ساڑھے اٹھارہ سال اچھی خاصی عمر ہوتی ہے۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اپنے باپ غلام قادر کی شکل تو اچھی طرح یاد ہوگی؟“

”جی ہاں، بالکل یاد ہے۔“

”اگر تمہیں غلام قادر کی تصویر دکھائی جائے تو تم اسے بہ آسانی پہچان لو گی نا؟“

”آبجیکشن یور آنر!“ وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔ ”اس وقت عدالت میں جو کیس سماعت ہے اس کا مظلوم شاہدہ کے باپ غلام قادر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ڈیفنس کونسلر غیر ضروری باتوں میں الجھ کر ایک طرف معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں تو دوسری جانب یہ سیدھی سادی مظلوم شاہدہ کو ہراساں کرنے کی کوشش بھی ہے لہٰذا......“ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں معزز عدالت سے پُرزور استدعا کروں گا کہ وکیل صفائی کو ایسی حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔“

”بیگ صاحب۔“ وکیل استغاثہ کے اعتراض پر جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”شاہدہ بی بی کے باپ غلام قادر کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق بنتا ہے؟“

”بہت گہرا تعلق جناب عالی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور مناسب وقت آنے پر میں یہ تعلق ثابت کر کے بھی دکھا دوں گا۔“

”اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟“ وکیل استغاثہ

نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"ہوسکتا ہے، وہ مناسب وقت اگلی پیشی ہی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ پیشی کیوں نہیں؟" سوال وکیل استغاثہ نے کیا تھا لیکن میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے جج کی جانب دیکھا پھر کھنکار کر گلا صاف کرنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

"جنابِ عالی! ممکن ہے، عدالت ملزم کی بیوی سلمٰی کے ماضی سے واقف نہ ہو۔ سلمٰی کے مطابق، شاہدہ کا باپ قادر ایک اوباش اور شرابی شخص تھا۔ وہ سلمٰی کو زدوکوب کرتا تھا، گالم گلوچ کرتا تھا۔ الغرض، اس نے سلمٰی اور شاہدہ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی لہٰذا سلمٰی نے ایک روز اس آوارہ بدمعاش سے جان چھڑالی۔ اس نجات کے ایک سال بعد سلمٰی اور ملزم کی شادی ہوگئی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے سلمٰی کے بیان پر یقین نہیں ......" میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ جو انکشاف ملزم ریحان پر ہوا وہ مبنی بر حقیقت ہو یعنی مظلوم شاہدہ اور اس کی ماں سلمٰی واقعی کردار کی صاف نہ ہوں اور اسی بنا پر قادر نے سلمٰی کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا ہو۔ میں نہایت ہی خفیہ انداز میں سلمٰی کے سابق شوہر اور مظلوم شاہدہ کے حقیقی باپ پر تحقیق کر رہا ہوں۔ دو چار روز میں قادر کے حوالے سے تمام تر سچ اور جھوٹ مجھے معلوم ہوجائے گا۔ اسی لیے میں نے وکیل استغاثہ کو آئندہ پیشی تک انتظار کا مشورہ دیا ہے۔"

"آپ اپنی تحقیق و تفتیش جاری رکھیں۔" وکیل استغاثہ برہمی سے بولا۔ "لیکن کسی تصویر کے ذریعے اپنے والد کی شناخت کیا مذاق ہے؟"

"یہ مذاق نہیں، بہت ہی سنجیدہ معاملہ ہے وکیل صاحب۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس کو اتنا بھی ایزی نہ لیں۔"

"اس میں ایسا کون سا سنجیدہ پہلو ہے جو مجھے نظر نہیں آرہا؟" وہ تڑخ کر بولا۔

"یہ فی الحال آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" میں نے سلگانے والے انداز میں کہا۔ "اسی لیے میں نے آپ کو آئندہ پیشی تک انتظار کا مشورہ دیا ہے۔" وہ معاندانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں مظلوم کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"جی شاہدہ بی بی، اگر میں تمہیں قادر کی تصویر دکھاؤں تو کیا تم اسے اپنے باپ کی حیثیت سے پہچان لوگی؟"

"اگر وہ میرے باپ کی تصویر ہوگی تو میں اسے ضرور پہچان لوں گی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
میں نے پوچھا۔ "شاہدہ بی بی، میں جاننا چاہوں گا کہ وقوعہ کے روز ملزم کے گھر آنے کے بعد سے لے کر تمہارے ساتھ مبینہ ظلم یا زیادتی ہونے تک واقعات کس طرح پیش آئے تھے؟"

اس نے چند لمحات تک آنکھیں بند کر کے گزرے ہوئے واقعات کو ذہن میں مجتمع کرنے کی کوشش کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔

"اس روز میں گھر میں امی کا انتظار کر رہی تھی۔ امی نے سات بجے تک واپس آنے کا کہا تھا لیکن جب آٹھ بجے تک بھی وہ واپس نہیں آئیں تو مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں کچن کے کام میں خود کو مصروف رکھ کر وقت گزارنے لگی۔ نو بجے انکل آگئے۔" اس نے رک کر ملزم ریحان کی جانب دیکھا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"انکل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی امی کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال کیا۔ یہ سیدھا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے کچن کا کام ختم کیا اور لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری تشویش بڑھتی چلی گئی کہ امی اب تک واپس کیوں نہیں آئیں۔ کوئی ساڑھے دس بجے انکل نے مجھے آواز دی۔

"شاہدہ بیٹی، ذرا میرے پاس آنا۔" انکل کا کمرا ٹی وی لاؤنج کے ساتھ ہی ہے۔ میں یہی سمجھی کہ انکل مجھ سے کھانے کے لیے کہیں گے۔ ہم لوگ رات کا کھانا دس بجے تک کھاتے ہیں۔ میں لاؤنج سے اٹھی اور ان کے کمرے میں چلی گئی۔"

"ایک منٹ۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "شاہدہ بی بی، تمہارا بیان ہے کہ ملزم کی تم پر نیت خراب ہوچکی تھی اور یہ اٹھتے بیٹھتے تمہیں ہوس بھری نگاہ سے دیکھا کرتا تھا پھر تم اس کے کمرے میں چلی گئیں جبکہ تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وقت سلمٰی بھی گھر میں موجود نہیں تھی؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ امی کی غیر موجودگی کے باعث مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے کئی بار سوچا تھا کہ اٹھ کر پڑوس میں چلی جاؤں لیکن پھر اس خیال سے میں اپنے ارادے پر عمل کرنے سے باز آگئی کہ انکل نے پہلے ہی ہمیں کافی برا بھ

رکھا ہے۔ امی پہلے ہی گھر میں موجود نہیں تھیں۔ میں بھی پڑوس میں چلی جاتی تو ہمارے خلاف کیس اور بھی مضبوط ہوجاتا کہ ہمارا تو گھر کے اندر دل ہی نہیں لگتا پھر......" وہ سانس درست کرنے کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"پھر انکل نے اتنے پیار سے مجھے شاہدہ بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا کہ چند لمحات کے لیے میرے ذہن سے سارے اندیشے اور خوف جاتا رہا۔ میں بے دھڑک ان کے کمرے میں چلی گئی اور پوچھا۔

"کھانا لے آؤں؟"

"کھانا نہیں، مجھے اس وقت بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس ہورہی ہے۔" انکل نے کہا۔ "میرے سر میں درد ہورہا ہے۔ اگر ایک کپ چائے......"

"ٹھیک ہے، میں چائے لادیتی ہوں۔" میں نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا اور کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے چائے بنا کر ان کے کمرے میں رکھ دی۔ لگ بھگ گیارہ بجے انہوں نے مجھے دوبارہ آواز دے کر اپنے پاس بلالیا۔ میں سمجھی، چائے کے برتن اٹھانے کے لیے کہہ رہے ہوں گے۔ میں کمرے میں پہنچی تو انہوں نے چائے کے برتن والی ٹرے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شاہدہ بیٹی، یہ ٹرے کچن میں رکھ کر میرے پاس آجاؤ۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

یہ بہ دستور محبت بھرے انداز میں بولے۔ "گھبراؤ نہیں، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ میں نے اس رات تم سے اور سلمٰی سے جو کچھ بھی کہا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ تم دونوں کردار کی صاف و شفاف ہو۔ میں تم لوگوں سے اپنے رویے کے لیے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ تمہاری ماں آجائے تو تم دونوں کو اپنے سامنے بٹھا کر بات کروں، وہ تو پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے۔" انکل کے مشفق اور مہربان رویے کی وجہ سے میرا سارا ڈر اور خوف جاتا رہا۔ میں نے انہیں امی کے بارے میں مزید بتایا۔

"امی منظور کالونی گئی ہیں خالہ کے گھر۔" میں نے بتایا۔ "کہہ رہی تھیں زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک واپس آجائیں گی لیکن ابھی تک نہیں آئیں۔"

"نہیں آئی تو آجائے گی وہ بھی۔" انکل نے بے پروائی سے کہا۔ "تم کچن میں برتن رکھ کر آؤ پھر ہم باتیں کرتے ہیں۔"

میں چائے کے برتنوں والی ٹرے کچن میں رکھ کر آئی تو وہاں کا منظر ہی بدل گیا۔ میں جیسے ہی انکل کے کمرے میں داخل ہوئی یہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیے۔ مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا کہ یہ کہاں چلے گئے پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتی، مجھے ایک زور کا دھکا لگا اور میں جا کر انکل کے بیڈ پر گری۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو یہ شیطان دروازے کو لاک کر رہا تھا پھر...... پھر...... اس مردود نے مجھے بے بس کر دیا۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "کاش اس واقعے سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔"

"شاہدہ بی بی، تم کوئی سیل سے چلنے والی گڑیا نہیں تھیں جو ملزم کا دھکا لگنے کے بعد آف ہوگئی تھیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم نے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے تگ و دو تو کی ہوگی یا نہیں؟"

"میں نے خود کو اور اپنی عزت کو بچانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے۔" وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "لیکن اس شیطان نے میری کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ اس کے اندر جیسے کسی وحشی گینڈے کی طاقت بھر گئی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت سے ہوس ٹپکتی تھی۔ میں نے اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ناخنوں سے اس کے چہرے اور گردن کو بھی نوچا۔ آپ میرے نوچنے کے نشانات اس کے چہرے اور گردن پر دیکھ سکتے ہیں۔"

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے ناخنوں نے واقعتاً ریحان کی گردن اور چہرے کو گھائل کر دیا تھا۔ ان زخموں کے نشانات کھرنڈ کی شکل میں اب بھی نظر آرہے تھے۔ شاہدہ اپنے اشک بار بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"اپنے بچاؤ کی کوشش میں میرا لباس تار تار ہوتا چلا گیا۔ اس رات میری ہر کوشش ناکام رہی۔ میرے چیخنے چلانے کی آوازیں بند کمرے سے باہر نہ جاسکیں اور یہ ہوس پرست مجھے برباد کرتا چلا گیا۔ جب امی کمرے کے اندر داخل ہوئیں تو میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس شیطان کی اولاد نے مجھے تباہ کر ڈالا تھا۔" اس نے نفرت بھرے انداز میں، اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کیا اور اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"کاش، میں اپنی تباہی اور بربادی کی داستان سنانے کے لیے آج زندہ نہ ہوتی۔ اس ذلت کی زندگی سے تو

موت اچھی تھی۔"

پھر وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ عدالت کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ حاضرینِ عدالت کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جج بھی شاہدہ کے بیان سے متاثر نظر آتا تھا۔ میں اس کیفیت کو زیادہ دیر برقرار رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔

"شاہدہ بی بی!" میری گونج دار آواز نے عدالت کے کمرے میں چھائے ہوئے سکوت کا سینہ چیر ڈالا۔ "ٹریجڈی سین ختم ہو چکا۔ تم نے اپنی لائنیں بول دی ہیں۔ اب اداکاری روک دو...... کیمرا رک چکا ہے۔ کیا تم نے کٹ کی آواز نہیں سنی؟"

"کیا مطلب؟" شاہدہ کے بجائے وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ مظلوم شاہدہ اب تک اداکاری کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی جبر، کوئی زیادتی نہیں ہوئی؟"

"جی ہاں۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "یہی حقیقت ہے۔"

"آپ مظلوم کی بے عزتی کر رہے ہیں۔"

"جس شخص کو اپنی عزت کا خود خیال نہ ہو، معاشرہ اسے عزت نہیں دیتا۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اگر مظلوم عزت دار لڑکی ہوتی تو درجنوں افراد کے سامنے اتنا بڑا اسٹیج ڈراما نہ رچاتی۔ اس کے مگرمچھ کے آنسو افسانوی تصویریں حقیقت کے رنگ نہیں بھر سکے۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" وکیل استغاثہ نے خاصی بدتمیزی سے پوچھا۔

"بیگ صاحب۔" جج کو بھی مجبوراً مداخلت کرنا پڑی۔ "آپ اپنے موقف کی وضاحت کریں۔"

"آف کورس یور آنر۔" میں نے دبنگ لہجے میں کہا پھر وکیل استغاثہ، مظلوم شاہدہ سمیت حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد اپنے موکل کی بے گناہی کے حق میں کچھ اس انداز میں دلائل دینا شروع کیے۔

"جنابِ عالی! مظلوم شاہدہ نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ وقوعہ سے چند روز پہلے ملزم اور ان ماں بیٹی کے درمیان ایک رات شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا جس میں ملزم نے واضح طور پر دو آپشنز استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ملزم کو ان ماں بیٹی کے کردار پر بڑا مضبوط شک تھا اور اس نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے اپنے طور طریقے درست نہ کیے تو وہ یا تو انہیں گھر میں تالا بند کر کے اپنے کام کاج کے لیے نکلے گا یا پھر وہ انہیں اپنی زندگی اور اپنے گھر ہی سے نکال باہر کرے گا اور اس نے سیکنڈ آپشن استعمال کرنے پر زیادہ زور دیا تھا یعنی اگر یہ ماں بیٹی اپنی غیر اخلاقی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو وہ انہیں سیدھا سیدھا اپنے گھر سے چلتا کر دے گا۔ ان حالات کی روشنی میں مظلوم شاہدہ کے بیان کا آخری حصہ کوئی اور ہی بھونڈی اور غیر منطقی کہانی سناتا ہے۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ریحان کے خانگی حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ جب وقوعہ کی رات وہ لگ بھگ نو بجے گھر پہنچا اور اس نے اپنی مبینہ بدکردار بیوی کو گھر میں موجود نہ پایا تو اسے مظلوم شاہدہ سے سلمٰی کے بارے میں سوال کرنا چاہیے تھا کہ وہ کہاں گئی ہے، کیوں گئی ہے اور کب تک واپس آئے گی لیکن مظلوم شاہدہ کے بیان کے مطابق ایسا کچھ نہیں ہوا تھا جو کہ ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ نمبر دو......"

میں نے تھوڑی دیر رک کر پھر بولنا شروع کیا۔ "ہم چند سیکنڈ کے لیے مظلوم شاہدہ کے بیان کو درست مان لیتے ہیں مگر جب مظلوم نے ملزم کے کمرے میں جا کر اسے خود بتایا کہ اس کی امی منظور کالونی اپنی بہن فریدہ سے ملنے گئی ہے اور اس نے سات آٹھ بجے تک واپس آنے کو کہا تھا لیکن جب رات کے گیارہ بجے تک بھی سلمٰی کی واپسی نہیں ہوئی تو ملزم کو اصولاً آگ بگولا ہو جانا چاہیے تھا۔ اسے فوری طور پر اپنی سالی فریدہ کے گھر فون کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی کہ سلمٰی اب تک واپس کیوں نہیں آئی لیکن مظلوم شاہدہ کے مطابق، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری معلومات کے مطابق دونوں گھروں میں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے اور سب سے اہم نکتہ......" میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر جج کی جانب دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ملزم وقوعہ کی رات نو بجے اپنے گھر آ گیا تھا۔ بیوی کو گھر میں نہ پا کر یقیناً اس کا دماغ گرم ہو گیا ہوگا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اس نے مظلوم شاہدہ سے اس کی امی کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کی ہو۔ ان دنوں ملزم کے گھر میں جس نوعیت کے حالات چل رہے تھے اس میں اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملزم نے مظلوم کو بڑی محبت اور دلار سے شاہدہ بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہو، اس سے چائے کی فرمائش کی ہو اور بڑی ندامت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ان تمام امور کو بھی چند لمحات کے لیے اگر درست مان لیا جائے تو پھر ایک بات کسی بھی طور قابلِ

نہیں ہے......" میں نے اپنا بیان نامکمل چھوڑ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ اضطراری انداز میں مستفسر ہوا۔

"کون سی بات ناقابلِ ہضم ہے؟"

میں نے وکیل مخالف کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے جج سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جنابِ عالی! کوئی انسان کتنا شریف ہے یا کتنا بدمعاش، یہ اس انسان کا ذاتی فعل شمار ہوگا۔ دونوں صورتوں میں ہم انسان کی بنیادی فطرت کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اگر ملزم ریحان کو اپنی بیوی اور سوتیلی بیٹی کے کردار پر بھروسا نہیں تھا اور وہ ان ماں بیٹی کو راہِ راست پر دیکھنے کا خواہاں تھا تو پھر فطرت کے اصول کے مطابق، وہ خود کسی ایسے فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے کردار کو داغ دار کرنے کا وسیلہ بن جائے اور وہ بھی اپنے گھر کے اندر...... اپنی سوتیلی بیٹی کے ساتھ...... ایسے موقع پر کہ کسی بھی لمحے اس کی بیوی وہاں پہنچنے والی ہو۔ کسی بھی صورت میں یہ ممکن دکھائی نہیں دیتا لہٰذا......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مجرمانہ کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ وہ عدالت سے ایک ناکردہ جرم کی سزا پا کر جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے چلا جائے اور اس دوران میں یہ ماں بیٹی اس کے کاروبار، دولت اور جائداد پر قابض ہو کر اپنی مرضی کے گل چھرے اڑانے والی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ملزم ان کے راستے کا کانٹا تھا۔ یہ کانٹا ہٹتے ہی یہ دونوں شاہراہ آوارگی پر اس طرح سرپٹ دوڑتی چلی جائیں کہ......"

"تو آپ کے خیال میں ملزم اپنی بیوی اور سوتیلی بیٹی کی مشترکہ سازش کا شکار ہوا ہے؟" جج نے مجھ سے سوال کیا۔ "درحقیقت وہ بے گناہ ہے۔ اس سارے بکھیڑے میں اس کا کوئی کردار نہیں؟"

"یس یور آنر۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "آبروریزی کا یہ کیس کسی اسکرپٹ ڈرامے سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں ہے۔"

"کیا آپ اپنے اس موقف کو عدالت کے سامنے سچ ثابت کر سکتے ہیں؟"

"جی ہاں، ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوتوں کے ساتھ۔" میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈجارنڈ۔"

☆☆☆

آیندہ روز ملزم کی بڑی بہن مسز سفیان یعنی عطیہ بیگم مجھ سے ملنے میرے آفس آئی۔ اس دن وہ بہت خوش تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"بیگ صاحب، کل والی پیشی پر تو آپ نے اس حرافہ شاہدہ کی پیش نہیں چلنے دی۔ سچ پوچھیں تو مجھے بہت مزہ آیا تھا۔"

"آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے کہ آپ میری کارکردگی سے خوش ہیں۔"

"خوش بھی اور پُرامید بھی۔" وہ بڑے جوش سے بولی پھر پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ نے قادر کے حوالے سے تصویر اور شناخت کا کیا چکر چلا دیا ہے؟"

"کوئی چکر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں دراصل ایک چھوٹا سا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا تجربہ؟" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "پہلے آپ یہ بتائیں کہ میں نے آپ کو قادر کے حوالے سے جو کام کرنے کو کہا تھا اس کا کیا بنا؟"

"وہ کام ہو گیا ہے۔" وہ بڑے فخریہ انداز میں بولی۔ "میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے پتا چلا لیا ہے کہ قادر آج کل کہاں ہے۔"

"ویری گڈ۔" میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے مذکورہ کاغذ کھول کر دیکھا۔ اس میں قادر کا موجودہ ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایڈریس والے کاغذ کو اپنی میز کی دراز میں ڈالا پھر مسز سفیان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیسا کہ میں نے پہلے بھی اس امر کا اظہار کیا تھا کہ عین ممکن ہے، قادر کوئی نیک اور صلح جو شخص ہو اور اس نے سلمٰی اور شاہدہ کے کردار کی وجہ سے انہیں اپنی زندگی سے الگ کیا ہو۔ یہ ناممکن تو نہیں...... سلمٰی کا بیان، قادر کے خلاف ایک سوچا سمجھا پروپیگنڈا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"آپ کی بات میں وزن ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ میں سوچ رہا ہوں اور آپ

میری اس سوچ کی تصدیق بھی کر رہی ہیں تو پھر قادر سے میری ملاقات، ہمارے کیس کے سلسلے میں بڑی سود مند ثابت ہوسکتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔''

''اگر قادر عدالت میں آکر سلمٰی اور شاہدہ کے کردار کے حوالے سے گواہی دینے کے لیے تیار ہوجاتا ہے تو ریحان کی بے گناہی ثابت کرنے میں بہت آسانی ہوجائے گی۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''لیکن آپ کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں بیٹھ سکی۔''

''کون سی بات؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ تصویر شناخت والا معاملہ۔''

''وہ میں نے محض شاہدہ، سلمٰی اور وکیل استغاثہ کو چکر دینے اور الجھانے کے لیے ایک چال چلی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ تصویر اور شناخت کے حوالے سے مختلف انداز میں قیاس آرائیاں کرنے میں پھنسے رہیں گے اور اگر اللہ نے چاہا تو میں آیندہ پیشی پر قادر کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کرکے ان پر ایٹم بم گرادوں گا۔''

''آپ کا آئیڈیا بہت دھانسو اور جاندار ہے۔'' وہ ستائشی نظر سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''اگر قادر والا معاملہ آپ کی اُمید کے مطابق نکل آئے تو؟''

''امید پر دنیا قائم ہے مسز سفیان۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کسی بھی حال میں امید کے دامن پر اپنی گرفت کمزور نہیں پڑنے دیتا۔ میں خدا کی رحمت، اپنی محنت اور امید کی کرن کے سہارے زندہ ہوں۔''

''واہ واہ...... سبحان اللہ!'' وہ بے ساختہ بولی۔

ہمارے درمیان مزید پندرہ منٹ تک ریحان، سلمٰی اور شاہدہ کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی پھر وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد میرے دفتر سے رخصت ہوگئی۔

آیندہ روز میں نے مسز سفیان کے فراہم کردہ ایڈریس پر جا کر اپنے تئیں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو مجھ پر حیرت اور دلچسپی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکل آیا تھا۔ میں جو کچھ سوچ کر گیا تھا اس سے انتہائی مختلف صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ نئی سچویشن کا تقاضا یہی تھا کہ میں سردست قادر سے ملاقات نہ کروں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

میرے ذہن میں ایک نیا اور اچھوتا آئیڈیا آگیا تھا۔ اگر میں احتیاط سے کام لیتا تو وہ بندہ اس کیس کے لیے ہماری توقع سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوسکتا تھا۔

کیسے...... فی الحال میں آپ کو اس بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ سلمٰی، شاہدہ، وکیل استغاثہ، جج اور حاضرِ عدالت کے ساتھ آپ بھی اگلی پیشی کا انتظار کریں۔ چلیے صرف اتنا جان لیں کہ میں اپنے مخصوص ذرائع استعمال کرکے قادر کی ایک تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ پانچ ضرب سات انچ کی ایک بڑی واضح تصویر تھی جو شناخت کے مقاصد کے لیے بہت عمدہ ثابت ہوسکتی تھی۔ اب میں بے حد مطمئن اور پُرسکون تھا۔

☆☆☆

آیندہ پیشی پر سب سے پہلے استغاثہ کی جانب سے دو گواہ یکے بعد دیگرے عدالت میں پیش کیے گئے۔ دونوں افراد ملزم ریحان کے محلے دار تھے جو وقوعہ کی رات سلمٰی کی چیخ و پکار پر اس کے گھر پہنچ گئے تھے۔ دونوں نے بیان دیا وہ شاہدہ کی حمایت میں اور میرے موکل کے خلاف جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے شاہدہ کی جو حالت دیکھی تھی بلکہ سلمٰی نے انہیں جو کچھ دکھایا اور بتایا تھا وہ اسی کی روشنی میں گواہی دینے آئے تھے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان دونوں افراد نے استغاثہ کے ہاتھ پاؤں مضبوط کرنے کے لیے کیا کیا تیر مارے ہوں گے۔ میں نے ان دونوں کے بیانات میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کی، لہٰذا ان کا ذکر گول کرتے ہوئے میں آگے بڑھتا ہوں۔

اس سے قبل کہ وکیل استغاثہ کسی اور گواہ کو شہادت کے لیے کٹہرے تک لانے کی زحمت کرتا، میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے صرف ایک سوال کرنا چاہوں گا۔''

جج نے فوراً مجھے اجازت مرحمت فرمادی۔ کسی بھی کیس کے تفتیشی افسر کو ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا ہوتا ہے۔ مذکورہ تفتیشی افسر جج کے حکم سے وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔

وہ ایک ڈھیلا ڈھالا، موٹا تازہ اور ست الوجود سب انسپکٹر تھا جس کا نام خیر سے خیر دین تھا۔ میں گواہوں والے کٹہرے کے قریب پہنچا پھر آئی۔ او (انکوائری آفیسر) کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''خیر دین صاحب، کیا آپ نے وقوعہ کے فوراً بعد جبر اور ظلم کا شکار ہونے والی شاہدہ بی بی کا مخصوص نوعیت کا میڈیکل چیک اپ کروایا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیوں نہیں؟''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے تحیر خیز آواز میں کہا۔

''مظلوم شاہدہ موقع پر موجود تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی حالت ظلم وجبر کی کہانی سنا رہی تھی۔ اس کی تباہی و بربادی کو نوٹ کرنے والے تین گواہ (سلمٰی سمیت) ہمیں میسر آگئے تھے پھر......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''پھر...... مظلوم شاہدہ بی بی از خود چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ ملزم ریحان یعنی اس کے سوتیلے باپ نے اسے بری طرح برباد کرڈالا ہے......''

''یہ......!'' میں نے شاہدہ بی بی کی جانب انگلی سے اشارہ کیا پھر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہ آوازِ بلند کہا۔ ''چیخ چیخ کر اپنی بربادی کا اعلان کر رہی تھی یا سرگوشیوں کے ذریعے لوگوں کو اپنے غم سے آگاہ کر رہی تھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس کو ہر حال میں قانونی تقاضے پورے کرنے چاہیے تھے جو کہ نہیں کیے گئے۔'' میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرنے کے لیے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! مظلوم شاہدہ بی بی کا مخصوص میڈیکل چیک اپ بہت ضروری تھا تاکہ اس کے دعوے اور ملزم کے جرم کی تصدیق کی جاسکتی لیکن پولیس نے اس چیک اپ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ یہ فرائض سے غفلت، پیشہ ورانہ کوتاہی اور استغاثہ کے ایک بھیانک سقم کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ یہاں یہ موقف اختیار کروں گا کہ یہ پولیس اور استغاثہ کی سازشانہ ملی بھگت کا شاخسانہ ہے۔ اگر مذکورہ چیک اپ کروالیا جاتا تو دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوجاتا تھا۔ اس کوشش کے نتیجے میں میرا موکل بے گناہ ثابت ہوجاتا لیکن استغاثہ کی بدنیتی کہ وہ ملزم کو ایک ناکردہ جرم میں لمبے عرصے کے لیے جیل بھجوانے کا ارادہ رکھتا ہے...... دیٹس آل یور آنر۔''

جج تھوڑی دیر تک گردن جھکائے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر مختلف انداز میں قلم چلاتا رہا پھر وکیل استغاثہ کو عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

وکیل استغاثہ نے اس کیس میں استغاثہ کی سب سے اہم گواہ اور ملزم کی بیوی سلمٰی کو شہادت کے لیے بلانے کا اعلان کیا تو میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

''جناب عالی! میں سلمٰی کی گواہی سے پہلے اس کیس کی مظلوم شاہدہ سے ایک ضروری سوال کرنا چاہتا ہوں...... اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو......!''

''اجازت ہے......'' جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو شاہدہ بی بی سے جو بھی پوچھنا ہے، اس میں زیادہ وقت صرف نہیں ہونا چاہیے۔''

''صرف ایک سوال یور آنر......!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اور اس سوال کا تعلق ''شناخت'' کے معاملے سے ہے۔ وہ میں نے پچھلی پیشی پر......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چبھتی ہوئی نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور کہا۔

''پچھلی پیشی پر میں نے کسی تصویر کا ذکر کیا تھا۔ وہ تصویر میں نے حاصل کرلی ہے۔ یہ سوال اسی تصویر سے متعلق ہے۔''

وکیل استغاثہ کے چہرے پر تشویش دوڑ گئی۔ شاہدہ بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ جج کی نگاہ میں بھی دلچسپی شامل ہوگئی تھی۔

میں نے اپنے بریف کیف میں سے بھورے رنگ کا ایک لفافہ نکالا۔ قادر کی تصویر کو میں نے اسی لفافے میں رکھا ہوا تھا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد شاہدہ بی بی والے کٹہرے کے پاس پہنچا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''شاہدہ بی بی! آپ نے گزشتہ پیشی پر مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ آپ کو یاد تو ہوگا......؟''

میں چونکہ چند لمحے پہلے فوٹو کا ذکر کرچکا تھا اور شاہدہ اس ذکر پر چونکی بھی تھی لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''جی ہاں...... مجھے یاد ہے، آپ مجھے میرے باپ قادر کی تصویر دکھانا چاہتے ہیں اور مجھ سے شناخت کرانا چاہتے ہیں کہ میں تصویر دیکھ کر اپنے باپ کو پہچان سکتی ہوں یا نہیں......''

''ویری گڈ......'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تمہاری یادداشت قابلِ تحسین ہے۔''

پھر آیندہ چند سیکنڈ میں، میں نے بھورا لفافہ کھول کر اس کے اندر سے قادر کی تصویر نکالی اور شاہدہ بی بی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''لو...... اس فوٹو کو اچھی طرح دیکھ کر شناخت کرو۔''

مذکورہ تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھوں اور چہرے پر شناسائی کے تاثرات نمودار ہوئے اور اگلے ہی لمحے

اس کی سرسراتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں سنائی دی۔
''ہم...... میں نے پہچان لیا...... یہ میرے باپ...... قادر کی تصویر ہے۔ ایک سو ایک فیصد قادر کی تصویر......!''
''دیٹس آل یور آنر......!'' میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔
وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس قسم کی شناخت سے آپ کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں......؟''
میں نے وکیل مخالف کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور شاہدہ بی بی کے ہاتھ سے قادر کی تصویر لے کر جج کی جانب مڑ گیا۔ پھر میں نے وہ تصویر جج کی سمت بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''جناب عالی! آج کی کارروائی کے اختتام تک یہ تصویر معزز عدالت کے پاس امانت کے طور پر محفوظ رہے گی۔''
جج نے میرے ہاتھ سے وہ تصویر لے لی۔ چند لمحات تک وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مذکورہ تصویر کو گھورتا رہا پھر اسے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کے نیچے دبا دیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
''بیگ صاحب! آپ شاہدہ سے کچھ اور پوچھنا چاہیں گے؟''
''ناٹ ایٹ آل یور آنر......'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔
جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''آپ اب گواہ کو پیش کرسکتے ہیں۔''
تھوڑی دیر کے بعد استغاثہ کی سب سے اہم گواہ سلمٰی وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوگئی۔ اس امر کی پہلے بھی کئی بار وضاحت کی جاچکی ہے کہ عدالت میں باری باری ایک ایک گواہ کو بلا کر اس کا بیان لیا جاتا ہے تاکہ کسی ایک کی گواہی، دوسرے کے بیان کو متاثر نہ کرسکے۔ میں نے فوٹو کی شناخت کے حوالے سے شاہدہ کے ساتھ جو بھی ٹرائل کیا تھا، سلمٰی اس کی تفصیل سے واقف نہیں تھی اور یہ میری پلاننگ کا حصہ تھا...... وہ پلاننگ جس کی مدد سے میں شاہدہ بی بی اور سلمٰی کو چاروں خانے چت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔
سلمٰی نے اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ سلمٰی نے عدالت کے روبرو کم وبیش وہی بیان دیا تھا جو وہ وقوعہ کے روز پولیس کو بھی دے چکی تھی۔ وکیل استغاثہ نے مختلف سوالات کے ذریعے، سلمٰی کے تصدیقی جوابات کی مدد سے شاہدہ بی بی کی ''فریاد'' کو حق سچ ثابت کرنے کی کوشش کی۔

جج بڑی دلچسپی سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کردی۔
میں اپنی باری پر جج سے اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔
''سلمٰی بی بی!'' میں نے استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ آپ ملزم کی بیوی ہیں......''
میرے اس عجیب وغریب سوال پر وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ''ہاں...... یہ سچ ہے!''
''اور یہ بھی سچ ہے کہ ملزم آپ کا شوہر ہے؟''
''ظاہر ہے...... جب میں اس کی بیوی ہوں تو وہ میرا شوہر ہی ہوگا نا......!''
''اس تصدیق کے لیے بہت بہت شکریہ۔''
''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست یہ کس قسم کی جرح کر رہے ہیں؟''
''جب اس جرح پر استغاثہ کی سب سے اہم گواہ سلمٰی بیگم کو کوئی اعتراض نہیں اور وہ بڑے صبر وسکون سے میرے سوالات کے جوابات دے رہی ہیں تو پھر استغاثہ کی جانب سے کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی......'' میں نے بڑے مضبوط انداز میں کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ وکیل سرکار کو کیا پریشانی ہے......؟''
جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ......''
''سلمٰی بیگم!'' میں گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کے سامنے اس بات کی تصدیق کریں گی کہ شاہدہ آپ کی سگی بیٹی ہے؟''
''جی ہاں۔ شاہدہ میری سگی بیٹی ہے۔''
''لیکن...... شاہدہ ملزم ریحان کی سگی بیٹی نہیں؟''
''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ بڑی رسانیت سے بولی۔
''ریحان، شاہدہ کا سوتیلا باپ ہے......؟''
''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
''شاہدہ کے سگے باپ کا نام قادر ہے؟''
اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔
''قادر سے آپ نے ساڑھے تین، چار سال پہلے نجات حاصل کرلی تھی؟'' میں نے بڑے سنجیدہ انداز میں جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... جی ہاں!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''وقوعہ کے روز آپ گھر میں موجود نہیں تھیں؟''
''میں اپنی بڑی بہن فریدہ سے ملنے منظور کالونی گئی ہوئی تھی۔''
''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز آپ سہ پہر چار بجے گھر سے نکلی تھیں اور مظلوم شاہدہ سے سات، آٹھ بجے تک واپس آنے کو کہا تھا۔'' میں نے پوچھا۔ ''لیکن آپ کی واپسی رات گیارہ، سوا گیارہ بجے ہوسکی تھی؟''
''جی، یہ درست ہے۔'' وہ نفرت بھری نظر سے ریحان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور جب تک یہ شیطان، میری بچی کو تباہ کرچکا تھا۔''
''جب وقوعہ کی رات آپ منظور کالونی سے واپس گھر پہنچیں تو آپ نے کیا دیکھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، اپنے گھر کے اندر کیا دیکھا؟''
''میرا خیال تھا، میں زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے رات تک واپس آجاؤں گی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں خود یہ نہیں چاہتی تھی کہ جب ریحان دکان سے واپس آئے تو شاہدہ اسے گھر میں اکیلی ملے۔ شاہدہ مجھے ریحان کی بری نیت کے بارے میں تفصیلاً بتا چکی تھی لیکن ایک تو فریدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، مجھے وہاں سے نکلنے میں دیر ہوگئی، دوسرے ٹریفک جام نے بھی بہت سا وقت ضائع کردیا تھا چنانچہ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے کوئی گیارہ بج گئے تھے، آپ سوا گیارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور سوال کیا۔ ''پھر آپ نے گھر کے اندر کیا تماشا دیکھا؟''
''بتا تو دیا ہے......'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''جب میں گھر پہنچی تو میری بچی کی عزت کا جنازہ اٹھ چکا تھا۔ یہ اجڑی بچھڑی زار وقطار رو رہی تھی۔ اس کے بدن کا لباس تار تار ہو چکا تھا اور...... اور...... بس، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔''
اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کی رات جب آپ گھر پہنچیں تو آپ نے گھر کے اندر سے مظلوم شاہدہ کی چیخ پکار تو سنی ہوگی؟''
''چیخ پکار سن کر ہی تو میں تیزی سے اندر کی طرف بھاگی تھی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''شاہدہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔''

''آپ مظلوم کی پکار پر دوڑتے ہوئے ملزم کے کمرے میں پہنچ گئیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس وقت تک، آپ کے بیان کے مطابق ملزم اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل کرچکا تھا...... پھر آپ کے شور مچانے پر محلے والے بھی وہاں جمع ہوگئے تھے جن میں سے دو افراد، استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے بیان بھی دے چکے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''
''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''ایسا ہی ہوا تھا۔''
''وقوعہ کی رات آپ منظور کالونی سے واپس آئیں۔ گھر پہنچ کر آپ کو پتا چلا کہ مظلوم شاہدہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ وہ مدد کے لیے پکار بھی رہی تھی۔ آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دوڑتے ہوئے سیدھی اس کمرے میں پہنچ گئیں جہاں آپ کے بہ قول، ملزم نے آپ کی دلاری کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا۔'' میں نے رفتہ رفتہ اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے جرح کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''گھر کے مین گیٹ سے جائے وقوعہ یعنی ملزم کے کمرے تک رسائی حاصل کرنے میں آپ کو کسی دشواری کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا تھا......؟''
''جی، بالکل نہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''میں کسی پرندے کی طرح اڑ کر پلک جھپکتے میں وہاں پہنچ گئی تھی۔''
میں نے جج کی سمت دیکھتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کی معزز گواہ کے بیان میں شامل اس نکتے کو خاص طور پر نوٹ کیا جائے کہ یہ وقوعہ کی رات مظلوم کی پکار، بلکہ فریاد پر، کسی پرندے کے مانند اڑ کر سیدھی اس کمرے میں جا پہنچی تھی جہاں استغاثہ کے مطابق ملزم نے مظلوم شاہدہ کو بے آبرو کیا تھا۔''
میری اس اسپیشل استدعا پر وکیل استغاثہ اور سلمٰی بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی نظروں کو نظرانداز کر کے سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کیا آپ کی بیٹی مظلوم شاہدہ بی بی کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے؟''
''نہیں...... نہیں تو......'' اس استفسار پر وہ گڑبڑا گئی۔ ''اس کے ساتھ جو ظلم اور زیادتی ہوئی ہے اس میں کسی غلط بیانی کا ہاتھ نہیں۔ اس کی فریاد کا ایک ایک لفظ سچ میں ڈوبا ہوا ہے۔''
''میں نے ایک عمومی عادت کی بات کی تھی۔'' میں

نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”آپ نے میرے استفسار کو زیرِ سماعت کیس سے جوڑ ڈالا ہے۔“

”ہم...... میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شاہدہ جھوٹ نہیں بولتی۔“

”پھر یہ مرض آپ کو لاحق ہوگا......؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

”مطلب یہ کہ......“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر جھوٹ بولنا آپ کی گھٹی میں شامل ہوگا......؟“

”ہرگز نہیں!“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”یہ بری عادت ہم ماں بیٹی دونوں میں نہیں ہے۔ انسان اپنے کسی جرم کو چھپانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ جب ہمارا کردار، ہمارے ہاتھ صاف ہیں تو پھر ہمیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں سلمٰی بیگم!“

میں نے یہ جملہ بڑے وثوقی انداز میں ادا کیا تھا لیکن چونکہ سلمٰی کو مجھ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی لہٰذا وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے تعجب کو ٹھنڈے کرنے کی غرض سے کہا۔

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں سلمٰی بیگم کہ انسان اپنے کسی جرم کو چھپانے کے لیے جھوٹ اور دروغ گوئی کا سہارا لیتا ہے۔ اب مجھے معزز عدالت کے سامنے یہ حقیقت منکشف کرنا ہے کہ اگر مظلوم شاہدہ نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”اس نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟“ سلمٰی متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

”گزشتہ پیشی پر......“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”میرے سوال کے جواب میں، مظلوم شاہدہ بی بی نے خود پر بیتنے والی قیامت کا احوال بیان کرتے ہوئے معزز عدالت کے روبرو اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ جب وہ چائے کے برتنوں والی خالی ٹرے کچن میں رکھ کر ملزم کی بات سننے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچی تو ملزم نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اسے بیڈ پر گرا کر دروازے کو اندر سے لاک کر دیا تھا۔ اگر دروازہ کھلا ہوتا یا مظلوم اسے کھول سکنے کی پوزیشن میں ہوتی تو وہ یقیناً اپنی عزت بچانے کے لیے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتی لیکن اب......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے مدلل بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اب استغاثہ کی سب سے معتبر گواہ سلمٰی بیگم بتا رہی ہے کہ جب اس نے مظلوم شاہدہ کی چیخ و پکار سنی تو وہ پرندے کی طرح اڑ کر پلک جھپکتے میں ملزم کے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ اسے گھر کے مین گیٹ سے جائے وقوعہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جبکہ مظلوم کا دعویٰ ہے کہ اس کی تباہی اور بربادی کمرے کے لاک دروازے کے پیچھے عمل میں آئی تھی......؟“

”وہ...... شاید...... میں بھول رہی ہوں۔“ وہ بے حد گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولی۔ ”جب میں نے شاہدہ کی چیخیں سنی تھیں تو میں اندھا دھند اندر کی جانب دوڑ پڑی تھی۔“ وہ بگڑی ہوئی صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”دروازہ واقعی لاک تھا۔ میں نے جب وہ دروازہ پیٹ ڈالا تو شاہدہ نے کھولا تھا۔“

”شاہدہ نے یا ریحان نے......؟“

”شاہدہ نے......“

”مظلوم شاہدہ بی بی تو کمرے کے اندر، ملزم کے سامنے بے بس اور لاچار تھی۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ یہ کام کس طرح کر سکتی تھی......؟“

وہ آئیں، بائیں، شائیں کرنے لگی۔ میں نے اسے مکمل طور پر چت کرنے کے لیے دوسری سمت سے حملہ کیا۔

”سلمٰی بیگم! کیا یہ درست ہے کہ ملزم کو آپ ماں بیٹی دونوں کے کردار پر شک تھا؟“

”کوئی ایسا ویسا شک!“ وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ”اس شکی آدمی کا بس چلتا تو ہمیں گھر میں تالا بند کر کے ہی باہر نکلتا...... یا کسی جیل میں سڑوا دیتا۔“

”تالا بند کرنے کی بات تو شاید ہوئی بھی تھی۔“ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے گھسنا شروع کیا۔ ”اور اس پر ملزم کا یقیناً بس بھی چلتا تھا۔“

”ہاں...... یہ کئی بار ایسی بات کر چکا تھا۔“ وہ ملزم کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”وقوعہ سے کتنا عرصہ پہلے ملزم کو آپ ماں بیٹی کے کردار پر شبہ ہوا تھا؟“

”کوئی چار ماہ پہلے......“

”اس شک کی وجہ؟“

”محلے والوں نے ہمارے خلاف اس کے کان بھر دیے تھے۔“ سلمٰی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں، اس لگائی بجھائی میں اس کی آپا کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔“

”آپا......!“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کون آپا؟“

”اس کی بڑی بہن۔“ وہ ملزم ریحان کی جانب دیکھتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ ”خود تو بیوہ ہو کر بیٹھ گئی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسرے بھی سکون کی سانس نہ لیں......“

اس کا واضح اشارہ مسز سفیان کی جانب تھا۔ ریحان کا کیس مسز سفیان ہی کے توسط سے مجھ تک پہنچا تھا۔ میں سلمٰی کو جس ڈھب پر لانا چاہتا تھا، وہ رفتہ رفتہ ادھر ہی کا رخ کر رہی تھی۔

میں نے بڑے انجان پن سے پوچھا۔ ”عطیہ بیگم کو آپ سے کیا دشمنی تھی؟“

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”ہم نے تو کبھی اس کی کوئی مرغی چوری نہیں کی۔ ویسے یہ مجھے پتا ہے کہ وہ ریحان کی مجھ سے شادی سے خوش نہیں تھی۔“

”کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ سے چند روز پہلے بھی ملزم نے آپ ماں بیٹی دونوں کے ساتھ شدید نوعیت کا جھگڑا کیا تھا؟“ میں نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

”جی...... یہ درست ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”جھگڑے کا سبب وہی تھا...... آپ دونوں کے کردار پر شک؟“

”جی ہاں......!“

”اس رات ملزم نے دو آپشنز کا ذکر بھی کیا تھا؟“

”ایسی باتیں تو یہ اٹھتے بیٹھتے کرتا ہی رہتا تھا۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

”اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے کی نہیں، میں اس رات کی بات کر رہا ہوں جس کے چند روز بعد وقوعہ پیش آ گیا تھا؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں...... اس رات بھی دو آپشنز کی بات ہوئی تھی۔“ اس نے تصدیق کر دی۔

”اور ملزم نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اگر آپشنز استعمال کرنے کی نوبت آ ہی گئی تو وہ ”سیکنڈ آپشن“ کو منتخب کرنا پسند کرے گا...... ہیں نا؟“

”جی ہاں...... اس نے یہی دھمکی دی تھی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”یعنی وہ آپ ماں بیٹی کو گھر میں تالا بند کرنے کے

بجائے اپنی زندگی ہی سے الگ کر دے گا؟" میں نے تائید طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک بار پھر گردن کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے اپنے سوالات میں ایک دم تیزی لاتے ہوئے پوچھا۔ "ملزم آپ لوگوں کو کردار کے حوالے سے اٹھتے بیٹھتے نشانہ تو بناتا ہی رہتا تھا لیکن وقوعہ سے چند روز پہلے جو فسادِ عظیم برپا ہوا اس میں ملزم نے کسی شخص...... کسی خاص شخص کا نام لے کر استفسار کیا تھا......؟"

"پتا نہیں...... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔

"کیا ملزم نے صفدر نامی کسی شخص کا حوالہ نہیں دیا تھا؟" میں نے وٹنس باکس میں کھڑی سلمٰی بیگم کو گھورا۔ "جو ادھر محمود آباد میں رہتا ہے۔ اس شخص کا کردار اور چال چلن اچھا نہیں۔ ملزم نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ صفدر محمود آبادی سے ملنے کیوں جاتی ہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... ایسی کوئی بات ہوئی تو تھی۔"

"شکر ہے، آپ کی یادداشت نے واپسی کا ٹکٹ تو کٹوایا۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔"

وہ کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔

میں نے بڑی سرعت سے اپنے ہدف کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "سلمٰی بیگم! آپ نے ملزم کے کڑے استفسار کے جواب میں، دوٹوک الفاظ میں اس پر واضح کر دیا تھا کہ آپ صفدر نامی کسی شخص سے واقف ہیں اور نہ ہی ملتی ہیں؟"

"جو حقیقت تھی، میں نے وہی کہا تھا۔"

"ملزم نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کے پاس، اس سلسلے کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی موجود ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے سلمٰی کی جانب دیکھا۔

"صرف دعویٰ کیا تھا، ثبوت پیش نہیں کیا تھا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"ثبوت پیش نہ کرنے کی وجہ؟"

"جھوٹ!" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "اس کا دعویٰ جھوٹا تھا۔ اگر واقعی اس کے پاس کوئی ثبوت ہوتا تو یہ اسے استعمال کرنے میں ذرا دیر نہ لگاتا۔"

"آپ کا اندازہ غلط ہے سلمٰی بیگم!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں کچھ سمجھی نہیں۔" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"میرا کون سا اندازہ...... ملزم کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت ہونے کا یا استعمال نہ کرنے کا......؟"

"میرا اشارہ ثبوت کی طرف ہے......"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کے پاس، ہمارے خلاف کوئی ثبوت تھا؟"

"جی میرا یہی مطلب ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ الجھن زدہ انداز میں مستفسر ہوئی۔ "تو پھر اس نے استعمال کیوں نہیں کیا؟"

"شاید یہ میری آمد کا انتظار کر رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے توسط سے وہ ٹھوس ثبوت سامنے لانا چاہتا تھا۔"

"تو وہ ثبوت آپ کے پاس ہے......؟"

"بالکل میرے پاس ہے۔"

"آپ اس ثبوت کو کب سامنے لائیں گے؟"

"ابھی...... اور اسی وقت......!"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اپنے بریف کیس میں سے ایک سفید لفافہ برآمد کیا اور وٹنس باکس کے قریب آ کر سلمٰی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس لفافے میں دو تصویریں ہیں۔ ایک میں صفدر اکیلا ہی نظر آ رہا ہے اور دوسری تصویر میں آپ بھی صفدر کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر آپ کسی صفدر کو نہیں جانتیں تو پھر اس کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی کیا تک بنتی ہے......؟"

"لائیں دکھائیں......" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں......"

میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے رفتہ رفتہ اس کھیل کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا لہٰذا سلمٰی کی کسی بداخلاقی پر اعتراض کر کے میں کوئی بدمزگی کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جج نے سلمٰی کے ریمارکس کو فوراً نوٹ کیا۔ نہ صرف نوٹ کیا بلکہ اسے کڑی تنبیہہ بھی کی۔

"سلمٰی بیگم! لینگویج پلیز...... ورنہ میں آپ کو توہین عدالت کے کیس میں جیل بھی بھجوا سکتا ہوں......" پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔"

میں نے استغاثہ کی گواہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"سلمٰی بیگم! پہلے میں آپ کو وہ تصویر دکھاؤں گا جس میں صفدر نامی وہ غنڈا اکیلا نظر آ رہا ہے۔ اگر آپ نے اس تصویر کو پہچاننے سے انکار کر دیا تو پھر میں آپ کی خدمت میں دوسری تصویر پیش کروں گا تاکہ آپ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کیونکہ دوسری تصویر میں اس غنڈے اوباش صفدر کے ساتھ آپ بھی دکھائی دیں گی......"

قارئین! یہ میرے ڈرامے کا کلائمیکس تھا جس کے بارے میں آپ سمیت کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے سفید لفافے میں سے ایک تصویر اتنی احتیاط کے ساتھ برآمد کی کہ اسے وٹنس باکس میں کھڑی سلمٰی بیگم کے سوا اور کوئی نہ دیکھ سکے۔ عدالت کے کمرے میں اس وقت سناٹے کا راج تھا۔ وہ الفریڈ ہچکاک کی کسی فلم کا سین معلوم ہوتا تھا۔ وکیل استغاثہ ایسی نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میں نے لفافے میں سے کوئی تصویر نہیں بلکہ پٹاری میں سے کوئی سانپ برآمد کیا ہو۔

میں نے مذکورہ تصویر سلمٰی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ صفدر بدمعاش کی تصویر ہے۔ کیا آپ اسے جانتی ہیں......؟"

تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اسے ایک جھٹکا سا لگا، اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں اور چہرے پر شناسائی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ اس سے اگلے ہی لمحے پر اس نے خود کو سنبھال لیا اور بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں اس بندے کو نہیں جانتی......"

"اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دے رہی ہیں نا......؟"

"ہاں ہاں۔" وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ "میں واقعی اس بندے کو نہیں جانتی۔ ریحان نے آپ کو بالکل غلط بتایا ہے۔ میں نے آج پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہے...... میرا مطلب ہے، اس کی تصویر کو دیکھا ہے۔"

"دی ڈرٹی گیم از اپ......!" میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر سلمٰی کے ہاتھ سے تصویر لے کر جج کی جانب مڑا اور کہا۔

"جنابِ عالی! میں اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"وہ کس طرح......!" جج کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "بیگ صاحب! آپ استغاثہ کی گواہ کو دوسری تصویر نہیں دکھائیں گے؟"

"اس کی اب ضرورت نہیں رہی۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بلکہ میرے پاس دوسری کوئی تصویر ہے ہی نہیں۔"

"بیگ صاحب! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" جج کی حیرت دیدنی تھی۔ "وہ جو آپ نے دوسری تصویر کا ذکر کیا تھا وہ کیا ہوئی...... وہ جس میں آپ کے بہ قول صفدر اور استغاثہ کی گواہ سلمٰی بیگم ایک ساتھ نظر آ رہے تھے......؟"

"جنابِ عالی! میں نے عرض کیا ہے نا، ایسی کوئی تصویر سرے سے ہے ہی نہیں۔ میں نے یہ سارا کھٹ راگ استغاثہ کی معزز گواہ کو گھیرنے کے لیے پھیلایا تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب رہا ہوں۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کی کامیابی کی کنجی صفدر غنڈے کی تصویر ہے؟" جج کی حیرت دوچند ہو گئی۔

"آف کورس یور آنر!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "یہ تصویر آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔"

پھر میں نے وکیل استغاثہ کی نظر بچا کر مذکورہ تصویر جج کی جانب بڑھا دی۔

اس تصویر کو دیکھتے ہی جج گویا اپنی کرسی پر اچھل پڑا۔ اس نے بڑی سرعت کے ساتھ، اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو چھیڑا اور ان کے نیچے سے شاہدہ بی بی کے باپ قادر کی تصویر کو برآمد کر لیا، پھر وہ غلام قادر اور صفدر کی تصاویر کو پہلو بہ پہلو رکھ کر بڑی سنسنی خیز نظر سے ان کا جائزہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ کے جائزے کے بعد وہ میری جانب دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"بیگ صاحب! یہ تو ایک ہی شخص کی دو، ایک جیسی تصاویر ہیں......!"

"یس یور آنر!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

جج نے پوچھا۔ "کون ہے یہ شخص؟"

"جنابِ عالی!" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے مظلوم شاہدہ معزز عدالت کے روبہ رو اس شخص کو اپنے سگے باپ قادر کی حیثیت سے پہچان چکی ہے۔ اس کی شناخت پر شک کی گنجائش ممکن نہیں۔"

"پھر سلمٰی بیگم اپنے سابق شوہر کو پہچاننے سے کیوں انکاری ہے؟"

"تاکہ صفدر کا پردہ چاک نہ ہو......"

"صفدر کا قادر سے کیا تعلق ہے؟"

"ایک شخصیت، دو نام!" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"بیگ صاحب! اس نکتے کی وضاحت کریں؟"

"اس نکتے کی وضاحت سلمٰی بیگم کی زبانی ہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

”سلمیٰ بیگم!“ جج نے استغاثہ کی سب سے معزز گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”نہایت ہی آسان الفاظ میں اس امر کی وضاحت کرو کہ تم نے اپنے سابق شوہر قادر کو پہچاننے سے کیوں انکار کیا اور...... معزز عدالت یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ تمہارے سابق شوہر قادر اور صفدر غنڈے میں کیا تعلق ہے......؟“

ادھر جج کی بات ختم ہوئی، ادھر سلمیٰ بیگم ”پ...... پانی......“ کا نعرہ لگاتے ہوئے کٹہرے کے فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

سلمیٰ بیگم کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا لہٰذا آئندہ پیشی پر اس نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ سلمیٰ نے اپنے اقبالی بیان میں جو تفصیل سنائی وہ بہت حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھی۔ میں یہاں پر اس کا خلاصہ پیش کروں گا۔

قادر اور صفدر ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے۔ شاہدہ اس شخص کو صرف قادر کے نام سے جانتی تھی اور اسے اپنا باپ مانتی تھی جبھی اس نے تصویر دیکھتے ہی اسے اپنے باپ کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا جبکہ سلمیٰ کو یہی تصویر میں نے صفدر کی شناخت کے حوالے سے دکھائی تھی اور اس نے فوراً انکار کردیا تھا کیونکہ اگر وہ صفدر کو شناخت کرلیتی تو پھر باقی کی کہانی بھی کھل جاتی تھی۔ صفدر ایک اختیار کیا ہوا نام تھا ورنہ درحقیقت یہ شخص سلمیٰ کا سابق شوہر قادر ہی تھا۔ میرے اس وضاحتی بیان سے یقیناً آپ کا ذہن بھی الجھ رہا ہوگا لہٰذا میں تھوڑا اور پیچھے جاتا ہوں۔

یہ ٹھیک ہے کہ قادر ایک بدمعاش اور غنڈا ٹائپ شخص تھا۔ سلمیٰ شروع ہی سے چکر بازیوں کی ماہر تھی لہٰذا قادر اس سے مار پیٹ کرتا رہتا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قادر نے اسے طلاق دے دی (خلع والا بیان سلمیٰ کی دروغ گوئی کا شاخسانہ تھا) اس موقعے پر شاہدہ نے ماں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا چنانچہ قادر نے دونوں پر لعنت بھیجی اور اپنی غنڈا گردی میں مصروف ہوگیا۔

کچھ عرصہ پہلے غلام قادر کو پتا چلا کہ سلمیٰ نے کسی ریحان نامی شخص سے شادی کرلی ہے اور اس نے اپنی بیٹی شاہدہ کو بھی بری راہ پر لگالیا ہے۔ سلمیٰ کے ساتھ وہ کسی اور علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ بعد میں اسے مجبوراً وہ علاقہ چھوڑ کر محمود آباد آنا پڑا تھا اور یہاں آکر اس نے اپنا نام صفدر رکھ لیا تھا۔ یہاں سب اسے صفدر کے نام سے جانتے تھے۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کرکے نہایت ہی خفیہ طور پر قادر کا راز جان لیا تھا جبھی میں نے ایک سنسنی خیز کھیل کھیلنے کے لیے دو ایک جیسی تصاویر والا ڈرامہ رچایا تھا۔ قصہ مختصر...... قادر نے مختلف ذرائع سے اس امر کی تصدیق کی اور پھر سلمیٰ کو بلیک میل کرنے لگا۔ اس نے سلمیٰ کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے قادر کو ایک بھاری رقم ادا نہ کی تو وہ اس کے شوہر کو سب کچھ بتادے گا۔ اسی سلسلے میں وہ دو تین مرتبہ محمود آباد جاکر صفدر (قادر) سے ملی بھی تھی اور ایک بار تعاقب کرتے ہوئے ریحان بھی محمود آباد پہنچ گیا تھا۔ سلمیٰ نے شاہدہ کو اس معاملے سے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔

سلمیٰ نے دو، تین مرتبہ قادر کے چھوٹے موٹے مطالبات پورے کردیے تو وہ اور زیادہ پھیلنے لگا۔ جب اس نے بہت بھاری رقم کا مطالبہ کیا تو سلمیٰ کے ذہن میں ایک تیر، دو شکار والا آئیڈیا چمکا۔ اس نے شاہدہ کو تیار کیا اور نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ ریحان کو جیل بھجوانے کا پکا بندوبست کردیا۔ اس کھیل کی کامیابی پر ریحان ایک لمبے عرصے کے لیے جیل چلا جاتا۔ سلمیٰ اور شاہدہ اس کی دولت، گھر اور کاروبار پر قابض ہوجاتیں اور قادر کی بلیک میلنگ کے لیے کوئی راستہ کھلا نہ رہتا۔ سلمیٰ کے شیطانی ذہن نے خاصا خطرناک منصوبہ بنایا تھا۔ شومئ قسمت کہ ایسا ہو نہ سکا۔ میری مداخلت اور وکالت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا تھا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر، عدالت نے میرے موکل ریحان کو باعزت بری کردیا تھا۔ ریحان نے سلمیٰ چالباز کو طلاق دینے میں ذرا سی غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا اور ان ماں بیٹی کو پہلی فرصت میں اپنے گھر اور اپنی زندگی سے دفع دور کردیا تھا۔ ان دونوں کے لیے سب سے بڑی سزا یہی ہوسکتی تھی۔

بعض لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔ سلمیٰ اور شاہدہ کا شمار بھی انہی بعض لوگوں میں ہوتا تھا۔ اگر وہ عقل مندی سے کام لیتیں تو اس معاشرے میں خوش حال اور باوقار زندگی گزار سکتی تھیں۔ اب ان کے مقدر میں ذلت رسوائی اور جیل کی سنگلاخ دیواریں تھیں۔

دوسری جانب ریحان کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ چھوٹا سا کرائسس اس کے لیے راحت کا سامان بن گیا تھا...... اس ہنگامہ آرائی اور مصیبت کو بلامبالغہ جزائے سزا بھی کہا جاسکتا ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)



اصلی نقلی

سلیم انور

اکثر ایسا ہوتا ہے جو دکھائی دیتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے ویسا نظر نہیں آتا، خدا جانے یہ نظر کا دھوکا ہے یا عقل کا بہرحال ایسا ہی معاملہ اسے بھی درپیش تھا جب وہ اصل اور نقل کے درمیان عقل کے گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے ہانپنے لگی تو وقت نے خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا۔

ایک دوشیزہ کی شاطرانہ چالوں اور گہری نگاہوں کا کمال

حقیقت میں ایک عمدہ چالبازی تھی اور عملی طور پر آسان بھی۔ صحیح معنوں میں اس میں لغزش کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ اگر باربرا اپنی خوب صورت انگلیاں جن کے ناخن نہایت عمدگی سے تراشیدہ تھے، بینک کی مشین میں ڈال کر کم سے کم پچیس ڈالرز کی ہیرا پھیری کرنے کی کوشش کرتی تو بینک ایگزامنرا سے پلک جھپکتے میں رنگے ہاتھوں پکڑ سکتا تھا۔ اس کے بجائے باربرا نے ریزگاری میں ہیرا پھیری کو ترجیح دی تھی اور وہ یہ ریزگاری بینک کے کیش میں سے نہیں بلکہ اس کے گاہکوں سے چراتی تھی۔

پین سلوانیا کے امیر شہر یارڈلے میں چند ہی لوگ ایسے تھے جو اس ریزگاری کو گننے کی زحمت کرتے تھے جو بینک کی کیشیئر انہیں تھماتی تھی۔ خاص طور پر ایک سینٹ اور دس سینٹ کے سکوں کو تو کوئی بھی نہیں گنتا تھا اور باربرا کا طریقۂ کار ایسا تھا کہ اس میں کسی قسم کا رسک نہیں تھا کیونکہ اس نے کبھی ریزگاری میں سے زیادہ رقم بٹورنے کا لالچ نہیں کیا تھا۔ اس نے سکے بٹورنے کی حد کم سے کم رکھی ہوئی تھی۔

وہ پہلے ریزگاری کو گاہک کی جانب کھسکاتے ہوئے کہتی تھی۔ ”یہ گن لیں۔“ اور پھر ساتھ ہی کرنسی نوٹ گننا شروع کردیتی تھی۔ بیشتر لوگ اپنی توجہ اس کے نوٹ گننے پر مبذول رکھتے تھے اور ریزگاری نہیں گنتے تھے۔ بعض اس کے شمار کیے ہوئے نوٹ وصول کرنے کے بعد اپنی تسلی کی خاطر خود بھی انہیں گنتے تھے۔ لیکن تقریباً کوئی بھی ریزگاری پر دھیان نہیں دیتا تھا۔

بعض مرد کوئی بھی کرنسی گننے کی زحمت نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کی تمام تر توجہ باربرا کی جھیل سی گہری نیلی آنکھوں پر مبذول رہتی تھی۔ بعض اس کی قدرتی سنہری لانبی زلفوں میں کھوئے تصور میں ان میں انگلیاں پھیرنے میں مگن ہوجاتے تھے۔ باربرا چاہتی تو اس قسم کے عاشق مزاج گاہکوں سے زیادہ رقم بٹور سکتی تھی لیکن اس نے کبھی ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھانے کی

کوشش نہیں کی تھی۔

وہ کسی بھی گاہک سے بیس پچیس سینٹ سے زیادہ رقم نہیں بٹورتی تھی۔ زیادہ لالچ کرنا کسی طور پر عقلمندی نہیں تھی...... چاہے بات ریزگاری ہی کی تھی۔

اور یوں وہ دن بھر میں لگ بھگ تیس ڈالرز روزانہ اکٹھے کرلیتی تھی۔

یہ اس کی ریزگاری کی جمع شدہ رقم تھی جو چھ سال کی عرصے میں تینتیس ہزار ڈالرز تک جا پہنچی تھی۔

اور اسی جمع شدہ رقم کی بدولت اب وہ یورپ کی سیر کے لیے نکلی ہوئی تھی اور اس وقت ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار ویرونا، اٹلی سے نائس، فرانس جارہی تھی۔

ابھی ٹرین کو ویرونا سے روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کے مقابل کی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے اس سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم برا نہیں مناؤ گی اگر میں تم سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہوں؟“

باربرا ہلکے سے مسکرادی۔

”جب سے ٹرین اسٹیشن سے نکلی ہے میں بات چیت شروع کرنے کے لیے کوئی اچھا موضوع تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن مجھے کوئی اور بات سجھائی نہیں دی اس لیے میں براہِ راست مخاطب ہوگیا۔ تم نے مائنڈ تو نہیں کیا؟“

باربرا کو پہلے سے توقع تھی کہ یہ شخص اس سے ضرور مخاطب ہوگا۔ مرد عام طور پر اجنبی عورتوں سے بات چیت کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں اور یہ مرد اس ٹائپ کے مردوں میں سے نہیں تھا جنہیں باربرا ترجیح دیتی تھی۔

وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا جس نے عینک لگائی ہوئی تھی اور سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے اور اس کی گنج نمایاں ہورہی تھی۔ اس کی عمر بھی پینتالیس برس کے لگ بھگ دکھائی دے رہی تھی لیکن اس وقت کیبن میں اور کوئی نہیں تھا اور اگر باربرا خاموش بیٹھی رہتی تو ٹرین کا یہ سفر نہایت بور ثابت ہوتا۔

”نہیں۔“ باربرا نے جواب دیا۔ ”درحقیقت میں خود بھی چاہ رہی تھی کہ ہم آپس میں بات چیت شروع کردیں۔“

”گڈ!“ اس شخص نے کہا۔

”میرا نام باربرا ہے اور میں امریکن ہوں۔“ باربرا نے اپنا تعارف کرایا۔

”صرف امریکی ہی اپنے ملک کے حوالے سے اپنی شناخت کراتے ہیں۔“ اس شخص نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ میرا نام مائیکل ہے اور میں گیلیلی میں رہتا ہوں۔“

باربرا نے جب اس کی جانب الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ”گیلیلی، اسرائیل!“

”واقعی؟“ باربرا نے حیرت سے کہا۔ ”وہ تو بڑی پرکشش جگہ ہے لیکن تم یہاں کیا کررہے ہو؟“

”کام سے آیا ہوں۔“ مائیکل نے جواب دیا۔ ”اور تم؟“

”اوہ، میں تفریح کی غرض سے نکلی ہوئی ہوں۔“ باربرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تفریح!“ مائیکل نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ”تب تو پھر اس بات کا جشن ہونا چاہیے۔ کیا خیال ہے اگر میں پورٹر کو کال کرکے اس سے ہم دونوں کے لیے کوئی مشروب لانے کا آرڈر دے دوں؟“

”ویل۔“ باربرا قدرے سوچ میں پڑ گئی۔ ”میں حقیقتاً میں کچھ کہہ نہیں سکتی......“

”احمق مت بنو!“ مائیکل نے کہا۔ ”وائن کی ایک بوتل سے بھلا کیا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے...... خاص طور پر جب وہ دو افراد کے درمیان تقسیم ہوجائے گی؟“

باربرا ہنس پڑی اور رضامند ہوگئی۔

مائیکل نے انٹرکام پر وائن کا آرڈر دے دیا اور کچھ دیر بعد پورٹر بوتل لے آیا اور وائن گلاس میں انڈیل کر انہیں پیش کردی۔

وہ دونوں وائن سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ انہوں نے کئی جام انڈیل لیے۔ اس دوران ان کی گفتگو بھی جاری رہی۔

باربرا چونکہ اس سے زیادہ تیز کاک ٹیلو کی عادی تھی اس لیے اس پر وائن کے نشے نے کوئی زیادہ اثر نہیں کیا البتہ مائیکل الکحل کا عادی نہیں تھا اس لیے ابھی بوتل آدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس پر قدرے سرور کا عالم طاری ہوگیا۔

اور جب بوتل خالی ہوگئی تو وہ بھی اپنی حدود سے آگے نکلنے لگا۔

”تمہیں معلوم ہے۔“ اس نے قدرے بہکے ہوئے لہجے میں باربرا کو مخاطب کیا۔ ”تم بلاشبہ ان انتہائی حسین ترین عورتوں میں سے ایک ہو جنہیں آج تک میں نے دیکھا ہے۔“

”دیکھا!“ باربرا نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”یہاں اب گفتگو کا رخ اس طرف گھوم گیا جہاں میں نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم کسی ایسے شخص کے ساتھ نہیں جیسا کہ وہ دکھائی دے رہا ہے۔“

البتہ وہ مائیکل سے صرف یہ کہہ کر رہ گئی۔ ”میرے خیال سے یہ تمہارا مخصوص جملہ ہے جو تم ایسے موقعوں پر ادا کرتے ہو۔“

”مخصوص جملہ؟“ مائیکل نے دہرایا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا معیار کیا ہے۔“

یہ کہہ کر مائیکل نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اسے کھولنے کے بعد اس کے اندر سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر باربرا کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اس حسین عورت کے لیے جیسی کہ تم ہو، صرف اسے ہی حسین چیزیں زیب دیتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسا جوہری تلاش کرلوگی جو اس سے ایک نہایت نفیس اور عمدہ انگشتری یا پن تیار کردے۔“

باربرا نے پیکٹ کھولا تو اس کے اندر موجود ہیرے کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ چند ساعت ہکا بکا رہنے کے بعد گویا ہوئی۔

”تم یقیناً سنجیدہ نہیں ہو۔“

”میں مکمل طور پر سنجیدہ ہوں!“ مائیکل نے کہا۔

”لیکن تم تو مجھے جانتے تک نہیں ہو۔“

”لیکن میں جاننا چاہتا ہوں۔“ مائیکل نے جواب دیا۔ ”اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ زندگی میں جن ہزاروں دیگر مردوں سے تمہاری ملاقات رہتی ہے اور تم انہیں فراموش کردیتی ہو، مجھے ان کے مانند فراموش نہ کردو، اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟“

”کیا یہ...... یہ اصلی ہیرا ہے؟“ باربرا نے پوچھا۔

مائیکل نے ایک لمحے کے لیے باربرا کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ”تقریباً لیکن کامل طور پر نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ باربرا نے حیرت سے کہا۔

”یہ کیوبک زرقون کہلاتا ہے۔“ مائیکل نے بتایا۔

”کیوبک زرقون؟“

”ہاں۔ کیا تم نے اس کے متعلق کبھی نہیں سنا؟“ مائیکل نے پوچھا۔

”نہیں۔“ باربرا نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ایک آرٹی فیشل ہیرا ہے...... یہ پیٹروکیمیکلز سے تیار کیا گیا ہے لیکن اصل سے اتنا زیادہ قریب ہے کہ اس کو بھانپنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔“

”کوئی جوہری بھی شناخت نہیں کرسکتا؟“ باربرا نے معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں، جوہری بھی شناخت نہیں کرسکتا۔“ مائیکل نے جواب دیا۔ ”اصلی ہیرے کی تشکیل کوئلے سے ہوتی ہے۔ جب کوئلہ دس لاکھ پونڈ کے پریشر میں دس لاکھ سال تک دبا رہتا ہے تو تب ہیرا بنتا ہے۔ کوئلہ ہائیڈروکاربنز سے بنتا ہے جس طرح تیل بنتا ہے۔ کیوبک زرقون بس اسی پروسس کی کیمیائی طور پر رفتار بڑھا دیتا ہے۔“

”لیکن یہ من وعن اصلی ہیروں کے مانند تو نہیں ہوسکتا۔“ باربرا نے کہا۔

”نہیں۔“ مائیکل نے اعتراف کیا۔ ”البتہ ایک فرق یہ ہے کہ یہ قدرے بھاری ہوتا ہے۔ اگر کیوبک زرقون بڑا پتھر ہو جیسے دو قیراط کا تو جوہری کو اصلی اور نقلی ہونے کا پتا چل جائے گا لیکن ایک چھوٹے ہیرے کا وزن اتنا کم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان فرق کو بھانپنا مشکل ہوتا ہے۔“

”تم نے کہا کہ ایک فرق یہ ہے، اس کے علاوہ اور کیا فرق ہوتا ہے؟“ باربرا نے جاننا چاہا۔

”صرف ایک۔“ مائیکل نے کہا۔ ”یہ اتنا سخت نہیں ہوتا جتنا کہ ہیرا ہوتا ہے۔ بے شک یہ اتنا سخت ضرور ہوتا ہے کہ شیشے کو کاٹ دے۔ آل رائٹ، لیکن ہیرا دنیا کی سخت ترین معدنیات میں سے ایک ہے۔ سختی کے پیمانے پر ہیرے کا نمبر 10 ہے جبکہ کیوبک زرقون کا نمبر 8.5 ہے۔ ہیرے سے اتنا قریب نمبر ہونے کی وجہ سے کوئی جوئیلر اس کی خامی کو بھانپ نہیں سکتا۔“

”کیا کیوبک زرقون بے حد قیمتی ہوتا ہے؟“

”جو پتھر میں نے تمہیں دیا ہے، وہ 1/4 قیراط ہے۔“ مائیکل نے بتایا۔ ”اگر یہ اصلی ہیرا ہوتا تو اپنے خالص پن اور رنگ کی وجہ سے اس کی قیمت لگ بھگ آٹھ سو ڈالرز ہوتی۔ زرقون کا پتھر لگ بھگ پانچ ڈالرز مالیت کا ہوتا ہے۔ وہ بھی ریٹیل میں۔ یقیناً میری اسے تیار کرنے میں اور بھی کم لاگت آئی ہے۔“

”تو پھر لوگوں کو اسے بہ طور ہیرا فروخت کرنے میں کیا چیز مانع آتی ہے؟“ باربرا نے سوال کیا۔

”اوہ، وہ اسے بہ طور ہیرا فروخت کرتے ہیں۔“ مائیکل نے بتایا۔ ”لیکن اکثر اوقات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے پتھر فوری طور پر نظروں میں آتے ہیں اور ان کا سراغ لگا لیا جاتا ہے۔ ایک تو وزن کے فرق سے اور دوسرا ان کے خالص پن کی ڈگری کے لحاظ سے۔ بہت بڑے بے حد کم ہیرے اس حد تک خالص ہوتے ہیں۔ اس کا بڑا ہونا ہی کسی بھی جوہری کو قدرے شک میں ڈال سکتا ہے۔ بہ شرط یہ کہ ہیرا لانے والا شخص جوہری کا شناسا اور بے حد مالدار بھی ہو۔

”زیادہ تر زرقون سے بڑے ہیرے بنائے جاتے ہیں۔ وہ اتنے زیادہ ارزاں ہوتے ہیں کہ لوگ اس بڑے متاثر کن پتھر کو اسی آسانی کے ساتھ خریدنے کے متحمل ہوسکتے ہیں جیسے کہ ایک چھوٹے پتھر کو خرید سکتے ہیں۔

”اسی لیے چھوٹے پتھر حقیقت میں قدرے کم ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔“ مائیکل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”گو میرے پاس یہاں ایسے متعدد چھوٹے پتھر موجود ہیں۔ یہ وہ پتھر ہیں جنہیں عام طور پر بہ طور ہیرے فروخت کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان کی فروخت اتنی عام نہیں۔ ایک چھوٹے سے منافعے کی خاطر جیل میں جانے کا خطرہ مول لینا ایک حماقت ہی ہوگی۔“

”کیا واقعی؟“ باربرا سوچ میں پڑ گئی۔ اسے یاد آگیا کہ اس نے کتنی مرتبہ اپنے بینک کے کسٹمرز کی رقوم میں سے معمولی رقمیں چرائی تھیں اور وہ قطرے قطرے سے دریا بننے کے مانند جمع ہوکر کہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ چھوٹی رقم چرانا بہترین ہوتا

ہے، باربرا نے فیصلہ کیا۔ اس لیے کہ ان پر عام طور پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

پھر باربرا کا دھیان مائیکل کے بریف کیس کی طرف چلا گیا۔ یہ بریف کیس اس کے مستقبل کو سنوار سکتا ہے بشرطیکہ مائیکل مبالغے سے کام نہ لے رہا ہو۔

جیسا کہ باربرا کو توقع تھی، مائیکل اس سے پوچھ بیٹھا کہ کیا وہ نائس میں اس سے ملاقات کر سکتا ہے۔ باربرا نے اگلی روز شب میں ملاقات کی ہامی بھر لی۔

نائس پہنچ کر باربرا سب سے پہلے ایک جوئیلری شاپ پر چلی گئی۔

''یہ ڈائمنڈ میرے ایک دوست نے مجھے دیا ہے۔'' باربرا نے جوئیلر کو بتایا۔ ''اور میں اسے ایک انگوٹھی میں جڑوانا چاہتی ہوں۔'' ساتھ ہی اس نے ڈائمنڈ جوئیلر کے سپرد کر دیا۔

''یقیناً میڈموزیل۔'' جوئیلر نے کہا اور اسے مختلف سیٹنگز دکھانے لگا۔

''میرے خیال سے یہ عمدہ رہے گی۔'' باربرا نے ایک انگوٹھی کی سیٹنگ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ اس دوست نے اس ڈائمنڈ کی کیا قیمت ادا کی ہوگی۔ کیا آپ مجھے اس کا تخمینہ بتا سکتے ہیں؟''

جوئیلر نے اپنے چشمے سے اس پتھر کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ''یہ نہایت عمدہ ہیرا ہے، تقریباً بے عیب۔ گو قدرے چھوٹا ہے لیکن اتنے عمدہ ہیرے کی خردہ کی قیمت لگ بھگ ایک ہزار ڈالر ہوگی۔''

باربرا مسکرا دی۔ پھر اس نے انگوٹھی کی قیمت ادا کی اور جوئیلری شاپ سے نکل آئی۔

باربرا نے خود کو کبھی ترغیب دلانے والی عورت نہیں سمجھا تھا...... یہ ہمیشہ مرد ہی ہوتے تھے جو اس کا پیچھا کرتے تھے۔

البتہ اس شب اس نے کسی فلمی ویمپ کے مانند منظر کو پوری احتیاط کے ساتھ سیٹ کیا ہوا تھا۔

جب مائیکل طے شدہ ملاقات کے لیے اس کے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو باربرا نے اسے بتایا کہ وہ ڈنر کے لیے نیچے ڈائننگ ہال میں جانے کے بجائے اپنے کمرے کو ہی ترجیح دے گی۔ پھر ساتھ ہی اس نے روم سروس کو ڈنر اپنے کمرے میں لانے کا آرڈر دے دیا۔ ڈنر میں اس نے کاک ٹیل اور وائن لازمی شامل کرنے کو کہا تھا۔

وہ گزشتہ ملاقات میں مائیکل پر الکحل کے اثر کو بہ خوبی دیکھ چکی تھی اور یہ یقین دہانی چاہتی تھی کہ مائیکل کی قوت فیصلہ کسی حد تک کمزور پڑ جائے۔

جب مائیکل اطمینان کے ساتھ تین چار جام چڑھا چکا تب باربرا نے اس سے پوچھ لیا کہ اس کے پاس کل کتنے چھوٹے پتھر موجود ہیں۔

''یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''لیکن میرے بریف کیس میں تین یا چار چھوٹے پتھر موجود ہیں جو ہوٹل کے سیف میں رکھا ہوا ہے۔ کیوں؟''

''میں وہ سب تم سے خریدنا چاہتی ہوں۔'' باربرا نے کہا۔ ''اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ تم مجھے مزید سوا لیے پتھر اور بھیج دو۔''

''وہ کس لیے؟''

''میں انہیں فروخت کرنا چاہتی ہوں۔'' باربرا نے صاف صاف بتا دیا۔ ''ایک وقت میں ایک اور وہ بھی امریکا کے جوئیلری اسٹورز میں۔''

''یہ تو بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

''نہیں، یہ ایسی کوئی مضحکہ خیز بات نہیں ہے۔'' باربرا نے جواب دیا۔ ''حقیقت میں یہ قطعی قانونی فروخت ہوگی۔ میں جوئیلر کو یہ نہیں بتاؤں گی کہ اس پتھر کی مالیت کیا ہے۔ میں صرف یہ کہوں گی کہ یہ ایک پرانے بوائے فرینڈ کا دیا ہوا تحفہ ہے اور اب میں اسے فروخت کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اسے انگوٹھی میں سے نکال لے گا، اس کو پرکھے گا اور مجھے ایک قیمت بتا دے گا۔ اگر کوئی جوئیلر یہ دریافت کر لیتا ہے کہ یہ پتھر اصلی نہیں ہے تو میں بس اپنے پرانے بوائے فرینڈ کو کوسنے دیتے ہوئے کمینہ اور قابل نفرت کہہ کر وہاں سے نکل جاؤں گی۔''

''ہنی!'' مائیکل نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''تم کافی ذہین ہو، لیکن کیا تم اس ذہانت کو اس سے کہیں زیادہ بڑے معاملے میں آزمانے کے لیے تیار ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''جو ہیرا میں نے آج تمہیں دیا تھا وہ نقلی نہیں اصلی ہیرا تھا۔ سو فیصد اصلی ہیرا!''

''کیا؟''

''اوہ ہاں! اور میں نے کیوبک زرقون کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا وہ بالکل سچ ہے۔ اسے میں نے بنایا تھا۔ اس لیے مجھے معلوم ہونا چاہیے لیکن میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تمام اصلی ہیرے ہیں!'' مائیکل نے کہا۔

''تو پھر...... تم نے مجھے ان میں سے ایک کیوں دے دیا؟'' باربرا نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اس لیے کہ یہ بے قیمت ہے، کم از کم اس وقت۔''

''وہ کیسے؟''

''کیا تم نے تل ابیب کے ڈائمنڈ ایکسچینج میں ہونے والی چوری کے بارے میں کبھی کچھ پڑھا تھا؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''کچھ یاد پڑتا ہے؟''

''کچھ یاد تو آ رہا ہے۔'' باربرا نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اصلی ہیروں کو بدل کر ان کی جگہ نقلی ہیرے رکھ دیے گئے تھے اور اس حقیقت کا انکشاف کئی دنوں کے بعد ہوا تھا۔''

''بالکل درست۔'' مائیکل نے کہا۔ ''وہ اصلی ہیرے میں نے تبدیل کیے تھے...... یا کم از کم ایک دوست نے میری مدد سے یہ کام سرانجام دیا تھا۔ وہ وہاں کام کرتا ہے اور اس نے ہی مجھے ان ہیروں کی وضع قطع کی تفصیلات مہیا کی تھیں۔ تب میں نے اپنے زرقون ورکشاپ میں ان کی نقول تیار کی تھیں۔ میرے دوست نے ان ہیروں کو کیوبک زرقونوں سے تبدیل کر دیا اور اب یہ وہی اصلی ہیرے ہیں جو میرے بریف کیس میں موجود ہیں۔''

''لیکن اخبارات نے تو یہ چھاپا تھا کہ ان کی مالیت دس لاکھ ڈالرز سے بھی زیادہ کی تھی۔''

''اخبارات نے صحیح لکھا تھا۔''

''تو پھر وہ بے قیمت کیوں کر ہو سکتے ہیں؟''

''اس لیے کہ انہیں فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خاصے عمدہ قسم کے ہیرے ہیں...... تقریباً بے عیب۔ ایسے نادر ہیرے صرف بے حد امیر لوگوں کے پاس ہوتے ہیں۔ اگر میں ان میں سے کوئی کسی جوئیلر کے پاس لے جاؤں گا تو اسے لازمی شک ہو جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس بات سے آگاہ ہو یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہیروں میں انگلیوں کے نشانات محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک فوٹو الیکٹرونک پروسس ہوتا ہے جو ہیرے کے اندر سے تصویر کھینچ لیتا ہے۔ جو بیش قیمت ہیرے ہوتے ہیں جیسے کہ یہ ہیں، تمام رجسٹرڈ ہوتے ہیں۔ اگر میں ان میں سے کسی کو فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو جوئیلر اسے چیک کرنے کے لیے پولیس سے مدد لے گا اور میں آخرکار جیل پہنچ جاؤں گا۔''

''لیکن یہ ہیرے تو اسرائیل میں چوری ہوئے تھے۔'' باربرا نے پلٹ کر کہا۔ ''یقیناً انہیں یہاں فروخت کرنا محفوظ ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''لیکن میں نے احتیاطاً اپنے طور پر کچھ چیکنگ کر لی۔ یورپ کی ہر ایک پولیس فورس ان ہیروں کی تلاش میں ہے۔ تم شاید امریکا میں انہیں ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو جاؤ لیکن تب بھی میرا مشورہ یہی ہوگا کہ اس معاملے کو ٹھنڈا ہونے کے لیے تمہیں دو تین سال انتظار کرنا ہوگا۔''

''تو تمہارا ایسا ہی کچھ کرنے کا ارادہ ہے؟'' باربرا نے پوچھا۔

''میرا؟'' مائیکل نے کہا۔ ''نہیں تو، ہیروں کی اس کھیپ کو دھیرے دھیرے ٹھکانے لگانا ہوگا...... ایک ہیرا ادھر تو ایک ہیرا ادھر۔ شاید چھ سات سال لگ جائیں۔ اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے شہروں میں جہاں جوئیلرز کو شبہ ہونے کا خطرہ کم سے کم ہو۔ اس کے لیے مجھے امریکا کے ہزاروں ٹرپ کرنا پڑیں گے۔ مجھے اس میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا...... لیکن یہ تمہارے لیے فائدہ مند ہو سکتے ہیں۔''

''مجھے کتنی رقم ادا کرنا ہوگی؟'' باربرا نے پوچھا۔

''پوری لاٹ کے پچاس ہزار ڈالرز''

''میرے پاس تو اتنی رقم نہیں ہے۔'' باربرا نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اس کے نصف کا انتظام کر سکتی ہوں...... پچیس ہزار ڈالرز کا!''

مائیکل نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر بولا۔ ''مجھے نصف قیمت یعنی پچیس ہزار ڈالرز منظور ہیں، لیکن ایک شرط کے ساتھ!''

''وہ کیا؟'' باربرا نے بے ساختہ پوچھا۔

''تمہیں شب میرے ساتھ گزارنی ہوگی۔''

باربرا نے کسی قسم کا تامل نہیں کیا۔ ''منظور!''

امریکا سے رقم ٹرانسفر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تیسرے روز رقم پہنچتے ہی باربرا نے اپنی تعطیلات مختصر کر دیں اور گھر واپسی کا ارادہ کر لیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ چوری شدہ ہیروں کے ساتھ ملک ملک کی سرحدیں پار کرنا دانش مندی نہیں ہوگی۔ وہ فوراً امریکا روانہ ہو گئی۔

امریکن کسٹمز پر اسے کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے تمام ہیرے اپنے بینک کے سیف ڈیپازٹ والٹ میں رکھ دیے۔ اس کا ارادہ انہیں کم سے کم دو سال تک وہیں محفوظ رکھنے کا تھا۔ پھر اس کے بعد ہی وہ انہیں فروخت کرنا شروع کرے گی۔

وہ ایک بار پھر سے بینک میں بہ طور کیشئر معمول کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دینے لگی۔ البتہ اب اس نے اپنے گاہکوں سے ریزگاری چوری کرنا ترک کر دی تھی۔

ادھر مائیکل بھی رقم ہاتھ آتے ہی واپس اسرائیل روانہ ہو گیا۔

اسے بار بار باربرا کا خیال آ رہا تھا۔ وہ واقعی ایک خوب صورت عورت تھی۔ کم از کم اس جیسی شکل صورت اور نقش و نگار والے شخص کو جس قسم کی عورت کی توقع کا حق پہنچتا تھا، باربرا اس معیار سے کہیں زیادہ حسین اور پرجوش ثابت ہوئی تھی۔

مائیکل پچیس ہزار ڈالرز کی رقم پا کر بھی قطعی مطمئن تھا۔ اس لیے کہ چھ سو ڈالر مالیت کے کیوبک زرقون سیمپلز کے عوض یہ کسی طور گھاٹے کا سودا نہیں رہا تھا۔

محفلِ شعر و سخن

* محمد ہمایوں تنولی...... مانسہرہ، ہزارہ

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو وہ ہے جس کی نہ حد ہے نہ حساب

* قیصر اعوان، خالد اعوان...... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

تم جو ڈھونڈو گے کوئی تو مل ہی جائے گا
مگر ہماری طرح کون تمہیں چاہے گا
دیکھے گا ضرور کوئی چاہت کی نظر سے
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

* جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی

خود پہ بیتی تو روتے ہو سکتے ہو
وہ جو ہم نے کیا تھا، کیا وہ عشق نہیں تھا؟



* نوید انجم بٹ گیہاں...... گجرات

کوئی سیلاب محبت کو کہاں تک روکے
دل میں جو بات ہو آنکھوں سے عیاں ہوتی ہے

* ڈاکٹر وسیم خالق گیہاں...... گجرات

محفلیں وہ مصر کے بازار کیا ہوئے
اے شہر دل تیرے در و دیوار کیا ہوئے
ڈسنے لگی ہیں ہم کو زمانے کی رونقیں
ہم جرم عاشقی کے سزاوار کیا ہوئے

* رضوان تنولی گریڑوی...... اورنگی ٹاؤن، کراچی

بھوکا اور پیاسا رکھنا کمسن دیوانوں کو
اے عشق تیرا انداز ستم ہے یزیدوں جیسا

* ملک رحیم بخش اعوان...... نامعلوم مقام

دعائے بد نہیں دیتا فقط اتنا ہی کہتا ہوں
کہ جس پہ آجائے دل تیرا وہ آگے بے وفا نکلے

* حاجی محمد اقبال زرگر...... نئی منڈی سکھیکی

حالانکہ گھر سے تربت کچھ دور تو نہیں تھی
پہنچا میرا جنازہ کاندھا بدل بدل کر
روئیں گے دیکھ کر وہ بستر کی ہر شکن کو
وہ حال لکھ چلا ہوں کروٹ بدل بدل کر



* یاسر محمود...... جہلم

بات نسبتوں کی ہے ورنہ
حجر اسود بھی اک پتھر ہے

* رانا محمد عامر شاد...... میاں چنوں

جس دن کتاب عشق کی تکمیل ہوگئی
رکھ دیں گے زندگی، تیرا بستہ اتار کر

* تفسیر عباس بابر...... اوکاڑہ

میزان زندگی سے تفریق وہ ہوا تو......ا
سب کچھ تھا پاس میرے کچھ بھی مگر نہیں تھا
وہ پاس تھا تو گویا سب کچھ تھا دسترس میں
اسے کھو دیا تو کچھ بھی کھونے کا ڈر نہیں تھا

* عرفان احمد عاجز...... چکوال

چشم بحر بیکراں کی روانی سے جل گیا
اتنا حساس تھا میں کہ پانی سے جل گیا

* صوبیہ تفسیر بابر...... اوکاڑہ

تیرا وجود رواجوں کے اعتکاف میں ہے
میرا وجود تیرے عین شین قاف میں ہے

* حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی...... میانوالی

تبدیلی جب بھی آتی ہے موسم کی اداؤں میں
اس کا یوں بدل جانا بہت ہی یاد آتا ہے

* احمد خان توحیدی...... پاکستان اسٹیل، کراچی

جب ترا حکم ملا ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی
تجھ سے کس طرح میں اظہار تمنا کرتا
لفظ سوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی

* محمد اشفاق سیال...... شورکوٹ سٹی

برس رہی ہے حریم ہوس میں دولت حسن
گدائے عشق کے کاسے میں ایک نظر بھی نہیں

* ریاض بٹ...... حسن ابدال

اتر بھی آؤ کبھی آسماں کے زینے سے
تمہیں خدا نے ہمارے لیے بنایا ہے

* تنویر آصف چودھری...... جہلم

حسن تحریر سے ظاہر ہے تیرے دل کا خلوص
خط کا ہر لفظ محبت کا پتا دیتا ہے

* طاہر عباس...... کوٹلی، آزاد کشمیر

کچھ تعلق جو نہ ہوتا تو خفا کیوں ہوتے
بے رخی ان کی محبت کا پتا دیتی ہے

* عدنان یوسف...... بنوں

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
ابھی رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

* ڈاکٹر ایچ اے لطیف...... فقیر والی

نہ کمزور پڑا میرا تم سے تعلق اور نہ کہیں اور ہوئے سلسلے مضبوط
یہ وقت کی سازش ہے کبھی تم مصروف تو کبھی ہم مصروف

* سعدیہ بخاری...... ضلع اٹک

جو ابھی سوچ رکھتا ہو الجھنا اسی سے بے معنی
مجھے سلجھی سی اک تحریر کا عنوان ہونا ہے

* عدنان ساحل...... بھیرہ

کبھی ویران سڑکوں پر بھی اک محفل رکھتے تھے
اور اب اپنے ہی گھر میں ہم تنہا رہتے ہو

* رمضان پاشا...... گلشن اقبال، کراچی

ہونٹوں پہ محبت کے فسانے نہیں آتے
ساحل پہ سمندر کے خزانے نہیں آتے

* سعید عباسی...... بہاولپور

تجھ کو یقین تو نہیں مگر سچ یہی ہے
میں تیرے واسطے عمریں گزار سکتا ہوں
یہی نہیں کہ تجھے پالینے کی خواہش ہے
میں تیرے واسطے خود کو بھی ہار سکتا ہوں

* رحیمہ سرور...... لاہور

سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رک گئی گردش ماہ و سال بھی

* سارہ...... کراچی

ورق ورق پہ تیری عبارت، تیرا افسانہ، تیری حکایت
کتاب ہستی، جہاں سے کھولی، تیری محبت کا باب نکلا

* محمد جاوید راؤ...... بہاولنگر

نہیں ہوتا کسی طبیب سے اس مرض کا علاج
عشق لاعلاج ہے بس احتیاط کیجیے

* نورین صبا...... کورنگی

سر بازار نکلوں تو آوارگی کا الزام دوستو
تنہائی میں بیٹھ جاؤں تو الزام محبت

* امداد خان...... بنوں

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

* محمد قدرت اللہ نیازی...... حکیم ٹاؤن، خانیوال

اس کے نرم نرم ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں چیزیں اکثر
میرا دل بھی لگا ہے ہاتھ اس کے، خدا خیر کرے

* رحیم قائم خانی...... میرپور خاص

میرا فسانہ محبت ہے مختصر سا جاناں
جسے چاہا، وہ شخص میرا نہ ہوا

* مدحت...... کراچی

میرا ہو کے بھی غیر کی جاگیر تھا
دل بھی گویا خطہ کشمیر تھا

* زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی

دلوں میں فرق پڑ جائے تو اتنا یاد رکھنا تم
دلیلیں، منتیں اور فلسفے سب بے کار جاتے ہیں

٭ ساجدہ راجا.....سرگودھا
آج ہمارے درو دیوار پر ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

٭ محمد محی الدین اشفاق.....فتح پور، لیہ
لوگوں نے جشن رات نئے سال کا کیا
ہم اپنے گھر میں تیرے لیے سوچتے رہے

٭ شکیل الرحمن.....کھاٹاں
دست صیاد بھی عاجز ہے کف گل چیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

٭ محمد اقبال اداس.....کھاریاں
سسک رہی ہیں ہوائیں اداس ساون کی
وطن سے دور بہت جارہا ہوں میں

٭ حسنین عباس، کمیل عباس.....کھاریاں
آسمان بھر گیا ہے تاروں سے میری آنکھیں ہنوز خالی ہیں
غم نہ ہو تو اداس رہتا ہوں میرے احساس کتنے عالی ہیں

٭ ماہا ایمان.....پنجاب
جس شام برستے ہیں تیری یاد کے بادل
اس شب کوئی ہجر کا تارا نہیں ہوتا

٭ منی ایمان.....پنجاب
فاصلے پیار کی پہچان ہوا کرتے ہیں
نہ جانے کیوں لوگ پریشان ہوا کرتے ہیں

٭ عبدالغفور خان خٹک.....اٹک
لوٹا ہے سدا جس نے ہمیں دوست بنا کر
ہم خوش ہیں اسی شخص سے پھر ہاتھ ملا کر

٭ مسز بابر عباس.....گلیانہ روڈ، کھاریاں
اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں
ہم نشینی اگر کتاب سے ہو

٭ محمد کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
محبت دل کا سجدہ ہے جو ہے توحید پر قائم
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے

٭ بابر عباس.....گلیانہ روڈ، کھاریاں
کچی مٹی کے گھروندے اکثر ٹوٹ جاتے ہیں
جن پہ گماں ہو اپنوں کا وہ روٹھ جاتے ہیں

٭ حافظ محمد عرفان.....سرگودھا
دھوپ کے دشت میں آگئے سائباں ڈھونڈتے ڈھونڈتے
اوڑھ لیں گے کسی دن زمین آسماں ڈھونڈتے ڈھونڈتے

٭ اعجاز احمد راحیل.....ساہیوال
قربت جو مانگی، جدائی دے گیا
آشنا تھا میرا کرب آشنائی دے گیا

٭ فرحان احمد.....پاک کالونی، کراچی
کٹ گئیں آنکھوں میں کتنی راتیں
دل سے کہتے ہوئے افسانۂ دل

٭ محمد جاوید.....تحصیل علی پور
روشن ہوئے چراغ سرشام دوستو
لاؤ کہیں سے بادۂ گلفام دوستو

٭ سنسان دل.....جودھپور، کبیروالہ
لب سلے ہیں تو اشاروں کی زبانی ہی سہی
رات کٹ جائیگی مبہم سی کہانی ہی سہی

٭ امیر بخش.....کوئٹہ
اس شرط پر حضور جلائیں نئے چراغ
شعلوں کا رنگ روپ نہ پائیں نئے چراغ

٭ دلشاد احمد.....بفرزون، کراچی
نئی سحر کے اجالے سراہنے والو
لٹا ہوا ہو ستاروں کا یہ کفن نہ کہیں

٭ محمد اظہر.....ملیر، کراچی
ظلمت شب کا اگر ٹوٹ گیا ہے فسوں
رقص کرتی کوئی سورج کی کرن بھی دیکھو

٭ محمد احسن.....سرگودھا
دیوانے مایوس نہیں ہیں قفل زنداں ٹوٹے گا
بستی بستی صحرا صحرا شور سلاسل گونجے گا

کوپن برائے شمارہ فروری 2013

محفل شعر و سخن

نام: ---------------------------------

پتا: ---------------------------------

"تو تم گزشتہ رات گیارہ بجے پلازا ہوٹل سے میلوں دور تھے؟" لیفٹیننٹ فلیچر نے سامنے بیٹھے ہوئے پریشان حال شخص کا جواب دہرایا۔

"بالکل۔ میں اس ہوٹل کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔" ٹامی سن نے سر جھکا کر کہا۔ "میں گزشتہ شب گیارہ بجے ہوٹل پلازا سے بیس میل دور تھا۔ کیا آپ میرا یقین نہیں کریں گے؟"

فلیچر نے سگریٹ کا ٹوٹا ماربل کی ایش ٹرے میں بجھایا اور دفتر میں موجود نوجوان معاون کورسی ڈورن کو استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ایک لحاظ سے اس کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت ہے۔" کورسی نے دھیمی آواز میں کہا۔

ٹامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ "ایک لحاظ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں نے جو گواہ پیش کیا ہے، کیا وہ کافی نہیں ہے؟ تم اپنے ساتھی پولیس افسر کے ساتھ اس سے مل چکے ہو۔ کیا شرلے نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے شب اس کے کمرے میں، اس کے بستر پر گزاری ہے؟"

کورسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کرسی کے

جرائم کی دنیا میں پینترے بدلتے مجرموں کا احوال

چور چاہے کتنی ہی ہیرا پھیری کرے بالآخر کہیں نہ کہیں اس کے گرد دائرہ اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ سانس کی آمدورفت بھی مشکل ہو جاتی ہے... اسے بھی اپنے سانسوں کی گھٹن مارے ڈال رہی تھی، اب جھوٹ سے فرار ممکن نہیں تھا بالآخر قانون کے محافظوں کا نفسیاتی حربہ "سوسنار کی ایک لوہار کی" ثابت ہوا۔

گرہ

بابر نعیم



چوڑے ہتھے پر رکھے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ہولے ہولے کچھ لکھ رہا تھا۔

”کیا تم ہمیں احمق سمجھتے ہو؟ کیا ہمیں شرلے ایسی عورت کی شہادت پر اعتبار کر لینا چاہیے......؟“ فلیچر نے غصے سے کہا۔ ”اس قسم کی عورتیں چند سکوں کے عوض سب کچھ کر سکتی ہیں۔ مجھے اس حرافہ پر رتی برابر اعتبار نہیں ہے......“

ٹامی نے بھاری شانے بے پروائی کے انداز میں ہلا دیے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر زہر خند سے کہا۔ ”تم لوگ شریف شہریوں کو پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ تم نے کڑکڑاتی سردی میں صبح پانچ بجے جگا دیا اور اب اوٹ پٹانگ سوالات سے میرا دماغ خراب کر رہے ہو مجھے بلاوجہ......“

”ہم نے تمہیں بلاوجہ پریشان نہیں کیا۔“ کورسی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اس شہر میں سیکڑوں ذات شریف ہیں جنہیں ہم یہاں لا سکتے تھے لیکن ہم نے صحیح آدمی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تم نے مجھے اور میرے ساتھی کو بولنے کا موقع دیے بغیر بتا دیا کہ شام چھ بجے سے رات دو بجے تک تم کہاں تھے۔ اس بے تابی کی وجہ بتا سکتے ہو؟“

لیفٹیننٹ فلیچر نے بڑے تحمل سے کہا۔ ”تمہارے ساتھی پر یاد آیا، تم پیٹر کے کمرے میں جا کر دیکھو، ممکن ہے وہ واپس آ چکا ہو۔ میرا خیال ہے وہ ضرور کوئی اہم خبر لایا ہوگا۔“

کورسی نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیفٹیننٹ کے دفتر سے نکل کر اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا پھر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا مطلوبہ شعبے کی جانب بڑھ گیا۔

”میرا خیال ہے معاملہ پھر سے شروع کیا جائے۔“ فلیچر نے کہا۔ ”اب سے چند گھنٹے قبل گیارہ بجے شب دو آدمی چہروں پر نقاب ڈالے ہاتھوں میں پستول لیے پلازا ہوٹل کے ہال میں داخل ہوئے انہوں نے استقبالیہ کلرک کے ہاتھ اٹھوا دیے اور اسے تجوری دکھانے کا حکم دیا جہاں ہوٹل کے مسافر نقدی اور زیورات وغیرہ رکھتے ہیں، پھر......“

”ہاں ہاں......“ ٹامی نے ہاتھ اٹھا کر ناگواری سے کہا۔ ”واقعہ تم پہلے ہی مجھے تفصیل سے سنا چکے ہو......“

”عین اسی وقت ہوٹل کا محافظ ہال میں پہنچ گیا......“ فلیچر نے ٹامی کی مداخلت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ”ان میں گولیوں کا شدید ترین تبادلہ ہوا۔ ایک دوسرے پر اندھا دھند فائر کیے گئے۔ دونوں بدمعاش صدر دروازے کی طرف بھاگے لیکن ایک بدمعاش کو باہر کھڑی ہوئی کار تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ ہوٹل کے محافظ کی گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو چکی تھی، وہ منہ کے بل فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ اس کا ساتھی کار میں بیٹھ گیا جو فوراً ہی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی تھی۔ ہلاک ہونے والے بدمعاش کو شناخت کر لیا گیا۔ وہ نامی گرامی مجرم ریمنڈ تھا، تمہارا پرانا دوست اور جیل کا ساتھی ریمنڈ ......اب تم یہاں اپنی موجودگی کا سبب سمجھ گئے ہو گے؟“

ٹامی نے وحشت کے عالم میں انگلیاں بالوں میں پھیریں اور مستحکم لہجے میں بولا۔ ”تمہارے پاس اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں پلازا ہوٹل کی واردات میں شریک تھا، میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میں شام سات بجے سے صبح دو بجے تک شرلے کے کمرے میں موجود تھا۔ تم چاہو تو اس سے پوچھ سکتے ہو۔“

فلیچر نے پشت کرسی سے ٹکائی اور دفتر کی چھت کو گھورنے لگا، سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے پاس واقعی ثبوت نہیں تھا سوائے اس کے کہ ریمنڈ ٹامی کا پرانا دوست اور جیل کا ساتھی تھا۔ ڈکیتی میں ٹامی کی شرکت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں ایک اور پتا بھی تھا۔

کورسی واپس دفتر میں آ گیا وہ قدرے پرجوش دکھائی دے رہا تھا، اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ”پیٹر آ گیا ہے جناب! بڑا اہم اور نازک معاملہ ہے۔“

”اوہ! میں سمجھ گیا۔“ فلیچر نے کہا۔ ”زخم کس ہتھیار سے......آئے ہیں......؟“

”بڑا اور تیز دھار چاقو استعمال کیا گیا تھا جناب! چھ مرتبہ سینے اور پیٹھ پر اسے گھونپا گیا ہے۔“ کورسی اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور پنسل سے پیڈ پر لکھنے لگا۔

ٹامی نے باری باری دونوں افسروں کا جائزہ لیا اور جھلا کر بولا۔ ”میری سمجھ میں یہ معما نہیں آیا۔ آخر بات کیا ہے؟ کیا کسی بھی غریب آدمی کو واردات میں ملوث کرنا مقصود ہے؟“

فلیچر نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا۔ ”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔ سیدھی طرح اعتراف کر لو۔ کیا تم ریمنڈ کے ساتھ تھے؟“

”بکواس۔“ ٹامی نے زہرخند سے کہا۔ ”میں جا رہا ہوں......“ یہ کہہ کر وہ اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

”واپس اپنی جگہ بیٹھ جاؤ......“ فلیچر غرایا۔ ”کورسی، اگر یہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرے تو بلا تکلف دو چار کرارے ہاتھ جما دینا......“

ٹامی بڑبڑاتا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں تمہارے متعلق پوری طرح اطمینان کر لینا چاہتا

ہوں۔“ فلیچر نے کہا۔ ”تمہارا دعویٰ ہے کہ تم شام سات بجے سے رات گئے تک شرلے نامی لڑکی کے ساتھ تھے......؟“

”میں دو بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور مجھے سخت نیند آ رہی تھی لہٰذا میں گھر آتے ہی بستر پر گر گیا۔ آفیسر کورسی اور اس کے ساتھی نے دروازہ دھڑدھڑایا تو میری آنکھ کھلی۔ مجھ تھکے ہارے شخص کو پریشان کر کے تم لوگوں کو کیا حاصل ہوا......؟“

”کیا تم قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتے ہو؟“ فلیچر نے پوچھا۔

”پچھلے ایک گھنٹے سے میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ ٹامی کی نگاہیں کورسی پر جمی ہوئی تھیں جو تیزی سے ایک نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔ ٹامی بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

لیفٹیننٹ فلیچر نے کورسی کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کورسی! تم اور پیٹر ٹامی کے فلیٹ پر گئے تھے۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے، وہاں جو کچھ پیش آیا مجھے تفصیل سے بتاؤ......“

”ہم اس کے فلیٹ پر پہنچے تو یہ سو رہا تھا۔“ کورسی نے کہا۔ ”ہمیں کئی بار دروازے کو پیٹنا پڑا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ چھوٹتے ہی اس نے ہمیں شرلے کے ہاں رات دو بجے تک رکنے کے بارے میں بتا دیا۔ ہم نے اسے لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی اور پھر اسے لے کر ہیڈ کوارٹرز کی طرف چل دیے۔ راستے میں اس نے پھر اصرار کیا کہ وہ دو بجے تک شرلے کے فلیٹ پر تھا۔ ہم نے کار ایک میڈیکل اسٹور پر روک لی جو رات بھر کھلا رہتا ہے، پیٹر نے وہاں سے شرلے کے فلیٹ پر فون کیا اور......“

”اور اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میں رات دو بجے تک اس کے پاس موجود رہا تھا۔“ ٹامی نے غصے سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”لیکن اس کے باوجود تم مجھے یہاں گھسیٹ لائے۔ یہ کہاں کی شرافت ہے۔“

”بات دراصل یہ ہے کہ پیٹر نے تمہاری محبوبہ شرلے سے بات نہیں کی تھی۔“ کورسی نے بڑے سکون سے کہا۔ ”اس نے عمارت کی مالکہ سے بات کی تھی......“

ٹامی نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔ کیا......؟“

”پیٹر نے شرلے کا نمبر ڈائل کیا تھا۔“ کورسی نے ہاتھ کے اشارے سے ٹامی کو خاموش کر کے کہا۔ ”مگر اس نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ مجبوراً پیٹر نے عمارت کی مالکہ سے رابطہ قائم کر کے صورت حال سے مطلع کر دیا۔“

کورسی نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک طویل کش لے کر دھوئیں کے چھلے بنانے لگا۔

”بات دراصل یہ ہے۔“ ٹامی نے جلدی سے کہا۔ ”شرلے گہری نیند سونے کی عادی ہے۔ وہ گھوڑے بیچ کر سوتی ہے، فون کی گھنٹی اس پر اثرانداز نہیں ہوئی ہوگی لیکن تم لوگوں نے اس سے رابطہ تو قائم کر لیا ہوگا؟“

کورسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑے غور سے لیفٹیننٹ فلیچر کو دیکھ رہا تھا۔

”اور ہاں......“ فلیچر نے کہا۔ ”افسران اس تک پہنچ گئے تھے......ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم شرلے کے ساتھ رات گزارنے پر اصرار کیوں کر رہے ہو۔ تم کئی بار کہہ چکے ہو کہ شام سات بجے سے رات دو بجے تک تم اس کے فلیٹ پر تھے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ ٹامی نے اضطراری کیفیت میں قمیص کا کالر مروڑتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً میں اس کے فلیٹ پر تھا۔ وہ اس امر کی گواہی دے گی۔“

کورسی نے پیڈ پر کچھ لکھا۔ پھر قلم رکھ کر بولا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں لیفٹیننٹ! غالباً کسی نے ٹامی کو شرلے کے فلیٹ سے نکلتے دیکھ لیا ہوگا۔ یہ بات چونکہ ٹامی کے علم میں بھی ہے لہٰذا وہ اس کے فلیٹ پر رکنے پر اصرار کرتا رہا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے اسے احساس نہیں ہے کہ میڈیکل سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے، پولیس سرجن ان دنوں صحیح فیصلہ کرتے ہیں ان کی بات غلط ثابت نہیں ہوتی۔ ان کے تعین کیے ہوئے موت کے وقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔“

لیفٹیننٹ نے ٹامی پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ”ہاں تمہاری بات......قرین از قیاس معلوم ہوتی ہے اس نے سوچا ہوگا کہ اس بارے میں آسانی سے ہمیں بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔“

”یہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو؟“ ٹامی نے چلا کر کہا۔ وہ اچھل پڑا اور سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ ”تم لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟“

”بیٹھ جاؤ......“ فلیچر نے کہا ”میں تمہیں صرف ایک خبر سنانا چاہتا ہوں بیٹے۔ ہم نے درجنوں بدمعاشوں سے ہوٹل کی ڈکیتی کے بارے میں پوچھ تاچھ کی ہے جن میں تم بھی شامل ہو لیکن تمہارے پاس واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت موجود ہے۔ تم رات شرلے کے فلیٹ پر موجود تھے۔ سارجنٹ پیٹر اس امر کی تفتیش کر چکے ہیں۔“

ٹامی آہستگی سے نشست پر بیٹھ گیا جیسے اس کے پیروں

میں جان نہ رہی ہو۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔
اس نے آستین سے منہ پونچھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پھر کیا ہوا......؟ میری سمجھ میں نہیں......''

''تم احمق ہو ٹامی......'' کورسی نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے پیٹر آدھے گھنٹے سے کہاں تھا؟''

ٹامی کو بات کی تہ تک پہنچنے میں چند لمحے لگے اور اس کا چہرہ کفن کی طرح سفید پڑ گیا۔

''تمہارا مطلب ہے...... تم لوگ چاقو گھونپے جانے کی بات شرلے کے بارے میں کررہے تھے؟''

کورسی اور فلیچر خاموشی سے اسے بہ غور دیکھتے رہے۔

''تم دونوں خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں ہو؟''

''میں طویل عرصے سے انتظار کررہا تھا۔'' بالآخر فلیچر نے کہا۔ ''میں کسی موقعے کی تلاش میں تھا تاکہ عمر بھر کے لیے تمہیں جیل بھجوا سکوں اب مجھے وہ موقع مل چکا ہے۔ جب سے تم یہاں آئے ہو ہم تمہارے گرد رسی باندھنے کی کوشش کررہے تھے۔ اب گرہ پڑ چکی ہے۔ تم بری طرح جکڑے جاچکے ہو......''

ٹامی مغلظات بکنے لگا، پھر اس نے کہا۔ ''اس کمینی نے مجھے بری طرح پھنسا دیا ہے۔ پتا نہیں کتنے مردوں سے اس نے تعلقات استوار کررکھے ہیں۔ سبھی جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن کوئی دل جلا اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ یہ کام بھی کل رات ہی ہونا تھا......''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔'' فلیچر نے کہا۔ ''تم ایسا کیوں نہیں......''

''میں کل رات اس کے فلیٹ پر نہیں تھا۔'' ٹامی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں نے یہ پروگرام اس سے فون پر طے کرلیا تھا۔ ہاں! میں ہوٹل کی واردات میں شامل تھا بے چارے فرینچی اور میں نے مل کر ہوٹل میں ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن ہوٹل کے محافظ نے عین وقت پر سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔''

فلیچر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''گویا تم پٹری بدل رہے ہو؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ہوٹل کی واردات میں شامل تھے؟ تم قتل کا الزام اپنے سر سے ہٹانے کے لیے ڈکیتی میں ملوث ہونا چاہتے ہو لیکن ہم تمہارے چکر میں آنے والے نہیں ہیں۔ تم قسم کھا کر کہہ چکے ہو کہ تم رات دو بجے تک شرلے کے فلیٹ میں موجود تھے......''

''میں حقیقت بیان کررہا ہوں لیفٹیننٹ۔ کئی ہفتوں سے میں نے شرلے کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے، میں نے اس سے فون پر بات کی تھی۔ میں نے جائے واردات سے عدم موجودگی کی گواہی کے لیے اسے معقول معاوضے کی پیش کش کی تھی۔ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی؟''

کورسی نے نوٹ بک زانو پر ماری اور بولا۔ ''اس نوٹ بک میں تو کچھ اور لکھا ہوا ہے۔''

''خدا کے لیے سنجیدگی سے میری بات سن لو......'' ٹامی نے تھوک نگل کر کہا۔ ''واردات میں جو پستول میں نے استعمال کیا تھا اس کے بارے میں! میں بتا دوں گا کہ میں نے کہاں پھینکا تھا۔ پستول سے یہ بھی ثابت ہوجائے گا کہ میں ہوٹل کی واردات میں شامل تھا۔ میرے پستول کی گولیاں ہوٹل کی دیواروں میں پیوست ملیں گی، تم چاہو تو میرے پستول سے انہیں ملا سکتے ہو۔ میں نے قتل نہیں کیا لیفٹیننٹ۔ شرلے کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اگر تم شرلے کے قتل سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو تمہیں مکمل ثبوت دینا پڑے گا بیٹے......'' فلیچر نے کہا۔ ''ورنہ تمہیں جان چھڑانا مشکل ہوجائے گا۔''

ٹامی کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں اسی وقت اس جگہ لے چلوں گا جہاں میں نے پستول چھپایا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع تو دو......''

لیفٹیننٹ متذبذب تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''کورسی! تم اور پیٹر اس احمق کو جہاں یہ چاہے، لے جاؤ لیکن یہ کسی قسم کی گڑبڑ کرے تو رعایت مت کرنا۔ اچھی طرح ٹھکائی کردینا، اگر یہ پستول بھولنے کا بہانا کرے تو اسے خاص طریقے سے یاد دلا دینا۔''

کورسی اور ٹامی کے رخصت ہونے کے ایک منٹ بعد لیفٹیننٹ فلیچر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''ایسا کم ہی ہوا تھا کہ کسی قاتل نے اپنے آپ کو تختۂ دار تک پہنچایا ہو۔ ظاہر ہے ٹامی کو حقیقت کا علم نہیں تھا، اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہوٹل کے محافظ کو فائرنگ میں گولی لگ گئی تھی اور ...... جانبر نہیں ہوسکا تھا۔'' ٹامی کو جلد ہی معلوم ہوجائے گا اور اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی۔''

ایک گیت گنگناتے ہوئے فلیچر اٹھ کھڑا ہوا، دروازے کے پاس پہنچا اور اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا وردی میں ملبوس ایک مستعد سپاہی باہر کھڑا ہوا تھا۔

''سنو ولسن!'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''حوالات سے اس حرافہ شرلے کو یہاں لے آؤ۔ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس عورت کو جھوٹ بولنے کا ذرا بھی سلیقہ نہیں ہے اور مجھے اس قسم کے لوگ پسند نہیں ہیں......''

آئینہ ایام

سید خلیق احمد

بعض لوگوں کی زندگی میں وقت دبے پاؤں گزر کر بھی اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے... اکھڑتی سانسوں اور چہرے کی جھریوں میں دنوں کا شمار تو ممکن نہیں ہوتا البتہ آنکھوں کی وحشت اپنے گردوپیش میں موجود لوگوں سے چند گھڑیوں کی رفاقت کی التجائیں کرتی ہوئی محسوس ہوجاتی ہے... اور وہ بھی بس یہی ایک تقاضا نبھانے چلا آتا تھا لیکن... ان آنکھوں کی وحشت اسے ہمیشہ بے کل کردیتی تھی۔



ان تک رسائی کے لیے چھبیس سیڑھیوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ پہلی سیڑھی ہی پر معلوم ہوجاتا تھا کہ وہ گھر پر ہیں یا نہیں، ان کی کھانسی کی آواز پہلی سیڑھی تک لڑھکتی ہوئی آتی اور سڑک پر بکھر جاتی اور گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے نیچے دب کر کچل جاتی۔ میں نے پہلی سیڑھی پر ہی انہیں پکڑ لیا تھا یعنی وہ گھر پر موجود تھے اکثر وہ گھر ہی ہوتے تھے باہر وہ زیادہ نہیں جاتے تھے۔ وہ باہر سے اندر آتے اور گھر کے تمام کھڑکی دروازے بند کرلیتے تھے۔ اس کے باوجود کہ اندر

مستقل ہوا کی کمی اور گھٹن بڑھتی جا رہی تھی، دروازوں کے رنگ غائب ہو چکے تھے۔ ان کا تانبے جیسا رنگ اپنی چمک کھو چکا تھا اور اٹھتے بیٹھتے ان کے گھٹنے بجتے تھے جہاں پر گمان ہوتا تھا کہ ٹانگیں لکڑی کی ہو گئی ہیں۔

میں ان سیڑھیوں پر تھا جن کی اینٹیں برسوں میرے قدموں کے نیچے رہی تھیں اور آدھے سے زیادہ گھس چکی تھیں اور میں بہت سنبھل کر ان پر چڑھ رہا تھا اور خیال تھا کہ ایک دن یہ سیڑھیاں اس قدر گھس چکی ہوں گی کہ اوپر سے نیچے کی طرف پھسل کر بہ آسانی آیا جا سکے گا مگر اوپر چڑھنا ایک مشکل کارنامہ ہوگا۔ میں جب دروازے پر پہنچا تو اندر ایک دھیمی سی سرسراہٹ تھی جیسے کوئی چیز کسی دوسری شے سے رگڑ کھا رہی ہو۔ میں نے سوچا کہ مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔ شاید وہ بہت ہی نجی لمحات میں ہوں مگر معلوم ہوتا تھا شاید انہوں نے میری سانسوں کی آواز سن لی ہو۔ ان کی سماعت بہت تیز تھی جو سوئی کا گرنا بھی اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ وہ ان ساری آوازوں کو گرفت میں لے لیتے تھے جو ان کے اردگرد ہوں۔

''کون؟'' انہوں نے پوچھا۔ آواز میں بڑھاپے کی کپکپاہٹ نمایاں تھی جیسے وہ اندھیرے کنویں کی منڈیر پر کھڑے ہوں۔

''میں۔'' میری آواز وہ پہچانتے تھے۔

دروازہ کھلا۔ وہ اندر کے اندھیرے میں.... کھڑے تھے، ان کا آدھا چہرہ اندھیرے میں گم تھا اور آدھا باہر بکھری شام میں لپٹا تھا۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ میں انہیں نہیں بلکہ اندھیرے کو دیکھ رہا ہوں۔ ''معلوم نہیں آج روشنی کیوں کم ہے۔'' وہ بولے ''میں لیمپ تلاش کر رہا ہوں جانے وہ کہاں ہے۔'' ان کا چہرہ اس باپ کے چہرے کی طرح تھا جس کا بچہ لاپتا ہو گیا ہو۔ مجھے محسوس ہوا جب وہ کمرے کے اندر تھے تو اندھیرے کو بھول چکے تھے اور اب وہ لیمپ تلاش کر رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ اندھیرے سے لپٹے اجالا تلاش کر رہے تھے۔

''تمہارے پاس ماچس ہے؟'' انہوں نے دریافت کیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں سگریٹ پیتا ہوں جبکہ ان کے سامنے میں نے کبھی سگریٹ نہیں پی تھی۔

میں کمرے کے اندر تھا۔ چوکور اندھیرے میں وہ میرے پیچھے تھے۔ ماچس کی روشنی میں اندھیرے کا وہ چوکور ٹکڑا کمرے میں بدل گیا اور تیلی کی روشنی میں انہوں نے لیمپ تلاش کر لیا جسے انہوں نے دوا کی شیشی اور کپڑے کی بتی سے خود تیار کیا تھا۔ آرام کرسی اور ہرن کی کھال مجھے سب سے پہلے نظر آئی۔ میں جب بھی آتا کمرے کی تمام اشیا ٹھیک اسی جگہ پر ہوتیں جہاں پہلے تھیں۔ اب آرام کرسی کی پالش اور زیادہ خراب ہو چکی تھی، ہرن کی کھال کے تمام بال غائب تھے۔ کبھی وہ وقت بھی تھا جب میں نے ہرن کی کھال کو دیکھ کر خیال کیا تھا کہ وہ اپنے سنہرے اور خوبصورت چکتوں کے ساتھ آرام کرسی سے اٹھے گا اور ہرن بن کر قلانچیں بھرتا ہوا جنگل کی طرف بھاگ لے گا مگر اب آرام کرسی پر ایک سڑی ہوئی سی کھال پڑی تھی جس کے کناروں سے کہیں کہیں ہرن جھلک رہا تھا۔ انہوں نے لیمپ لکھنے کی میز پر رکھ دیا جس کے ٹھیک اوپر کالک کا ایک گول کالا گھیرا بنا ہوا تھا۔ لیمپ وہ ہمیشہ وہیں رکھتے تھے اور وہاں سے پورے کمرے میں روشنی ہوتی تھی۔

''اس میں دو گھنٹے کی روشنی ہے۔'' وہ بولے۔ لیمپ کی روشنی میں ان کا چہرہ واپس آ گیا جس میں جھریاں چمک رہی تھیں۔ پسینے میں ڈوب کر ان کے چہرے پر جھکی ہوئی آنکھیں تھیں جو کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ایک راہ گیر تھوڑی دیر ستانے کے لیے جیسے کوئی سایہ دار درخت تلاش کر رہا ہو اور شاید انہیں میرے چہرے پر کوئی درخت نظر آ گیا ہو، میرا ایسا ہی خیال تھا۔

وہ لکھنے کی میز پر لیمپ رکھتے ہوئے جھکے ہوئے تھے۔ ان کی پشت اندھیرے میں چمک رہی تھی جس میں ریڑھ کی ہڈی کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا بعد میں احساس ہوا کہ ان سے پہلے مجھے نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ اب وہ آ کر میرے قریب بیٹھ گئے اور مسکرانے لگے۔ وہ کچھ بولنے کے لیے الفاظ تلاش کرتے وقت جیسی مسکراہٹ تھی، جس کے کوئی معنی نہ تھے۔ یہ صرف مسکراہٹ تھی ان کی مسکراہٹ میں ان کے بیتے دن تھے۔

اب شہر وہ نہیں تھا جو بیس سال قبل تھا اور وہ اس شہر میں زندگی گزارنا چاہتے تھے، انسان ہمیشہ اپنے پرانے دنوں کی طرف واپسی چاہتا ہے اور وہ بھی کچھ غلط نہیں چاہتے تھے۔ شاید وہ اسی لیے کمرے سے باہر نہیں جانا چاہتے تھے کہ باہر نیا شہر انہیں پکڑ لے گا اور وہ اجنبی بن کر رہ جائیں گے، بیوی کے مرنے کے بعد جیسے وہ اپنے گھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ بیٹے کا چہرہ بدل گیا تھا اور بیٹے کی بیوی کا چہرہ وہ پہچان نہیں پاتے تھے۔

کبھی یہ تمام مکان ان کا تھا اور ان کے جوتوں کی آواز پر کانپتا تھا۔ پوری طرح ان تک رسائی کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ نہ ان کی بیوی اور نہ ان کا بیٹا، وہ گھر کو سر پر اٹھا لیتے اگر ان کو احساس ہو جاتا کہ فلاں بات ان کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ ان کی بیوی گھر کے کسی کونے کھدرے میں جا کر روتی اور بیٹا ماں کی گود میں دبک جاتا اب وہ اس اکیلے کمرے میں سمٹ آئے تھے جو ان دنوں ردی سامان رکھنے کے کام آتا تھا، وہ اسی ردی سامان کی طرح تھے جو اوپر پھینک دیا گیا تھا مگر وہ اس صورت حال کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ کہتے کہ میں ایک پرانا ٹوٹا ہوا صوفہ ہوں جو بیٹھک سے اٹھا کر اس کمرے میں اس لیے پھینک دیا گیا ہے کہ کوئی اس پر بیٹھنے کی کوشش میں گر کر زخمی نہ ہو جائے۔

ان کے پاس ایک سوٹ بھی تھا جسے انہوں نے بہت احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ اسے وہ اس دن پہنتے جب انہیں اپنی پینشن لینے ٹریژری جانا ہوتا تھا۔ پینشن کے روز وہ آسمان میں سورج کے اٹھنے کے پیشتر اٹھ جاتے اور خوب گھس گھس کر نہاتے اور آٹھ بجے تک تمام کاموں سے فارغ ہو کر سوٹ پہن لیتے، ان کے پاس قد آدم آئینہ نہیں تھا اور چھوٹے سے آئینے میں پورا سوٹ نہیں نظر آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک آئینہ کو اوپر نیچے کرتے رہتے اور ان کا جسم بھی کئی حصوں میں تقسیم ہو کر اس آئینے میں آ جاتا ان کا سوٹ مشکل سے ہی سوٹ معلوم ہوتا تھا۔ بوسیدہ ہو کر اس میں اس قدر شکنیں پڑ چکی تھیں کہ وہ مڑے تڑے کاغذ کا معلوم ہوتا جس کا رنگ اڑ چکا ہو۔ جوتے ان کے پاس نہیں تھے سوٹ کے ساتھ چپل پہن لیتے۔ جب باہر نکلتے تو ہاتھ میں پرکھوں کی ایک قدیم سی چھتری ہوتی جس کے مٹھ پر شیر بیٹھا ہوتا۔ وہ جب اسے اپنے ہاتھوں میں جھلاتے تو شیر مٹھ سے اڑ کر ان کے چہرے پر آ بیٹھتا۔

وہ اس طرح زندہ تھے کہ لوگوں کو ان کا ہونا نہ ہونا محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ جب کبھی اپنی چھت پر نظر آتے تو لوگوں کو ان کا ہونا نظر آتا جس کو وہ اکثر بھول جاتے۔ وہ اپنی چھت سے بہت کم نیچے آتے تھے۔ کمرے کی کھڑکی سے آسمان صاف نظر آتا تھا اور دوسروں کے گھروں کی چھتیں بھی جن کے کالے کھپریلوں پر چڑیاں بیٹھی ہوتیں اور وہ ان چڑیوں کو گنا کرتے اور آسمان میں سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرتے۔

''بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔'' لوگ ایسا ہی خیال کرتے اور ان سے بات کرتے بھی ڈرتے تھے۔ ان کا بیٹا اور بہو سوچتے اگر وہ پوری طرح پاگل نہیں ہوئے ہیں تو ہو جائیں گے۔ بیٹا مکان کے نچلے حصے میں قیام پذیر تھا اور وہ اوپر... ایک کمرے میں، چھت پر جانے کے لیے باہر سے سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں۔ جس دن سیڑھیاں بنیں، نیچے کے حصے میں بسنے والے چھت کو بھول گئے اور وہ اس دن سے چھت سے نیچے تھوکنے لگے۔ خاص کر وہ اس وقت ضرور تھوکتے جب بیٹا تیار ہو کر باہر جانے کے لیے نکل رہا ہوتا اور تھوک بیچ سے ان کے بیٹے کے اوپر آتا اور وہ ان کو گھورتا کھڑا ہو جاتا۔ جنہیں گالی تو در کنار کچھ کہنے کی ہمت بھی اس میں نہ تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو گھورنے لگتے، بیٹا بہت دیر تک ان سے آنکھیں

نہیں ملا پاتا تھا، وہ سر جھکا کر واپس گھر کے اندر چلا جاتا جبکہ وہ مسکراتے اور ایک بار پھر تھوک کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

نیچے ایک عورت کی چیخ وپکار کی آواز مسلسل آرہی تھی وہ شاید بچوں پر جھلا رہی تھی۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ بچوں کی ماں تھی۔ چہرے کی جھریاں تن گئیں اور چہرہ لال ہوگیا وہ شاید اس طرح نیچے کے رہنے والوں سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی بہو ہمیشہ چیختی چلاتی رہتی، جھلاہٹ سے بھرے ہوئے بچے جب کھلکھلاتے تو انہیں بہت اچھا لگتا اور وہ مسکرانے لگتے، بچوں کو اوپر آنے کی ممانعت تھی جبکہ وہ بچوں سے ملنا اور ان کو پیار کرنا چاہتے تھے، وہ اکثر بچوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے اور چوک جاتے، بچوں کا کمرا ٹھیک ان کے کمرے کے نیچے تھا۔ انہوں نے ایک بار اپنے فرش میں سوراخ کرنے کی کوشش بھی کی تو نیچے ہنگامہ ہوگیا سب بچوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ بڈھا پاگل ہے اور چہرہ نوچ لیتا ہے۔

"تم اس سے ملے تھے۔" وہ اپنے بیٹے کا نام نہیں لیتے تھے۔

"ہاں وہ نہیں ہے میں ادھر سے گزر رہا تھا سوچا اس سے ملتا چلوں۔"

بہت کوشش کے باوجود میں ان سے کبھی یہ نہ کہہ سکا کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔

"وہ جنگل میں رہتا ہے اس کی بھیڑیوں سے دوستی ہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"میں بھی ان کا دوست ہوں۔" میں مسکرایا۔

"تم بھیڑیے نہیں ہو۔ تم کلرک ہو اور کلرک بھیڑیا نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ بلا ہوسکتا ہے۔"

بلا بھیڑیے سے ڈرتا ہے یہ مجھے معلوم تھا ان کا لڑکا اور میں اسکول میں ہم جماعت تھے پھر وہ پڑھ لکھ کر افسر بن گیا اور میں یونیورسٹی میں کلرک۔ انہوں نے ہم دونوں کو تعلیم دی تھی۔ ان کا بیٹا پڑھنے میں مجھ سے بہتر تھا اور میں اکثر ان کے ہاتھوں مار بھی کھاتا تھا۔

اور ایک اسکول ماسٹر نے براہ راست ان پر حملہ کیا تھا۔ "مڈل اسکول کا ایک ماسٹر بلا بھی نہیں ہوسکتا۔" انہوں نے یہ جملہ اس انداز سے کہا کہ اگر وہ بلا ہی ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ انہوں نے کسی کا چہرہ کبھی نہیں نوچا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے ناخن نہیں ہوتے، صرف انگلیاں ہوتی ہیں۔

انہیں کھانسی کا دورہ پڑا وہ دہرے ہوگئے تھے۔ گلے کی نسیں تن گئیں اور چہرہ لال ہوگیا وہ مجھ پر گرتے گرتے بچے۔

"آج آپ کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔" میرا ہاتھ ان کی پشت پر تھا جس کو انہوں نے نہایت آہستہ سے ہٹا دیا کہ مجھے محسوس نہ ہو۔

"یہ میری آواز ہے۔" انہوں نے پھولتی سانسوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"یہ کھانسی نہیں میں اداکاری کررہا تھا۔" جبکہ خود میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔

"ہاں تم نے سنی ہوگی جب تم نیچے سیڑھیوں پر تھے۔"

"ہاں میں نے آواز سنی تھی اور اسی سے میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ آپ ہیں۔"

"زندہ ہیں۔" انہوں نے شاید جملہ پورا کیا تھا۔

"نہیں زندہ نہیں...... آپ کا گھر پر ہونا۔" میں نے جھجک کر کہا۔ "آپ دوا تو وقت پر لیتے ہیں نا؟" میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ہاں مگر ایک عمر کے بعد دوا بھی کام نہیں کرتی۔" انہوں نے کہا اور اپنی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگے۔

میرے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا، میں اب اوبھ بھی رہا تھا اور باہر جانا چاہتا تھا۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لیمپ کی مرتی ہوئی روشنی میں ان کا کمرا تنگ اور چھوٹا ہوتا جارہا تھا۔ اب اس میں مشکل سے آدھے گھنٹے کا تیل اور باقی تھا میں سوچ رہا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد جب لیمپ میں تیل ختم ہوجائے گا تو وہ اندھیرے میں کیسے رہیں گے اور اگر مجھے مزید آدھا گھنٹا ان کے پاس بیٹھنا پڑا تو اندھیرے میں کس طرح رہوں گا، میری جیب میں کچھ ریزگاری تھی اور دل میں تھوڑی ہمدردی بھی، وہ کوئلے کی انگیٹھی کی طرف دیکھ رہے تھے تو میں نے کہا "لائیے بوتل دے دیجیے میں تیل لے آتا ہوں، یہ روشنی کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔" انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر لیمپ کی طرف مگر خاموش رہے، میں گھبرا گیا، خاموشی سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا ہے اور خاص کر اس وقت جب سامنے والی خاموشی کہ جواب تک طاری تھی۔

وہ کھڑے ہوگئے اور اپنے ہاتھوں کو کمر پر رکھ کر سیدھی کرنے لگے۔ ان کے سر سے اوپر چھت پر ایک چھپکلی رینگ رہی تھی۔ وہ اس کو نہیں دیکھ پا رہے تھے اور مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ ان کے سر پر نہ آگرے مگر ایسا ہوا نہیں۔ وہ بانس کی کھڑکی سے ہوتی ہوئی کھپریلوں میں کہیں گم ہوگئی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے، وہ باہر خلا میں کہیں دیکھ رہے تھے جہاں اندھیرا سیڑھیوں کے نیچے سڑک پر اتر رہا تھا۔

کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی ان کا کمرا آہستہ آہستہ کانپتے ہوئے سیڑھیوں سے اترنے لگا اور سڑک پر جاکر لیٹ گیا۔

"تم تھوڑی دیر اور ٹھہر سکتے ہو میرے لیے روشنی کی کوئی اہمیت نہیں مجھے یوں بھی صاف نظر آتا ہے۔" وہ اب بھی باہر دیکھ رہے تھے مجھے ایسا لگا کہ میں بیچ چوراہے پر کھڑا ہوں ایک بوڑھے آدمی کے مجسمے کے سامنے جس کے چہرے پر ایک پتھریلی لہردار لکیروں کے سہارے اداسی پھیلی ہوئی ہے۔ اچانک بیچ چوراہے پر مجسمہ میرے سامنے بولنے لگتا ہے اور میں چونک جاتا ہوں، میرے آس پاس انبوہ غفیر جمع ہوجاتا ہے میرے شانے بھیڑ سے ٹکراتے ہیں اور پیر چپل جاتے ہیں۔

"مہنگائی بہت بڑھ رہی ہے۔" انہوں نے کہا وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں چلا جاؤں، وہ بات جاری رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے باتوں کا ایک نیا سرا تلاش کرلیا تھا۔ "ہاں میں اپنے کرتے کی جیب سات تاریخ کو الٹ دیتا ہوں جس سے کسی کو یہ بھرم نہ رہے کہ میرے پاس ابھی تک تنخواہ کے پیسے ہیں۔" وہ اپنی پینشن کے بارے میں بات کررہے تھے۔ "میں اگر لفافے بنانے لگوں تو کیسا رہے گا؟" ان کے چہرے پر بچوں سی خوشی تھی۔

"لفافے" میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

"ہاں۔ جو سودا سلف پیک کرنے کے کام آتے ہیں۔" انہوں نے اپنے دائیں طرف اشارہ کیا جہاں کچھ کتابیں اور اخباری ردّی کا ڈھیر تھا، کچھ لمحوں کے لیے میں سوچ میں پڑ گیا، مجھے محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے مگر یہ میرا خیال تھا وہ واقعی ایسا کچھ کرنا چاہتے تھے۔

"مگر اس میں تو آپ کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں ان کتابوں کو میں نے اپنے اسکول کے دنوں میں پڑھا تھا وہ ہمارے نصاب میں تھیں۔"

"اب انہیں کون پڑھے گا، وہ پرانی ہوچکی ہیں، جیسے میں۔"

"آپ لفافے بنا لیتے ہیں؟" میں کتابوں کے معاملے پر ان سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں نے بچپن میں یہ کام خوب کیا ہے۔ میں اپنی پڑھائی کا خرچا اسی سے نکالتا تھا۔" وہ بہت خوش تھے اور اب خوب چہکنا چاہتے تھے۔

"تم چائے پینا چاہو گے میں پانی چڑھاتا ہوں۔" میں نے سوچا منع کردوں لیکن انہوں نے اپنی خواہش کو اس کے ساتھ ملا پایا تھا۔

"مگر انگیٹھی جلے گی کیسے، تیل تو ہے نہیں۔" میں نے کہا۔

"کچھ لفافے کم بن جائیں گے۔" وہ مسکرائے اور انگیٹھی کی طرف چل دیے۔ کمرا دھوئیں سے بھرنے لگا تو میں کمرے سے باہر آگیا، وہ اندر انگیٹھی سے لگے بیٹھے تھے۔ دھواں ان کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے انہیں کھانسی کا دورہ پڑا میں اندر گیا تو وہ دیوار سے لگے ہانپ رہے تھے۔ کمرا ابھی دھوئیں سے بھرا مجھے ہانپتا محسوس ہوا۔

"میں چائے نہیں پینا چاہتا۔" میں نے کہا۔

"تم ڈر گئے ہو۔" وہ ہانپتے ہوئے مسکرائے۔ یہی سچ تھا میں واقعی بہت خوفزدہ ہوگیا تھا۔ مگر انہیں بے خوف وخطر پھر سے کاغذ جلاتے اور پھونک مارتے ہوئے دیکھنے لگا۔ انہیں اتنی مشقت کرتے دیکھ کر جانے کیوں میں اندر ہی اندر شرمساری سی محسوس کررہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جس نے ہمیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا اسے لڑکھڑانے کے لیے پتھریلے رستوں پر تنہا چھوڑ دیا ہو۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ان کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح آگ جل اٹھے اور پانی کو جوش آجائے...... جبکہ جس دل میں آگ لگنی تھی اور جس لہو میں جوش آنا تھا وہاں سرد سناٹا سا تھا۔ شاید یہی ہمارا المیہ ہے جو لگن جہاں ہونی چاہیے تھی وہ وہاں مفقود تھی۔ جن بچوں کو بچپن میں سہارے نہیں ملتے شاید وہی بڑھاپے کی لاٹھی کی اہمیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ میں اور جنہیں مل جاتے ہیں وہ ضعیف جسم کے لرزوں کا عذاب نہیں جان سکتے۔

میں دل میں ایک درد کی لہر دبائے دھیرے دھیرے سیڑھیوں سے اتر کر اندھیرے میں گم ہوگیا۔



ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر: 11

گل و گلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے جسے لوگ پیار سے شیرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خونچکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنھوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی عزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی۔ میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر

اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص مگر کچھ قنوطی انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنا دیا۔ جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی زیناں نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلا ڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیا نامی لڑکی سے ہوئی جس نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد بھلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کر لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ ہم ڈیرے پر پہنچے لیکن وہاں ہمارے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی، وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دل جیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نور پور سے نکال لانا چاہیے لہٰذا ہم نور پور پہنچے لیکن، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم

افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو خالی ہاتھ تھا، اسے یوں مایوس دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا اور ایک سابق فوجی ہماری خدمت پر مامور تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائداد کی خاطر، بخت جان پھوپی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں پیا نے میری تربیت کی اور مجھے فارم ہاؤس میں میڈم سے ملاقات کا حکم ملا لیکن یہ ملاقات ایک خونی مقابلے کی صورت تھی جس میں، میں بہ مشکل تمام غالب رہا یہ میڈم کے امتحان لینے کا ایک طریقہ تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی کے سفر میں ہم جب گاڑی میں بیٹھے تو عقب سے ہم پر ہتھیا تان لیے گئے۔ میڈم نے نہایت ڈرامائی انداز میں ان دونوں کو قابو کر لیا تعارف کرانے پر معلوم ہوا کہ وہ دونوں نامی گرامی ڈاکو تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمے داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا وہ چہرہ دیکھ کر میرے سارے زخم تازہ ہو گئے لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے بس میں گھر جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا میرے لیے اجنبی نہیں تھا وہ ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے موبی کا دوست زور آور تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے کیوں یرغمال بنا رہا ہے لیکن بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گیا اس دوران حیدر خان نے استاد بھلو کے ساتھ مجھے خریدنے کی کوشش بھی کی۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہو گئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہد نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ وہ چاچا کی جائداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں بڑبڑایا۔ ”جمعہ خان ولد فریدن خان قوم لشاری سکنہ......“

ماضی میں میری سماعت سے ٹکرانے والا حیات خان کا ایک جملہ گونجا۔ ”چراغ دین! مجھے بتا، میں کیا کر سکتا ہوں۔ تیرے بھرا (بھائی) نے کئی سال پہلے اپنی زمین فریدن خان کے ہاتھ بیچ دی تھی۔ اپنی مونچھ اونچی رکھنے کے لیے اس نے یہ بات نور پور میں کسی کو نہیں بتائی تو فریدن کا کیا قصور؟...... اس نے تو سوہنے خان کو اپنی زمین کئی سال ٹھیکے پر دیے رکھی تا کہ وہ بھوکا نہ مرے۔ اب سوہنا اس دنیا میں نہیں رہا تو کیا فریدن خان اپنا تر کہ چھوڑ دے؟“

جب چاچے چراغ نے حیات خان کے پاس جا کر فریاد کی تھی کہ اس کے بھائی کے رقبے پر قبضہ کر لیا گیا ہے تو حیات خان نے اُسے یہی جواب دیا تھا۔ میں چاچے کے ہمراہ خان کے دارے پر گیا تھا پھر اس نے پٹواری کو دارے پر بلوا کر چاچے کی تسلی کرائی تھی۔ پٹواری نے بستے میں سے خسرہ کھتونی نکال کر حیات خان کے سامنے رکھ دی تھی جس کا ایک ایک لفظ حیات خان نے پڑھ کر سنایا۔ بعد میں یہی رقبہ سردار حیدر خان نے خرید لیا اور وریام خان سے باہمی تبادلہ کر لیا۔ وریام خان کی بیوی کا وراثتی رقبہ بلوچ نگر میں پڑا تھا۔ حیدر خان نے وہ اپنے نام کروا لیا جبکہ میری زمین وریام خان نے اپنے کھاتے میں ڈال لی۔

جن دنوں میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد نتیجے کا انتظار کر رہا تھا، انہی دنوں میں اور کھالا فریدن کو تلاش کرتے کرتے موضع گوور تک پہنچ گئے۔ وہ کوئی بڑی بستی نہیں تھی مگر ہمیں فریدن خان نہ ملا۔ یہاں اس کا رقبہ نہیں تھا بلکہ پرائی زمینوں پر مزدوری کر کے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ پھر ایک دن اپنے خاندان کو لے کر کہیں چلا گیا۔ کہاں؟ یہ کسی کو علم نہیں تھا۔

وہ پٹواری مر چکا تھا جس نے زمین کا انتقال درج کیا تھا۔ پھر جب میں اور کھالا حلقے کے موجودہ پٹواری کے پاس پہنچے تو اُس نے بتایا کہ گزشتہ سالوں میں تین پٹواری اس حلقے میں تعینات ہوئے۔ چونکہ وہ زمین کی ہسٹری سے آگاہ نہیں تھا اور محض کاغذات کی زبان بول سکتا تھا، بولتا رہا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں فریدن خان کو تلاش کرنا چاہتا ہوں تو مجھے ریونیو ریکارڈ میں موجود رجسٹریوں کی فائلیں چیک کرنا ہوں گی۔ فریدن خان نے جس دستاویز کی رُو سے زمین سردار حیدر خان کے نام منتقل کی تھی، اُس میں شناختی کارڈ کی نقل موجود تھی۔ اس نقل کو دیکھ کر اسے تلاش کیا جا سکتا تھا۔ ہم ریونیو آفس بھی پہنچے تھے مگر وہاں پتا چلا کہ ریونیو آفس میں اپنا نام بتانے کے لیے بھی پیسے لٹانا پڑتے ہیں۔ خالی ہاتھ یہاں آنے والوں کو سلام کا جواب تک نہیں دیا جاتا۔ مایوس ہو کر ہم گھر لوٹ آئے۔

میرے باپ کی زمین فریدن خان کے نام منتقل ہوئی تھی۔ میرے سامنے پڑی ہوئی دستاویز کی رُو سے چاچے چراغ کی جائداد فریدن خان کے بیٹے کے نام منتقل ہونے والی تھی۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ سوہنے خان کی کہانی دُہرائی گئی تھی۔ طریقۂ واردات بھی وہی تھا۔ سوہنے خان نے مرنے سے چھ سات سال قبل فریدن کے ہاتھ زمین بیچی تھی جبکہ چاچا مرنے سے چار سال قبل ان اسٹامپ پیپرز پر انگوٹھے لگا رہا تھا۔ اگر یہ پیپرز میرے ہاتھ نہ لگتے اور اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتے تو میرا خاندان بقیہ نصف جائداد سے بھی محروم ہو جاتا۔ جس طرح فریدن خان ڈھونڈے سے نہیں ملا تھا اور رقبہ حیدر خان کو مل گیا، اسی طرح فریدن کا بیٹا زمین حیدر خان کو بیچ کر غائب ہو جاتا اور میری طرح میرا چچازاد بھائی موج دین عرف موجو بھی تہی دست ہو جاتا۔

میں نے پوری احتیاط سے ماضی بعید اور قریب کی دونوں کہانیوں کی مماثلت کا تنقیدی جائزہ لیا۔ سرِمو کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ طے تھا کہ میرے چچا سے زمین ہتھیانے کی کوشش کرنے والا اور اُسے موت کے گھاٹ اُتارنے والا وہی تھا جس نے میری ماں رضیہ عرف رجو اور باپ سوہنے خان کا خون کیا تھا۔ یعنی سردار حیدر خان......

میرے ذہن میں تند و گرم ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کبھی نظروں کے سامنے رنگو قسائی کا چہرہ گھوم جاتا تو کبھی ایرانی شال اوڑھے، فرعون کی طرح چھاتی پھیلائے کھڑے حیدر خان کا...... جنہوں نے محض چند بیگھے زمین کی خاطر میرے خاندان کو آگ میں جھونک دیا تھا۔

شانو چائے گرم کر لائی۔ مجھے منہمک دیکھ کر بولی۔ ''بھائی! کیا ہوا؟ کچھ مجھے بھی بتاؤ ناں!''

میں چونکا۔ اسٹامپ پیپرز رول کر کے بیڈ سے ملحقہ دراز میں ڈالے اور چائے کا پیالہ تھام لیا۔ وہ میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی، بولی۔ ''بھائی! کیا ہم بھی نور پور نہیں جائیں گے؟''

میں نے اُسے بہ غور دیکھا۔ آنکھوں میں اُمید کی پرچھائیاں تھرک رہی تھیں۔ جن گلیوں میں بچپن اور لڑکپن گزرا ہو، انہیں انسان مرتے دم تک بھول نہیں سکتا۔ جہاں بھی رہتا ہے، لوٹ کر انہیں گلیوں میں جانا چاہتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نور پور کی گلیاں خواہش بن کر نقش ہو گئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''کیا تم یہاں خوش نہیں ہو؟''

اس نے سر جھکا لیا۔ ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے بعد گھر کی دیکھ بھال کون کرتا ہوگا؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''گھر کو دیکھ بھال کی ضرورت نہیں رہی۔ بتایا تو تھا کہ وہ جل کر بھسم ہو گیا۔''

وہ بولی۔ ''کچھ تو بچا ہوگا؛ ہمارا ڈیرا، مال ڈنگر اور کھیتوں کے ہتھیار وغیرہ...... چاچے سوہنے خان کا سامان تو سارے کا سارا اس کے گھر میں موجود ہے۔''

اس کا اشارہ میرے کھنڈر گھر کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ''شانو! مجھے نور پور یاد آتا ہے۔ مال ڈنگر کا پتا کروں گا کہ وہ کس کے پاس ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی اُٹھوں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ خانزادے ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ کاغذات تم نے دیکھے ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہیں، جیسے میری زمین ہتھیانے کے لیے تیار کیے گئے تھے اور میری وراثت دن دیہاڑے لوٹ لی گئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے بھائی موجو کی وراثت ان کمینوں کے ہاتھ لگنے سے بچ گئی۔ جب تک ہم میں سے کوئی شخص بھی زندہ ہے، وہ زمین، ڈیرا اور گھر کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں ہم تب تک نور پور نہیں جا سکتے جب تک ہمارے دشمن موجود ہیں۔ یہ میرا نہیں، ہمارے لیکھوں کا فیصلہ ہے۔''

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے دلاسا دیا۔ وہ میرے کرب کو بھانپ گئی۔ بولی۔ ''بھائی! کیا ہم قانون کی مدد بھی نہیں لے سکتے؟''

میں نے کہا۔ ''پولیس بعد میں پہنچتی ہے، جان لینے والے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے چاچا اور چاچی کو جلایا تھا، میں نے انہیں مار دیا مگر انہیں بھیجنے والا خانزادہ ابھی زندہ ہے۔ قانون اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ثبوت مانگتا ہے اور میرے پاس ثبوت نہیں ہے۔''

''یعنی جب تک حیدر خان زندہ ہے، ہم نور پور نہیں جا سکتے؟ یہی کہنا چاہتے ہو؟'' وہ قدرے مایوسی سے بولی۔

''ہاں شانو! فی الحال ایسا ہی ہے۔''

''وہ تو بہت بڑا آدمی ہے۔''

''ہاں! لیکن موت چھوٹے بڑے کا فرق نہیں دیکھتی۔'' میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''وہ بے گناہوں کی سزا بھگتے گا۔''

باتوں کے دوران میں چائے پی چکا تھا۔ اُس نے پیالہ اُٹھایا اور اُداس چہرہ لیے کمرے سے چلی گئی۔

جب تک مجھے اپنے والدین کے قاتلوں تک پہنچنے کا کلیو نہیں ملا تھا، تب تک مجھ پر مایوسی طاری تھی۔ میں نے

...تھا کہ میں شاید کبھی ان تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ قسمت ...ردوں کو یکے بعد دیگرے چاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ ...نگو قسائی نظر آیا۔ پھر فریدن خان اور سردار حیدر خان کا ...ردار سامنے آ گیا۔ میں ان دونوں سے بہ آسانی نمٹ سکتا ...۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کمزور تھے یا میں ان سے زیادہ ...اقت ور ہو گیا تھا، بلکہ مجھے اپنے دشمنوں کا پتا چل گیا تھا۔ آج نہیں تو کل، میں ان کی گردنیں ماپ سکتا تھا۔ اسی طرح فریدن خان اور اس کے بیٹے کو تلاش کرنا بھی اَب مشکل نہیں رہا تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں ریونیو آفس جا کر مطلوبہ معلومات خرید لیتا۔

شام کو بازار کی طرف نکلا۔ ایک ڈاکٹر سے اپنے زخم کا معائنہ کروایا۔ اس نے پٹی تبدیل کی، اینٹی بائیوٹک گولیاں تجویز کیں اور تسلی دی کہ زخم ٹھیک ہونے والا ہے۔ چونکہ درد نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا، اس لیے میں اُس کی رائے سے متفق تھا۔ شانو نے تکے اور شامی کباب لانے کی فرمائش کی تھی۔ انہیں پیک کرایا، پھر ایک موبائل فون سیٹ اور نیا سیلولر میڈیول خریدا اور گھر آ گیا۔ زور آور نے میرا موبائل میڈیول (سم) سمیت چھین لیا تھا۔ چونکہ وہ سم میرے نام رجسٹرڈ نہیں تھی، نہ اُس کی میموری میں کوئی نمبر محفوظ تھے، اس لیے مجھے فون کے چھننے پر کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ میرو شاہ کی ہدایت کے مطابق گروپ کے سبھی لوگوں نے ایک دوسرے کے نمبر یاد کر رکھے تھے۔ فون کرنے کے بعد اُس نمبر کو میموری سے مٹا دیا جاتا تھا۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تک ہم بھی نے بیٹھ کر خوش گپیاں ہانکیں۔ ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھا پھر سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں کا رُخ کیا۔ میں نے لحاف میں دبک کر میرو شاہ کو فون کیا۔ اس نے کال ریسیو کی اور میری آواز سن کر بولا۔ ''اڑے غنچے! سائنسی بٹیرے کا نمبر کیوں بدل لیوت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہی بتانے کے لیے تو فون کر رہا ہوں۔ میرا فون زور آور نے چھین کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔''

''جور آور نے؟ وہ سالا کباڑیہ کہاں مل جاوت ہے تمہیں؟'' وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔

''اس نے حیدر خان کی سپاری پر مجھے اغوا کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا ہوں......''

میں نے اسے اپنی بات کے بیچ میں کہیں ٹپکنے کا موقع دیے بغیر مختصر الفاظ میں اپنی رام کہانی گوش گزار کر دی۔

وہ بولا۔ ''اڑے واہ لاڈے میاں! کمال کر دیوت ہے بھئی...... مہارانی تیرے کو کوہِ نور ہیرا بولت ہے تو کیا غلط بولت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں شاہ جی!''

''ماڑے پاس کیا رکھا ہووت ہے؟'' اس کی آواز شوخ ہو گئی۔ ''غنچے! تیرے تن کی رگ رگ میں جوان جہان خون دوڑے پھرت ہے؛ ایسا لہو تو جوانی مانگت ہے، جام مانگت ہے......''

میں نے ٹوکا۔ ''میری بات تو سنو۔ میں کئی باتیں تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہووت...... کل شام کو میڈم نے ہم سب کو بلا رکھا ہووت؛ غنچے کو بھی بلا لیا جاوے ہے۔ وہاں اپنے دل کی بھڑاساں نکالنے کا پورا موقع دیوت ہے ماڑے لاڈے کو...... مہارانی سننے کو بیٹھے، جوانی سنانے کو بیٹھے، تب مجا (مزہ) آوت ہے لاڈے میاں! پَر ایک بات سن لیوت ہے۔ وہاں اپنا دکھڑا نہیں رونے کا، صرف اتنی بات کرنے کا جتنی کا تعلق ہمارے دھندے سے ہووت۔ وہ حرام جادے حیدر خان کی رشتہ داری مت بھول بیٹھے ہے، وہاں پر، ماڑا غنچہ...... سمجھ میں آوت کہ ناں آوت؟''

''میں سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''پان کی گلوری ماڑے ہاتھ میں ہووت اور انتجار (انتظار) کرت کہ لاڈے کا فون بند ہووت اور ماڑی واڑھ گرم ہووت...... بس یاد رکھ لیوت کہ پیا کی گڈی آ جاوے گی تیرے کو لینے کے لیے کل شام کو...... ٹھیک اے ناں ماڑے غنچے؟ اَب جرا مسکا دیوت ہے ناں......''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''خیر تو ہے؟ کل شام کو کیوں سب اکٹھے ہو رہے ہیں؟''

''ناں بابا...... فکر نہ کرت...... مہارانی جرا (ذرا) پڑھی لکھی ہووت تو نخرے دکھاوت...... ہر مہینے میں ایک بار جرور (ضرور) سب کو اکٹھا کرے ہے اور رپورٹ شپورٹ لیوے ہے۔ جرا (ذرا) کھسکی ہوئی کھوپڑی ہووت ہے ناں اُس جنانی جات (زنانی ذات) کی......''

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ فون پر میری اغوا کی کہانی سننے سے گریزاں تھا ورنہ اپنی عادت کے مطابق کرید کرید کر پوچھتا۔ بیچ بیچ میں فلسفیانہ انداز میں سوچنے کی اداکاری بھی کرتا۔

اپنے نئے موبائل سیٹ کے آپریٹنگ سسٹم کو سمجھنے کے لیے میں چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا جب اچانک مجھے یاد آیا کہ مظفر گڑھ سے چلتے ہوئے شاہد سلیم سے فون نمبر لینا مجھے یاد نہیں رہا تھا، حالانکہ اس کے باپ نے ہم دونوں کو تاکید کی تھی۔

اَب اس سے رابطہ ماسوائے ملاقات کے، نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ یاد آیا تو اُس کی من بھاونی شبیہہ نظروں میں گھوم گئی۔ وہ واقعی بہت خوب صورت لڑکا تھا۔ عاشی کے ساتھ جچتا تھا۔ اس کے پہلو میں کھڑی عاشی بھی جچتی تھی۔ اب یہ قسمت پر موقوف تھا کہ ان دونوں کو زندگی کے کسی موڑ پر ایک ساتھ کھڑا کرتی یا نہیں...... اس کی باتیں میرے ذہن میں چکرانے لگیں۔ ''شہر یار! اگر تمہاری بہن حیدر خان کی قید سے نکل کر کسی اور قید میں نہیں گئی تو پھر اُس نے اَب تک تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

پھر اس نے میری تاویل سن کر بڑی مایوسی سے کہا تھا۔ ''تمہاری بہن کی حد تک تو اِس خوش گمانی میں رہا جاسکتا ہے مگر میرا گھر اور فون نمبر تو وہی ہے جسے عاشی مرتے دم تک بھول نہیں سکتی۔ اس نے کیوں مجھ سے رابطہ نہیں کیا؟''

زندگی ایسا ہی طویل سفر ہے۔ کبھی یادوں کے اُجالے، کبھی مایوسیوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے...... تو کبھی سرسراتے ہوئے جان لیوا اوہام اور اندیشے......

☆☆☆

میں پوری طرح تیار ہو چکا تھا جب مجھے سراج الدین عرف پیا جی لینے کے لیے پہنچ گیا۔ اسے میرو شاہ نے مجھے پک کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی پوٹھوہار جیپ پر تھا۔ ہم دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے عقیل کی خیریت دریافت کی۔ جب میری پیا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، وہ اُس کے ساتھ تھا۔ گونگا تھا مگر غضب کا دلیر اور چاق و چوبند تھا۔ پیا نے بتایا کہ اسے جاوید کے ساتھ میڈم نے کسی مشن کے سلسلے میں بلوچستان کے پہاڑی شہر 'زیارت' میں بھیج رکھا ہے۔

میں نے کہا۔ ''زیارت میں تو ان دنوں سخت سردی پڑتی ہے۔ سنا ہے کہ وہاں برف باری بھی ہوتی ہے۔ ایسے میں وہ وہاں کیا کریں گے؟''

اس نے کندھے اُچکائے۔ ''میڈم جانتی ہیں یا وہ دونوں...... میں نے پوچھا، نہ انہوں نے بتایا۔''

میں نے دیکھا کہ اس کا رُخ میڈم کی کوٹھی کی طرف نہیں تھا تبھی پوچھا۔ ''پیا جی! ہم کہاں جارہے ہیں اس وقت؟''

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ کسی غلط جگہ پر نہیں لے جاؤں گا۔ بائی دی وے! ہم جلیل آباد کی طرف جارہے ہیں۔ کیوں؟ یہ وہاں جا کر تم دیکھ لو گے۔''

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اس نے چند دن قبل یہ پرانے ماڈل کی پوٹھوہار جیپ خریدی تھی۔ اس کی ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام ہونا باقی تھا اور ٹائر بھی بدلے جانے تھے، وقت نہ ملنے کے باعث ابھی تک کھٹارا معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے یو ٹرن گیٹ سے دائیں ہاتھ ٹرن لیا۔ چند منٹوں بعد بائیں ہاتھ مڑ کر ایک ہاؤسنگ کالونی میں گھس گیا۔ اس کے بتانے پر پتا چلا کہ ہم جلیل آباد میں داخل ہو چکے تھے۔ چند موڑ کاٹنے کے بعد اُس نے ایک چھوٹی مگر جدید طرز کی نوتعمیر شدہ کوٹھی کے گیٹ پر جیپ روکی اور مجھے اُترنے کا اشارہ کیا۔ میں اتر گیا تو وہ جیپ آگے لے گیا۔ کچھ فاصلے پر خالی پلاٹ میں تین چار کاریں کھڑی تھیں۔ اس نے وہیں جیپ پارک کی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔

اس نوتعمیر شدہ کوٹھی کے گیٹ پر زُوم اِن کمپیوٹر کالج کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ چار دیواری پر ایڈمشن کے لیے ترغیبی کلمے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ ہم کہاں آگئے ہیں؟''

''یہ کمپیوٹر کالج میڈم کا ہے مگر اِسے مس شائلہ خانم چلاتی ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں دو انگلش میڈیم اسکولز بھی ہیں میڈم کے۔'' پیا بولا۔ ''دھندے کے ساتھ ساتھ میڈم بزنس بھی کرتی ہے۔ کوئی پوچھے تو بتا سکتی ہے کہ اس نے اسکولز کی چین بنا رکھی ہے۔''

''کیا ہر مرتبہ یہیں میٹنگ ہوتی ہے؟''

''نہیں...... یہاں پہلی مرتبہ ہو رہی ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں گیٹ کا بغلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ سیاہ رنگ کی ایک بڑی لینڈ کروزر کو دیکھ کر پیا بولا۔ ''میڈم آ چکی ہیں۔ جلدی چلو!''

گاڑی سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں بھولی بھالی شکل والا ایک گن مین بیٹھا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر دوسرا قوی الجثہ گن مین ٹہل رہا تھا۔ دونوں پیا جی کو جانتے تھے۔ علیک سلیک اور میرا تعارف حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نہ صرف ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی بلکہ ٹہلنے والے سکیورٹی گارڈ نے اَز خود کارِ رہبری سنبھالا اور ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کی تقلید میں ہم جہازی سائز کے چوبی گیٹ کو عبور کر کے بڑے سے ہال میں داخل ہوئے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ چوبی تختے ڈیسک کی صورت نصب تھے جن پر ترتیب وار کمپیوٹر پڑے ہوئے تھے۔ مخصوص ساخت کے ریوالونگ اسٹولز بھی قطار میں رکھے گئے تھے جن پر بیٹھ کر اسٹوڈنٹس کمپیوٹر چلاتے تھے۔ ایک دیوار پر وائٹ بورڈ آویزاں تھا جس پر ایک ٹیڑھی میڑھی ڈرائنگ نظر آرہی تھی۔

ہال میں تین دروازے نظر آئے۔ ایک سے ہم داخل ہوئے، دو سامنے تھے۔ گن مین نے ایک دروازے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور پلٹ گیا۔ پیا اُلٹے ہاتھ کی دیوار کے آخری دروازے میں داخل ہوا۔ سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک باوردی سکیورٹی گارڈ اسٹول پر ایلی میگزین شارٹ گن تھامے چوکس بیٹھا تھا۔

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میری اسکیننگ کی، پھر میرے بارے میں پیا جی سے کئی سوال کیے اور جیب سے موبائل فون نکال کر کسی سے رابطہ کیا۔ میرے بارے میں بتا کر ہدایات لیں تب اندر جانے کی اجازت دی۔

یہ چھوٹا سا کمرا تھا جس میں تین دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ پیا نے داہنے ہاتھ والا دروازہ کھولا اور جھانک کر اندر داخل ہو گیا۔ میں اُس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ سوچا تھا کہ وہاں تیس چالیس افراد موجود ہوں گے مگر اس بارہ ضرب اٹھارہ کے طویل کمرے میں محض پانچ آدمی بیٹھے ہوئے تھے جبکہ میڈم شکیلہ طویل اور چمکدار کانفرنس ٹیبل کی صدارتی کرسی پر براجمان تھی۔ اس کے پہلو میں میرو شاہ اور اس کے بائیں ہاتھ ایک گھنگھریالے بالوں والا لمبا تڑنگا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی چمکدار تھیں۔ سامنے دو خواتین اور ایک فربہی مائل مرد کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

پھول ہر ماحول میں جچتا ہے۔ میڈم یہاں بھی جچ رہی تھی۔ سیاہ پینٹ شرٹ اور کوٹ، ہلکا اور تر و تازہ میک اَپ، بال جوڑے میں بندھے ہوئے...... اس پر سے نظر ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ پُروقار انداز میں، کرسی پر شاہانہ تمکنت سے بیٹھی ہوئی، میڈم شکیلہ کسی اور ہی جہان کی مخلوق لگ رہی تھی۔ میرے انہماک کو تاڑ گئی۔ ایک ذرا مسکرائی۔ آنکھوں سے بولی۔ ''دیوانگی سے دیکھنے کی اجازت تنہائی میں دے رکھی ہے ناں کہ سرِ بزمِ عاشقاں...... آنکھیں نیچی کرو اور مجھے بات کرنے دو۔''

میں نے جھینپ کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی سخت آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''کیا تمہیں وقت کا احساس نہیں ہے پیا؟ پچھلی مرتبہ بھی تم ہی سب سے آخر میں آئے تھے۔''

''سوری میڈم! آئندہ یہ غلطی نہیں ہو گی۔'' پیا جی نے ندامت سے کہا۔

میڈم نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چمکدار میز پر گلدان، ٹشو پیپرز اور منرل واٹر کی بوتلیں پڑی تھیں۔ ہر ایک کے سامنے ایک نوٹ پیڈ اور پینسل بھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ یہاں موجود بھی لوگ خطرناک جرائم پیشہ افراد تھے۔ اغوا، مار دھاڑ، قتل و غارت، اسلحہ و منشیات کی ترسیل اس گروہ کا بزنس تھا مگر وہ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے کسی بھی طرح غنڈے، ڈاکو یا مجرم دکھائی نہیں دیتے تھے بلکہ پڑھے لکھے، سنجیدہ مزاج اور باوقار تاجر معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کانفرنس کا منظر بارہا ٹی وی ڈراموں، خبروں اور فلموں میں دیکھا تھا۔ آج بہ نفسِ نفیس اس فلمی منظر کا حصہ بن گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ دیر بعد کوئی اعلیٰ سطح کی کاروباری میٹنگ ہونے والی تھی۔ فول پروف انتظامات کو دیکھ کر میرے دل پر میڈم کی دھاک بیٹھ گئی۔

ہم بیٹھ گئے تو میڈم نے کانفرنس کے آغاز کا اعلان کیا اور میرا تعارف کرایا۔ تھری پیس سوٹ میں جکڑے ہوئے شخص، جس کا نام بعد میں وارث علی معلوم ہوا، نے پوچھا۔ ''میڈم! سینئرز کی میٹنگ میں اس کی موجودگی کیوں ضروری سمجھی گئی؟''

میڈم مسکرائی۔ ''آپ لوگوں کی حیرانی بجا ہے مگر نہ صرف شہر یار کا تعارف آپ سے کرانا مقصود تھا بلکہ یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ میں نے سابقہ دو میٹنگز میں زیرِ بحث آنے والا ایکشن گروپ تشکیل دے دیا ہے۔ جو کام مختلف ممبران سے مختلف اوقات میں لیا جاتا تھا، اب وہ کام صرف ایکشن گروپ سے لیا جائے گا۔ میں نے مسٹر شہر یار کو اس گروپ کا لیڈر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سخی محمد، عقیل، عمیر اور طاہرہ اس گروپ میں شامل ہوں گے۔ کیا میں نے درست قدم اُٹھایا ہے؟''

سبھی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بھٹکتی ہوئی نظریں مجھ پر آن ٹھہریں۔ نظروں کی کسوٹی پر لٹکتے ہوئے میرے احساسات بہت عجیب اور بے عنوان تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں اور کسی پل اس ماورائی اور غیر یقینی دنیا سے میرا ناتا ٹوٹ جائے گا۔ مجھے نظروں ہی نظروں میں جانچنے کے بعد میڈم کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر لیا گیا۔ پھر ایکشن گروپ پر تفصیلی بحث کو اگلی میٹنگ پر موقوف کر دیا گیا اور معمول کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے میڈم نے گھنگھریالے بالوں والے طویل قامت شخص کو مخاطب کیا۔ ''جمال! تمہارے پاس گزشتہ ماہ ایک مشن تھا۔ خواجہ ظفر کو صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیتنے کے لیے ساری فنڈنگ ہماری تھی۔ وہ تین ماہ پہلے تک ہماری پسِ پردہ اعانت کرتا رہا پھر اُس نے آنکھیں پھیر لیں۔ سوچا کہ وہ ممبر بن کر کوئی توپ قسم کی چیز بن گیا ہے۔ اسے نیچا دکھانا

اور اس کا ڈنک نکالنا ضروری تھا جو تمہارے ذمے لگایا گیا تھا۔ تم نے اسے کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسے استعفا دینے پر مجبور کرنا، مجھ سے معافی کا طلب گار ہونا اور اپنا رویہ بدلنا تمہارے مشن کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ویل ڈن! تم بہت ذمے دار اور ایکٹو ہو۔"

میں حیرت زدہ نظروں سے حاضرین کے بے حد سنجیدہ چہروں کو دیکھ رہا تھا جو میری دانست میں، ناٹک کر کے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میڈم خاموش ہوئی تو سبھی نے جمال کو کامیابی کی مبارک باد دی۔ میں نے بھی شرکائے محفل کی دیکھا دیکھی اجنبیت کے باوجود اسے جملۂ تحسین سے نوازا۔ پھر میڈم کے مطالبے پر اُس نے اپنے مشن پر تفصیلی گفتگو کی۔ پتا چلا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ کاغذ کی ہتھیلی بناتا تھا اور اس ہتھیلی پر سرسوں جما کر دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

میڈم بولی۔ "وارث نے گزشتہ ماہ مال کی سپلائی حسبِ معمول بروقت اور بنا رکاوٹ کی ہے۔ اس ماہ اس کے پاس کرنسی کی وصولی اور ترسیل کا اضافی کام سونپا گیا تھا جس کا بونس اسے دے دیا گیا ہے۔ چونکہ وارث کا کام سب سے مشکل اور حساس ہے، اس لیے میں نے وارث کو زیادہ نفری دی ہے۔ میں وارث کو ان گنت کامیابیوں کی مبارک باد دیتی ہوں اور اس پر فخر کرتی ہوں۔ وارث! دوستوں کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بتاؤ۔"

وارث گلا کھنکار کر تقریر کرنے کے سے انداز میں بتانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے پر میڈم نے ایک ادا سے مسکرا کر تالی بجائی۔ سبھی نے اُس کی تقلید کی اور تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد میڈم نے میروشاہ سمیت سبھی شرکا کی کارکردگی پر گفتگو کی۔

امیر شاہ عرف میروشاہ مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ وہ جیسا بھی تھا، سب لوگوں کے نزدیک اہم تھا اور وہ اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس سے دب کر بات کرتے تھے۔ انتظامی تقسیم کی بدولت اس کے ذمے پولیس کے معاملات، پارٹیوں سے ڈیلنگ اور منصوبہ سازی تھی۔ اس کانفرنس میں دو خواتین بھی شریک تھیں۔ شمائلہ خانم قدرے فربہ مگر خوب صورت خال وخد والی تیس بتیس سالہ خاتون تھی۔ ابھی اس کی ڈھلتی ہوئی جوانی میں تڑپ اور کسک موجود تھی۔ اس نے میک اَپ بڑے قرینے سے کر رکھا تھا اور لباس کا انتخاب عمدہ تھا۔ اس کے ذمے نوعمر اور ضرورت مند جوانیوں کی کھوج اور تعاون پر آمادہ نہ ہونے والیوں کے اغوا کا کام سونپا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے میڈم کے اسکواڈ میں ایک لڑکی کا اضافہ کیا تھا۔ دوسری خاتون ادھیڑ عمر تھی۔ وہ اغوا شدہ لڑکیوں کے معاملات کو سنبھالتی تھی اور میڈم کے حکم پر انہیں تیار کر کے مقررہ مقامات پر بھجواتی تھی۔ لین دین بھی اُسی کے ذمے تھا۔ اس نے کرخت اور بے سری آواز میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

پانچواں شریک ڈاکٹر ظہور اختر تھا۔ وہ میڈم کے جدید طرز کے اسپتال 'میڈی کمپلیکس' کو چلاتا تھا۔ یہ اسپتال شہر کی مصروف شاہراہ پر واقع تھا۔ دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں تھا مگر یہاں جدید آلات اور سرجری کی قابلِ ذکر سہولیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر ظہور اختر کی زیرِ نگرانی چار ڈاکٹر اور چھ نرسوں کے علاوہ پانچ دفتری اہلکار وہاں کام کرتے تھے۔ ویسے تو یہاں عام مریض بھی خاصی تعداد میں آتے تھے مگر اس کمپلیکس کے قیام کا بنیادی مقصد میڈم کے گروپ کے زخمی ہونے والے ارکان کا روایتی رکاوٹوں اور قانونی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر بروقت علاج معالجہ تھا۔ اس نے سب سے آخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد آنے والے مہینے کے ٹارگٹ زیرِ موضوع آئے۔ میڈم نے سبھی کے ذمے نئے پراجیکٹ لگائے۔

میروشاہ کی ترغیب پر میں نے پہلے رنگو قسائی کی وعدہ خلافی کا ماجرا پھر زور آور کی دیدہ دلیری کا مقدمہ پیش کیا۔ غیر متعلقہ ہونے کی وجہ سے میں نے شاہد سلیم سے اتفاقیہ طور پر ہونے والی ملاقات کو گول کر دیا۔

میڈم نے میرے سنائی ہوئی کہانیوں کو بڑے انہماک سے سنا۔ سن کر خاموش رہی۔ دوسرے بھی لب بستہ رہے۔ جمال نے بھڑک کر کہا۔ "اس نالی کے کیڑے کی یہ جرأت! تو...... تو...... یہ قابلِ برداشت نہیں ہے۔ میڈم! زور آور کو اس کے کیے کی سزا دینا ہوگی ورنہ وہ حد سے بڑھ جائے گا۔"

میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش کرایا۔ بولی۔ "ایسے نہیں...... ہمیں جو بھی قدم اُٹھانا ہے، سوچ کر اُٹھانا ہے۔ فیصلے جذبات سے نہیں کیے جاتے۔"

میروشاہ نے کہا۔ "ماڑی میڈم! یہ سن لیوت ہے کہ اگر ہم کجور (کمزور) ہووت تو پھر پورا جمانہ (زمانہ) ماڑے پر گند بلا لا دیوت ہے۔ ماڑی دنیا میں ایسا نہ ہونے کا، جیسا رنگو اور جور آور نے کر دکھاوے ہے۔"

میروشاہ کی تائید میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ میڈم نے یکے بعد دیگرے ہر چہرے پر نظر دوڑائی، کچھ سوچا پھر تمکنت سے بولی۔ "یہ درست ہے کہ ان دونوں نے اپنی

شامت کو آواز دی ہے۔ اگر ہم لوگ ایک دوسرے پر ایسے وار کرنے لگیں گے تو کوئی بھی سروائیو نہیں کر سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان دونوں سے رابطہ کرنا چاہیے اور یہی بات باور کرانی چاہیے۔"

"وہ اِسے ہماری بزدلی قرار دیں گے میڈم!" شمائلہ خانم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

جمال نے زوردار انداز میں تائید کی۔ "بالکل ٹھیک کہا خانم نے۔ میڈم! یہ لاتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔"

"مگر کیا ہم جواباً وہی کچھ کریں گے، جو انہوں نے کیا؟" میڈم نے سمجھانے کے سے انداز میں سوال کیا۔ "میرا خیال ہے کہ محاذ آرائی کے بجائے ہمیں مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔"

میرو شاہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے، باچھیں کھنچ گئیں اور استہزائیہ انداز میں بولا۔ "اڑے واہ مہارانی جی! محاج آرائی...... کیا کھوب کہوت ہے۔ پھر کاہے کو یہ بھاجا دوڑی (بھاگ دوڑ) کرت؟ کالی وردی سے بھی مفاہمت کر لیوت ناں...... میرو شاہ کیوں مارا ماری کرتا پھرت ہے تیرے نام پر!"

"یوشٹ اپ......" میڈم کا پارہ یک لخت چڑھ گیا۔ آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ "میرو شاہ! تم حد سے بڑھ جاتے ہو۔ تمہیں یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ تم کس کو مخاطب کر رہے ہو۔ یہاں ہم نے مل بیٹھ کر یہی کچھ طے کرنا ہے۔ دیکھو! اگر ہم زور آور اور رنگو قسائی کو بہ یک وقت چھیڑ دیتے ہیں تو ان دونوں کی جوابی کارروائیاں ہمیں نقصان پہنچائیں گی۔ رنگو کے پیچھے میاں دلبر حسین ہے۔ زور آور کے پیچھے مرغوب گیلانی ہے۔ دونوں بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کے مالکوں کو بتایا جائے، انہیں باور کرایا جائے کہ ان کے بے وقوف کتوں کی احمقانہ چھیڑ چھاڑ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور وہ ان کی گردنوں میں پٹے ڈال دیں۔"

ہال میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس کی آواز میں شامل برہمی بتدریج کم ہونے لگی، بولی۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ان کی گردنوں میں پٹا ڈالا جائے یا کچلا پھینک کر ہلاک کر دیا جائے اور انہیں بھونکنے کا موقع نہ دیا جائے مگر جارحانہ انداز میں نہیں، بلکہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں۔ دیکھو! زور آور اپنے یار موبی کی وجہ سے شاکی ہے۔ رنگو قسائی کے ہم نے تین جوان مار دیے ہیں۔ وہ بھی آگ بگولا ہے۔ سردار حیدر خان اور استاد ببلو اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہے ہیں۔ ایسے میں ہماری طرف سے کیا گیا حملہ اعلان جنگ تصور ہوگا اور ہم تین مختلف دشمنوں کے نرغے میں آ جائیں گے۔"

جمال بولا۔ "پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"ہاں جمال! یہ ہوئی ناں بات!" میڈم نے سر ہلا کر کہا۔ "ہمیں اپنی توجہ دفاع پر مرکوز رکھنی چاہیے اور پھر جو نہی حالات موافق ہوں، زور آور اور استاد ببلو کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر کے بیچ میں آگ لگا دی جائے۔ دونوں میں سے جو جیتے گا، وہی سکندر قرار پائے گا۔ جو ہارے گا، وہ آگ میں جل مرے گا۔ رہی بات رنگو قسائی کی، تو وہ اس علاقے میں نووارد ہے۔ اُسے پیر جمانے کا موقع نہ دیا جائے اور ہاتھ پاؤں بچا کر اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔ یعنی میں ایک طرح سے فی الحال انتظار کرنے کی پالیسی کو ترجیح دیتی ہوں۔"

میرو شاہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ میڈم کی طرف سے پہلو پھیر کر بیٹھ گیا اور منہ بنانے لگا۔ میڈم نے اُسے دیکھا اور نظر انداز کر کے جمال اور شمائلہ سے باتیں کرنے لگی۔

اس میٹنگ کا آخری سیشن پرتکلف طعام پر منتج ہوا۔ یہ کھانا شہر کے ایک مہنگے فائیو اسٹار ہوٹل سے پیک ہو کر آیا تھا۔

میٹنگ برخاست ہو گئی۔ میں پیا جی کے ساتھ جانے کے ارادے سے اُٹھا۔ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا حکم دیا۔ پیا سے مخاطب ہوئی۔ "تم جاؤ، میرو شاہ اور شہریار میرے ساتھ جائیں گے۔"

میرو شاہ بولا۔ "مہارانی جی! اتنا بھی ماڑے غنچے کو سر پر نہ چاڑھا ہت کہ یہ سالا ماڑے کو ہی آنکھیں دکھانے لگ جاوت......"

میڈم نے اُسے غصے سے دیکھا۔ ڈاکٹر ظہور اختر مسکرایا، بولا۔ "میڈم! شاہ جی کی بات پر غور کیجیے گا۔"

میڈم نے میرا ہاتھ تھاما اور باہر کھینچتے ہوئے بولی۔ "میرو شاہ! تم نہ صرف خود بکواس کرتے ہو بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہو۔ لگتا ہے پھر دو چار دن حوالات کی سیر کرنے کا دل کر رہا ہے تمہارا۔"

اس نے مضحکہ خیز انداز میں ہاتھ باندھ دیے اور گڑگڑایا۔ "ناں مہارانی! یہ عجب (غضب) نہ کیجیو سالے میرو شاہ پر...... وہ جالم انسپکٹر، اجہر (اظہر) دھمکی دیوت ہے کہ اب کے میرو شاہ ماڑے شکنجے میں آوے تو اس کی

بھاوت...... مہارانی شہر کے لونڈوں کو برائلر کہوت ہے، تجھے اصیل بانکا ککڑ جان کر تجھ پر ریجھ جاوت ہے۔ ماڑے کو پتا ہووے۔"

میں نے کندھے اُچکائے، کہا۔ "تم مجھے سبز باغ دکھا رہے ہو۔ میں بھی ساون کا اندھا ہوں۔ ہر طرف ہریالی دیکھ رہا ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرو شاہ کی سجائی ہوئی اس دنیا میں چاند نہیں چڑھتا، پھول نہیں کھلتے، اوس نہیں پڑتی۔"

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پوری وسعت میں کھول کر استعجاب سے مجھے گھورنے لگا، بولا۔ "اڑے! تو تو غجب (غضب) کا پیدا گیر بن جاوت ہے۔ سالا شاعر بن جاوت...... جراہٹ کے!"

میں نے ہنس کر سیڑھیوں پر قدم رکھا اور دو دو زینے ایک قدم میں عبور کرتا ہوا فرسٹ فلور پر آ گیا۔ رُک کر پلٹا، دیکھا، وہ ابھی تک گراؤنڈ فلور پر سیڑھیوں کی ریلنگ تھامے کھڑا تھا اور مجھے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر قدرے اونچی آواز میں بولا۔ "شالا جوانی سلامت رہوے ماڑے غنچے کی!"

میرے عقب میں 'ٹک ٹک' کی مخصوص آواز گونجی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میڈم کے کمرے سے نکل کر زرینا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ دراز قد تھی۔ اونچی ہیل والے جوتے پہن کر کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ اس نے بڑا جاندار میک اَپ کر رکھا تھا۔ قریب آ کر رُک گئی۔ میری سانسوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کمال نفاست سے لپیٹتے ہوئے مسکرائی اور بولی۔ "یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

میں جواب دیے بغیر اُسے دیکھے گیا۔ اس نے ایک ادا سے مجھے، پھر سیڑھیاں چڑھتے میرو شاہ کو اور دھیمی آواز میں بولی۔ "کیا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے اُسے اتنے قریب سے پہلی مرتبہ تب دیکھا تھا جب وہ گیسٹ روم میں وحید کو لینے کے لیے آئی تھی۔ کھالا بھی میرے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ میں نے کہا۔ "حسن کا وصف ہے کہ جب بھی نظر آتا ہے، آنکھوں کو پہلے سے بہتر اور نیا لگتا ہے۔"

"ابے! آنکھوں کو نہیں، دل کو نیا لگت ہے......" میرو شاہ نے میری بات سن لی تھی۔ پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اڑے واہ غنچے! چھپا رستم نکلا ہے تو...... اے بانکی چھوکریا! آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھت ہے لاڈے خان کو۔ کیا نجر (نظر) لگانے کا...... جرا (ذرا) حیا کو ہاتھ مار لے تو چار دن جیاتی کے بڑھ جاویں...... یہ سالا میرو شاہ سچ بولت ہے، جرینا بی بی!"

وہ پچھلے قدموں ہٹ کر دیوار گیر ونڈو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ادائے قاتلانہ سے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "شاہ جی! میں بھی سچ بولتی ہوں کہ آنکھیں چاہیں کہ آپ کی موجودگی میں کچھ اور دیکھیں۔ آپ اپنے لاڈے خان کو سنبھال کر لے جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کسی کام کاج کا ہی نہ رہے۔"

اس کے چہرے پر بڑی ہوش ربا مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ میں نے شکوہ کناں نظروں سے میرو شاہ کو دیکھا جو آنکھیں مچا رہا تھا اور زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر میڈم کے کمرے کی طرف کھینچتا ہوا زرینا سے مخاطب ہوا۔ "ابھی تیری سسری مالکن کے پاس جاوت ہوں اور تیرے تن کی آگ پر گھڑا ساون کا ڈالت ہوں......"

ہمارے عقب میں اس کے حلق سے نکلی مندر کی گھنٹیوں کی مترنم صدا گونجی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے ہاتھ لہرا رہی تھی۔

ہم آگے پیچھے میڈم کے کمرے میں داخل ہوئے۔ میڈم جوتے اُتارے بیڈ پر دوزانو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے جام و صبو کی بساط سجی ہوئی تھی۔ ہم اس سے کچھ فاصلے پر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میرو شاہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "رانی! یہ شراباں نہ پیوت، یہ جھوم جھوم مستی سے دور رہوت؛ نہیں تو کسی کام کی نہ رہوت...... جوانی کو آگ لگانے میں مجا (مزا) تو آنے کا، پر جوانی دروجا (دروازہ) کھول کر جانے کا......"

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میرو کی بات سن کر سر اُٹھ گیا۔ جوڑے سے نکل کر سوختہ جاں جھولتی ہوئی لٹ کو بے نیازی سے جھٹک کر بولی۔ "میں زیادہ نہیں پیتی۔ کم پیتی ہوں۔ ویسے بھی آگ پر آگ کا کچھ اثر نہیں ہوتا میرو شاہ۔ یہ تم زرینا سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"ماڑے کو کوئی بات نہ کرتا ہووے جرینا سے، وہ میرے غنچے پر لائن مارت ہے۔"

میڈم نے مجھے دیکھا۔ چند ثانیے سپاٹ چہرہ لیے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "لائن مارنے دیتے، تمہارا کیا جاتا؟"

"وہ سالی ہر روج (روز) نیا عاشق دیکھت پر اُس کا دل نہ بھرت......"

"تمہاری باچھیں بھی تو پھیل جاتی ہیں، سونیا کو دیکھ کر......"

"گدی پر فائر نہ مارت مہارانی! وہ اور بات ہووت

ملت ہے...... تیرے کو گولی مارنے کا اس کے سینے میں، پر پہلے بتانے کا......"

میڈم نے آنکھیں بند کرلیں۔ آدھے گلاس میں ہوا، آدھے میں مائع آگ بچی تھی۔ اس نے گلاس لبوں سے لگا کر خالی کردیا پھر ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "میں نے کہہ دیا ناں کہ یہ کام شہر یار کرے گا۔ لیکن ابھی نہیں...... چند دن بعد...... جب میں کہوں گی۔ اب تم جانا چاہو تو نیچے جاؤ اور ڈرائیور سے کہو۔ وہ تمہیں گھر چھوڑ آئے۔"

میرو شاہ نے جیب سے پان نکال کر منہ میں ٹھونسا، سگریٹ کارٹن پیک کا خاکی رنگ کا موٹا کاغذ تہ کرکے ڈسٹ بن میں پھینکا اور کھڑا ہوگیا۔ ایک اچٹتی نظر مجھے، پھر میڈم کو دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ نکلتے نکلتے ایک ذرا رُکا، پلٹا اور انگلی تان کر بولا۔ "مہارانی! ماڑے ساتھ غصہ نہ کیا کرت ورنہ ماڑے کو جندگی (زندگی) بھر نہ دیکھ سکت......"

میڈم نے نہ اُس کی طرف دیکھا اور نہ کوئی جواب دیا۔ وہ ایک نگاہِ برہم ڈال کر چلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور بولی۔ "اِدھر آؤ!"

میں سمجھ گیا۔ وہ کچھ دیر کھیلنا چاہتی تھی۔ اپنے جذبات کے منہ زور گھوڑے کو چارہ دکھانا چاہتی تھی۔

میں نے بہ عجلت مگر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "اگر آپ مجھے اجازت دے دیں تو میرو شاہ کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ ڈرائیور کو دو مرتبہ......"

"کہا ناں...... اِدھر آؤ!" وہ قدرے غصے سے بولی۔

میں بیڈ کے قریب جاکر تھم گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑی ہوگئی۔ گلاس کو دیوار کی طرف اچھالتے ہوئے تھوڑا جھومی، لہرائی اور بانہیں کھول کر مجھے دعوت کناں نظروں سے دیکھنے لگی۔ آنکھیں بولتی ہیں تو کبھی نہ سمجھنے والوں کو بھی سمجھانے لگتی ہیں۔ میں نے اس کی مخمور اور بدن میں اُترنے کی الگ خوبی رکھنے والی آنکھوں میں لکھے ہوئے جذبات خیز لفظوں کو پڑھا، اپنے قلب و ذہن میں ابھرنے والی سرسراہٹوں کو محسوس کیا اور چاہا کہ اس کی ناراضی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دروازہ کھولوں اور یہاں سے بھاگ جاؤں...... مگر سیاہ پینٹ شرٹ سے جھانکتا گلاب گوں حسن خیرہ کن چمک سے آنکھوں پر کامیاب حملہ کرچکا تھا۔ جان کے قلعے کی فصیلوں میں شگاف ڈال چکا تھا۔

مجھے ایک دم ساکت کھڑا دیکھ کر اس نے آنکھوں سے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ "میڈم! میں آپ کے جتنا مضبوط نہیں ہوں۔"

اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا، پھر مسکرائی اور بولی۔ "کم آن! مضبوطی آزمانے پر اپنا آپ ظاہر کرتی ہے۔ تم اپنی منگیتر سے محبت کرتے ہو۔ اس محبت کی طاقت کو میرے قریب آکر آزماؤ...... ڈرتے کیوں ہو؟ آؤ ناں......"

ناچار ایک قدم بڑھا۔ گھٹنے مخملیں بیڈ شیٹ میں چھپے فوم سے لگا کر کھڑا ہوگیا اور مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل پر چلتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر، میرے عین مقابل آکر تھم گئی۔ وہ جب بھی میرے قریب آتی تھی، میری سانسیں تھمنے لگتی تھیں۔ اب بھی مجھ پر عجیب سی بے خودی طاری ہونے لگی۔ میں چاہنے کے باوجود پیچھے نہ ہٹ سکا۔ اس نے سر اُٹھایا، میری آنکھوں میں جھانکا اور ہونٹوں کو دائرہ شکل میں نیم وا کرتے ہوئے میرے چہرے پر پھونک ماری۔ نامانوس مہک نے میرے حواس کا احاطہ کرلیا۔ اس کے منہ سے شراب کی ناگوار بو کے بجائے خوشبو پھوٹتی دیکھی تو تعجب ہوا۔

اس نے کانفرنس میں یہی پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ تب فاصلے پر بیٹھی تھی۔ دل قابو میں رہا تھا۔ اَب قریب از جان تھی۔ دل کو مٹھی میں لے چکی تھی۔ میں نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر اندر کہیں مزاحمت جنم لے چکی تھی اس لیے ٹھہرا رہا۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلائیں، مزید قریب نہیں ہوسکتی تھی مگر ہوگئی اور اپنا وزن مجھ پر ڈال کر بولی۔ "عمومی طور پر لڑکیاں قریب آنے کی خواہش دل میں پالتی ہیں اور عین موقع پر ان کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ مرد ہوکر بھی مجھ سے دور بھاگتے ہو۔ مجھ میں کوئی کمی ہے یا......"

اس نے اپنی بانہیں میرے گرد پھیلاتے ہوئے جان بوجھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر میرے ذہن کو چیلنج کے حصار میں دے دیا تھا۔ بعض ادھورے جملے اپنے تئیں پورا متن دیتے ہیں۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے میڈم! میں اپنی اوقات کو دیکھتا ہوں تو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔"

"میری بانہوں میں کھڑے ہو، میری سانسوں سے سانسیں بچا رہے ہو، پھر بھی اوقات کا گلہ کرتے ہو۔" اس کی آنکھوں میں شرارت اور عشق کی بساط پر پیادے بڑھانے کی کھلی دعوت عیاں تھی، بولی۔ "میرے بزنس نیٹ ورک میں سب سے اہم فرد میرو شاہ ہے۔ وہ مجھے انکار کرسکتا ہے، ڈانٹ لیتا ہے اور روٹھنے کی اداکاری بھی کر دکھاتا ہے۔ اس کی اوقات تم نے دیکھ ہی رکھی ہے۔"

اس کی سانسوں کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ اچانک علیحدہ ہوکر بیڈ سے اُتری۔ میرے عقب میں آگئی۔ میں بے اختیار تیزی سے پلٹا۔ دیکھنا چاہا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ تب تک اس نے میری چھاتی پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور کا دھکا دے دیا۔ میں کمر کے بل بیڈ پر گرا۔ جلدی سے اُٹھنا چاہا مگر اس کے کوٹ سے چھلکتے بدن کی لپک میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ وہ مجھ پر لیٹ گئی اور اپنا چہرہ میری چھاتی پر رکھ کر ایک دم ساکت ہوگئی۔ اس کی سانسوں کا گرم لمس میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر سرسرانے لگا۔

میں نے اُٹھنا چاہا۔ نہ اُٹھ سکا۔ مدافعانہ لہجے میں بولا۔ "میڈم!"

اس نے میرے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے خاموش ہونے پر کھیلنے لگی۔ قدرے بھاری آواز میں ہولے سے بولی۔ "میرا جوڑا کھول دو۔"

میں نے اپنی زندگی میں کسی کو جوڑا باندھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نہ کبھی کھولا ہی تھا۔ کیسے کھلتا تھا؟...... پتا چلا مگر اس کی ریشمی زلفوں نے تب تک مجھ سے تمام منظر چھین لیے کیونکہ اس کے بال کھل کر میرے چہرے پر پھیل گئے تھے۔ بالوں سے پھوٹنے والی بھینی بھینی خوشبو نے میرے ذہن کو اپنی مسحور کن گرفت میں لے لیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی تاب نہ رہی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

اس کے مضطرب ہاتھ نے میرے لبوں کو آزاد کردیا۔ گریبان کے بٹن کھول دیے۔ جونہی اپنے سینے پر اُس کے ہاتھ کا گداز اور پُرحدت لمس جاگا، میری سانسیں تھمنے لگیں۔ میں نے مزاحمت کی مگر اس میں جان نہیں تھی۔ میں نے بدقت تمام کہا۔ "میں زرخرید کھلونا ہوں مگر آپ یہ خیال کیوں نہیں رکھتیں کہ اس کھلونے میں ایک دل بھی موجود ہے۔"

چونکی، سر اُٹھایا اور میرے چہرے پر اپنی زلفوں کی آبشار کو سرسراتے ہوئے مخمور لہجے میں بولی۔ "تم کھلونے نہیں، میرے دوست ہو۔ دوست کا دل ڈھونڈ رہی ہوں۔"

"میں دوست نہیں؛ ملازم ہوں۔ آپ مجھے اپنے کمرے میں لاکر کچھ دیر کھیلتی ہیں۔ پھر دور جانے کا حکم دیتی ہیں۔ میں آتا ہوں، چلا جاتا ہوں، بے جان انداز میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہوں مگر اپنی مرضی سے آپ کو چھو نہیں سکتا۔ آپ کو دیکھ نہیں سکتا...... کیا میں دوست ہوں؟" میرے لہجے کی بے بسی نے موہوم طنز کی صورت اختیار کرلی۔

"تم غلط کہتے ہو۔ ٹھیک کہا ہے؟"

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ کچھ فاصلے پر بوتل پڑی تھی۔ بوتل کے ساتھ اس کا موبائل فون پڑا تھا۔ اس نے فون تھاما، میرے سینے پر رکھ کر سر ڈال دیا۔ زلفوں نے پھر میرا احاطہ کرلیا۔ وہ مجھ پر لیٹے لیٹے فون سے کھیلتی رہی، پھر فون میرے سینے پر رکھتے ہوئے مترنم آواز میں گنگنائی۔ "تجھ میں رب دکھتا ہے، یارا میں کیا کروں......"

وہ خاموش ہوئی تو فون بول پڑا۔ مدھم موسیقی کی لے کے ساتھ کمرے میں مردانہ آواز گونج گئی۔ "تو ہی تو جنت میری، تو ہی میرا جنوں...... تو ہی تو منت میری، تو ہی روح کا سکوں...... اور کچھ نہ جانوں، میں بس اتنا ہی جانوں؛ تجھ میں رب دکھتا ہے، یارا میں کیا کروں......"

گیت چل رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے سن رہے تھے۔ گیت تھم گیا۔ یوں لگا جیسے دنیا تھم گئی ہو۔ کار جنوں میں مبتلا، اپنے ہاتھ کی پیدا کردہ سرسراہٹوں سے بے خبر، جذبات سے مغلوب لہجے میں بولنے لگی۔ "شہر یار! میں امیر ہوں۔ پڑھی لکھی ہوں۔ جو چاہتی ہوں، خرید لیتی ہوں۔ انسان بھی...... مگر میرا دل بھی چاہتا ہے کہ کوئی ایسا شخص ہو جو میری ان خوبیوں سے ماورا ہوکر مجھ سے پیار کرے۔ تم تازہ دل شخص ہو۔ دیہات کی تازہ فضا سے نکل کر سیدھے یہاں آئے ہو۔ تبھی ڈرتے ہو۔ دل کی بات کرنے سے بھی گھبرا جاتے ہو۔ میں جس دم چاہوں کہ تم ہاتھ بڑھا کر مجھے توڑنے کی کوشش کرو، تم اپنے ہاتھوں کی رگوں سے خون کھینچ لیتے ہو کہ کہیں وہ اپنی گرمی سے مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچادیں۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

"کیا عزت کرنے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے؟" وہ سر اُٹھا کر تھوڑا اوپر کھسکی، جان لبوں تک آگئی تو وہ تھم گئی، بولی۔ "شہر یار! میرو شاہ نے دھن کی دنیا میرے لیے پلیٹ میں سجا کر رکھ دی۔ میری دولت اور طاقت نے تن کی دھونکنیاں میرے سامنے پیش کردیں۔ جیسے تم! نہ چاہتے ہوئے بھی میرے نیچے پڑے رہنے پر مجبور ہو۔ دل غزالہ، غزالہ کرتا ہے۔ زبان میرے احترام کا کلمہ پڑھتی ہے۔ مگر مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔"

"تو کیا چاہیے آپ کو؟" بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔

"مجھے شیلف میں جھاڑ پونچھ کر رکھی گئی وہ کتاب نہیں بننا جس کو پڑھنے کے بجائے شوق بھری نظروں سے دیکھ کر شیشے میں قید کردیا جاتا ہے۔ مجھے کھولو، پڑھو...... کیا لکھا ہوا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ تحریر مجھ سے زیادہ خوبصورت ہو۔

ہوسکتا ہے کہ اس تحریر میں بلاخیزی ہو، جنوں ہو یا ورق ورق خالی ہو اور کسی حقیقی شبد کار کا منتظر ہو......“

میں نے سوچا، وہ تشنہ تھی۔ اپنے پڑھے جانے کی آرزو میں گھل رہی تھی۔ تبھی میں نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ شادی کیوں نہیں کرلیتی ہیں؟“

اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ فون میرے سینے سے پھسل کر پہلو کی طرف گر گیا۔ اس نے چہرہ میری آنکھوں کے مقابل لاکر گہری اور مستفسر آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں اور ایک ذرا توقف کے بعد پوچھا۔ ”کس سے؟“

میں اس کی نظروں کی تاب نہ لاکر گڑبڑا گیا۔ اس نے سر جھٹکا۔ اپنی زلفوں کے احاطے میں رکھتے ہوئے مجھ پر جھک گئی۔ دونوں آنکھوں کو چومنے کے بعد ہونٹوں کو آگ لگانے لگی۔ پھر چابی والے کھلونے کی طرح رُک گئی، بولی۔ ”تمہاری آنکھیں سچ بولتی ہیں۔ زبان جھوٹ کا سہارا لیتی ہے۔ آنکھوں سے بتاؤ کہ مجھے کس سے شادی کرنی چاہیے؟“

میری آنکھوں میں سوائے اس کے حسن بلائے جاں کی توصیف کے کچھ نہیں تھا۔ مگر وہ اپنے مطلب کی ہی کوئی تحریر کھوج رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے چھوڑ دیں ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔“

وقت جانتا تھا کہ ایسے موقع پر دم نہیں گھٹتا، سانسیں گھٹنے لگتی ہیں، تبھی میرا جھوٹ سن کر روٹھ گیا اور میڈم کی انگلی تھام کر چلنے لگا۔ وہ مسکرائی، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی، بولی۔ ”میں جس سے چاہوں، شادی کرسکتی ہوں۔ کس سے شادی کرنی ہے؟ یہ فیصلہ بھی وقت آنے پر کرلوں گی۔ ابھی تم خاموش ہوجاؤ۔ میرے دل کو چند نئی دھڑکنیں لینے دو۔“

ناگن کی طرح بل کھا کر سیدھی ہوئی، پھر نیچے کھسک گئی اور میرے وجود پر رہتے ہوئے کروٹ بدل کر سینے پر سر رکھ کر خاموش ہوگئی۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ جسم ہلکی آنچ پر دہک کر الاؤ گیر ہوگیا۔ سانسیں غیر معتدل ہوگئیں۔ جی چاہا کہ اُسے پرے پھینک کر اس دشتِ جنوں سے نکل جاؤں۔ شاہد سلیم نے کہا تھا کہ یہ دنیا ٹارچر سیل ہے۔ مصیبت گاہ ہے۔ ایک زندہ، گرم اور تڑپتی ہوئی مصیبت میرے سینے پر چڑھی میری جوانی کی سردسِل پر مونگ دل رہی تھی اور پُر حدت سانسوں کی ضربوں سے میرے وجود کو چکنا چور کرنے پر کمربستہ تھی۔

میں نے زِچ ہوکر کہا۔ ”مجھے جانے دیں۔“

اس نے سر دائیں بائیں ہلایا۔ بولی۔ ”نہیں...... خاموشی سے لیٹے رہو اور میرے بال سمیٹ دو۔“

میرا ایک بازو آزاد تھا جس سے آدھے بال سمیٹ دیے۔ آدھے بکھرے رہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے نرم اور سرکتے ہوئے بالوں سے کھیلتا رہوں۔ بس اتنی ہی دیر...... جتنی دیر تک میرا دل دھڑک رہا تھا...... وہ سرتاپا حسن کا مکمل شاہکار تھی اور شاہکار کبھی کبھار تخلیق پاتے ہیں۔

اس نے پھر کروٹ بدلی، گردن تلے دونوں ہاتھ ڈالے اور بالوں کو جھٹک کر مجھ پر پھیلا دیا۔ میری بے بسی سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسی اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر اس نے اپنے سینے پر اوپر تلے رکھ کر اپنے ہاتھوں تلے بھینچ لیے۔ میرے تنے ہوئے اعصاب بے جان ہوگئے۔

کافی دیر گزر گئی۔ اس کی سانسوں کے مخصوص تسلسل نے مجھ پر باور کرایا کہ وہ سوچکی تھی۔ عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ بھرپور جوان لڑکی تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں تنہائی میں بے فکری کی نیند نہیں لے پاتیں۔ خوابوں کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں آدھی سوتی، آدھی جاگتی ہیں۔ مستزاد یہ کہ وہ جس دنیا میں سانسیں لیتی تھی، اس دنیا میں اپنے سائے پر بھی شک کرنے کا رواج تھا۔ بظاہر یہ اُس کا بیڈروم تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ یہاں سویا نہیں کرتی تھی۔ سونے کے لیے وہ اس کمرے سے گزر کر کسی اور جہان میں جایا کرتی تھی جہاں اس نے اپنی حفاظت کے لیے بہت سے انتظامات کر رکھے تھے۔ آج بھی احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر میرے سینے پر لیٹی سوگئی تھی۔ یوں کہ اُسے مجھ سمیت کسی سے بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

اس کا وجود بھلے موٹے کوٹ اور پینٹ میں چھپا ہوا تھا مگر میرا احساس برہنہ پا تھا۔ میری عمر بھی آتش گیر تھی۔ ایسے میں اس کا شعلے کی نوک پر گہری نیند سوجانا حقیقت کا پرتو نہیں تھا۔ وہ یقیناً بن رہی تھی۔ مجھے بنا رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی، بدن ڈھیلا چھوڑا اور اپنا دھیان بدلنے کے لیے کمرے کے دکھائی دینے والے گوشے پر نظریں جمادیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا میں نے اس سے پیشتر ملاقاتوں میں دیکھا تھا۔ اگر کچھ بدلا تھا تو وہ میرا مقام تھا، میری حیثیت تھی جو اس وقت شدید ہیجان اور جذباتی بھونچال کا شکار تھی۔

ہاتھ حرکت کے قابل نہیں رہے تھے اور نہ ہی میں انہیں ہلا کر نئے فتنے کو جگا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے ہونٹوں سے اُس کے بالوں کو چھیڑا، کوٹ کے کالر کو دانتوں میں لے کر ننھے ننھے جھٹکے دیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کافی دیر گزر گئی۔ اس کے استغراق اور سکوت میں کوئی تغیر

رونما نہ ہوا تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں کب تک اپنا دامن بچائے یوں بے جان انداز میں اس کے خوب صورت بدن تلے دبا رہ سکتا تھا؟...... مجھے شبہ تھا کہ وہ جاگتے ہوئے سونے کی اداکاری کررہی تھی مگر پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کوئی شخص اتنی دیر تک ڈھیٹ بن کر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ سوگئی تھی۔

ہم ابتدائے شب میں کمپیوٹر کالج کے کانفرنس روم سے نکلے تھے۔ بیڈ کے عین اوپر آویزاں دیوار گیر گھڑی پر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات کے دس بجنے لگے تھے۔ اُس کی خوابیدگی کا دورانیہ ایک گھنٹے سے متجاوز ہوگیا تھا۔ اتنی دیر سے میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا، کبھی ہار کی طرف مائل، کبھی جیت پر استوار...... لڑکھڑاتے ہوئے ذہن کو قابو میں رکھنا مشکل تھا مگر اس کی شخصیت کی ٹرانس، حاکمانہ مزاج اور اپنی حیثیت کا حقیقت پسندانہ احساس میری فتح میں بنیادی کردار ادا کرتا رہا اور میں کوئی حرکت کیے بغیر پڑا رہا۔

پھر ساڑھے دس بج گئے۔ دل میں خوف جاگا کہ کہیں اس دار پر لٹکتے ہوئے پوری رات آنکھوں میں نہ کاٹنی پڑ جائے۔ ایسے ہی وقت میں اس کے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ میں نے چہرے پر پھیلے بالوں کو سر ہلا کر ایک طرف ڈھلکایا، دیکھنے کی جگہ بنائی اور موبائل فون کی روشن اسکرین پر جلتے بجھتے ہندسوں کو دیکھنے لگا۔ میڈم کے بدن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تو میں نے کہا۔ ”میڈم! آپ کا فون بج رہا ہے۔“

میں نے اپنے ہاتھوں کو ہلایا۔ میرے یرغمال من میں نیا فتنہ جاگ پڑا۔ لحظہ بھر میں پورے بدن میں بجلی کی رو دوڑی۔ بہ وقت تمام، ہونٹ بھینچ کر، آنکھیں سختی سے میچ کر، میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ کسمسا کر بیدار ہوگئی تو میں نے اپنی بات دہرائی۔

وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔ ”بجنے دو!“

”کوئی ضروری کال ہوسکتی ہے۔“

”نمبر دیکھ رہے ہو تو بتاؤ...... صرف آخری تین ہندسے۔“ اس کی آواز مرتعش تھی۔

میں نے اسکرین پر دیکھا، پھر کہا۔ ”زیرو ڈبل نائن......“

وہ بیزاری سے بولی۔ ”اَن نون نمبر ہے۔ کسی کے ہاتھوں میں کھجلی ہورہی ہے۔“

بزر ایک مرتبہ بج کر خاموش ہوگیا۔ پھر بجنے لگا۔ وہی نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”وہی ہے ناں؟“

”جی!“ میں نے کہا۔ مجھے اپنی آواز کی شکستگی کا از خود احساس ہوا۔ کمزور سی صدائے احتجاج بلند کی۔ ”میڈم! خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔“

اس نے رحم کرنا نہیں سیکھا تھا، نہیں کیا تو میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے ہاتھ کھینچنے چاہے۔ وہ بظاہر بے جان، درحقیقت چوکس تھی۔ میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے ہنسی، بولی۔ ”اوں ہوں...... کچھ دیر ایسے ہی پڑا رہنے دو۔“

”مجھے خود پر ترس آنے لگا ہے۔“

”مجھے بھی...... تبھی کہہ رہی ہوں کہ مجھے کچھ دیر تک زندگی کا احساس حاصل کرنے دو۔ پھر تمہیں گھر جانے کی اجازت دے دوں گی۔“

موبائل فون کا بزر تیسری مرتبہ بجنے لگا۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ چھوڑ دیا، بولی۔ ”کال ریسیو کرو اور وائنڈ اسپیکر آن کردو۔“

میں نے بتایا کہ مجھے اس کے موبائل سیٹ کے آپریٹنگ پینل کا علم نہیں تھا۔ اس نے میرا دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا اور ناگن کی طرح تڑپ کر اوندھی ہوگئی۔ ہاتھ بڑھا کر فون قریب کیا مگر بیڈ پر پڑا رہنے دیا۔ کال ریسیو کرتے ہی کوئی بٹن دبایا۔ وائنڈ اسپیکر سے پھوٹنے والی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ کسی نے ’ہیلو‘ نہیں کہا تھا بلکہ چند لمحوں تک سائیں سائیں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر ایک چیختی ہوئی نسوانی آواز گونجی۔ ”تیکوں آدھی ہاں پئی جو میکوں اوندھا کئی پتا کائنی...... خدا کیتے ساڈی جان چھوڑ ڈیوو......“

(تجھے کہہ رہی ہوں کہ مجھے اُس کا علم نہیں ہے۔ خدا کے لیے ہماری جان چھوڑ دو۔)

نسوانی لہجے سے عیاں تھا کہ وہ کوئی بوڑھی اور ان پڑھ خاتون تھی جو بڑے درد میں ڈوب کر چیختی تھی۔ وہ آواز اپنی تمام تر ناتوانی کے باوجود کسی شعلے کی طرح بھڑکی تھی۔ کسی کوندے کی طرح لپکی تھی۔ کیونکہ مجھ پر ڈھیر ہوئے پڑے میڈم شکیلہ کے ست وجود کو اچانک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔ اس کے ہٹتے ہی میں بھی اُٹھ گیا۔ اس نے فون اُٹھایا، زور سے ’ہیلو‘ کہا مگر اسے جواب نہ ملا۔ ایسی آواز سنائی دی جس سے صاف پتا چلا تھا کہ بولنے والی بوڑھی خاتون کو کسی نے زوردار تھپڑ دے مارا تھا۔ اس کی چیخ بڑی دردناک تھی۔

”اللہ داناں ہووے...... میکوں ناں مارو...... نا نہہ جو ڈسا سکدی جو اُہ موئی کتھ ودی ہے تاں کیوں نوے منیندے...... ہائے وے میڈے ربا!“

(اللہ کا نام مانو، مجھے نہ مارو، میں نہیں بتا سکتی کہ وہ کہاں ہے تو تم لوگ کیوں نہیں مانتے۔ ہائے میرے ربا!)

وہ میری طرف پشت کیے گھٹنوں کے بل بیٹھی فون کو گھور رہی تھی۔ میں جلدی سے بیڈ کی پائنتی کی جانب آیا۔ اسے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کا چہرہ بے حد سرخ، آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیلی ہوئیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ فون کے وائڈ اسپیکر میں سے اُسی خاتون کی منت سماجت کی نقاہت سے معمور آواز برآمد ہو رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آواز ایک کم سن بچے کے رونے کی آواز میں دب گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میڈم کوما میں چلی گئی تھی کیونکہ اس کا زندگی سے بھرپور چہرہ موت کی طرح سنگین ہو گیا تھا۔ چہرے کی سرخی پیلی چادر اوڑھنے لگی تھی۔

کوئی تیسری آواز سنائے بغیر کال منقطع کر دی گئی۔

کمرے میں روتے ہوئے بچے اور بوڑھی خاتون کی آوازیں چکرانے لگیں۔ میڈم پہلو کے بل کھلی ہتھیلی پر گر گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ”میڈم! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟“

اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فون سے پھوٹنے والی دل شگاف آوازیں سن کر مجھ سے بے خبر ہو گئی تھی۔ میں نے ہمت کی اور اس کے مقابل بیڈ پر ٹک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا پھر فون اُٹھا لیا۔ جس نمبر سے کال آئی تھی، اُس نمبر پر کال 'او کے' کی۔ دوسری طرف گھنٹی بجی پھر کسی نے کال منقطع کرتے ہوئے سمجھا دیا کہ اسے جتنا سنانا ضروری تھا، سنا دیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اُسے کچھ نہیں دیا جائے گا۔

اس نے جھنجلا کر نمبر ری ڈائل کیا۔ اس مرتبہ فون کے اسپیکر میں 'آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے......' کا ریکارڈ شدہ وائس کلپ چلنے لگا۔ میڈم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے فون بیڈ پر ڈال دیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کے چہرے پر ایسی مردنی چھائی ہوئی دیکھی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے کانوں میں پڑنے والی دونوں آوازوں کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے تھا۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! آپ کی حالت درست نہیں ہے۔“

میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود پر طاری ہونے والی اس جانکاہ کیفیت سے نکل آئے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بدستور پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھے گئی۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ”بتائیں ناں، کیا ہوا ہے؟“

میرے جھنجوڑنے کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی لہر دوڑی۔ اس نے طویل سانس لے کر، مجھے ایک شناسائی بھری نظر دیکھ کر اپنا موبائل فون اُٹھایا۔ ایک مرتبہ پھر کال ملانے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر کوئی اور نمبر ملانے کے لیے بٹن پش کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ”ہیلو...... پیا! تم اس وقت کہاں ہو؟“

کمرے میں غیر معمولی سکوت تھا۔ تبھی پیا کی آواز بذریعہ وائڈ اسپیکر کے میرے کانوں میں پہنچی۔ وہ مؤدبانہ انداز میں بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کسی ہوٹل میں بیٹھا کھانا سرو کیے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

میڈم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”کھانا چھوڑ دو۔ میں ایک نمبر تمہیں ایس ایم ایس کے ذریعے بھیج رہی ہوں۔ اس کا پتا کرو! کس کا ہے اور کہاں چل رہا ہے۔ او کے؟“

پیا نے جواب دیا۔ ”جی میڈم! آپ کو ایک گھنٹے میں رپورٹ مل جائے گی۔“

میڈم نے سختی سے تاکید کی، ”نہیں...... میرے پاس وقت کم ہے۔ پندرہ بیس منٹوں میں رپورٹ دو۔“

اس نے پیا کی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کیا۔ 'پاور آف' ہونے والے فون کا نمبر پیا کے سیل فون پر 'سینڈ' کیا اور دونوں رانوں پر ہتھیلیاں ٹکا کر بیڈ پر جھکتی چلی گئی۔ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ بے حد مضطرب تھی۔ اسے میرے دلاسے اور تقویت کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی اور سر اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! مجھے پوری طرح تو علم نہیں کہ آپ اس وقت کس الجھن میں گرفتار ہیں مگر یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ شدید تکلیف میں ہیں۔ آپ خود کو سنبھالیے۔ منتشر ذہن انسان کی مدد نہیں کرتا بلکہ رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔“

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی پھر لمبی سانس حلق میں اُتار کر مسکرائی۔ آزردگی میں گندھی ہوئی یہ مسکراہٹ بہت دل فگار تھی۔ ہونٹوں پر عمودی سرخ لائنیں واضح ہو گئیں۔ غور کیا تو اس کی آنکھوں کے گوشے نم دکھائی دیے۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ سارے تکلفات اُس ایک لمحے کی نذر ہو گئے اور میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ تقویت خیز لہجے میں کہا۔ ”میڈم! آپ رو رہی ہیں۔ نہیں...... میڈم! میں بہت چھوٹا ہوں۔ اتنا کہ آپ کے دکھ کو سمجھنے کی قدرت بھی شاید نہیں رکھتا مگر...... مگر میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ انہیں پونچھنے کے

لیے آپ کی اجازت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ میری گستاخی پر درگزر کیجیے گا۔“

اس کا چہرہ بہت گرم تھا۔ آنسو اس سے بھی زیادہ گرم تھے۔ میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے دکھ کے ڈھلتے دریاؤں کو پونچھ لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ مجھے یک ٹک دیکھتی رہی، پھر ڈھلکتے ہوئے میرے زانوؤں پر اوندھے منہ گر گئی۔ میں نے اس کے آبشار بالوں میں اپنی انگلیاں پیوست کر دیں اور کہا۔ ”اگر مناسب سمجھیں تو مجھے حکم دیجیے...... کس نے آپ کا دل دکھایا ہے؟ میں اس پر قہر بن کر ٹوٹ پڑوں گا اور ان دو آنسوؤں کا خراج منوں خون کی صورت میں وصول کر کے پلٹوں گا۔“

وہ چند آنسو رو کر تھم گئی تھی۔ اب رو نہیں رہی تھی کیونکہ اُس کا بدن ساکت تھا۔ کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات مجھ سے چھپا رہی تھی، تیزی سے کچھ سوچ رہی تھی اور فیصلہ کرنے کی مہلت لے رہی تھی۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ دو چار منٹ...... یا...... کچھ زیادہ وقت لینے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی، اچھل کر بیڈ پر کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”شہر یار! تیاری کرو! تمہیں اپنے گھر اور مجھے کہیں دور جانا ہے۔“

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”کہاں؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ فون اُٹھا کر بیڈ سے اُتری اور جلدی جلدی شوز پہننے لگی۔ اس کے اعصاب میں یک لخت بجلی سی بھر گئی تھی۔ بیڈ کے دراز میں سے ایک سلور کلر کا اسمارٹ سا پسٹل نکالا۔ میگزین نکال کر چیک کیا۔ مٹھی بھر فالتو گولیاں نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیں۔ ایک اڑھائی تین انچ چوڑا سنہرے رنگ کا ہیئر بینڈ نکال کر اُس نے اپنے بالوں پر چڑھا دیا۔ اگر جوڑا کھل بھی جاتا تو اس کے لمبے بال اُس کے لیے کوئی فوری پریشانی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ صوفے اور بیڈ کے عین بیچ میں ترچھے پڑے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رُکی، بالوں کو ہاتھوں میں بھر کر جوڑے کی شکل میں سمیٹا اور تیزی سے بولی۔ ”چلیں...... میں تمہیں شہر میں کہیں اُتار دوں گی۔ رکشا پکڑ کر گھر چلے جانا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچانک خیال آیا کہ وہ بہت زیادہ پریشان تھی۔ اس کا کہیں اکیلے جانا اس وقت کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھا۔ کچھ غلط ہو جاتا تو میرو شاہ میرا جینا دوبھر کر دیتا۔ میں نے کہا۔ ”میڈم! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

”کہاں؟“ وہ بے رُخی سے بولی۔

”جہاں آپ جا رہی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مگر...... نہیں...... میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں جا رہی۔ میرا وقت نہ ضائع کرو اور چلو......“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور سخت لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو اس حالت میں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ ساتھ جاؤں گا۔“

وہ ٹھٹکی اور مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگی، بولی۔ ”مگر کیوں؟“

”بھلے ناراض ہوں مگر میں نے آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میرے انداز سے میرا تیقن اور اس کی ذات سے خلوص ہویدا تھا۔ ”میڈم! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت طاقتور ہیں، کسی بھی صورتِ حال سے بہ آسانی نمٹ سکتی ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا؛ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

اس نے کچھ دیر سوچا پھر میرے اصرار کے آگے ہار مان لی، بولی۔ ”او کے! آر یو فٹ فار دی رشنگ ایکشن؟“

میں نے خلوص دل سے کہا۔ ”یس، آئی ایم فٹ میڈم!“

”ایک اور بات......“ اس نے بے حد درشتی سے کہا۔ ”تم کچھ پوچھو گے نہیں۔ بس دیکھنے پر اکتفا کرو گے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے قبول ہے میڈم!“

اس نے مجھ پر ایک نگاہ عجب ڈالی، انٹرکام پر سونیا کو اپنی روانگی سے مطلع کرتے ہوئے کنٹرول پینل پر بیٹھنے کا حکم دیا اور ریسیور کو بے دردی سے کریڈل پر پٹخ کر میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”کم آن! ہری اَپ!“

چند منٹ قبل دکھائی دینے والی ملول لڑکی چاق چوبند، زیرک اور سفاک آنکھوں والی میڈم شکیلہ کا روپ دھار کر میری نظروں کے سامنے سج گئی۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پارکنگ میں آئے۔ اس نے بلند آواز میں ظاہر خان کو گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔ جلدی میں گاڑی کی چابی اُٹھانا بھول گئی تھی۔ احساس ہونے پر، تیز تیز قدموں سے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ”شہر یار! ٹیبل پر گاڑی کی چابی پڑی ہے۔ اُٹھا لاؤ۔“

میں دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں گیا۔ چابی اُٹھائی اور پارکنگ میں آیا۔ اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں چابی پکڑی، گیٹ کھولا اور اچھل کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بٹن دبا کر برابر والا گیٹ بھی کھول دیا۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے تک میں اگلی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

اس نے کھلے ہوئے گیٹ میں گاڑی روکی، ہاتھ کے

اشارے سے ظاہر خان کو بلایا اور کہا۔ ''اپنی گن اور فالتو راؤنڈز شہریار کو دے دو۔ اپنے لیے اندر سے گن نکال لاؤ۔''

ظاہر خان نے گن اور فالتو میگزین میرے حوالے کر دی۔ وہ شاید کوٹ کی بڑی جیب سے اور گولیاں نکال کر مجھے دینے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر میڈم نے ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا دی۔

میں نے گن اپنی ٹانگوں کے بیچ کھڑی کی، میگزین سائڈ پاکٹ میں ڈالی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہونٹ بھینچے ہوئے، آنکھیں سلگتی ہوئیں اور پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تنا ہوا...... وہ سخت برہم، افسردہ بھی۔ میں نے دل ہی دل میں 'یا اللہ خیر!' کہا اور ڈیش بورڈ میں نصب ڈیجیٹل کلاک پر وقت دیکھا۔ پونے گیارہ کا عمل تھا۔ شہر جاگ رہا تھا۔ اس وقت تک دیہاتوں میں رہنے والے اپنی آدھی نیند پوری کر چکے ہوتے ہیں۔

وہ خطرناک ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی کو بچا نہیں رہی تھی، لوگ اپنا بچاؤ خود کر رہے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ٹوکا۔ اس پر اثر نہ ہوا۔ دوسری مرتبہ اسے احتیاط سے چلانے کا مشورہ دینے کی جرأت مجھ میں پیدا نہ ہوئی۔ ہم عزیز ہوٹل کی طرف گئے، پھر اوور ہیڈ برج عبور کر کے شجاع آباد روڈ پر چڑھ گئے۔ یہاں دن میں تنگ سڑک پر انسانوں کا کھوئے سے کھوا چھلتا ہے۔ رات کو بھی سڑک ویران نہیں ہوتی۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کی بانہیں بڑی تیزی سے اوپر نیچے ہو رہی تھیں اور بڑی جسامت والی نئے ماڈل کی گاڑی شارک مچھلی کی طرح بل کھاتی لہراتی سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ میں نے پیا جی اور سخی محمد کی ڈرائیونگ کو باکمال ڈرائیونگ کا درجہ دیا تھا۔ اس کی ڈرائیونگ کو دیکھا تو جو کلمے پڑھ رکھے تھے، سبھی دل ہی دل میں ان گنت مرتبہ دہرا لیے۔ اسے بارہا شاباش بھی دی کیونکہ میرے اندازے کے مطابق جہاں سے گاڑی گزر نہیں سکتی تھی، اُس نے رفتار کم کیے بغیر گزار دکھائی تھی۔ اس کی ٹھہری ہوئی آنکھیں اور سپاٹ چہرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے حواس میں نہیں تھی اور اس کا یہ جذباتی روپ پہلی مرتبہ مجھ پر آشکار ہوا تھا۔

بیس منٹ بعد ہم ناگ شاہ چوک پر پہنچ کر شاہراہ عبور کر رہے تھے۔ میں اس طرف پہلی مرتبہ آیا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ علاقہ زرخیزی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا جبکہ آنکھوں کو بے آباد اور قدرے ویران علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ شاید سڑک کے قرب و جوار میں فصلیں نہیں تھیں۔

سڑک کے کنارے پر ایستادہ سفید رنگ کے سنگِ میل دیکھ کر اندازہ کر چکا تھا کہ ہم شجاع آباد کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ دور تک باغات کا سلسلہ ہمارے دائیں بائیں چلتا رہا، پھر ختم ہو گیا۔ میڈم کے فون کا بزر بجا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ کال اٹینڈ کی، بولی۔ ''ہاں پیا! جلدی بولو؛ کچھ پتا چلا؟''

اسپیڈو میٹر کی سوئی ایک سو بیس پر تھرک رہی تھی۔ رات کو کراسنگ کا مرحلہ مشکل ہوتا ہے۔ مگر میڈم نے اسپیڈ کم نہیں کی تھی۔ میں نے میڈم کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا کہ پیا کی رپورٹ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ وہ بولی۔ ''نہیں...... تم فکر نہ کرو۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ موبائل جیب میں ڈالنے کے بجائے ہاتھ میں پکڑ کر اسٹیئرنگ تھام لیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کچھ پتا چلا؟''

اس نے اوپر والے ہونٹ پر نچلا ہونٹ چڑھایا، سر کو نفی کے انداز میں دائیں بائیں جھٹکا اور بولی۔ ''کم بخت فون کمپنیوں نے بوگس ماڈیولز جاری کر رکھے ہیں۔ پیا نے کمپنی کے فرنچائز آفس کے کلرک کے ذریعے کسٹمر سینٹر سے معلومات حاصل کی ہیں۔ سیریل نمبر ضلع فیصل آباد کا تھا اور کسی اکبر علی کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔''

بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار کم کی۔ سامنے نہر کا پل دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دائیں طرف گاڑی موڑ لی۔ نہر کی پٹڑی پر بنی ہوئی سڑک پر گاڑی مچھلی کی طرح پھسل رہی تھی۔ میں نے ازحد احتیاط سے کہا، ''میڈم! آپ اپنے غصے پر قابو پائیں ورنہ آپ وہ کچھ نہیں کر پائیں گی جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔''

اس نے ہنکارا بھرا۔ بولی، ''ہم تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد اس نے نہر کی پختہ پٹڑی چھوڑ دی۔ کوئی فرلانگ بھر کا کچا اور ناہموار راستہ حائل ہوا پھر ہم دریا کے سپر بند پر تعمیر کی گئی پختہ سڑک پر چڑھ گئے۔ بائیں ہاتھ سپر کے ساتھ ساتھ نہر بہہ رہی تھی۔ ڈرائیونگ کی تھوڑی سی غلطی ہمیں گاڑی سمیت نہر میں غوطہ زن کر سکتی تھی۔ سپر بند کے اوپر سنگل سڑک موجود تھی جس نے نہر کے ایک پل پر دوسری سڑک کو کراس کیا۔ سڑک کے کنارے پر دو آدمی آگ جلا کر بیٹھے ہاتھ سینک رہے تھے۔ انہوں نے اپنے

بدنوں پر چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ یہیں سے میڈم نے دائیں ہاتھ پر ٹرن لیا۔ اس سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت دکھائی دے رہی تھی اور سڑک کی حالت بھی خراب تھی۔ کوئی دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے پر ایک سرکاری اسکول کی مخصوص وضع کی عمارت دکھائی دی۔ سطحِ زمین سے کم و بیش دس فٹ بلند تھڑے پر گھروں کا ایک جھرمٹ دکھائی دیا۔ سڑک بل کھا کر اُس جھرمٹ میں داخل ہوئی پھر 'ایس' کی شکل میں گھومتی ہوئی اس گاؤں سے باہر نکل گئی۔ سڑک پر جا بجا اسپیڈ بریکر بنے ہوئے تھے جن کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ لبِ سڑک تعمیر شدہ گھروں نے اپنے بچوں کو تیز رفتار ڈرائیوروں سے محفوظ کرنے کے لیے ازخود بنا رکھے تھے۔ میڈم نے کسی بھی بریکر پر اسپیڈ آہستہ کی نہ بریک لگائے۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد، ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر بائیں ہاتھ ایک سرکاری اسپتال دکھائی دیا۔ نیلے رنگ کے بورڈ پر محکمہ صحت کا مونوگرام اور گاؤں کا نام لکھا ہوا تھا۔ پتا چلا کہ ابھی جس گاؤں سے ہم گزرے تھے، اس کا نام بوٹا تھا۔ اسپتال بند تھا۔ سرکاری کالونی میں روشنیاں جل رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ اس علاقے میں بجلی کی سہولت موجود تھی۔

چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میڈم نے دائیں ہاتھ گاڑی موڑ دی۔ پکی سڑک کی جگہ ایک ناہموار اور کیچڑ زدہ راستے نے لے لی۔ یہ تکلیف دہ سفر ایک کچے مکان پر منتج ہوا۔ اس نے گاڑی آم کے پرانے درخت کے نیچے روکی اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے نیچے اُتر گئی۔

میں نے گن سنبھالی، اس کے آپریٹنگ سسٹم کا سرسری جائزہ لیا اور نیچے اُتر آیا۔ گاڑی کے اندر گرمی تھی، باہر سردی...... آدھے چاند کی روشنی نے ماحول کو منور کر رکھا تھا۔ گاڑی کے عین سامنے چند قدموں کے فاصلے پر کچا کھال گزر رہا تھا۔ کھال میں پانی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ میڈم گاڑی کے بونٹ ہڈ کے ساتھ ٹیک لگائے میرے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں قریب پہنچ کر حکم کا منتظر ہوا۔ اس نے پسٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ بولی۔ ''ہم اس گھر میں داخل ہوں گے۔''

میں نے 'یس میڈم' کہا۔ وہ نپے تلے انداز میں کھال پر سے کود گئی۔ اس کے اعضا میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ میرے آگے آگے دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی چھوٹے سے کچے مکان کے پہلو میں پہنچی۔ مکان کی چار دیواری نہیں تھی۔ سامنے کی طرف ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی لکڑیوں کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ لکڑیوں کے ڈھیر اور مکان کے درمیان خلا تھا جس میں سے ہم گزر کر صحن میں پہنچے۔ ایسے ہی وقت میں دو کچے اور خستہ حال کمروں والے گھر کے نسبتاً چھوٹے اور نیچی چھت والے کمرے میں بکریوں کے منمنانے کی آواز گونجی۔ ان کی آواز سن کر سردی میں کانپتے ہوئے دو کتوں کے منہ کھل گئے۔ وہ بھونکتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے علم ہو گیا کہ وہ لڑنے بھڑنے والے کتے نہیں تھے بلکہ عام نسل کے تھے جو محض بھونک کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ میڈم نے بھی کتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وگرنہ میرے دیکھنے میں یہ آیا تھا کہ شہری لوگ کتوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ نہیں ڈری بلکہ صحن اور کمروں کے بیچ میں بنے ہوئے فٹ ڈیڑھ فٹ بلند تھڑے پر کھڑی ہو کر چوکنی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسا کسی عسرت زدہ مزدور یا سیپی کا گھر دکھائی دیتا ہے۔

کتوں کی پُرجوش آوازیں احتجاج میں بدل گئیں پھر ان پر نالہ و فغاں کا احساس ہونے لگا۔ میں نے انہیں دبکا کر بھگا دیا۔ وہ بکریوں والے کمرے میں گھس کر 'کوں کوں' کرنے لگے۔ میڈم بولی۔ ''تم یہیں رکو، میں اندر جاتی ہوں۔''

اس نے دو کواڑوں والا سالخوردہ دروازہ دھکیلا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ ہولے سے بولی۔ ''اماں...... سیمو......''

جواب میں ایک لاغر مردانہ کھانسی کی آواز ابھری۔ وہ بولی۔ ''بابا...... بابا!''

''کیہڑا ایں......؟'' (کون ہو؟) کھانسنے والے نے بیزار لہجے میں استفسار کیا۔

وہ اندھیرے کمرے میں گھس گئی۔ میں دم بخود کھڑا کمرے کے اَدھ کھلے دروازے کو گھورنے لگا۔ یہ ماجرا میری فہم و فراست سے بالاتر تھا۔ تجسس کے مارے میں تھڑے پر چڑھ گیا۔ دروازے کے قریب جا کر صحن کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میرے عقب میں میڈم کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''بابا! تیرے پاس ماچس ہے؟''

میں نے اسے پہلی مرتبہ سرائیکی بولتے سنا تھا ورنہ جب بھی دیکھا، اُسے رواں اُردو بولتے دیکھا تھا۔ اس کے ایک ہی جملے نے مجھ پر آشکار کر دیا کہ اس کی مادری زبان سرائیکی تھی۔

چند لمحوں بعد دیا سلائی جلانے کی آواز سنائی دی پھر

میرے پیروں تلے کی زمین پیلی ہوگئی۔ کمرے میں لالٹین روشن ہوگئی تھی جس کی روشنی کھلے کواڑ سے چھن کر تھڑے پر روشنی کی لکیر کھینچنے لگی تھی۔ بوڑھی کھانسی بدستور سمع خراشی کر رہی تھی۔

میڈم بولی۔ ”بابا! اماں اور سیمو کہاں ہیں؟“

”تو؟“ کھانسی ختم گئی، ”تو چندو ہے ناں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں بابا! میں چندو ہوں۔ یہ بول، وہ دونوں کدھر ہیں؟“

”تو یہاں کیوں آئی ہے؟“ بوڑھی آواز میں بلا کی نفرت گھل گئی، ”وہ مریں یا جئیں، تجھے کیا...... جا...... جیسے آئی ہے، ویسے ہی پلٹ جا۔ یہاں نہ تو کوئی تیری اماں رہتی ہے اور نہ ہی سیمو...... چل! میری نظروں سے دور ہوجا......“

دریا کی خنکی ماحول میں رچی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں شل کرنے والی سردی بوڑھے کے چند بول سن کر ذہن سے محو ہوگئی اور میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میڈم منت سماجت کر رہی تھی۔ اماں اور سیمو کے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر بڈھا اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ پھر میڈم کی جھلائی ہوئی آواز آئی۔ ”بابا! مجھے سیدھی طرح بتا کہ وہ کہاں ہیں، اچھا...... یہی بتا دے کہ تجھے کون باندھ گیا ہے؟“

”پرے دفع ہوجا کلموہی...... مجھے ہاتھ نہ لگا۔“

میڈم کی بھرائی ہوئی شکست خوردہ آواز ابھری۔ ”خدا کے لیے بابا! ان کی جان پر بنی ہے۔ اگر تو نے مجھے کچھ نہ بتایا تو وہ مرجائیں گے۔“

”اگر ان کے دن پورے ہوگئے ہیں تو کون مائی کا لعل انہیں بچا سکتا ہے؟...... کھوں، کھوں...... نہ ہاتھ لگا، نہ کھول مجھے...... بندھا رہنے دے...... نی پراں دفع تھی ونج......!“

(اے! پرے دفع ہوجا!)

میں دروازے کے مزید قریب ہوگیا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم نے مجھے بلایا۔ میں جھٹ سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر کا منظر میرے لیے بڑا حیرت ناک تھا۔ تین چارپائیوں میں سے دو خالی تھیں۔ ان پر بستر کھلے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان پر سونے والوں کو بستر سمیٹنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ تیسری چارپائی پر ایک بوڑھا رضائی میں لپٹا پڑا تھا۔ اس کے سر پر میڈم کھڑی تھی۔ سرہانے دیوار کے ساتھ ایک پرانی، چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی بیساکھی نظر آ رہی تھی۔

میں قریب ہوا تو میڈم بولی۔ ”اس کے ہاتھ کھولو۔ مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔“

میں نے رضائی کھینچ کر ایک طرف کی۔ بڈھا ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ جونہی میری نظر اُس کے نچلے دھڑ پر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی بالشت بھر لمبی داہنی ران کے نیچے بستر خالی تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ میڈم کو غلیظ گالیاں دے رہا تھا اور مجھے بھی بار بار ’پراں دفع تھی ونج‘ کہہ کر جھٹک رہا تھا۔ میں نے اس کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے الٹا دیا۔ وہ تڑپا، میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ میں نے اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولے اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”بتاؤ! تمہیں کس نے باندھا ہے اور کیوں؟“

وہ سیدھا ہوا۔ لالٹین کی پیلی روشنی میں اس کے چہرے پر نظر پڑی تو دل عجیب سے تاسف اور دکھ سے معمور ہوگیا۔ وہ بہت نحیف اور معمر تھا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر بے حد درشتی کے آثار مترشح تھے۔ غصے کی شدت سے سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور رہ رہ کر کھانسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ ٹھیٹھ سرائیکی میں بولا۔ ”بدمعاشی نہ دکھا اور مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلا جا۔ اس بے حیا کو بھی لے جا۔ اسے سمجھا دے کہ اس کا یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ہم سب مر بھی جائیں، تب بھی اس کی یہاں کوئی جگہ نہیں ہے...... سمجھاتا کیوں نہیں ہے تو اِسے...... لے جاناں......“

میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور بڑی نرمی سے کہا۔ ”بابا! ہم ابھی چلے جائیں گے۔ بس اتنا بتا دو کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”مم...... میں......“ اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ چند لمحوں میں بدحال ہو کر ایک طرف گر گیا، بولا۔ ”ہائے! میری بکریاں بھوکی پیاسی ہیں...... ہائے! اس کلموہی کو باہر بھیج دے...... میں بتاتا ہوں......“

میں نے پلٹ کر میڈم کو دیکھا جس کا چہرہ اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ طویل سانس حلق میں اُتار کر بولی۔ ”ٹھیک ہے بابا! میں باہر جا رہی ہوں۔ اسے ساری بات بتا دے ورنہ بڑا نقصان ہوجائے گا۔“

”نی ونج پراں کالے موتھ آلی...... جیہڑا زان تھیونا ہائی، ہیڈے ہتھوں تھی گیا ہا...... بس توں پچھے تھی ونج...... مکروں لہہ ونج!“

(اے جا پرے کالے منہ والی...... جو نقصان ہونا تھا، وہ تیرے ہاتھوں سے ہوگیا تھا۔ بس تو دفعان ہوجا۔ پیچھا چھوڑ دے۔)

بابا بپھر گیا۔ اس کے منہ سے بلغم آمیز رال نکل کر ڈاڑھی کو بھگونے لگی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی بالشت بھر کی رانیں پیٹنے لگا۔

میرے اشارے پر میڈم میرے عقب سے گزر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے بڈھے کی کمر تھپتھپائی، ادگرد دیکھا، پانی دکھائی نہیں دیا۔ پوچھا۔ ”بابا! پانی کہاں رکھا ہے؟“

”ہا...... مجھے پپ...... پانی...... ادھر گھڑا پڑا ہوگا۔ ادھر دیکھ......“ اس نے اپنے سرہانے دیوار کی جڑ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے گھڑا جھکایا اور مٹی کا پیالہ جسے مقامی زبان میں ’ٹھوٹھا‘ کہا جاتا ہے، بھرا اور اس کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے بندھا پڑا تھا۔ پیاسا تھا۔ پورا ٹھوٹھا خالی کر گیا۔ یخ بستہ پانی رگوں میں سردی اتار گیا۔ وہ چھاتی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگا۔ کچھ افاقہ ہوا تو میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ تھک گیا تھا۔ شکست خوردہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”تو کون ہے؟ پر جو کوئی بھی ہے، مجھے کیا۔ وہ ظالم مجھے باندھ کر میری ذال (بیوی) اور میرے سیمو کو اُٹھا کر لے گئے۔“

اس نے اٹک اٹک کر کہا تھا۔ اس کی بات مان لی گئی تھی اور میڈم بادل ناخواستہ کمرے سے چلی گئی تھی مگر اس کے باوجود اس کی عسرت و افلاس میں بجھنے والی آنکھیں ابھی تک شعلہ بار تھیں۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”یہ کب کا واقعہ ہے؟“

”وتھی ویلا ہا! ہائے...... بھک توں آندراں ترٹدیاں کھڑیاں ہِن...... کجھ کھاون کیتے چاتی ودا ہیں؟“

(صبح کا وقت تھا۔ ہائے! بھوک سے آنتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ کچھ کھانے کو لیے پھرتے ہو؟)

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کون لوگ تھے وہ؟“

”بیٹ سے آئے تھے۔ بیٹ خیر پور سے۔ ایک کو دیکھا تھا۔ ہائے! ہائے! وہ کمینہ پیرو ماچھی تھا۔“ اس نے ہانپتے ہوئے بتایا، پھر کھانسنے لگا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی، ”یہ بیساکھی مجھے دو۔ میری بکریاں بھوکی پیاسی ہیں۔“

”پیرو ماچھی تمہاری بیوی اور بیٹے کو کیوں اُٹھا کر لے گیا؟ اس نے بتایا تو ہوگا۔“ میں نے بیساکھی پر ہاتھ رکھا۔

”اس بے حیا نے مجھے مارا پیٹا مگر بتایا نہیں کہ وہ کیوں میرے بوڑھے چہرے پر کلنک ملنا چاہتا تھا۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق اس کل موہی نے نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ میری جھولی میں زہر کی پڑیا رکھ گیا ہے۔ پتا نہیں، خدا ہم جیسے لولے لنگڑے غریبوں کو کیوں زندہ رکھتا ہے، اُٹھا کیوں نہیں لیتا۔ بس! اب تو جا...... چلا جا، اس بے حیا کو بھی ساتھ لے جا۔“

اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھ چھوڑی تھی جو اس وقت اس کے منہ سے نکلنے والی رطوبت سے تر ہوگئی تھی۔ اس کا جسم زندگی کی ٹہنی سے جڑے ہوئے پیلے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”اتنا بتا دے کہ یہ بیٹ خیر پور کس طرف ہے؟“

”تو کہاں سے آیا ہے؟ کیا تجھے بیٹ کا بھی پتا نہیں۔ دریا کے پاس ہے...... وہ کمینی جانتی ہے۔ اس سے جا کر پوچھ لے......“ اس نے ہاتھ لہرا کر کہا اور پھر اپنی بیساکھی تھام لی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بیٹھا رہے، میں اس کی بکریوں کو دیکھتا ہوں۔ اس نے مجھ پر ایک غصیلی نظر ڈالی اور نفرت سے زمین پر تھوکتا ہوا بیساکھی کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بدن کی غیر معمولی لرزش خدشہ پیدا کر رہی تھی کہ وہ رات کی اس سردی میں کمرے سے نکلے گا تو ٹھٹھر کر مرجائے گا۔ میں نے اسے یہی بات سمجھانا چاہی مگر

حسد کیا ہے؟

☆ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ، لکڑی کو۔

☆ حسد ایک ایسی آگ ہے جس میں جل کر انسان خود ہی راکھ ہوجاتا ہے۔

☆ حسد کی صورت یہ ہے کہ کسی کی نعمت دیکھ کر تمنا کرنا کہ کاش، اس سے یہ نعمت چھن کر مجھے حاصل ہوجائے۔

☆ حسد کے بجائے رشک کرو۔

☆ کچھ مانگنا ہو تو صرف خدا سے مانگو کیونکہ تمام دنیا کو وہی سب کچھ دیتا ہے۔

☆ خدا سے دعا ہے کہ ہمیں حسد جیسی بدترین بیماری سے نجات عطا فرمائے۔ (آمین)

مرسلہ: اے غفور خان، اٹک

اس نے میری بات پر کان نہ دھرا۔ میں اس سے پہلے کمرے سے نکلا۔ میڈم کو مضطربانہ انداز میں دروازے کے سامنے تھڑے پر ٹہلتے پایا۔ مجھے دیکھ کر فوراً میرے قریب آئی، بولی۔ ”ہاں! کچھ بتایا بابا نے؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”بتا دیا ہے مگر...... وہ غضب کی سردی میں باہر نکل کر اپنی بکریوں کو چارا ڈالنا چاہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ سردی سے مر جائے گا۔ اسے سخت بھوک بھی لگی ہوئی ہے۔“

وہ بولی۔ ”اسے کمرے میں روکو، لالٹین اور کوئی برتن مجھے لا دو! میں اس کے کھانے پینے کے لیے کچھ کرتی ہوں۔“

میں نے حیرت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیا کرلے گی! مگر اس نے مجھے ڈانٹا۔ ”جلدی کرو شہریار! ہمارے پاس سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔“

میں الٹے قدموں بڈھے کے پاس آیا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بیساکھی چھین کر دوسری چارپائی پر ڈالی، اسے چارپائی پر دھکیل کر لحاف میں لپیٹا اور کہا۔ ”یہیں پڑے رہو۔ میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ کرتا ہوں۔ تمہاری بکریوں کو بھی چارا ڈال دیتا ہوں۔ ایسی حالت میں باہر نکلتے ہی گر جاؤ گے۔“

اس کے من میں نفرت کا اتنا بڑا الاؤ جل رہا تھا کہ اسے میرے ہمدردی آمیز رویے نے بھی نرم نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے لحاف سے نکلنے لگا۔ میں نے اسے پھر لحاف میں لپیٹا اور سخت لہجے میں کہا۔ ”جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو...... نجانے کس ڈھیٹ مٹی سے بنے ہوئے ہو کہ اپنے فائدے کی بات بھی نہیں سمجھتے۔ یہاں کچھ کھانے کو پڑا ہے؟“

اس نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کمرے کے اس گوشے میں دیوار پر لکڑی کا ایک تختہ دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے چند میلے اور پرانے برتن پڑے تھے۔ میں نے لالٹین اُٹھائی اور برتنوں کی تلاشی لی۔ ایک ٹوٹے ہوئے کناروں والی بالٹی اُٹھالی۔ کندوری میں لپٹی ہوئی آدھ کھائی روٹی مل بھی گئی۔ اسے بڈھے کے پاس رکھا اور بالٹی اور لالٹین لے کر باہر آ گیا۔ میڈم نے میرے ہاتھوں سے بالٹی اور لالٹین چھینی، مجھے بڈھے کے پاس رکنے کا حکم دیا اور بکریوں والے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ وہ بڈھے کو پلانے کے لیے بکریوں کا دودھ دوہنے کے لیے گئی تھی۔

پیرو ماچھی اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچا کر رخصت ہو گیا تھا۔ اس ویرانے میں اسے یہ معمولی سا کام سرانجام دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی ہو گی کیونکہ یہاں عملی طور پر قانون بے دست و پا تھا۔ دریا کے دونوں اطراف بیٹ کا وسیع و عریض علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کی محفوظ کمین گاہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں رہنے والے لوگ انہی کے رحم و کرم پر زندگی گزارا کرتے تھے۔

مجھے پونا کے سرکاری اسپتال سے لے کر اس کچے مکان تک کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا تھا۔ مکان کے اطراف دور دور تک کوئی گھر آباد نہیں تھا۔ سکوت میں حشرات الارض کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں مجھے یا میڈم کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا مگر محتاط رہنا ہمارے دھندے کا بنیادی تقاضا تھا۔ میں نے چوکنے انداز میں صحن کا جائزہ لیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، کوئی حرکت دیکھنے کو نہیں ملی تو مطمئن ہو کر اندھیرے میں احتیاط سے چلتا ہوا بڈھے کے پاس پہنچا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ”ادھر دیا پڑا ہے، وہ جلا دو۔“

میں نے اس کی نشاندہی پر دیا سلائی کی مدد سے ٹین کا بنا ہوا ننھا سا دیا جلا دیا۔ مٹی کے تیل کی بو کمرے میں پھیل گئی مگر مجھے بڈھے کے نقوش دکھائی دینے لگے۔ وہ رضائی کی بکل مار کر چارپائی کے وسط میں بیٹھا ہوا کھانس رہا تھا۔ سینے کو سہلا کر اپنی کھانسی پر قابو پانے کی ناکام کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نفرت کے غیر معمولی تاثرات مستقل طور پر ثبت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس دور اُفتادہ اور ناخواندہ شخص کو میڈم کے وجود سے اتنی نفرت کیوں تھی؟ میرے حصے میں بھی بڈھے کا وہی رویہ آیا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”بابا! پیرو ماچھی کے ساتھ کتنے آدمی تھے؟“

اس نے بولنا چاہا مگر کھانسی نے بولنے کی مہلت نہ دی۔ اس نے اپنی انگلیاں پھیلا کر مجھے حملہ آوروں کی تعداد بتائی...... چار...... میں نے پوچھا۔ ”ان لوگوں سے تمہاری دشمنی کیا ہے؟“

اس نے پانی کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹھوٹھا تھمایا، چند گھونٹ پینے کے بعد وہ بے بسی آمیز بیزاری سے بولا۔ ”میری کیا مجال کہ میں پیرو ماچھی سے دشمنی مول لوں...... وہ اس علاقے کا بادشاہ ہے۔ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ کوئی اس کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بڑا ہو یا چھوٹا۔ میں ایک ٹانگ پر پھدک پھدک کر زندگی گزار رہا ہوں۔ جینا چاہتا ہوں تو جی نہیں سکتا۔ مرنے کی دعا کرتا ہوں تو دعا پوری نہیں ہوتی۔ خدا جانے مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم نے پیرو سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ ان معصوموں کو کیوں اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟“

”پوچھا تھا۔ جواب میں اس کے ساتھی نے میرے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ پھر کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔“

اس کا چہرہ بے بسی کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کی حالت زار ہی ایسی تھی۔ بھلا ٹانگ سے معذور شخص، جو زندگی کی آخری کیاری کو پانی لگانے جا رہا ہو، ضعیف اور بے حد ناتواں ہو، وہ کس طرح چار ہٹے کٹے اور اسلحے سے لیس ڈاکوؤں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میرے دل میں ہلکورے لیتا ہوا تجسس میری زبان پر آ گیا۔ پوچھا۔ ”بابا! تم میری میڈم سے کیوں اتنی نفرت کرتے ہو؟“

اسے میری بات کی سمجھ نہ آئی۔ حیرانی سے بولا۔ ”کون میڈم؟ میں تو کسی میڈم کو نہیں جانتا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہی لڑکی جسے تم نے گالیاں دے کر کمرے سے نکال دیا ہے۔“

اس کا مدقوق چہرہ مزید بجھ گیا۔ فرطِ نفرت سے غلیظ گالی دے کر بولا۔ ”اس حرامزادی کی تو...... میں اس کا نام لینے سے میری زبان پلید ہو جاتی ہے۔ تم کوئی اور بات کرو......“

ایسے ہی وقت میں میڈم نے مجھے پکارا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ میں مستعدی سے باہر آیا۔ اس نے بالٹی اور لالٹین مجھے تھمائی اور سرگوشی کی۔ ”شہریار! اسے مت کریدو! تم اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، مجھ سے پوچھ لینا۔ میں تمہیں بتا دوں گی۔“

اس کے لہجے کی تلخی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ بالٹی پکڑ کر بے ترتیب پڑے ہوئے برتنوں کے پاس گیا۔ ایک پیالے میں دودھ انڈیلا، بڈھے کو تھمایا اور پینے کا حکم دیا۔ وہ بھوکا تھا۔ بھوک انسان کو توڑ دیتی ہے۔ وہ جس سے نفرت کرتا تھا، جس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، اسی کے ہاتھ کا دوہا ہوا دودھ بغیر سانس لیے حلق میں اتار گیا۔

میں پلٹ کر دروازے میں آیا۔ وہ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر بولی۔ ”بابا نے دودھ پی لیا؟“

میں نے کہا۔ ”جی میڈم! مزید کچھ پوچھنا ہے یا بس؟“

وہ بولی۔ ”نہیں۔ وہ کچھ اور نہیں بتا سکتا۔ آ جاؤ۔“

میں نے الوداعی نظر بڈھے پر ڈالی جو اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میڈم لکڑیوں اور کمرے کے بیچ کے خلا سے گزر کر باہر جاتی دکھائی دی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر پہنچا، پھولی ہوئی سانسوں میں بولا۔ ”میڈم! وہ اکیلا پڑا رہے گا؟“

میرا اشارہ بڈھے کی طرف تھا۔

وہ اختصار سے بولی۔ ”پہلے بھی تو پڑا تھا۔ اب بھی پڑا رہے گا۔ اس نے کچھ مزید بتایا؟“

اس نے باقی باتیں سنی تھیں۔ جس دوران وہ دودھ دوہ رہی تھی، اس دوران ہونے والی باتیں میں نے جلدی جلدی اُس کے گوش گزار کر دیں۔ پھر ہم دونوں خشک گوبر پر چلتے ہوئے اپنی لینڈ کروزر کی طرف بڑھے۔ ایسے میں میڈم ٹھٹک کر رک گئی۔ ایڑیوں کے بل گھومی۔ چہار جانب دیکھ کر رُک گئی۔ بولی۔ ”خطرہ......“

اس کے ساتھ ہی اُس نے چھلانگ لگائی اور مجھے ساتھ لیتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ ایسے ہی وقت میں فائر کی ہولناک آواز سے فضا گونج اُٹھی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اٹک گئی۔ چند لمحے پہلے میڈم جہاں کھڑی تھی، وہیں اچٹتی ہوئی گولی زمین پر لگی تھی۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اب تک گولی اس کی ٹانگوں میں سوراخ کر چکی ہوتی۔

میں پہلو کے بل اپنی گن پر گرا تھا۔ اس کی مزل میری پسلیوں میں چبھی۔ میڈم مجھ پر لمحہ بھر کو گری تھی پھر لڑھک کر ایک طرف ہو گئی۔ میں مخالف سمت میں کھسک کر دور ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ پہلی مرتبہ پتا نہیں چل سکا تھا فائرنگ کرنے والا کہاں موجود تھا۔ اب پتا چل گیا تھا کہ جو کوئی بھی تھا، وہ لینڈ کروزر پر سایہ فگن آم کے بڑے درخت میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے دوسرا برسٹ مارا مگر تب تک میں کچی اینٹوں کے ڈھیر کے عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بارشوں میں آدھ گھلی اینٹوں کے تین فٹ بلند ڈھیر اور میرے عقب میں کمرے کی کچی دیوار میں گولیاں لگ کر ٹھنڈی ہو گئیں۔ فضا میں بارود کی بو پھیل گئی اور تڑتڑاہٹ کی خوفناک آواز بازگشت کی صورت چاروں طرف گونجنے لگی۔

میں نے سر نکال کر میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دی جس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں چھپ کر ٹارگٹ فائرنگ سے محفوظ ہو گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے اچانک خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے ہم دونوں کی جان بچا دی تھی۔ باوجود کہ وہ فوری طور پر خطرے کی نوعیت کو بھانپ نہیں سکی تھی مگر اس نے جو ردِعمل ظاہر کیا، وہی بہت تھا۔

میں نے اپنی گن سیدھی کی، لاک پن ہٹائی اور کرولنگ کرتا ہوا اینٹوں کے ڈھیر کی داہنی اخیر تک پہنچ گیا۔ آم کے درخت کی طرف نال کا رُخ کیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دبیز سیاہی میں چھپے ہوئے کو کھوجنے لگا۔ فاصلہ زیادہ

تھا۔ چاند کی ناکافی روشنی اور درخت کا غیر معمولی گھنیرا پن...... وہ تب تک میری نظروں میں نہیں آسکتا تھا جب تک شاخیں ہل کر اس کی موجودگی کی نشاندہی نہ کر دیتیں یا اس کی گن کا شعلہ اگلتا دہانہ نظر نہ آتا۔

ایسے ہی وقت میں مکان کے اکلوتے راستے کی مخالف جانب سے کسی ٹریکٹر کے گھر گھرانے کی آواز سنائی دی۔ کوئی اس طرف آرہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ مجھ پر آشکار ہو گیا کہ ہم دونوں طرف سے گھیرے میں لیے جاچکے تھے۔ یہ چھوٹا سا مکان ہماری مقتل گاہ بننے والا تھا۔ میڈم کے پاس گن نہیں تھی، ایک چھوٹا سا پستل تھا جس کی رینج کم تھی۔ وہ صرف قریب آنے والے کو نشانے پر لے سکتی تھی۔ میرے پاس گن تھی مگر گولیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ایک میگزین گن میں لوڈ تھی۔ دوسری میرے پہلو کی جیب میں تھی۔ یہ امونیشن بھرپور مدافعت کے لیے ناکافی تھا۔ حملہ آوروں کے پاس یقینی طور پر اسلحہ زیادہ مقدار میں موجود تھا۔ مجھے نہ صرف اپنی جان بچانی تھی بلکہ اپنی میڈم کو بھی بہ حفاظت اجنبی دشمنوں کے خونیں حصار سے باہر نکالنا تھا۔

ٹریکٹر کی گھر گھراہٹ بکریوں والے کمرے کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت یہاں کسی دوست یا غیر متعلق شخص کی آمد متوقع نہیں تھی۔ جو بھی آیا تھا، وہ ہمارے خون کا پیاسا تھا۔

ٹریکٹر کے کمزور بریک لیدر چیخے؛ پتا چلا کہ ٹریکٹر رک گیا تھا۔ ایسے ہی وقت میں اس جانب سے فائر کی آواز گونجی۔ فائر پستل سے کیا گیا تھا۔ شاید میڈم نے کیا تھا...... یہ قیاس تھا کیونکہ پستل تو ٹریکٹر پر آنے والوں کے پاس بھی ہو سکتا تھا۔ آم پر مچان بنا کر بیٹھنے والے شکاری کو باور ہو چکا تھا کہ وہ مجھے اپنا نشانہ تب تک نہیں بنا سکتا جب تک میں اینٹوں کے ڈھیر کی اوٹ میں دبکا ہوا تھا۔ تبھی اس نے دوبارہ فائر نہیں کیا بلکہ مائل بہ انتظار ہو گیا۔ میری حالت بھی بعینہٖ یہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ شب بھر انتظار کر سکتا تھا جبکہ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے اینٹ کا بڑا ٹکڑا اٹھایا، لیٹے لیٹے لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف اچھال دیا۔ کھٹکا ہوا۔ شکاری میرے دام میں آگیا۔ اس نے فوراً ہی اس طرف فائر کر دیا۔ میں اسی تاک میں تھا۔ جونہی مجھے گن سے نکلنے والے شعلے نے اس کی لوکیشن کی خبر دی، میں نے نشانہ لینے اور فائر کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ فضا ایک دلدوز چیخ سے تھرا گئی اور وہ ٹہنیوں پر سے پھسلتا ہوا لینڈ کروزر کے موٹے پائپ والے بمپر پر زوردار آواز کے ساتھ گرا، پھر زمین پر ڈھلک گیا۔ کھال کے پار گرنے کی وجہ سے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ٹھنڈا ہو گیا تھا، زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا یا سنبھل کر میرے خلاف پوزیشن سنبھال چکا تھا؛ معلوم نہ ہو سکا۔

مکان کی دوسری جانب پستل کے فائر کے بعد دوطرفہ فائرنگ ہونے لگی۔ پستل کے فائر کے جواب میں دو گنیں آگ اور دھماکے اگلنے لگی تھیں۔ میرا اُس طرف پہنچنا خطرناک اور مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری تھا۔ اپنے عقب میں کمرے کی بلندی کا اندازہ کیا۔ بہ مشکل نو دس فٹ بلند تھا۔ سرکنڈوں کی مدد سے بنائی گئی چھت ایک ڈیڑھ فٹ باہر نکل کر جھکی ہوئی دکھائی دی۔ دیوار پر مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا۔ ایسی دیوار پر چڑھ کر چھت پر سرعت سے پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ مجھے اندازہ تک نہ تھا کہ میری گولی کا شکار بننے والے شخص کے علاوہ کوئی اور بھی میری تاک میں چھپا ہوا تھا یا میدان صاف ہو چکا تھا۔ میں صحن عبور کر کے محاذ تک ایک دم پہنچنے کے بجائے میڈم اور دشمنوں کی پوزیشنوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا تاکہ میرے ہاتھوں میڈم کو نقصان نہ پہنچے۔

بجلی کی سی مستعدی سے پہلو کے بل کروٹیں لیتا ہوا لکڑیوں تک پہنچا۔ مجھ پر کوئی فائر نہ ہوا تو حوصلہ پکڑا اور اچھل کر کمرے کی لکڑیوں کی جانب والی دیوار سے چمٹ گیا۔ یقین ہو گیا کہ میرا شکاری میری گن سے نکلنے والی گولی کا شکار ہو چکا تھا۔

میں دوڑتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ فائرنگ کی آواز سے اندازہ ہوا کہ میڈم مکان کی دوسری جانب نرغے میں آئی ہوئی تھی۔ میں نے کھانستے ہوئے بڈھے کو نظر انداز کرتے ہوئے چوبی دروازے کی کنڈی لگائی، افقی بلیوں پر پیر رکھ کر بندر کی سی پھرتی سے اُچھلتا ہوا چھت پر پہنچ کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ چھت پر لیپ کی ہوئی چکنی مٹی رات کی تمام تر خنکی سمیٹ چکی تھی جس کی وجہ سے میرے ہاتھ یک لخت سرد ہو گئے۔ کھڑے ہونے میں قباحت تھی کہ کوئی آوارہ گولی میرا سینہ چھلنی نہ کر دے۔ کہنیوں اور چھاتی کے بل پر آگے کھسکتا ہوا چھت کے کنارے پر پہنچا۔ منڈیر نہیں تھی۔ سرکنڈے بکریوں والے کمرے کی چھت پر جھکے ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں فائرنگ تھم گئی۔

میں آہستگی سے نچلی چھت پر اُترا اور کرولنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ جہاں چھت کی ڈھلان شروع ہوئی، وہیں رُک کر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کھیت کو دیکھنے لگا۔ چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی تاہم درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ کھیت میں برابر ایستادہ آم کے دو درختوں کے عین بیچ میں ٹریکٹر

کھڑا دکھائی دیا۔ قرب و جوار میں کوئی موجود نہ تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ کہیں چھپا ہوا تھا۔

مجھے میڈم کہیں چھپی دکھائی نہیں دی۔ میرے اندازے کے مطابق اسے مکان کے قریب کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس خستہ حال کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک مٹی کی دس بارہ فٹ لمبی کھرلی بنی ہوئی تھی جس میں غالباً بکریاں چارا کھاتی تھیں۔ کھرلی کے اردگرد خاردار ٹہنیوں کی مدد سے دس ضرب پندرہ فٹ کا جنگلا نما کمرا بنا ہوا تھا۔ اس کی دائیں جانب پانچ سات قدموں کے فاصلے پر گوبر اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر دکھائی دیا۔ اس ڈھیر کے پار ایک کھال واقع تھا جو اس کھال سے نکلتا تھا جس پر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

میرے بائیں ہاتھ پر تاحدِ نگاہ کھلا کھیت واقع تھا جس میں شاید گندم کاشت کی گئی تھی۔ اس کے درمیان سے چیرتا ہوا کھال نظر آرہا تھا جو تاحدِ نگاہ خالی تھا۔ یعنی میڈم اور اس پر حملہ کرنے والے میرے سامنے یا دائیں جانب کہیں چھپے ہوئے تھے۔ ایسے ہی وقت میں جب میں مایوس ہونے لگا تھا، مجھے گوبر کے ڈھیر پر ایک ابھرتا ہوا سر دکھائی دیا۔ میں نے گن سیدھی کی اور نشانہ لیا۔ میرے فائر کرنے سے لمحہ بھر پیشتر فائر کی آواز گونجی۔ ڈھیر کے اوپر والے حصے میں لگنے والی گولی یقینی طور پر کسی گن کے دہانے سے نکلی تھی۔ میں لبلبی دباتے دباتے رہ گیا۔

ڈھیر کے عقب سے ایک فائر ہوا۔ فائر اس چھت کے جھکے ہوئے کنارے پر لگا جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ یہ فائر پستل کا تھا۔ اندازہ ہوا کہ ڈھیر کے پیچھے میڈم چھپی ہوئی تھی اور دشمن میرے نیچے، کہیں آس پاس مورچہ زن تھے۔ میں نے بہ طور احتیاط اپنی گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میری گولی کا نشانہ بننے والا کام آچکا تھا۔ میں مزید آگے کھسکا۔ کافی قریب تک دیکھنے کے قابل تو ہو گیا مگر کوئی شخص چھپا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے فوری طور پر چھت سے اترنے کا فیصلہ کیا اور بائیں طرف کروٹیں لیتا ہوا کنارے پر آیا۔ جونہی میں نے اُترنا چاہا، مجھے ٹہنیوں کے خاردار جنگلے کی بائیں نکڑ میں ایستادہ کیکر کے تنے سے چمٹا ہوا شخص دکھائی دے گیا۔ اس نے گہرے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میری نظر اچانک ہی اُس پر پڑ گئی تھی۔ میں نے اُس کا نشانہ لیا مگر فائر نہ کیا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ میڈم نہیں تھی، دشمن تھا۔ محض پستل کے فائر کی بنیاد پر میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ گوبر کے ڈھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ ممکن تھا کہ اس نے کسی ایک دشمن پر قابو پا کر اس سے گن چھین لی ہو، اس لیے جب تک اس کی پوزیشن کا حتمی علم نہ ہو جاتا، میں کسی پر بھی فائر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

دکھائی دینے والے کو نشانے پر رکھتے ہوئے میں نے الجھ کر گوبر کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ چھپا ہوا سر تھوڑا بلند ہوا۔ چاند کی روشنی میں اس کے سر پر کوئی چیز چمکی؛ بس ایک لمحے کے لیے...... اور میں نے گردن موڑ کر اپنا نشانہ درست کرتے ہوئے فائر کر دیا۔ فائر کیکر کے تنے میں لگا۔ چھپے ہوئے شخص کو اندازہ نہ ہو سکا کہ فائر کس طرف سے کیا گیا تھا، اس لیے وہ گھوم کر درخت کی دوسری جانب نہ گیا بلکہ وہیں کھڑا رہا۔ میں نے دوسرا فائر کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ گولی اس کی چھاتی اور ٹانگوں کے درمیان پیٹ میں کہیں لگی تھی۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ برآمد ہوئی اور وہ تنے کے ساتھ گھوم کر اوجھل ہو گیا۔ میں آنکھیں جھپکے بغیر تنے کو دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح بائیں جانب گر گیا۔ وہ یقیناً تڑپ رہا تھا مگر اس منظر کی دید کا شرف حاصل نہ ہو سکا کیونکہ فاصلہ اور اندھیرا حائل تھا۔ میں نے بہ طور احتیاط اس کے بدن میں ایک اور گولی اُتار دی۔ محسوس ہوا تھا کہ وہ کوئی بالشت بھر اچھلا تھا۔

اس کے ساتھی نے ڈھیر پر اوپر تلے چار پانچ گولیاں پھونکیں پھر دبک گیا۔ شاید اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی کو لگنے والی گولیاں پستل کی نہیں بلکہ گن کی تھیں۔ اس نے خود کو غیر محفوظ خیال کرتے ہوئے فائرنگ روک کر پوزیشن بدلنے کا فیصلہ کیا اور اسی کوشش میں مجھ پر آشکار ہو گیا۔ نظر تو نہیں آیا مگر مجھے احساس ہو گیا کہ وہ دیوار کے نہایت قریب، چھت کے باہر کی طرف نکلے ہوئے سرکنڈوں کے نیچے، کسی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ میں اُسے دیکھ سکتا تھا نہ ڈھیر کے پیچھے چھپی ہوئی میڈم اُسے ٹارگٹ بنا سکتی تھی۔

یہ تو شکر ہوا تھا کہ میڈم کے سر پر بندھا ہوا سنہرے رنگ کا ہیئر بینڈ چاندنی میں چمک کر میری مشکل آسان کر گیا تھا اور میں ایک سورما چت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میڈم شاید مجھے دیکھ چکی تھی، اس لیے چیخی۔ ”وہ اسی دیوار کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ فائر!“

اس کی باریک اور تیز آواز سناٹے میں گونج گئی۔ شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ دشمن گھبرا جائے اور اپنے مورچے سے نکل کھڑا ہو۔ وہ کامیاب رہی تھی۔ مورچہ زن اپنی پوزیشن بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا اور ڈھیر پر اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا

میرے دائیں طرف بڑھا۔ پھر مجھے اس کی موجودگی کا اندازہ ہوگیا۔ وہ کمرے کی نکڑ پر پہنچ کر دوسرا رُخ لے چکا تھا۔ چونکہ ابھی تک کسی چوتھے شخص کی موجودگی کا شبہ نہیں ہوا تھا، اس لیے میں خطرہ مول لیتا ہوا کھڑا ہوگیا اور بھاگ کر کمرے کی نکڑ پر پہنچا۔ میڈم کی آواز گونجی۔ ”اسی دیوار کے پاس...... اسی سیدھ میں بھاگ رہا ہے...... فائر کرو!“

میں نے اندازے کی بنیاد پر فائر کیا جو خطا گیا۔ میڈم پھر چیخی۔ ”لکڑیوں کی طرف......“

میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ نظر نہ آیا۔ میں اونچے کمرے کی چھت پر چڑھ کر بھاگا۔ نکڑ میں گیا تو اُسے لکڑیوں کے ڈھیر کی اوٹ میں دوڑتے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کو دکھائی دیا، پھر لکڑیوں کے پرے کسی گڑھے میں کود کر اوجھل ہوگیا۔ مجھے ناچار پھر بستہ چھت پر چھاتی کے بل لیٹنا پڑا۔ کھڑا رہتا تو اس کے نشانے کی زد میں آجاتا۔ میرے حق میں میرا فوری فیصلہ سودمند ثابت ہوا کیونکہ اس نے گولی چلانے میں لحظہ بھر کی دیر نہیں کی تھی۔ گولی میرے اوپر سے گزر گئی۔

جہاں وہ کودا تھا، میں نے اندازے کی بنا پر وہاں دو فائر کیے۔ اگر میرے پاس گولیاں وافر مقدار میں ہوتیں تو میں برسٹ مارتا۔ اسی مجبوری کی بنا پر میں سنگل شوٹ پر اکتفا کررہا تھا۔

دشمنوں کی تعداد کے بارے میں قائم کیا گیا میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میرے عقب میں پھر پسٹل اور گن کی فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ میڈم کو کسی اور شخص سے نبرد آزمائی کا مرحلہ درپیش تھا۔ میرا یکبارگی جی چاہا کہ فوراً میڈم کی مدد کے لیے جاؤں، پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ اس حماقت کے نتیجے میں میرے مقابل چھپا ہوا شخص میرے عقب میں پہنچ کر زک پہنچا سکتا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے لکڑیوں کے پار جھانک رہا تھا کہ اچانک موہوم سی ہلچل محسوس ہوئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ تیسرا فائر ثمر بار ثابت ہوا اور گھٹی گھٹی سی چیخ ابھری۔ اُسے گولی لگی تھی مگر شاید پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی۔

میں جلد بازی میں کوئی الٹا سیدھا قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ہمارے مابین حائل غیر معمولی فاصلہ صبر آزمائی کا درس دیتا تھا۔ جو بھی خود پر قابو پانے میں ناکام رہتا اور جھنجلا کر باہر نکلتا، وہی کام آجاتا۔ اس لیے میں دم سادھے لیٹا رہا۔

شاید اسے گولی کی تکلیف نے بے چین کردیا تھا یا وہ ازخود مطمئن ہوگیا تھا کہ میں میدان صاف دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ہوں؛ وہ اچانک کھڑا ہوا اور لنگڑاتے ہوئے کھلے کھیت کی طرف دوڑا۔ یہ اُس کی احمقانہ حرکت تھی جس کی کم از کم مجھے اُس سے توقع نہیں تھی۔ شاید وہ تکلیف کی شدت کو برداشت نہیں کر پایا تھا اور دیوانہ وار بھاگ اُٹھنے پر کمربستہ ہوگیا تھا۔ جو بھی تھا، میرے لیے بڑا فائدہ مند تھا اور میں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوڑتے ہوئے دشمن کا نشانہ لیا، فائر کیا جو خطا گیا۔ دوسرا فائر بھی خطا گیا۔ وہ زگ زیگ کے انداز میں بھاگ رہا تھا۔ یہاں برسٹ کی ضرورت تھی۔ مجبوراً میں نے برسٹ آپریشن آن کیا اور نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ٹریٹ...... ریٹ...... ریٹ...... کی فضا شگاف آواز اُسے چاٹ گئی اور گن کے خاموش ہونے پر وہ چھلنی ہوکر بالشت بھر اونچی فصل میں گر گیا۔ ایک ہی رات میں اس نے ہماری سانسیں ضبط کرنا چاہیں، پھر اپنی سانسیں بحال رکھنے کے لیے نبرد آزما ہوا اور پھر اس کی زندگی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ جان لینے والے کو بھی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ دنیا ایسی ہی ہے، نہ سمجھ میں آنے والی......

میں نے جلدی سے میگزین نکال پھینکی اور دوسری چڑھا لی۔ اب ایک دشمن باقی تھا۔ میں کرولنگ کرتا ہوا سابقہ جگہ پر پہنچا۔ اس دوران فائرنگ تھم چکی تھی۔ میں نے گوبر کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ میڈم وہاں نہیں تھی۔ شاید اپنی جگہ بدل چکی تھی۔

میں نے آواز دی۔ ”میڈم!...... میڈم!“

میری توقع کے برعکس مجھے گاڑی کی طرف سے جواب ملا۔ ”میں ادھر ہوں...... گاڑی کے پاس...... اگر میدان صاف ہے تو چلے آؤ۔“

میری دانست میں میدان صاف تھا۔ میں کھڑا ہوا، چھت سے نیچے کودا اور بھاگ کر کیکر کے درخت کے پاس پہنچا۔ یہاں میرا ایک شکار پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روسی ساخت کی کے کے گن دبی ہوئی تھی اور وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ میں اُس پر جھکا۔ نبض چیک کی۔ وہ مرچکا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں تلاشی لی۔ اس نے پنڈلی پر ایک تیز دھار خنجر اور کمر پر سیاہ رنگ کی جرسی کے اوپر لیدر کا بلٹ بیلٹ باندھ رکھا تھا۔ چند نوٹ بھی ہاتھ لگے۔ میں نے نہ صرف تمام سامان کو اپنی تحویل میں لے لیا بلکہ اس کی گن کو بھی اس کی مردہ گرفت سے کھینچ لیا۔

وہ تحیم شحیم اور خاصی خوف ناک شکل کا مالک تھا۔ گھنی سیاہ مونچھیں اور ڈاڑھی اس کی ظاہری دہشت میں اضافہ کرتی تھی۔ اس نے سر پر اُونی مفلر باندھ رکھا تھا۔ دیہاتی

غنڈے اور نچلی سطح کے ڈاکو اسی قسم کا حلیہ بنا کر رکھتے ہیں تا کہ لوگوں پر ان کی شخصیت کا دبدبہ قائم ہو جائے۔

دوسرا آدمی کافی فاصلے پر کھیت میں گرا تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کا ارادہ منسوخ کیا اور مالِ غنیمت اٹھائے ہوئے میڈم کی طرف بڑھا۔ کچھ فاصلے پر رک کر بولا۔ ''میڈم! آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں! جلدی آؤ۔''

اس کی آواز سنائی دی تھی، خود دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید گاڑی کی دوسری طرف کھڑی تھی۔ میں نے کھال پھلانگا تو کھال اور گاڑی کے درمیان پہلو کے بل پڑا ہوا لمبا تڑنگا شخص دکھائی دیا۔ اس کی گن اس کے جسم تلے دبی ہوئی تھی جس کی نال کا تھوڑا سا حصہ باہر تھا۔ میں نے اُسے ٹھوکر ماری۔ ... وہ گاڑی کی جانب الٹ کر سیدھا ہو گیا۔

میڈم کی آواز سنائی دی۔ ''کوئی فائدہ نہیں...... ادھر آؤ۔''

وہ آم کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رُخ زمین کی طرف تھا۔ تبھی میری نظر اُس کے پیروں تلے گھاس میں پڑے ہوئے شخص پر پڑی جو چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ میں میڈم کے قریب پہنچا۔

میڈم بولی۔ ''دِس از لاسٹ ون!''

میں نے مالِ غنیمت والی کے کے گن میڈم کو پکڑائی۔ اپنی گن آخری شکار پر تان لی اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''تم کون ہو؟''

وہ بولا۔ ''مم...... میں دِتہ ماچھی ہوں...... اللہ دِتہ!'' اس نے مقامی لب و لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

اس کی آواز نے اس کے خوف کا پول کھول دیا۔ وہ موت کو سامنے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

''پپ...... پتا نہیں......'' وہ منمنایا۔

میں نے اس کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر رسید کی اور درشت لہجے میں کہا۔ ''بکواس نہ کرو ورنہ چھلنی کر دوں گا؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا۔ بب...... بشیرے کو ہی پپ...... پتا ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اب کہاں ہے، کوئی پتا نہیں۔'' اس کی لرزتی ہوئی آواز نے مجھ پر اس کی قلبی کیفیت کو آشکار کر دیا۔ ایسی حالت میں انسان جھوٹ نہیں بولتا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں کس نے بھیجا تھا یہاں؟''

''استاد پیرو نے...... پیرو ماچھی نے......'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''کیا کہہ کر؟''

''اس نے کہا تھا کہ ملتان کی طرف سے جو بھی مکان پر آئیں، انہیں باندھ کر ڈیرے پر پہنچا دینا۔''

''کس ڈیرے پر؟''

''استاد پیرو کے ڈیرے پر...... بیٹ خیر پور میں۔''

''اُسے ہم سے کیا دشمنی ہے؟''

''مم...... مجھے نہیں پتا...... میں تو حکم کا غلام ہوں۔ استاد پیرو نے حکم دیا، میں بشیرے کے ساتھ یہاں آ گیا۔''

میرے استفسار پر اس نے اپنے تین ساتھیوں کے نام بتائے۔ وہ عمومی سطح کے بدمعاش تھے اور میرے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیوں یقین تھا کہ ہم لوگ آج رات کو یہاں ضرور آئیں گے؟''

''استاد پیرو نے کہا تھا۔''

''جس عورت اور بچے کو تم لوگ صبح یہاں سے اُٹھا کر لے گئے ہو، انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟'' میرا لہجہ بے حد ڈراؤنا ہو گیا۔

اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں صبح ادھر نہیں آیا تھا۔''

''کون آیا تھا؟''

''استاد...... اس کے ساتھ تین بندے تھے۔ یہی تینوں میرے ساتھ آئے تھے۔'' وہ بولا۔

''تم اس وقت کہاں تھے؟''

''میں دریا کے پار، روہیلانوالی بستی میں گیا تھا۔ وہاں سے کچھ سامان لانا تھا۔''

''واپسی پر کیا تم نے ان لوگوں کو ڈیرے پر نہیں دیکھا؟'' میں نے اُسے لات رسید کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

وہ بلبلایا۔ ''نہیں۔ انہیں استاد نے کہیں بھیج دیا ہوگا۔''

میں نے اس کے ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ٹریکٹر، جس پر تم لوگ یہاں آئے تھے، کس کا ہے؟''

''یہ زبیر خان کا ہے۔ لین دین کے چکر میں استاد پیرو کے ہاتھ لگا ہے۔'' اس کی آواز بتدریج کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

''اس آم پر چھپنے والا...... وہ جو گاڑی کے بمپر کے پاس انٹا غفیل ہوا پڑا ہے، کیا تم سے پہلے یہاں موجود تھا؟''

''ہاں! سردی بہت تھی۔ اس لیے ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ وہ درخت پر چھپ جائے گا۔ تم لوگوں کے پہنچتے ہی ٹارچ سے ہمیں مطلع کرے گا۔ ہم فوری طور پر یہاں پہنچ جائیں گے اور تم لوگوں کو پکڑ لیں گے۔''

وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے انہیں یقین تھا کہ ہم یہاں چوڑیاں پہن کر آئیں گے اور انہیں دیکھتے ہی ہینڈز اَپ ہو کر اپنی گرفتاری پیش کر دیں گے۔

''پیرو ماچھی کے گینگ میں کتنے آدمی ہیں؟'' میں غرایا۔

''مجھ سمیت پانچ...... ایک ڈیرے پر موجود ہے۔''

''کیا وہ جانتا ہے کہ پیرو ماچھی نے اس عورت اور بچے کو کہاں رکھا ہوا ہے؟'' میں نے اپنے لہجے کو ازحد کرخت بناتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! مگر شاید نہیں......'' وہ گڑبڑا گیا۔

میں نے دانت پیس کر کچھ کہنا چاہا کہ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کرا دیا۔ اس نے آم کے تنے کی ٹیک چھوڑ دی۔ قریب آئی اور اس کے دل پر پستول کی نال رکھ کر بولی۔ ''آخری سوال...... پیرو ماچھی اس وقت کہاں ہے، کیا اپنے ڈیرے پر ہے؟''

وہ خاصا توانا اور طویل قامت انسان تھا مگر موت نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں فرطِ دہشت سے پھٹنے کو آ گئیں اور ہکلا کر بولا۔ ''نہیں...... وہ...... وہ...... جھوک لوری میں...... پاروالے پتن کے پاس۔ مم...... مجھے مت مارو...... میں معافی مانگتا ہوں......''

''وہ کمینہ جھوک لوری میں کس کے پاس گیا ہے؟'' میڈم کے لہجے میں موت کی سی خنکی چھپی ہوئی تھی۔

''جمیل دِتی کے پاس...... وہاں کوئی پروگرام تھا۔ کہہ گیا تھا کہ صبح تک لوٹ آئے گا۔'' اس کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ اگر کچھ دیر اور پوچھ گچھ چلتی رہتی تو وہ مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتا مگر میڈم نے اسے خوف سے نجات دلاتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس کے دل میں گھس گئی اور وہ لمبی اور دردناک ''آہ'' کی آواز نکال کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ میڈم نے اس کی کھوپڑی میں بھی سوراخ کر دیا۔ اس کے جھٹکے لیتے ہوئے وجود کو پھلانگ کر گاڑی کی طرف بڑھی۔ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آئی اور گیٹ کھول کر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھنے تک اُس نے نہ صرف لینڈ کروزر کا انجن بیدار کر دیا تھا بلکہ ہیڈ لائٹس بھی روشن کر دی تھیں۔

میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ان لوگوں کی لاشیں ایسے ہی پڑی رہیں گی؟''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''لاشوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ معذور بڈھا مصیبت میں پڑ جائے گا۔ پولیس اُس کا جینا حرام کر دے گی۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو ہے...... مگر انہیں فوری طور پر کیسے ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے؟'' میڈم نے میری طرف دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

میری چشمِ تصور میں سائیں دل جیت شاہ کی خون میں لت پت لاش گھوم گئی جسے میں نے اپنے ڈیرے پر آگ کے بھڑکتے ہوئے بلند و بالا شعلوں کی نذر کر دیا تھا۔ آگ بانس کو نگل گئی تھی اور بانسری آج تک بج نہیں پائی تھی۔ اپنا آزمودہ نسخہ بتایا۔ ''انہیں لکڑیوں کے ڈھیر پر ڈال کر آگ لگا دیتے ہیں۔ ان کی چتا جل جائے گی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا، سوچ کر بولی۔ ''نہیں شہریار! یہ اچھا طریقہ نہیں ہے۔ ایک تو ان کی ہڈیاں جلنے سے بچ جائیں گی......''

میں نے بات کاٹی۔ ''وہ راکھ تلے دب جائیں گی اور فوری طور کسی کو نظر نہیں آئیں گی۔''

اسے میری جلد بازی بُری لگی جس کا اظہار اس کے متفکر چہرے پر لمحہ بھر کو نقش ہوا، پھر مٹ گیا، بولی۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ اس منحوس ٹریکٹر کا کیا کیا جائے گا جو مکان کے اُس طرف درختوں تلے کھڑا ہے؟''

میں نے اس کا حل بھی پیش کر دیا۔ ''اُسے میں سڑک پر چھوڑ آتا ہوں۔''

وہ مطمئن نہیں ہوئی۔ ''اور اس کے ٹائروں کے نشان؟ انہیں اتنے کم وقت میں مٹائے نہیں جا سکتا۔ بس! انہیں ایسے ہی پڑا رہنے دو۔ پولیس اٹھا کر لے جائے گی۔ مجھے اندازہ ہے کہ پولیس والے بابا کو تنگ نہیں کریں گے۔ روایتی پوچھ گچھ کریں گے اور پھر چھوڑ دیں گے۔ بابا کو جب کسی بات کا علم ہی نہیں تو وہ پولیس کو کیا بتائے گا۔ رہی بات اسے حوالات میں یا جیل بھیجنے کی، تو وہ پہلے کون سا جنت میں رہ رہا ہے۔ جیل کے قیدیوں سے کہیں بدتر زندگی گزار رہا ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے اور خاموش ہو گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کی۔ مناسب جگہ دیکھ کر ٹرن لیا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہم اب ملتان جائیں گے؟''

وہ قدرے تلخی سے بولی۔ ''کیا ہم نے اپنا مشن مکمل کر لیا ہے؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ہم اس عورت اور بچے کو اغوا کاروں سے تحویل سے نکالنے کے لیے اِدھر آئے تھے۔ ان تک ابھی پہنچ نہیں پائے تھے، بازیابی کا مرحلہ تو بعد کا تھا۔ میں نے شرمندگی سے کہا۔ ”سوری میڈم! مجھے خیال نہیں رہا تھا۔“

وہ بولی۔ ”شہریار! تم بہت اچھے ہو۔ مگر مجھے سہارے کی نہیں، کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ تم اِس کمی کو پورا کرو، مجھے ماتحتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔“

وہ اُس دکھ کی گہری ٹرانس سے نکل چکی تھی جس نے ملتان سے نکلنے سے پہلے اس کے قلب و ذہن پر اپنا غمناک حصار کھینچا تھا۔ اگرچہ وہ ابھی تک بالکل نارمل نہیں ہوئی تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ ہی دیر میں پوری طرح سنبھلنے والی تھی۔ یہ ہم دونوں کے لیے اچھی بات تھی۔

میں نے آہستگی سے کہا۔ ”جی شکریہ! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔“

گاڑی میں چلنے والے ہیٹر نے ہمارے بدن کو خاصی حرارت پہنچائی۔ میڈم نے سڑک سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک دی اور سر سیٹ سے ٹکا کر، آنکھیں موند کر، سوچتے ہوئے بولی۔ ”شہریار! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

میں نے یاد دلایا۔ ”ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ کو سہارے کی نہیں، ساتھی کی ضرورت ہے۔ ساتھی سے کچھ مانگا نہیں جاتا، لے لیا جاتا ہے۔“

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی کے اندر جلتی ہوئی دودھیا لائٹ اس کے آدھے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ آدھے چہرے پر سایہ تھا جبکہ سر پر بندھا ہوا سنہرا ہیئر بینڈ چمک رہا تھا۔ بولی۔ ”بولنے دو ناں! ہم اِس وقت بیٹ خیر پور کے ویران علاقے میں کھڑے ہیں۔ یہاں سے بہت تھوڑے فاصلے پر، شاید ایک کلومیٹر دور، دریائے چناب مختلف نالوں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ سردیوں میں پانی کم ہوتا ہے۔ ایک آدھا نالہ چلتا ہے؛ باقی خشک ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف جنگلات کے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہے۔“

میں ہمہ تن گوش اسے سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے آئندہ درپیش آنے والے متوقع حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنے چلی تھی، بولی۔ ”دریا کے اسی کنارے پر، جنگل کے بیچ، پیرو ماچھی کا ڈیرا واقع ہے۔ وہاں ہماری مڈبھیڑ کئی خطرناک لوگوں سے ہو سکتی ہے مگر وہ اس وقت جمیل دستی کے ہاں جھوک لوری پہنچا ہوا ہے۔ کسی غریب کی عزت پر موج میلا کر رہا ہوگا۔“ اس کے لہجے میں نفرت گھل گئی، بولی۔

”جھوک لوری دریا کے پار واقع چند ملاحوں کے گھروں پر مشتمل چھوٹی سی بستی ہے۔ جمیل دستی کا گھر بستی سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی جانب واقع ہے۔ ہم وہاں جائیں گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا، وہ بولی۔ ”یہاں سے بالکل سامنے دریا کے پار جھوک اللہ یار کا پتن ہے۔ اگر کشتہ (بڑی کشتی) اِس پار کھڑا ہوا تو ہم دریا پار کر سکیں گے۔ اگر پار کھڑا ہوا تو پھر مشکل ہو جائے گی، دریا پار نہیں کیا جا سکے گا۔ میری معلومات کے مطابق یہاں صرف ایک ہی کشتہ ہے۔ لوگ اپنے ٹریکٹر اس پر لاد کر آر پار منتقل کرتے ہیں۔ یعنی اس پر لوڈ کر کے ہم اپنی لینڈ کروزر پار لے جا سکتے ہیں۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟“

میں نے کہا۔ ”جی میڈم! میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ بات کیجیے۔“

”ہم جھوک اللہ یار جانے کے بجائے اوپر کی جانب، جدھر سے پانی آتا ہے، ایک کچے راستے پر کشتے سے اُتریں گے۔ وہاں سے جمیل دستی کا ڈیرا بہ مشکل پندرہ منٹوں کی مسافت پر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم یہاں سے ناگ شاہ چوک جائیں، پھر مظفر گڑھ اور خان گڑھ سے ہوتے ہوئے براستہ پل عمر پور ہم جھوک اللہ یار کی طرف واپس آئیں۔ ہم وہاں تک پہنچنے کے لیے تلیری نہر کی پختہ پٹڑی پر بھی ڈرائیو لے سکتے ہیں۔ مگر اس روٹ سے وہاں جانے میں ہمیں کم از کم دو گھنٹے یا کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا۔“ وہ مجھے تفصیل سے بتا رہی تھی۔ ”تب تک سورج طلوع ہونے والا ہوگا اور ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

میں سمجھا کہ شاید وہ واپس جانے کا تہیہ کرنے لگی تھی، تبھی بولا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں سے لوٹ جاتے ہیں۔ صبح دم میں اور سخی محمد یا پیا جی اِس مشن پر نکلیں گے اور مغویان کو برآمد کر کے آپ کے پاس لے آئیں گے۔“

اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا، بولی۔ ”نہیں شہریار! تم نہیں جانتے کہ وہ دونوں کون ہیں؟ میں چاہتی ہوں کہ کسی کو بھی یہ علم نہ ہو کہ وہ دونوں کون ہیں...... اور جب تک میں انہیں کمینے پیرو ماچھی کے چنگل سے رہا نہیں کروا لیتی، چین سے بیٹھ نہیں سکتی۔“

مجھے اندازہ تھا کہ وہ دونوں اس کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ بڈھے نے اُسے ’چندو‘ قرار دیا تھا۔ میڈم نے اُسے ’بابا‘ اور اس کی بیوی کو ’اماں‘ کہا تھا۔

زیادہ قیاس یہی تھا کہ بڈھا میڈم کا باپ تھا جبکہ اغوا کی جانے والی بڑھیا اور بچہ، اس کی ماں اور بھائی تھے۔ چونکہ ہمارے ہاں خالہ، پھوپی وغیرہ کو بھی ’اماں‘ کہا جاتا تھا، اِس لیے میں ابھی تک کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کے کون تھے؟...... یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ میڈم کو بہت پیارے تھے؛ تبھی وہ رات کے اِس پہر میں اس خوفناک علاقے کی خاک چھاننے پر کمربستہ تھی۔

میں نے کہا۔ ”اوکے میڈم! آپ بہتر جانتی ہیں۔“

”تم یہ سوچو کہ پیرو ماچھی کی ان دونوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ان دونوں کی خاطر بھری دنیا میں کوئی بیس تیس ہزار روپے بھی تاوان میں دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ پھر...... اس بے غیرت نے انہیں کیوں اغوا کیا؟“

میں نے غلط سمجھا تھا کہ اس کا ارادہ متزلزل ہو گیا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس سے یہ اُلجھن سلجھائی نہیں جا رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”کوئی زمین جائداد کا تنازعہ تو نہیں ہے؟“

وہ بولی۔ ”نہیں...... یہ زمین بھی بابا کی نہیں ہے۔ وہ مزارعہ ہے۔ آدھ پر فصل کاشت کرتا ہے اور بکریاں چرا کر پیٹ پالتا ہے۔“ اس نے ایک طویل سانس سینے میں اُتاری اور بولی۔ ”سگریٹ بھی نہیں ہے؛ پی لیتی تو ذرا دماغ کی رگیں کھل جاتیں...... تم میں یہی خامی ہے شہریار! سگریٹ پیا کرو...... ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ اس بوڑھی عورت اور بچے کو پیرو ماچھی نے کیوں اغوا کیا ہوگا؟...... مجھے ان کی آوازیں کیوں سنائی گئی تھیں...... یعنی میرے کسی دشمن نے پیرو ماچھی کو ٹوکن دیا ہے۔ ہیں ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے۔“

اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا موبائل فون اُٹھایا۔ کوئی بٹن دبا کر اسکرین روشن کی۔ دیکھا، پھر مایوسی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”سوچا تھا کہ اس منحوس نمبر پر کال بیک کروں؛ شاید رابطہ ہو جائے مگر افسوس! یہاں سگنلز ہی نہیں ہیں......“

میں نے اس کے آدھے روشن چہرے پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں پیرو ماچھی کے ڈیرے پر دھاوا بولنا چاہیے۔ وہاں کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جو ہماری اُلجھن دور کر دے اور بتا دے کہ پیرو ماچھی نے کس کے کہنے پر یہ قدم اُٹھایا ہے۔ یوں ہم دریا پار کرنے کے عذاب میں پڑے بغیر اس کے پیچھے جائیں جس نے اماں اور سیمو کو اغوا کرایا ہے۔ کیا خیال ہے؟“

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا، زیرِ لب کہا۔

”اماں اور سیمو“ پھر ایک طویل سانس کھینچی، اُسے ننھے ننھے جھٹکوں سے خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”قسمت کو آزمانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اس نے فوراً فیصلہ کیا، فوراً ہی اس پر عمل کرتے ہوئے گیئر لگا کر ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میری توقع کے عین مطابق اب وہ نارمل ہو چکی تھی۔ سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر بیٹھی ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ ذہن کو دوڑا رہی تھی۔ کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک بولی۔

”تمہارے پاس کتنی گولیاں ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”چند ایک...... مجھے برسٹ مارنا پڑا تھا۔“

”دوسری گن میں...... میرا اشارہ لوٹی ہوئی گن کی طرف ہے۔“

”وہ فل ہے۔ فالتو راؤنڈز بھی ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”آپ پیرو ماچھی کے ڈیرے سے کچھ فاصلے پر کسی محفوظ جگہ پر گاڑی چھپا کر رُک جائیں۔ آگے میں اکیلا جاؤں گا اور معلومات حاصل کر لاؤں گا۔“

”کیوں؟“ اس نے چونک کر میری طرف رُخ کیا۔ ایسے ہی وقت میں گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے جلدی سے سامنے دیکھا اور اسٹیئرنگ وہیل کو دائیں جانب گھما دیا۔ اگر اُسے لمحہ بھر کی تاخیر ہو جاتی تو گاڑی کیچڑ بھرے گڑھے میں دھنس چکی ہوتی۔

دوسری مرتبہ اس نے میری طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی اور کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ ڈیرے پر نہ جاؤں؟“

”جی میڈم! یہ اکیلے آدمی کا کام ہے۔“

”یعنی میں آگ کے اس دہکتے ہوئے دریا میں تمہیں جھونک دوں اور خود بالکل محفوظ رہوں۔ ہیں؟“

”یہی سمجھ لیں۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”گولی تو تمہیں بھی لگ سکتی ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو اس طریقے سے محفوظ رکھنا نہیں چاہو گے جو طریقہ تم نے میرے لیے تجویز کیا ہے؟“ اس کے لہجے کی کاٹ نے مجھے چونکا دیا۔ ”یعنی ہم دونوں گولی کے ڈر سے یہیں گاڑی روک کر بیٹھے رہیں۔“

”میڈم! سردی بہت ہے۔ دریائی علاقے میں ہوا نم ہوتی ہے جس کی وجہ سے سردی بعض اوقات خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ یہ تجربہ آپ کو کچھ دیر پہلے ہوا تھا۔ آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں دیہاتی ہوں۔ سردی کو برداشت کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے آپ کو گاڑی

میں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔"

راستہ بہت پرپیچ اور دشوار ہوگیا تھا۔ ٹریکٹروں اور ریہڑیوں کی آمدورفت کی وجہ سے چکنی زمین پر نالیوں کی سی دو لائنیں جھاڑیوں کے بیچ سے گزر رہی تھیں جن پر ہم چل رہے تھے۔ کانہہ اور لائی کی ٹہنیاں گاڑی کی باڈی سے ٹکرا کر عجیب آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کیچڑ اور پھسلن کی وجہ سے میڈم نے گاڑی کی رفتار خاصی کم رکھی ہوئی تھی۔ پھر فور وِیل لیور دبا کر کیچڑ سے گاڑی نکالتے ہوئے بولی۔ "شہریار! انسان کبھی باہر کی سردی سے نہیں مرتا۔ جب بھی مرتا ہے، اپنے اندر اترنے والی سردی یا گرمی سے مرتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "جس طرح مرغی کو لپ اسٹک لگانا یا ہاتھی کو گود میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے، ایسے ہی دل کی دنیا کو آباد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ دل کبھی چاند تو کبھی سورج مانگتا ہے۔ فلک کے شہزادوں کو اس کی مٹھی میں اُتارنا پڑتا ہے یا بہلا پھسلا کر دھیان بدلنا پڑتا ہے ورنہ جینے نہیں دیتا۔"

وہ شاید راستہ بھول گئی تھی۔ تبھی چونک کر، بریک لگا کر اردگرد دیکھنے لگی۔ اس راستے سے کئی راستے نکلتے تھے۔ اس نے باتوں میں دھیان نہیں رکھا تھا اور بھٹک گئی تھی۔ بڑبڑائی۔ "اب کیا کروں؟"

گاڑی اس وقت بلند ٹیلا نما جگہ پر رکی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور نیچے اُتر گئی۔ چند قدم دور جا کر رُک گئی۔ میں نے بھی سیٹ چھوڑ دی اور گن سنبھالتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے چند لمحوں میں ہی بدن کو سن کر دیا تھا۔ یہ علاقہ چھوٹی بڑی مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا۔ کہیں پانی کا جوہڑ، کہیں جھنگی، کہیں اونچے درختوں پر مشتمل گھنے جنگل کا ٹیلا نما خطہ تو کہیں چٹیل ریتلا میدان...... ہم ایک پہاڑی نما ٹیلے پر کھڑے تھے جس کے درمیان میں سے راستہ گزرتا تھا اور اسے دو برابر گنبدوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ہوا کم و بیش بیس کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے گزر رہی تھی۔

میڈم ٹیلے کے اوپر کھڑی تھی۔ ایک طرف ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "وہاں، دریا کے پار، جھوک اللہ یار کا پتن ہے۔ اس سیدھ میں آگے روہیلانوالی بستی ہے۔ اس طرف! بہ مشکل پانچ سات کلومیٹر کے فاصلے پر خان گڑھ واقع ہے۔ ہم نے اسی طرف جانا ہے۔ مگر پہلے پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جانا ضروری ہے۔ مجھے اَب سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ اِدھر ہے یا اُدھر...... بھول گئی۔"

میں نے دریا کی جانب نظر دوڑائی۔ اندھیرے کی گود میں ایک بل کھاتی سفید لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے کناروں والا، گھنے جنگل پر مشتمل ایک جزیرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اور جنگل کے بیچ ایک بڑی سی جھیل حائل تھی۔ اسے مقامی زبان میں 'ڈھنڈ' کہا جاتا تھا۔ شکاری ایسی جگہوں پر جال لگا کر مچھلیاں پکڑتے تھے۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ "میڈم! گاڑی میں چلیں۔ سردی بہت ہے۔"

"تھوڑی دیر پہلے تو تمہیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ تب تم چھتیں پھلانگتے پھر رہے تھے۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تب میں ایکشن میں تھا۔" میں نے خفت سے کہا۔

"ہم تو اَب بھی حالتِ جنگ میں ہیں۔" وہ میری طرف پشت کر کے کھڑی ہوگئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، جدھر سے ہم آئے تھے۔ پھر ایڑیوں کے بل گھومی اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی۔ شاید اسے منزل کا کوئی کلیو مل گیا تھا۔ ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔ ہم دریا کے بہاؤ کے اُلٹے رُخ چل رہے تھے۔ نصف کلومیٹر چلنے کے بعد میڈم نے دائیں ہاتھ ٹرن لیا۔ اِس طرف راستہ نہیں تھا۔ وہ بڑی مہارت سے ایک ننھے سے ڈھنڈ کے کنارے پر ڈرائیو کر رہی تھی۔ کیچڑ کی وجہ سے گاڑی متعدد بار پھسل کر ڈھنڈ کے پانی کی طرف لپکی مگر اُس نے کمال مستعدی سے سنبھل کر گاڑی کو پانی میں گرنے سے بچالیا۔ میں نے تحسین آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ "میڈم! یوں لگتا ہے جیسے آپ نے اس علاقے کی گرداوری کر رکھی ہو۔"

وہ مسکرائی، پھر ہنسنے لگی۔ بولی۔ "واہ شہریار! کیا تشبیہ دی ہے تم نے...... میں نے واقعی اس علاقے کو اچھی طرح کھنگال رکھا ہے۔"

مجھے تعجب ہوا۔ پوچھا۔ "سیر کی غرض سے......"

اس نے مبہم جواب دیا۔ "یہی سمجھ لو۔"

"ان جنگلوں میں جانور بھی ہوتے ہیں؟"

"ہاں...... ڈاکوؤں کے علاوہ بھیڑیے اور جنگلی بلے...... سنا ہے کہ ہرن بھی ہوتے ہیں مگر میں نے آج تک اس علاقے میں کوئی ہرن دیکھا نہیں ہے۔"

"کیا یہ آپ کا آبائی علاقہ ہے؟"

وہ مسکرائی۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ بولی۔ "تم جو پوچھنا چاہتے ہو، مناسب وقت آنے پر راز خود بتا دوں گی۔"

میں خفت سے بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس ایسے ہی پوچھ بیٹھا۔"

ڈھنڈ ختم ہوگیا۔ جنگل شروع ہوگیا۔ دس پندرہ میٹر کے بعد لینڈ کروزر کے گزرنے کے لیے جگہ بھی معدوم ہوگئی۔ اونچے درختوں اور بیچ میں اگی ہوئی خاردار جھاڑیوں میں سے گزرنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا، گاڑی کہاں سے گزرتی۔ میڈم نے بتیاں گل کیں، ہینڈ بریک کا لیور کھینچا نیچے اُترتے ہوئے مجھے دونوں گنیں اُٹھا لانے کا حکم دیا۔ میرے نکلنے اور دروازہ بند کرنے تک وہ چند قدم دور جنگلی کیکر کے گھنے جھنڈ تک پہنچ چکی تھی۔ باہر تیز یخ بستہ ہوا بدن کو چیر رہی تھی۔ جھنڈ کے اندر ہوا نہیں تھی مگر خون کو منجمد کرنے والی خنکی استقبال کرنے کو موجود تھی۔

"میری یادداشت کے مطابق یہاں تنگ اور دشوار گزار راستہ ہونا چاہیے تھا جس پر سے گاڑی گزر جاتی جبکہ یہاں تو پیدل چلنا مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ میں بھول گئی ہوں۔" وہ متذبذب انداز میں بولی۔ "تھوڑا آگے تک جاتے ہیں۔ شاید کچھ یاد آ جائے۔"

جنگلی کیکر کی آکٹوپس کی طرح پھیلی ہوئی خاردار ٹہنیوں سے بچ کر چلتے ہوئے ہم بہ مشکل چند قدم ہی بڑھے تھے کہ اچانک کانوں میں گاڑی کے انجن کے گھرگھرانے کی آواز پڑی۔ پلٹ کر دیکھا۔ دریا کی جانب بلند قامت درختوں پر ہیڈ لائٹس کی روشنی تھرک رہی تھی۔ میڈم کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ پونٹے والی سڑک پر کوئی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔"

"ہوں......" میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ہم دونوں ٹھہر گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہیڈ لائٹس کی لہراتی ہوئی روشنی ڈھنڈ پر پڑی۔ میڈم بولی۔ "جو بھی، ادھر آ رہا ہے۔ ہمیں کہیں چھپنا ہوگا۔"

میں نے چہار اطراف نگاہ دوڑائی۔ بائیں جانب بیس قدم دور گھنی جھاڑیاں دکھائی دیں۔ چھپنے کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔ میں نے میڈم کو بتایا۔ اس نے جست بھری اور ننھے سے گڑھے کو عبور کرتی ہوئی اس طرف بھاگی۔ میں نے تقلید کی۔ کانٹوں کی بدولت جھاڑیوں تک پہنچنا محال تھا۔ جیسے تیسے پہنچے، میں نے میڈم کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا، کہا۔ "مجھے پہلے جانے دیجیے۔ ہو سکتا ہے، جھاڑیوں میں کوئی سانپ یا جنگلی جانور چھپا ہو۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور سخت لہجے میں کہا۔ "فضول باتیں مت کرو، میرے پیچھے آؤ۔ یہ بات یاد رکھا کرو کہ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ سمجھ میں آیا کہ میں نے کچھ زیادہ ہی مہر و خلوص کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ اس کا کہنا بجا تھا کہ وہ بچی نہیں تھی اور نہ کوئی گھریلو عورت ہی تھی کہ میں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا۔ اس نے ٹہنیوں کو ہٹا کر راستہ بنایا اور سر جھکا کر گھس گئی۔ میں اُس کے عقب میں تھا۔ دل ہی دل میں شکر کیا کہ وہ جھاڑیاں خاردار نہیں تھیں ورنہ بہت مشکل پیش آتی۔ ایسے ہی وقت میں فضا گھرگھراہٹ کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ گاڑیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شاید تین یا چار...... اتنی رات گئے اس طرف کوئی نہیں آتا تھا۔ جو بھی آیا تھا، وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا تھا۔ ہم جھاڑیوں کے قلب میں دس بارہ فٹ تک گھس کر رُک گئے۔ کان لگائے۔ میرے اندازے کے مطابق آنے والی گاڑیاں لینڈ کروزر کے قریب آن رکی تھیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس کی روشنی عین اُس جگہ پر پڑ رہی تھی جہاں کچھ دیر پہلے ہم موجود تھے۔ چند دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے ایک سے زیادہ لوگ لینڈ کروزر کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گئے ہوں۔

جھاڑیاں بہت گھنی تھیں۔ کوشش کے باوجود ہم کچھ نہ دیکھ پائے۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں دبیز اندھیرا تھا۔ باہر روشنی تھی۔ ہم تک صرف روشنی کا احساس پہنچ رہا تھا۔ میں نیچے بیٹھ کر جھاڑیوں کے بیچ سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میڈم میرے عقب میں مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئی، سرگوشی میں بولی۔ "کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ہمارے تعاقب میں یہاں آئے ہیں۔"

"نہیں......" وہ پورے وثوق سے بولی۔ "ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ فائرنگ کی آواز سن کر کسی نے پولیس کو مطلع کر دیا ہو اور پولیس ادھر آ نکلی ہو۔"

"نہیں میڈم!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ بڈھے کے مکان تک آتے۔ ادھر تک ہمارا پیچھا نہ کرتے کیونکہ انہوں نے ہمیں اس طرف آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ ہم فائرنگ کے بعد کچھ دیر تک دِتے ماچھی سے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے اور سڑک پر آنے تک ہم نے کسی گاڑی کی آواز نہیں سنی تھی۔ پھر کس طرح ان لوگوں نے اتنے کم وقت میں مکان کا جائزہ لے لیا، یہ بھی طے کر لیا کہ ہم اس طرف آئے ہیں اور ہمارے یہاں رُکنے کے چند ہی لمحوں بعد یہاں پہنچ گئے...... نہیں، ایسا عملی طور پر ناممکن ہے۔"

وہ بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو مگر یہ ہماری پولیس ہے۔ واردات کے دوسرے دن موقع ملاحظہ کرنے پہنچتی ہے۔ مجرموں تک کبھی نہیں پہنچتی، مجرم اس تک پہنچتے ہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''پیرو ماچھی بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ دریا پار گیا ہوا ہے۔ ویسے بھی اس کی آدھی سے زیادہ نفری ہلاک ہوگئی ہے۔ دتے ماچھی کے بعد اس کے پاس دو آدمی بچے ہیں جبکہ یہ زیادہ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔''

''تو پھر یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟'' وہ متردد ہوگئی۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا جب میرے کانوں میں ایک پاٹ دار آواز پڑی۔ ''اوئے اِدھر دیکھ...... کوئی جھنگی میں چھپا ہوا نہ ہو۔''

ایک اور بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ''گاڑی تو ایک دم فرسٹ کلاس ہے چودھری...... لگتا ہے کوئی امیر جوڑا ہنی مون پر نکلا ہے۔''

اسے جواب میں ایک شاندار گالی سے نوازا گیا۔

''اوئے بھوتنی کے! یہ تیرے باپ کی سیرگاہ ہے کیا؟ دیکھو...... کسی کو زبردستی یہاں نہ لایا گیا ہو۔''

وہ شخص بولا جسے گاڑی کی تلاشی لینے کا حکم صادر ہوا تھا۔ ''چودھری صاحب...... گاڑی بالکل خالی ہے لیکن پتا چلتا ہے کہ کوئی ابھی یہاں سے نکلا ہے۔''

''کیا یہ بات گاڑی کے میٹر پر لکھی ہوئی ہے؟'' چودھری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں چودھری صاحب! گاڑی کا انجن گرم ہے اور اندر گرمی ہے۔ کسی نے تھوڑی دیر پہلے انجن اور ہیٹر کو بند کیا ہے۔ شاید ہمارے ڈر سے نکل بھاگا ہے۔''

''ہاں بھئی...... اوئے غضنفر! سن رہے ہو ناں کالو خان کی بات...... اس کے ڈر سے کوئی اپنی نئی نکور فور ویل جیپ جنگل میں چھوڑ بھاگا ہے۔ ہشکے بھئی ہشکے!''

چند آدمیوں کا ملا جلا قہقہہ گونجا۔ جدھر ہم چھپنے سے پیشتر کھڑے تھے، اُدھر ایک غیر معمولی فریکوئنسی والی تیز آواز ابھری۔ ''سر! ادھر تو کوئی نہیں ہے۔ میں نے سارا جھنڈ کھنگال مارا ہے۔''

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ کوئی بھی اتنے مختصر وقت میں جھنڈ کے ایک چوتھائی حصے کا جائزہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ شاید نہ دکھائی دینے والے جنگلی جانوروں سے ڈر گیا تھا یا کانٹوں کے خوف میں مبتلا ہو کر جھوٹ بول گیا تھا۔ پھر اسے ان گھنی جھاڑیوں کو دیکھنے کا حکم صادر ہوا جس میں ہم چھپے ہوئے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ قریب آئی۔ اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر اردگرد دیکھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ اگر جھاڑیوں کے اندر بھی گھس آتا تب بھی اُسے ہم نظر نہ آتے۔ اس نے حکم دہندہ چودھری کو مطمئن کرنا تھا، کر دیا اور لینڈ کروزر والوں کو کوستا ہوا لوٹ گیا۔

اُسے چودھری نے ڈانٹا ڈپٹا اور سخت سست کہا۔ پھر اس نے چند اور لوگوں کو ہماری تلاش پر روانہ کیا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ تلاش کرنے والے اس جھنگی کے قریب بھی آئے، جس میں ہم سانسیں روکے بیٹھے ہوئے تھے اور ٹارچوں کی مدد سے جھاڑیوں کے بیچ جھانکتے رہے۔ ٹارچ کی تیز روشنی بے ترتیب ٹہنیوں کے بیچ سے چھنتی ہوئی ہم تک پہنچی مگر میری توقع کے مطابق وہ ہماری موجودگی کو بھانپ لینے میں ناکام رہے۔

پھر قدرے بلند آواز میں ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ''کوئی ہے...... یہ گاڑی کس کی ہے؟ اگر اس گاڑی کا مالک سن رہا ہے تو فوراً اپنی گاڑی کے پاس آجائے......''

مجھے میڈم کی سانسوں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے جسم کا آدھا بوجھ بھی مجھ پر ڈال رکھا تھا۔ بولی۔ ''مجھے تو یہ پولیس والے لگتے ہیں۔''

میں نے جواباً سرگوشی کی۔ ''شاید!''

ایسے میں ایک دروازہ کھلا، بند ہوا اور ہماری لینڈ کروزر کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ چونکہ آنے والوں نے اپنی گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ رکھے تھے، اس لیے ہمیں فوراً پتا چل گیا کہ انہوں نے ہماری لینڈ کروزر ہی اسٹارٹ کی تھی۔

میڈم گھبرا کر بولی۔ ''یہ کیا؟ ان لوگوں نے ہماری گاڑی کیوں اسٹارٹ کر دی ہے؟''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''تو کیا آپ گاڑی کی چابی اگنیشن میں ہی چھوڑ آئی تھیں؟''

''ہاں! یہ غلطی مجھ سے ہوگئی ہے۔''

ایک بھرائی ہوئی کرخت آواز سنائی دی۔ ''امانت! تم اسی گاڑی میں ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ...... نہیں، بلکہ ہمارے درمیان میں چلو۔ واپسی پر اسے تھانے لے چلیں گے۔ جس کی ہوگی، آکر لے جائے گا۔''

امانت بولا۔ ''صاحب! یہ جیپ کسی بڑے آدمی کی لگتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''بکواس نہ کرو۔ بڑا آدمی اس وقت جنگل میں اپنی زوجہ محترمہ کو ڈانس کی ٹریننگ دلانے لائے گا...... ابے بھوتنی کے! مجھے لگتا ہے کہ پیرو گینگ اسے شہر سے چوری کر

لایا ہے۔ یاد رکھو کہ ہم نے اس گاڑی کو بڑی مشکل سے لٹیرے ڈاکوؤں سے چھینا ہے اسے......''

''پر چودھری صاحب......''

''زیادہ ٹال مٹول نہ کر...... جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔ بات کم ہے۔ یہ نہ ہو کہ پیرو گینگ فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے اور ڈی ایس پی صاحب ہماری کھال کھنچوا دیں۔''

چودھری نے اُسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

ایک ساتھ کئی دروازے بند ہوئے اور آن کی آن میں کسی سخت مزاج ڈی ایس پی صاحب کے اختیاراتی پلاس سے اپنی کھال بچانے والے ہماری گاڑی لے کر چلتے بنے۔

میڈم نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے جھنگی سے باہر نکلے۔ جھنگی میں سردی زیادہ تھی۔ تبھی ہم دونوں ہاتھ رگڑ کر ہاتھوں کو حرارت پہنچا رہے تھے۔ دیکھا! میدان صاف ہو چکا تھا۔ وہ ڈھلوان خالی تھی جس پر میڈم نے لینڈ کروزر کھڑی کی تھی۔ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر، ڈھنڈ کی دوسری جانب گاڑیوں کی ایک قطار جاتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کی ٹیل لائٹس کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ہماری لینڈ کروزر سمیت ان کی تعداد چھ تھی۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے آگے جانے والی گاڑیاں پچھلی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں چند لمحوں کے لیے نہائیں۔ پتا چلا کہ وہ سبھی پولیس کی موبائل وین تھیں۔ ان کی گفتگو سے ہمیں علم ہوا تھا کہ وہ پیرو گینگ پر ریڈ کرنے جا رہے تھے۔ ریڈ کا انجام کیا ہونا تھا؛ یہ پولیس کی پیشہ ورانہ کارکردگی کو دیکھ کر قبل از وقت طے کیا جاسکتا تھا۔

میڈم نے زمین پر زور سے پاؤں مارا اور بے حد غصے سے بولی۔ ''شٹ...... ان کمینوں کو بھی اسی وقت ادھر آنا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی برسٹ میں ڈھیر کردوں۔''

گاڑیوں کی قطار کچھ فاصلے پر دریا کی مخالف سمت میں جنگل میں گھس کر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میڈم نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے اور برہمی سے بولی۔ ''میں اگر راستہ بھول نہ جاتی تو ہم ان لوگوں سے پہلے پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جاتے اور اپنا کام کر کے ہم لوگ وہاں سے نکل جاتے۔ مگر افسوس! سارا کیا کرایا کھوہ کھاتے پڑ گیا۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اور پولیس کے نرغے میں آکر پیرو ماچھی کے ساتھی قرار پاکر بھون دیے جاتے......''

ہم دونوں ڈھنڈ کے کنارے گاڑیوں کے ٹائروں سے بننے والی لکیروں پر متوازی چل رہے تھے۔ ہمارا رُخ اسی جنگل کی طرف تھا جس میں گاڑیاں داخل ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! میرا خیال ہے کہ ہم کچھ ہی دیر میں ڈیرے پر پہنچ جائیں گے۔''

اس نے میرے ہاتھ سے ایک گن پکڑتے ہوئے کہا۔ ''دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے......'' اس نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے جس کی وجہ سے وہ گرم تھے۔ گن ٹھنڈی تھی۔ تبھی اُس کے منہ سے کلمۂ حیرت نکل گیا۔ ''اف!...... یہ تو برف کے مانند ٹھنڈی ہے۔''

ڈھنڈ کے ٹھنڈے پانی سے ٹکرا کر اُٹھنے والی ہوا یخ بستہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم باقاعدہ کپکپانے لگے۔ ہماری آوازیں بھی لرزنے لگیں۔ میڈم بولی۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا۔ یہاں بہت سردی ہے۔''

یخ بستہ ہوا بدن کے پار ہو رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ جب ہم بڈھے کے کچے گھر میں اچھل کود کر رہے تھے، ہمیں سردی کا مطلق احساس نہیں ہوا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے برابر چلتی ہوئی میڈم کو دیکھا۔ مجھے سردار حیدر خان کی بیلے والی حویلی یاد آگئی جہاں سے رات گئے نکلا تھا اور جلدی میں کوئی گرم کپڑا، دیا سلائی یا سردی سے بچاؤ کے لیے کچھ بھی اُٹھا نہیں پایا تھا۔ حویلی سے نہر کے پل تک، طے کی جانے والی مسافت کو میں شاید عمر بھر نہیں بھول پاؤں گا۔ وہی غلطی میں نے دہرائی تھی۔ ملتان سے چلتے ہوئے میں نے سردی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ میڈم نے چونکہ خاصا گرم سوٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا، اس لیے سردی کے اس جانکاہ محاذ پر اس کی حالت مجھ سے بہتر تھی۔ اسے بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا، تبھی اس نے میرے ہاتھ سے گن پکڑی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں اپنا ایک ہاتھ سائڈ والی جیب میں ڈال کر گرم کرنے کے قابل ہو گیا۔

چاند ایک سیاہ بدلی کی اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ ماحول پر چھائی ہوئی چاندنی ماند پڑنے لگی تھی اور اندھیرا بتدریج گہرا ہونے لگا تھا۔ ہماری رفتار کم نہیں تھی مگر راستے کی ناہمواری، پھسلن کا احتمال اور راستے سے لاعلمی کے باعث ہمیں چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ دائیں جانب چکنی مٹی تھی۔ بائیں ہاتھ ریتلا میدان تھا۔ ہم دونوں کی سرحدی پٹی پر چل رہے تھے جب میڈم نے مجھے کہا۔ ''شہریار! چکنی مٹی اگر

گیلی ہو تو اس پر چلنا محال ہو جاتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے توجہ ہٹنے سے چلنے والا سر کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم خاصی بے پروائی سے چل رہے ہو۔ مجھے خدشہ ہے کہ گر جاؤ گے۔''

اچانک اس کا پاؤں کیچڑ پر پڑا اور وہ پھسل کر 'دھپ' کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گئی۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ پھسل کر گرنا بڑا عجیب حادثہ ہوتا ہے۔ بجائے ہمدردی کے اظہار کے، دیکھنے والوں کے لبوں پر قہقہہ مچل جاتا ہے۔ میں نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ مجھے اس کی ناراضی کا اندیشہ تھا مگر اسے کوئی جھجک نہیں تھی۔ اسی لیے وہ بجائے برہم یا شرمندہ ہونے کے، ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس پر گزشتہ طویل دورانیے سے گہری سوگوار کیفیت طاری تھی جس سے اس نے آخر کار نجات حاصل کر لی تھی۔ میں اُسے اُٹھانے کے لیے بڑھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''میڈم! چوٹ تو نہیں لگی؟''

وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''آپ کیوں ہنس رہی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''اصولاً تمہیں ایسا کرنا چاہیے تھا۔ تم نے نہیں کیا، میں نے سوچا، میں کر لوں۔ کسی ایک کو تو ہنسنا چاہیے ناں۔''

اپنے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھنے لگی۔ کولھوں کے بل گرنے کی وجہ سے پینٹ کا عقبی حصہ بھی کیچڑ زدہ ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کا جائزہ لینے کے بعد بولی۔ ''سوٹ کا ستیاناس ہو گیا ہے۔'' پھر کندھے اُچکا کر بولی۔ ''خیر! تمہیں تنبیہ کر رہی تھی، خود ہی گر گئی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ چلو!''

میں نے اس کی گن اُٹھا کر کندھے سے لٹکا لی اور چل پڑا۔ وہ جوگنگ کے سے انداز میں دوڑتی ہوئی میرے برابر پہنچی اور بولی۔ ''شہر یار! ہم تھوڑی دیر میں پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جائیں گے جہاں پولیس کی بڑی نفری ہمارے استقبال کے لیے موجود ہو گی۔ کیا تم نے یہ سوچا کہ ہم ان سے اپنی گاڑی کس طرح حاصل کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ بہتر جانتی ہیں۔''

اس نے منہ بنا کر مجھے دیکھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد تفکر آمیز لہجے میں بولی۔ ''ہمارے پاس یہاں موجودگی کا جواز نہیں ہے۔ کوئی معقول سا جھوٹ تراشو ورنہ وہ ہمیں گاڑی نہیں دیں گے۔ یہ بھی بڑی مصیبت ہے کہ یہاں سگنلز بھی نہیں ہیں جس کی وجہ سے فون پر کسی سے رابطہ نہیں کیا جاسکتا۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ ویسے ماچھی کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کے مطابق ڈیرے پر صرف ایک آدمی موجود تھا۔ اب اس تک رسائی ممکن نہیں رہی تھی کیونکہ پولیس ہمیں اپنے حصار کے اندر نہیں جانے دے گی۔ اگر ہم چھپ چھپا کر ڈیرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو پھر ہمیں پولیس کی اندھا دھند فائرنگ میں باہر نکلنے کا موقع نہیں ملنا تھا۔ ایسی حالت میں بہتر یہی تھا کہ ہم اپنی گاڑی کی فکر کرتے۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مالِ غنیمت کے علاوہ بھی چند نوٹ موجود تھے مگر کم تھے۔ ان نوٹوں سے کسی وردی پوش کو خریدنا محال تھا۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ مجھے پولیس سے تک مکاؤ کا عملی تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہت سوچا مگر کوئی معقول بہانہ سجھائی نہیں دیا تو میں نے مایوسانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم پولیس کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔''

اسی اثنا میں ہم سطح زمین سے آٹھ دس فٹ بلند واقع خودرو جنگل میں داخل ہو گئے۔ دو متوازی نالیوں والا راستہ جنگل میں بل کھا کر یوں غائب ہو رہا تھا جیسے سانپ لہرا کر بل میں گھس جاتا ہے۔ میڈم نے بے ساختگی سے کہا۔ ''ہاں! یہی راستہ پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جاتا ہے۔ میں نے اس جھنڈ کی طرف جانے کی غلطی کی تھی......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک تیز چیختی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ کوئی اہلکار مائیکروفون پر مقامی زبان میں اعلان کر رہا تھا۔ ''پولیس نے ڈیرے کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ چاروں طرف نفری تعینات ہو چکی ہے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ بھی ڈیرے کے اندر موجود ہیں، وہ اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر باہر آ جائیں ورنہ انہیں برے انجام تک پہنچا دیا جائے گا۔''

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور رُک گئے۔ آگے جانا بے سود تھا۔ خطرے سے خالی بھی نہیں تھا کیونکہ پیرو ماچھی اور پولیس کے مابین خوف ناک میچ کھیلا جانے والا تھا۔ میں نے آواز سے اندازہ کیا کہ مائیکروفون والا مجھ سے کم و بیش ایک فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا بول رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے الفاظ بدل کر اعلان کر رہا تھا۔ متن ایک ہی تھا کہ پیرو گینگ کے تمام ارکان ہتھیار ڈال کر گرفتاری دے دیں ورنہ انہیں گولی ماردی جائے گی۔

میڈم نے موبائل فون نکالا۔ اسکرین روشن کی اور وقت دیکھ کر بڑبڑائی۔ ''دو چالیس...... شہر یار! ہم کس وقت ملتان سے نکلے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''پونے گیارہ بجے تھے۔ یعنی ہمیں شہر سے نکلے تین گھنٹے ہونے والے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''کیا ہمیں ڈیرے کی طرف جانا چاہیے؟''

''وہاں جا کر کیا کریں گے؟'' میں چونکا۔

''صورتِ حال کا جائزہ لیں گے۔ اگر موقع ملا تو اپنی گاڑی نکال لائیں گے۔''

''میڈم! وہاں ہمارا دکھائی دینا ہمارے لیے خطرناک بہت ہو گا۔'' میں نے تشویش آمیز لہجے میں باور کرایا۔

''تو پھر ان کے لوٹنے کا انتظار کیا جائے؟''

''بہتر تو یہی ہے......'' میں نے اپنی دانست میں بہتر مشورہ دیا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور راستے سے ہٹا کر درختوں کی طرف چل دی۔ اس کا نہ اور لائی کے غیر معمولی گھنے جنگل میں کیکر کے بلند قامت درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم جنگل کے کنارے پر چلتے ہوئے چند گز دور پہنچ کر رُک گئے۔ ایک طرف جنگل تھا۔ دوسری طرف کٹاؤ یافتہ گزرتا...... وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بولی۔ ''شہر یار! ایک آئیڈیا سوجھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں پولیس والوں کو الو بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''وہ کیسے میڈم؟''

میرے اور اس کے بیچ دو تین فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ وہ میری جانب کھسک آئی۔ انہی ساعتوں میں چاند سیاہ بدلی سے دامن چھڑا کر دنیا کو دیکھنے لگا۔ پہلے سے قدرے شوخ چاندنی پھیل گئی۔ دریا کی سفید لکیر، دلہن کے پاؤں میں بندھی ہوئی چاندی کی پازیب سی، نظروں کو بھلی لگنے لگی۔ میڈم شکیلہ دریا پر نظریں جمائے شوخ انداز میں گویا ہوئی۔ ''تم نے سنا تھا، پولیس والا کیا کہہ رہا تھا؟''

پولیس والوں کی بہت سی باتیں ہم نے سنی تھیں جب ہم ڈھنڈ کے پاس گھنی جھنگی میں دبکے بیٹھے تھے۔ وہ نہ جانے کس بات کا تذکرہ کر رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''چودھری کو کسی اہلکار نے رپورٹ دینے کے بعد کہا تھا کہ 'لگتا ہے کوئی امیر جوڑا ہنی مون پر نکلا ہے'...... یاد کرو!''

میں جھینپ کر بولا۔ ''میڈم! وہ تو بکواس کر رہا تھا، ایسی باتیں یاد رکھنے کی کہاں ہوتی ہیں۔''

رات کے سناٹے میں جلترنگ سی بج اُٹھی۔ اس کی ہنسی

زندگی سے بھرپور تھی۔ اس نے یک لخت مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑ لیا، بہ مشکل گھنٹیوں کی کھنک دباتے ہوئے بولی۔ ”ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کانسٹیبل بکواس نہیں کر رہا تھا، سچ کہہ رہا تھا۔ ہم جس کمیونٹی کے لوگ ہیں، وہاں ایسی خرمستیاں روا ہیں۔ ہم بھی جوانی کی آگ پر دریا کی برف ڈالنے ادھر آ نکلے تھے۔ کئی گاڑیوں کو ادھر آتا دیکھ کر ڈر گئے تھے اور گاڑی چھوڑ کر چھپ گئے تھے...... بس!“

حیرت ہوئی کہ اس نے کتنی بڑی بات کو کتنے عام سے انداز میں لیا تھا۔ مایوسی ہوئی کہ اس خام کہانی پر کسی کو یقین دلانا بہت محال تھا۔ اس نے میرا ردِعمل بھانپ لیا اور چیلنج کرنے کے سے انداز میں بولی۔ ”دعا کرو، پولیس جلد آپریشن سے فارغ ہو جائے تاکہ ہمارا وقت بچ جائے۔ تم بھی دیکھ لو گے کہ میں کیا کرسکتی ہوں۔“

اس کے انداز نے مجھے باور کرا دیا کہ اس نے دل ہی دل میں اس احمقانہ سوچ پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے اُسے مؤدبانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ بہت بھونڈی کہانی ثابت ہوگی اور ہمیں بقیہ رات تھانے کی حوالات میں گزارنا پڑے گی مگر وہ مجھ سے متفق نہ ہوئی۔

مائیکروفون سے متواتر پھوٹنے والی آواز خاموش ہو گئی۔ ہمیں یہاں بیٹھے دس منٹ کے لگ بھگ وقت ہو گیا تھا جب پیرو ماچھی کے ڈیرے کی طرف سے پہلے فائر کی گونج دار آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والوں نے ”نعرۂ تکبیر! اللہ اکبر“ کی یک آواز صدائے پُرجوش بلند کی۔ پھر فائرنگ کا لگاتار سلسلہ چل نکلا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فائرنگ یک طرفہ تھی یا دوطرفہ......

میڈم بڑے انہماک سے دریا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چاندنی سمٹ رہی تھی اور اس کے خال و خد کو مجھ پر آشکار کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، یوں لگا جیسے اس نے بڈھے کی بیوی اور بچے کے اغوا کو وقتی طور پر فراموش کر دیا تھا۔ وہ قطعاً مغموم، افسردہ یا متفکر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میڈم! ایک بات پوچھوں؟“

اس نے اپنا رُخ بدلے بغیر کہا۔ ”ہاں ہاں! پوچھو۔“

”آپ کا مزاج بڑا عجیب سا ہے۔ کسی پل پریشان، کسی ساعت برہم تو کسی لمحے بچوں کی طرح شوخ...... ایسا کیوں ہے؟“

وہ تھوڑی نخوت سے بولی۔ ”میں ڈیفرنٹ ہوں۔“

”کیوں؟“

”تم بتاؤ، تم اتنے پیچیدہ کیوں ہو؟ کسی وقت بہت چالاک، دلیر اور فتنہ پرداز دکھائی دیتے ہو تو کسی وقت لوح، دیہاتی اور بزدل...... ایسا کیوں ہے؟“ اس نے میری نقل اتاری۔

میں نے بات بنانی چاہی مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ بولی۔ ”اس لیے کہ تم بھی ڈیفرنٹ ہو۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب تمہارے پاس نہیں ہے۔ ہے نا؟...... میرے پاس بھی نہیں ہے۔“

اسی لمحے فائرنگ رُک گئی۔ میڈم نے چونک کر بڑی تیزی سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ یہ اُس کی غیر اختیاری حرکت تھی ورنہ ہمارے عقب میں سوائے گھنے جنگل کے کچھ نہیں تھا۔ کوئی پانچ سات منٹ بعد گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ریڈ مشن مکمل ہو چکا تھا اور پولیس کی فاتحانہ واپسی عمل میں آ رہی تھی۔

میڈم تیزی سے بولی۔ ”گنیں اس جھاڑی کے پیچھے رکھ کر میرے پیچھے آؤ۔ ہم دونوں نے چند دن پہلے شادی کی ہے...... یاد رکھنا!“

اس کے ساتھ ہی اُس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر بلٹ بیلٹ اور دونوں بندوقیں جھاڑی کے پیچھے پھینکیں اور اس کے تعاقب میں تھڑے سے نیچے ریتیلی جگہ پر چھلانگ لگا دی۔ وہ آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ میں اس کے نقشِ قدم پر دوڑ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ریتیلے میدان میں چکرانے لگی۔ پولیس کی گاڑیاں تیزی سے چلی آ رہی تھیں۔ میڈم مجھ سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر دوڑ رہی تھی۔ دوڑتے دوڑتے منہ سے ’ہاؤ، ہو‘ کی تیز آوازیں نکال رہی تھی۔ اچانک رُکی، پلٹ کر چیخی۔ ”ہم زندگی کو انجوائے کر رہے ہیں، ڈو یو نو ڈارلنگ...... کم آن...... زندگی پھر کبھی دریا پر اس طرح کھیلنے کا موقع دے گی یا نہیں...... آج دے رہی ہے۔ انجوائے اِٹ......“

وہ پارک میں کھیلتی ہوئی دس سالہ بچی کی طرح اچھل کود رہی تھی۔ میں نے پھولی ہوئی سانس میں قدرے برہمی سے کہا۔ ”میڈم! یہ کیا حماقت ہے؟“

میں رُکا تو وہ کچھ دور ہو گئی۔ اسی لمحے جنگل میں پولیس کی پہلی گاڑی نمودار ہوئی۔ میڈم اس کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں نہا گئی۔ ہاتھ لہرا کر دوڑتے ہوئے چیخی۔ ”کم آن ڈارلنگ...... اس حماقت پر عقل نثار...... اس لمحے پر ہزاروں تنہا صدیاں قربان......“

اس کی آواز سناٹے میں بہت دور تک سنائی دے رہی تھی اور وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی جانب بلا رہی

تھی۔ مجھے ناچار اُس کی طرف دوڑنا پڑا۔ وہ پولیس کی گاڑی کی طرف بھاگ رہی تھی۔ جونہی گاڑی کے قریب پہنچی، ایک ذرا رُکی پھر پلٹ کر میری جانب دوڑی۔ میرے سنبھلنے سے پیشتر اچھل کر مجھ پر لد گئی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اسے لیے زمین پر آن گرا۔ وہ تڑپ کر پہلو کے بل ہو گئی اور اپنا چہرہ میرے چہرے پر رگڑنے لگی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس ناٹک سے پولیس کو کیا دکھانا چاہتی تھی؟ تب سمجھ میں آیا جب پولیس کی اگلی گاڑی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گئی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پچھلی گاڑیاں بھی رُک گئیں اور ان کے ڈرائیور ہارن بجانے لگے۔ چند لمحوں بعد، جب گاڑی کے اندر بیٹھے ہوؤں کو ہمارے خالی ہاتھ ہونے کا یقین ہو گیا، گاڑی کا دروازہ کھلا اور بھاری رعب دار آواز گونجی۔ ”اوئے! تم کون ہو...... یہ فحاشی بند کرو اور ہاتھ سروں سے بلند کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

میڈم نے سرگوشی کی۔ ”یہ تو وہی چودھری ہے۔ تم نے کچھ نہیں بولنا۔ میں اس سے نمٹتی ہوں۔“

ہم دونوں بیک وقت کھڑے ہوئے۔ میڈم نے میری کمر میں ہاتھ حائل کیا، میرا بازو پکڑ کر اپنے کندھوں پر ٹکایا اور چیخ کر کہا۔ ”تم ہماری پرائیویسی، جسے تم نے فحاشی کا نام دیا ہے، دیکھنے کے لیے یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہیے تھی ناں......“

چودھری کے عقب میں کئی قہقہے گونجے اور ایک شوخ آواز سنائی دی۔ ”ڈوجا پا سا کرو چودھری صاحب! آپ کو شرم آنی چاہیے تھی ناں!“

چودھری نے گردن موڑ کر کسی کو ڈانٹا۔ ”اوئے اپنی گندی چونچ بند کر بھتنی کے......“

پھر گن ہاتھ میں پکڑ کر تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔ چونکہ اس کے عقب میں وین کی تیز ہیڈ لائٹس روشن تھیں، اس لیے ہمیں اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قریب آ کر رُک گیا۔ بولا۔ ”تم کون ہو؟“

میڈم نے میری کمر سے ہاتھ نکال لیا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ”ہم وہ ہیں جن کی لینڈ کروزر تم لوگ پوچھے بغیر لے کر چلتے بنے۔ پولیس اگر چوری چکاری کا کام سنبھال لے تو پھر چور بے چارے بھوکے مرنے لگیں گے۔ اپنے آدمیوں کو بولو، وہ میری گاڑی اِدھر لا کھڑی کرے۔“

وہ جواں سال اور خوب صورت لڑکی تھی۔ قیمتی لباس میں ملبوس تھی۔ شکر تھا کہ لباس کا اگلا حصہ کیچڑ سے محفوظ رہا تھا۔ مضبوط اور حاکمانہ انداز میں، چودھری کے رعب و دبدبے کو خاطر میں لائے بغیر اپنی لینڈ کروزر مانگ رہی تھی۔ چودھری ٹھٹک گیا۔ نادان نہیں تھا۔ سمجھ گیا کہ اس پُراعتماد انداز میں پیش آنے والی لڑکی عام نہیں ہوتی ’خاص‘ ہوتی ہے۔ خاص لوگوں سے خاص برتاؤ کیا جاتا ہے، جانتا تھا۔ تبھی قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ”اچھا! تو وہ گاڑی آپ کی ہے۔ ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ پیرو گینگ شہر سے چرا لایا ہے۔“

”اگر تم لوگ واپس نہ آتے تو ہمیں ساری رات ادھر ہی گزارنا پڑتی۔“ میڈم نے منہ بنا کر کہا۔ ”تم نے پوچھا تھا کہ ہم کون ہیں۔ سنو! میں ملک عظمت اللہ خان کی بھتیجی ہوں۔ ملک عظمت اللہ کون ہیں؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔ نہیں جانتے تو بتا دیتی ہوں۔ ایڈیشنل آئی جی پولیس ہیں۔ کہو تو فون پر بات کرا دیتی ہوں...... اور یہ میرا ہزبینڈ ہے۔“ پھر ہنس کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بتاؤ ناں اِسے کہ تم ’زوں‘ کر کے جہاز اُڑاتے ہو اور ملک دشمنوں پر بڑے بڑے بم گراتے ہو......“

وہ اتنی روانی سے بول رہی تھی کہ چودھری کو کچھ بولنے اور پوچھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ ”بتاؤ ناں...... تم نے جہاز کے جو کرتب مجھے ائربیس پر دکھائے تھے، ان کا خلاصہ انسپکٹر کو سناؤ ناں......“

ساتھ ہی اُس نے جھپٹ کر میرے دونوں کان پکڑے اور کھینچ کر اچھلتی ہوئی، خوشی سے چیختی ہوئی ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ میں ’ٹھہرو، ٹھہرو‘ کے نعرے بلند کرتا ہوا اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ کچھ فاصلے پر پہنچ کر ایک ذرا رُکی اور چیخ کر بولی۔ ”انسپکٹر! میری گاڑی ادھر ہی کھڑی کر جانا...... میں بزی ہوں، پھر ملاقات ہوگی۔ انکل سے بات کراؤں گی تمہاری۔ بائی بائی!“

اس کی ہنسی فضا میں گونجی۔ ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کر گئے۔ ایک بڑی ٹارچ کی تیز روشنی کا ہالا ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے دبوچ لیا۔ وہ بولی۔ ”مجھے پکڑ کر کھینچو......“

میں نے اس کی بانہیں پکڑ کر ایک جانب کو کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ بلند آواز میں چیخی۔ ”پولیس...... ہیلپ می...... پولیس...... مجھے میرے شوہر سے بچاؤ...... بچاؤ...... ہیلپ می......“

اس کی آواز سناٹے میں بازگشت پیدا کرنے لگی۔ عجیب

ماحول بنا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ٹارچ کی تھرکتی ہوئی روشنی نے ہمیں آزاد کرتے ہوئے کھل کھیلنے کا موقع عنایت کر دیا۔ چودھری کی شوخ آواز سنائی دی۔ ”جہاز اُڑانے والے شوہر سے خدا بچا سکتا ہے، پولیس نہیں۔ ہم آپ کی گاڑی چھوڑے جا رہے ہیں۔ سنبھال لیں۔ گڈ بائی!“

ایک اور آواز سنائی دی۔ ”یہ خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں سے فوراً نکل جائیں ورنہ......“

میں نے میڈم کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ دریائی ریت پر گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تمہیں ہماری اتنی ہی فکر ہے تو دو چار سپاہی بھی بندوقوں سمیت یہاں چھوڑے جاؤ۔ ہم انہیں علی الصباح تھانے پہنچا دیں گے۔“

اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ قطار کی صورت میں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ لینڈ کروزر سب سے پیچھے تھی۔ اس میں سے دو سپاہی نکل کر اگلے ڈالے میں سوار ہوئے اور سبھی گاڑیاں رینگنے لگیں پھر غراتی ہوئی ڈھنڈ کی طرف مڑ گئیں۔

میں آہستگی سے میڈم کے سامنے جا کھڑا ہوا پھر اُس کے مقابل گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور تحسین آمیز انداز میں بولا۔ ”میڈم! آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ آپ واقعی ڈیفرنٹ ہیں۔“

اس نے چہرہ اُٹھایا، آسودگی سے آنکھیں بند کیں اور کمان کی طرح پیچھے کی طرف دہری ہو گئی۔ اگر میں اس کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر لیتا تو وہ گر گئی ہوتی۔ اُسے سنبھالا اور کھینچ کر سیدھا کرنا چاہا تو وہ ایک جھٹکے سے میرے سینے سے آن ٹکرائی۔ اپنے ہاتھ چھڑا کر مجھ سے لپٹ گئی اور میرے سینے پر آہستگی سے گال رگڑتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کتنے نمبر حاصل کیے ہیں؟“

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ’سو بٹا سو‘ اور پھر غیر متوقع جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر زور سے بھینچ لیا۔ اس کی بھنچی بھنچی آواز ابھری۔ ”تھوڑا اور......“

میرے بازوؤں کے اعصاب کھنچے۔ وہ بولی۔ ”اور کس دو ناں!“

اس نے اپنا بند آنکھوں والا چہرہ اوپر اُٹھایا اور ہولے سے کھانسی۔ میں نے اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ اچانک وہ تڑپی اور میری گرفت سے نکل کر کھڑی ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ بولی۔ ”تھک گئی ہوں۔ چلو، سردی لگ رہی ہے۔“

وہ تھکی نہیں تھی مگر تھکاوٹ کے پردے میں چھپ کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے حد سے نکل کر شاید خود کو اس کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ میں اُٹھا اور گاڑی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”سوری میڈم! دراصل مجھے اختیار......“

اس نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”نہیں ڈیئر! ایکسکیوز نہ کرو۔ انسان اور کمپیوٹر میں یہی بنیادی فرق ہے۔ وہ صرف فیڈ کیا گیا مواد لوٹاتا ہے۔ انسان ہر بار نیا ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔ دریا پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔“

اس نے بڑی لاجواب اداکاری کی تھی۔ چند ہی لمحوں میں چودھری نامی انسپکٹر مطمئن ہو گیا تھا تو یہ میڈم کے غیر معمولی اعتماد، بچگانا طور اور بے خوف رویے کا کمال تھا۔ میڈم نے اسے نہ تو پوچھ گچھ کے لیے وقت دیا تھا، نہ اُسے تشکیک کا کوئی موقع فراہم کیا تھا۔

وہ مسرور کن انداز میں مجھ سے چمٹ کر چل رہی تھی۔ دھیمی آواز میں کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اگر وہ آپ کے کہنے پر ملک عظمت اللہ کو فون کر لیتا تو؟“

وہ ہنسی۔ ”کیسے؟ یہاں تو سگنلز ہی نہیں آتے۔“

”وہ ہمیں تھانے لے جاتا اور وہاں سے فون......“

”اوہ یار! بھلا ایک انسپکٹر میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ ایڈیشنل آئی جی کو فون کرے۔ وہ بھی اتنی رات گئے۔“

ہم گاڑی کے پاس پہنچے۔ اس نے سرسری انداز میں گاڑی کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ’اوکے‘ تھا۔ پھر کچھ فاصلے پر چاندنی میں چمکتی ہوئی ریت پر ٹانگیں پسار کر جا بیٹھی۔ بولی۔ ”اپنا اسلحہ اُٹھا لاؤ۔ میں تب تک ٹھنڈی ریت سے کھیلتی ہوں۔“

میں تیز تیز قدموں سے جنگل تک پہنچا۔ ٹیلے پر چڑھا۔ جھاڑی کے پیچھے پڑی ہوئی گنیں اور بلٹ بیلٹ اُٹھائیں۔ ابھی بلٹ بیلٹ کمر پر باندھ ہی رہا تھا کہ اچانک میڈم کی تیز چیخ سناٹے کا سینہ چیر گئی۔ میں نے جھٹکے سے پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ میرا خون میری آنکھوں میں سمٹ آیا اور یوں لگا جیسے چارسو گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

ہم نشیں

منظر امام

عہدِ حاضر میں زندگی جس قدر تیزی سے اپنی قیمت گنوا رہی ہے اسی شدت سے بناوٹ اور تصنع ہمارے معمولات میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ حالات کا اتار چڑھاؤ نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کی زندگی میں بھی بدلاؤ کا سبب بن رہا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی ہم نشین و غمگسار تھا جسے زمانے کے بدلاؤ نے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا اور... احساس کوئی بھی ہو جب طاقت پکڑتا ہے تو دنیا ادھر سے ادھر کر دیتا ہے۔



انسان اور جانور کی زندگی کا ایک دلچسپ تقابلی جائزہ

میرا دل چاہا کہ میں اس کم بخت کو پتھر مار مار کر بھگا [illegible]ان۔

اتنی مشکلوں سے تو میں نے یہ کچرا گھر تلاش کیا تھا جو [illegible] شادی ہال کے برابر میں تھا اور اکثر یہاں بچا ہوا کھانا پھینک دیا جاتا تھا شیرمال، تافتان، بریانی وغیرہ۔

میں نے سوچا تھا کہ چلو خوراک کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ میں اس کچرا گھر کا بلاشرکت غیرے مالک ہوں۔ یہاں مجھے ڈسٹرب کرنے کوئی نہیں آئے گا لیکن وہ کم بخت آن ٹپکا

تھا، وہ تھا تو خوب صورت، گول مٹول سا لیکن کتا ہی تھا، گلیوں میں آوارہ پھرنے والا، جس کی کوئی اوقات نہیں ہوتی، جس کا کوئی نام نہیں ہوتا، جس کو پتھر مار مار کر بھگا دیا جاتا ہے۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال خود میرے ساتھ بھی تھی۔

لیکن میں اس سے برتر اس لیے تھا کہ میں انسان تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے، میری ڈاڑھی جھاڑیوں کی طرح لٹک آئی تھی۔ میرے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ میرے پیروں میں جوتے یا چپل نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میرے گندے اور غلیظ بدن پر کھرنڈ سی جم چکی تھی۔ اس کے باوجود میں ایک انسان تھا، اشرف المخلوقات۔

یہ اور بات ہے کہ اس اشرف مخلوق نے گزشتہ تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا اور جب اس نے ایک شادی ہال کے برابر والا یہ کچرا گھر تلاش کر لیا تو یہ نابکار کتا نہ جانے کہاں سے آن مرا تھا۔

میں نے اس کتے کو مخاطب کرتے ہوئے باقاعدہ تقریر کر ڈالی۔ ''اے دو کوڑی کے آوارہ کتے! تیری حیثیت ہی کیا ہے کہ تو انسان سے مقابلہ کرے۔ تو چلا جا یہاں سے ورنہ پتھر مار کر سر پھاڑ دوں گا۔ آوارہ انسان کا علاج تو ہو جاتا ہے، لیکن تیرا علاج کوئی نہیں کرے گا اور تو کتے کی موت مارا جائے گا لیکن تجھ سے کیا کہوں کیونکہ تو تو ویسے ہی کتا ہے۔''

میری تقریر سن کر کتے نے اپنی گردن اوپر اٹھائی۔ کتے کی طرح ہلکی سی آواز نکالی پھر مجھ سے کہنے لگا۔ ''بے وقوف انسان۔ اپنا رزق تلاش کرنے کچرا گھر تک تو آ گیا ہے۔ پھر بھی خود کو مجھ سے افضل سمجھ رہا ہے۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ کتا باقاعدہ باتیں کرنے لگے گا۔ اس لیے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی اور بول رہا ہو۔ اس پر کتے نے مجھے ڈانٹ پلا دی۔ ''اب اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ میں بول رہا ہوں، تیرے سامنے کھڑی ہوئی وہ مخلوق جس کو تو کتا کہتا ہے۔''

''تو کیا تم کتے نہیں ہو؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''بے وقوف میں کتا ہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ اور بات ہے کہ بولنا سیکھ گیا ہوں۔''

اسی دوران ایک آدمی وہاں نمودار ہوا۔ اس نے ایک پیکٹ کچرا گھر کی طرف اچھال دیا۔ اس نے مجھ پر دھیان نہیں دیا تھا یا چونکہ میں کتے کے پاس کھڑا ہوا تھا، اس لیے مجھے بھی کتا ہی سمجھا ہو۔ نہ جانے اس پیکٹ میں کیا تھا۔

بیک وقت ہم دونوں ہی اس کی طرف لپکے تھے۔ میں نے وہ پیکٹ اٹھا لیا۔ اس میں شیرمال کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ ''یہ دیکھ۔'' میں نے کتے کو وہ ٹکڑے دکھائے۔ ''یہ ہم انسانوں کی خوراک ہے، شیرمال۔ ہم شادی کے موقعوں پر اس سے مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں لیکن تجھے کیا معلوم۔ تو، تو کتا ٹھہرا۔ تو کیا جانے کہ ہم انسان کیا کیا مزے مزے کی چیزیں کھاتے ہیں۔''

''انسان کھاتے ہیں نا۔'' کتا میری بات سن کر ہنسنے لگا تھا۔ ''تو اپنی بات کر۔''

''کیا پاگل ہو گیا ہے؟'' میں غصے سے بولا۔ ''میں بھی انسان ہی ہوں۔''

''غلط فہمی ہے تیری۔'' کتے نے کہا۔ ''انسان تو وہ ہے، وہ دیکھ۔ وہ جو سامنے گاڑی سے اترا ہے۔ کیا شاندار کپڑے پہن رکھے ہیں اس نے اور اس کے ساتھ جو عورت ہے وہ کتنی خوب صورت ہے۔ انسان یہ سب ہیں، تو کہاں کا انسان ہے۔''

''بے وقوفی کی بات مت کر۔ میں بھی انسان ہوں، ان ہی جیسا۔''

''اچھا۔ تو پھر ان کے پاس جا کر کھڑا ہو جا۔'' کتے نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہاں چار پانچ سوٹ اور ٹائیوں والے ایک دائرہ بنائے کھڑے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

ان کی مضبوط آوازیں یہ ثابت کر رہی تھیں کہ ان کی جیبیں بھری ہوئی ہیں۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں اور ان کے بینک بیلنس بھرے ہوئے ہیں۔

''اب جا نا...... سوچ کیا رہا ہے؟'' کتے نے مجھے اکسایا۔ ''جا۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ تو کتنا بڑا انسان ہے۔ تو بس ان کے پاس جا کر کھڑا ہو جا۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی اپنا انسان ہونا ثابت کر دیتا ہوں۔''

میں ٹہلتا ہوا ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے غصے سے کہا۔ ''اوئے کیا کر رہا ہے یہاں، دفع ہو جا۔''

''بھائی صاحب، میں تو......'' میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''جاتا ہے یا نہیں۔'' ایک باڈی بلڈر قسم کے شخص نے آگے بڑھ کر مجھے دھکا دے دیا۔

مجھ میں جان ہی کتنی تھی۔ فاقوں نے تو مجھے بے حد کمزور کر رکھا تھا۔ اس لیے میں اس کا دھکا برداشت نہیں کر سکا اور کچھ دور جا گرا۔ وہ لوگ پھر اپنی باتوں میں اس طرح مصروف ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ کیسا دکھ ہوا تھا مجھے۔ میں آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا کتے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کم بخت زور زور سے ہنسے جا رہا تھا۔

''دیکھ لیا تم نے۔'' اس نے کہا۔ ''تم انسان نہیں ہو کتے سے بھی بدتر ہو۔''

اس وقت میرا دھیان اس پیکٹ کی طرف تھا جس میں شیرمال کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جھپٹ کر وہ پیکٹ اٹھا لیا پھر ہم دونوں مل کر وہ شیرمال چبا رہے تھے۔

اس وقت مجھے یہ ہوش نہیں رہا تھا کہ میں ایک کتے کے ساتھ بیٹھا ہوا کھا رہا ہوں۔ اس کی بھی فکر نہیں تھی کہ یہ کتا کم بخت باقاعدہ باتیں کرتا ہے اور اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ انسانوں نے مجھے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ کیونکہ میں ان کے قریب کھڑے رہنے کے قابل نہیں تھا۔

شیرمال کے ٹکڑے پیٹ میں اتار لینے کے بعد جان میں جان آ گئی اور میں نے احسان کرنے والی نگاہوں سے کتے کی طرف دیکھا۔ ''او بدبخت کتے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''جا میں نے تجھے معاف کیا۔''

''معاف کرنے کی شرط بھی بتا دو۔ کیونکہ انسان شرط لگائے بغیر کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ احسان بھی کرتا ہے تو پہلے فائدہ سوچتا ہے، تم بتاؤ...... تم نے کیا سوچا ہے؟''

''تو یہاں سے چلا جا۔ یہ کچرا گھر میری ملکیت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ برابر میں جو شادی ہال ہے یہ مجھ جیسے انسانوں کا ہے، تجھ جیسے کتوں کا شادی ہال نہیں ہے۔ یہاں انسانوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ خیر تم کتوں کو کیا معلوم کہ شادی کیا چیز ہوتی ہے۔''

''اوہو، تو کیا تمہیں معلوم ہے۔'' کتا میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ''تمہاری حالت سے تو پتا نہیں چلتا۔''

اس بدبخت نے مجھے ایک بار پھر اداس کر دیا تھا۔ میری زندگی ایسی کہاں تھی کہ میری شادی ہو سکتی۔ میں نے تو صرف شادیاں ہوتے ہوئے دیکھی تھیں۔ مفلسی نے کبھی اس تجربے کی مہلت نہیں دی تھی۔

میں نے اپنی زندگی ایک یتیم خانے میں گزاری تھی۔ وہاں کے منشی کا یہ کہنا تھا کہ کوئی مجھے یتیم خانے کے دروازے پر ڈال گیا تھا۔ اس وقت میں صرف ایک ہفتے کا تھا۔

چونکہ وہ یتیم خانہ کچھ اس قسم کا تھا کہ اِدھر اُدھر پھینکے ہوئے بچوں کی پرورش کیا کرتا تھا اور ان ہی کے نام پر سالانہ لاکھوں روپے بٹورتا تھا اس لیے مجبوراً یتیم خانے والوں کو میری پرورش کرنی پڑ گئی تھی۔

جب میں سات آٹھ برس کا ہوا تو ایک میاں بیوی یتیم خانے سے مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ویسے تو ان کے یہاں کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔ انہوں نے کسی حد تک مجھے تعلیم بھی دلوائی۔ میرے کھانے پینے کا بھی خیال رکھتے تھے لیکن ان کے یہاں ایک دشواری یہ تھی کہ دونوں آپس میں ہر وقت لڑتے رہتے تھے اور ہر لڑائی کے بعد بجائے ایک دوسرے کو مارنے کے مجھے مارتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہونے لگتا اور میری شامت آ جاتی۔ ایک دن میں نے تنگ آ کر پوچھا۔ ''آپ لوگ اپنے جھگڑے کے بعد میری ٹھکائی کیوں کرتے ہیں؟''

''بیٹے، ہم اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔'' شوہر نے بتایا۔ ''کیونکہ ہمارے یہاں عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔ بہت برا سمجھا جاتا ہے، اسی لیے میں غصے میں آ کر تمہیں مارنے لگتا ہوں۔''

''اور یہی میرے ساتھ بھی ہے۔'' بیوی نے کہا۔ ''ہمارے یہاں بھی شوہر پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی لیے میں تمہیں مارتی ہوں۔''

''یعنی آپ لوگ مجھے یتیم خانے سے صرف اس لیے اٹھا کر لائے ہیں کہ میری ٹھکائی کرتے رہیں؟''

''اب کیا کریں بیٹا۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو آپس میں خون خرابا ہو جائے۔''

میں چونکہ مار کھا کھا کر تنگ آ چکا تھا اس لیے میں اس گھر سے بھاگ گیا۔ خدا جانے میرے بھاگ جانے کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کا کیا حشر کیا ہوگا۔

بہرحال میں نے اس طرح کی زندگی گزاری۔ گیرج پر کام کیا۔ ہوٹلز میں برتن دھوئے۔ ایک دفعہ چوری بھی کی۔ صفائی کا کام کیا اور نہ جانے کیا، کیا کرتا رہا اور وقت گزرتا چلا گیا۔

میرے پاس رہنے کے لیے نہ گھر ہو سکا اور نہ پہننے کے لیے کپڑے اور نہ کھانے کے لیے مناسب کھانا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس۔ میں نے کئی برسوں تک بھیک بھی مانگی۔

اس وقت تک میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو لوگ مجھے بھیک دیتے ہیں وہ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد یہ پتا چلا کہ اس دنیا میں صرف دو قسم کے لوگ ہیں۔ بھیک دینے والے اور بھیک لینے والے۔ ان کے علاوہ اور کوئی قسم نہیں ہے۔ پھر ایک بار دو مذہبی گروہوں

کے درمیان جھگڑے دیکھے اور اندازہ ہوا کہ شاید دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک وہ جن کا مذہب اس طرف جھنڈے اور ڈنڈے لیے کھڑا ہے اور دوسرے وہ جن کا مذہب دوسری طرف جھنڈے اور ڈنڈے لیے کھڑا ہے۔

پھر دو سیاسی پارٹیوں کے درمیان جھگڑے دیکھے، تو یہیں خیال ہوا۔ دو زبانیں بولنے والوں کو دیکھ کر ایسا ہی لگا، پھر میں نے اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

میرا مسئلہ تو کچھ اور تھا۔

میرا مسئلہ تھا، بھوک اور سر چھپانے کی جگہ۔

خاص طور پر جب بارش ہوتی تو بہت پریشانی ہوجاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں۔ کسی دکان کے چھجے کے نیچے پناہ لے لیتا یا کسی ایسی ہی جگہ پہنچ جاتا اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا۔

پھر رات بھی میرے لیے پرابلم لے کر آتی تھی۔ دن میں تو کہیں بھی پڑا رہتا تھا کسی پارک میں، کسی پل کے نیچے یا کسی فٹ پاتھ پر لیکن رات میرے لیے عذاب بن کر آتی۔ کہیں بھی سونے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی۔

ایک دفعہ راجا نام کا ایک نوجوان مجھے مل گیا۔ پتا نہیں وہ نوجوان ہی تھا یا کیا تھا کیونکہ اس کو دیکھ کر پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ جوان ہے یا بوڑھا ہے کیونکہ اس کی حالت بہت سوختہ تھی۔

بہرحال وہ ایک عقل مند آدمی تھا۔ میں نے جب اپنی پرابلم بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔ ''کتنے دنوں سے نہیں سوئے ہو؟''

''کئی دن ہوگئے۔'' میں نے بتایا۔ ''سونے کے لیے ترس رہا ہوں۔ میری آنکھیں باہر آنے والی ہیں۔ سر پھٹنے والا ہے۔ گردے جواب دینے والے ہیں اور زندگی ہاتھ سے نکلی جارہی ہے۔''

''خیر، خیر یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سمجھ گیا ہوں۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''اچھا یہ بتا کبھی چوری کی ہے؟''

''چوری! نہیں تو، بھیک مانگی ہے، کام کیا ہے لیکن چوری نہیں کی۔''

''اب چوری کر۔'' اس نے کہا۔

''کیوں، اس سے کیا ہوگا؟''

''تیری نیند پوری ہوجائے گی۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن کوشش یہ کر کہ تیری چوری پکڑی جائے۔''

''یہ تم کیسی الٹی ترکیب بتا رہے ہو۔ نیند سے چوری کا کیا تعلق؟''

''بے وقوف ...... پکڑا جائے گا تو پولیس والے تجھے جیل بھیج دیں گے۔ بس وہاں آرام سے سوتے رہنا۔''

''ہاں؟ یہ ترکیب اچھی ہے۔ میں ابھی چوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں نے ایک دکان سے چوری کی اور وہ بھی اس طرح کہ دکان والے نے مجھے دیکھ لیا لیکن اس نے مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا بلکہ میری ٹھکائی کر کے مجھے چھوڑ دیا۔

جھلا کر میں نے ایک محلے میں جا کر چوری کی۔ وہاں بھی یہی تماشا ہوا۔ کم بختوں نے میرا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر پورے محلے میں گھمایا لیکن پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ میں ان کی خوشامدیں کرتا رہا۔ کہتا رہا کہ خدا کے لیے مجھے پولیس کے حوالے کردو۔ جیل بھیج دو، لیکن کسی نے میری بات نہیں مانی۔

پھر میں نے چوری کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ میری قسمت میں نہ تو جیل تھی اور نہ ہی نیند۔

اسی دن میں ایک پارک میں بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک بندے کو مجھ پر ترس آگیا۔ اس نے میرا حلیہ دیکھ کر میری حالت کا اندازہ کرلیا تھا۔ میں نے اسے اپنی ساری داستان سنادی کہ میں کس طرح نیند کے لیے ترس رہا تھا۔

وہ شریف آدمی مجھ پر ترس کھا کر مجھے اپنی کھولی میں لے آیا۔ یہ کھولی لائنز ایریا میں تھی اور میں ابھی اس کا شکریہ ادا کر کے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔

وہ آدمی ایک مشہور چور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی جیل ہوگئی۔ خود سوچیں، جب تک میں اپنے طور پر جیل جانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس وقت کچھ نہیں ہوا اور جب ایک شریف آدمی اپنے گھر لے گیا تو چھاپہ پڑ گیا اور مجھے جیل ہوگئی۔ اس طرح میں جیل بھی ہو آیا۔

تو یہ ہے میری داستان۔ اور تازہ صورت حال یہ تھی کہ میں نے کئی وقتوں سے کچھ نہیں کھایا تھا اور بھٹکتا ہوا شادی ہال کے برابر والے کچرا گھر میں آگیا تھا۔

ہاں ایک بار بہت دلچسپ بات ہوئی تھی۔ ایک شام میں اسی طرح نڈھال فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا کہ کچھ لوگ وہاں سے گزرے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر آپس میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر وہ میرے پاس آگئے۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''نام، یہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نام، نام ہوتا ہے...... جیسے میرا نام ہے نواز۔ یہ میرے ساتھی ہیں مختار اور یہ نسیم۔ اسی طرح تمہارا بھی تو کوئی نام ہوگا جس نام سے لوگ تمہیں پکارتے ہوں گے۔''

''منشی صاحب مجھے نمبر آٹھ کہا کرتے تھے۔'' میں نے بتایا۔ ''ہوسکتا ہے میرا یہی نام ہو۔ اس کے علاوہ جو میاں بیوی مجھے صرف مارنے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ مجھے چھوکرا کہا کرتے تھے۔''

''تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟''

''میں نہیں جانتا، یہ کون ہوتے ہیں؟'' میں نے بتایا۔ ''البتہ سنتا آیا ہوں کہ لوگوں کے ماں باپ بھی ہوتے ہیں۔''

ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''یہ آدمی یا تو پاگل ہے یا بہت بڑا افلاسفر ہے۔''

''چلو۔ یہ بتاؤ تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''بھوک۔ میں سوائے بھوک کے اور کچھ نہیں جانتا۔''

''تم نماز پڑھتے ہو؟''

''لوگوں کو مسجدوں میں جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔ خود مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' میں نے بتایا۔

''یہ تو کافر معلوم ہوتا ہے۔'' دوسرے نے فتویٰ دے دیا۔

''زندگی میں کبھی روزہ رکھا ہے؟''

''یہ کس طرح رکھا جاتا ہے؟''

''اس میں کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔''

''پھر تو میں نے ساری زندگی روزہ ہی رکھا ہے۔ اس وقت بھی میں روزے سے ہوں کیونکہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

وہ لوگ مجھے لعنت ملامت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ان میں سے ایک نے جاتے جاتے مجھے جہنم رسید ہونے کی بشارت بھی دے دی تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ جہنم کیا چیز ہے اور جنت کیا ہوتی ہے۔ ہاں البتہ ایک بار ایک جلسے میں بیٹھ گیا تھا۔ وہاں مولوی صاحب لوگوں کو جہنم اور جنت کے بارے میں بتا رہے تھے۔

میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ جس دن مجھے کچرے سے کھانے کو مل جاتا تھا۔ میں وہ دن جنت میں گزارتا تھا اور جس دن کچھ نہیں ملتا تھا میرے لیے وہ دن جہنم کا ہوتا تھا۔ بس اس کے علاوہ مجھے جنت اور جہنم کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر کتے نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے دوست۔ اتنے چپ چپ کیوں ہو؟''

مجھے اس کا دوست کہنا بہت برا لگا تھا۔ اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ کسی کتے کو دوست سمجھ لیتا۔ اس لیے

اطالوی موسیقار

کی دو باتیں مشہور تھیں

ایک اس کی بدصورتی دوسری خواتین کے لیے محترم رویہ۔ ایک مرتبہ وہ اوپیرا میں ریہرسل کروا رہا تھا جہاں امریکی لڑکی گا رہی تھی۔ بار بار بے سری ہوجاتی۔

موسیقار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا مگر عادت سے مجبور وہ صنف نازک کے لیے کوئی سخت کلمہ نہ کہہ سکتا تھا چنانچہ بولا۔ ''کرسٹوفر کولمبس پر لعنت ہو جس نے امریکا دریافت کیا۔''

مرسلہ: مقبول حسین ابن عاشق حسین، خوشاب

میں نے اس سے کہا۔ ''زبان سنبھال کر بات کر کتے! میں انسان ہوں، اشرف مخلوق، میں تمہارا دوست نہیں ہوسکتا۔''

''اچھا تو پھر ایسا کرو جاؤ کسی انسان سے دوستی کر کے دکھا دو۔'' اس نے کہا۔ ''پھر میں تمہیں انسان مان لوں گا۔'' کم بخت نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

میں انسان کہاں تھا، انسان تو صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ کھانے کھاتے ہیں۔ دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ شادیاں کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ میں تو ان کاموں میں سے کچھ نہیں کر پا رہا تھا پھر انسان کہاں سے ہوگیا۔

صرف دو ہاتھ، دو ٹانگیں اور دو کان وغیرہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ کتا اب مجھے زہر لگنے لگا تھا۔ کم بخت میری ہر کمزوری سے واقف ہوتا چلا جارہا تھا۔

''اچھا دوست۔'' تھک ہار کر میں نے اسے دوست کہہ کر مخاطب کر ہی لیا۔ ''چلو مان لیا کہ تم میرے دوست ہو۔ لیکن اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ تم میرے برابر آگئے ہو۔''

کتا خوش ہو کر دم ہلانے لگا۔ وہ بہت مطمئن نظر آرہا تھا۔ ''چلو۔ ابھی اتنا ہی بہت ہے۔''

''دیکھو، اس وقت کھانے کا مسئلہ تو حل ہوگیا ہے۔ اب یہ سوچو کہ رات کہاں گزاریں گے۔''

''اسی کچرے گھر پر۔'' اس نے بتایا۔ پھر خود ہی بول

پڑا۔ ”ہاں تمہارے لیے مشکل ہوگی کیونکہ تم انسان جیسے ہو۔ میرا کیا ہے میں تو کہیں بھی گھس کر سو سکتا ہوں۔“

اس وقت ایک بہت ہی شرم ناک سا خیال میرے ذہن میں آیا۔ وہ خیال یہ تھا کہ کاش میں بھی کوئی کتا ہوتا پھر کتنی آسانی ہوتی لیکن اس بے تکے خیال کو میں نے فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ کیونکہ میں کسی کتے کا دوست تو ہو سکتا تھا لیکن خود کتا نہیں ہو سکتا تھا۔

”اچھا تم یہیں ٹھہرو، میں تمہارے لیے کوئی جگہ تلاش کر کے آتا ہوں۔“ کتے نے کہا۔

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اتنی دیر میں ہم ایک دوسرے سے مانوس جو ہو گئے تھے۔ اس کی واپسی جلد ہی ہو گئی تھی۔ ”آؤ، میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہارے لیے ایک جگہ ڈھونڈ لی ہے۔“

ایسا کم ہی ہوا ہوگا۔ لوگ آگے آگے چلتے ہیں اور ان کے پیچھے ان کے کتے دُم ہلاتے ہوئے چلتے رہتے ہیں۔ یہاں کتا آگے آگے جا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے باوجود یہ خناس میرے ذہن میں بسا ہوا تھا کہ میں بھی انسان ہوں، اشرف مخلوق۔ ہت تیری کی۔

وہ مجھے ایک فلیٹ کی عمارت کے پچھلے حصے کی طرف لے آیا تھا۔ یہ ایک گندی گلی تھی۔ اس عمارت کے سارے غسل خانوں اور باتھ رومز کے رخ اسی طرف تھے۔ اگر کوئی میرے علاوہ ہوتا تو وہاں کی بدبو اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی لیکن مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

جگہ جگہ سے گٹر ابل رہے تھے۔ اسی پانی سے گزر کر ہم ایک بالکونی کے نیچے آ گئے۔ یہاں ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔

”بس یہ ہے تمہاری جگہ۔“ کتے نے کہا۔ ”تم یہاں اطمینان سے سو سکتے ہو۔ اس گلی میں کوئی آتا ہی نہیں ہوگا۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ دوست۔“ میں چبوترے پر بیٹھ گیا تھا۔ ”اور تم، تم کیا کرو گے۔ تم کہاں رات گزارو گے؟“

”میرا کیا ہے، میں بھی یہیں کہیں تمہارے پاس لیٹ جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”کیونکہ میں تو کتا ہوں اور مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”کتا تو اب میں بھی ہو گیا ہوں۔“

اچھا چلو، لیٹ جاؤ۔“

میں چبوترے پر لیٹ گیا۔ آنکھیں نیند سے جھکتی جا رہی تھیں۔ میں جلد ہی سو گیا اور اس وقت آنکھ کھلی جب بارش ہو رہی تھی ...... لیکن نہیں بارش کہاں ہو رہی تھی۔ گلی میں ویسا ہی اندھیرا تھا۔ اوپر بالکونی سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ”کیوں منے، کر لیا پیشاب؟“

”جی امی۔“ بچے کی آواز آئی۔

”تو پھر آؤ۔ آ کر سو جاؤ۔“

تو یہ بارش نہیں، پیشاب کی چھینٹیں تھیں جو براہ راست مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے کتے کو لات مار کر جگایا جو میرے پاس ہی سو رہا تھا۔ ”چل اٹھ یہاں سے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ جگہ میرے لیے نہیں ہے۔ یہاں لوگ انسان پر گندگی پھینک دیتے ہیں۔“

اس نے بڑی سی انگڑائی لی اور کچھ بولے بغیر ایک طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس بار وہ مجھے ایک پارک میں لے آیا تھا۔ ”اب یہاں نخرامت کرنا۔ سو جاؤ۔“

پارک میں اس وقت بالکل سناٹا ہو رہا تھا۔ میں ایک بنچ پر سو گیا۔ کتا قریب ہی لیٹ گیا تھا۔ پھر میں بے خبر سو گیا۔ میں کسی کی آوازوں سے بیدار ہوا تھا۔

یہ ایک مرد اور ایک عورت تھے جو جاگنگ کرنے پارک میں آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی لوگ تھے۔ وہ سب فیشن ایبل قسم کی وہ دوڑ، دوڑ رہے تھے جس کو یہ لوگ جاگنگ کہا کرتے ہیں۔

”دیکھو تو سہی۔ کتنا پیارا ہے۔“ عورت مرد سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں ہے تو اچھا۔ اعلیٰ نسل کا معلوم ہوتا ہے۔“

اس وقت میری گردن اکڑ گئی۔ یہ مرد مجھے اعلیٰ نسل کا قرار دے رہا تھا۔ انسان ہی انسان کو پہچانتا ہے۔

”سنو، کیوں نہ اسے گھر لے چلیں؟“ عورت نے کہا۔

”ارے وہ چھوٹا کمرا فالتو پڑا ہوا ہے۔ اس میں AC بھی ہے۔ گدے بھی لگے ہوئے ہیں، اسی میں رکھیں گے۔“

اب مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ میرے لیے ٹھنڈے کمرے کی بات ہو رہی تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار آرام اور سکون کے لمحات ملنے والے تھے۔

”دیکھو کہیں کاٹ نہ لے۔“ مرد نے کہا۔

اور اس وقت میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ دونوں اس کتے کی بات کر رہے تھے جو میرے قریب ہی .... نیچے لیٹا ہوا تھا۔ میری طرف تو دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ مجھے ان کی بکواس سن کر غصہ آ گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

”دیکھو، میں ایک انسان ہوں اور یہ تو کتا ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے صرف ایک سائبان چاہیے۔ مجھے اے سی والے کمرے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں بھی رکھو، تم یقین کرو میں تمہارے لیے کتے سے بھی زیادہ وفادار ثابت ہوں گا۔ چاہو تو میرے گلے میں پٹا بھی ڈال سکتے ہو۔“

”پاگل معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔“ عورت نے تبصرہ کیا۔

”تم تو ایک عورت ہو، سنا ہے دنیا کی ہر عورت کے سینے میں ماں کا دل ہوتا ہے۔ تم مجھے اپنی اولاد سمجھ کر ساتھ لے چلو ماں۔ میں دو دنوں سے بھوکا ہوں۔ میرے پاس رہنے کی جگہ نہیں ہے ماں۔ مجھ پر رحم کرو ماں۔“

”چلو یہاں سے۔“ عورت نے مرد سے کہا۔ ”یہ کم بخت تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔“

”ماں۔ میری بات سنو ماں، میری بات سنو۔“

وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلے گئے اور میں نے رونا شروع کر دیا۔ نہ جانے کیوں اب مجھے شدت سے رونا آ رہا تھا۔ آخر انسان ہی تو تھا۔ ایک ماں اپنی اولاد کو چھوڑ کر جا رہی تھی تو آنکھوں میں آنسو تو آنے ہی تھے۔

کتا میرے پاس کھڑا بف بف کرتا رہا۔ وہ میری حالت پر افسوس کر رہا تھا۔

”دوست۔“ میں نے کتے سے کہا۔ ”اب اس دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ زندہ رہ کر بھی کیا کروں گا اور پھر جس انداز سے میں زندگی گزار رہا ہوں، وہ تو موت سے بھی بدتر ہے۔“

”تو پھر کیا کرو گے؟“ کتے نے بہت بے رحمی سے پوچھا۔

”خودکشی کر لوں گا۔“ میں نے بتایا۔

”وہ مشکل کام ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے میرے پاس تمہاری موت کے لیے ایک طریقہ ہے اگر کہو تو اسی کو آزمائی کروں؟“

”ہاں بتاؤ۔“

”میں تمہیں کاٹ لیتا ہوں۔“ کتا دھیرے سے بولا۔ ”شاید تم نہیں جانتے کہ کتے کے کاٹنے سے بھی موت آ جاتی ہے۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں پہلے پاگل ہوتے ہیں، اگر وقت پر ٹیکے نہ لگیں تو مر جاتے ہیں۔“

اتنی جلدی

امجد شہر جا رہا تھا۔ اس کے دوست حامد نے اسے خط دے کر کہا اسے شہر سے پوسٹ کرنا ہے۔

ایک ہفتے بعد امجد واپس آیا۔ حامد نے اس سے خط کے متعلق پوچھا۔

امجد نے جیب سے خط نکال کر واپس کرتے ہوئے کہا۔

اگر اتنی ہی جلدی ہے۔ تو یہ لو خود پوسٹ کر آؤ۔

مرسلہ: ریاض بٹ از حسن ابدال

”ٹھیک ہے دوست۔ جب مرنا ہی مقدر میں ہے تو تمہارے ذریعے کیوں نہ مروں۔“ میں نے کہا۔ ”کاٹ لو مجھے۔“

اور اس کتے نے بہت ہی بوجھل دل کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے میری دونوں ٹانگوں پر کاٹ لیا، بے انتہا تکلیف ہوئی تھی لیکن میں موت کے سفر پر جانے والا تھا اسی لیے یہ سوچ کر خوش بھی ہو رہا تھا کہ چلو اب یہ سب کچھ تھوڑی دیر کا رہ گیا ہے۔ پھر ہمیشہ کے لیے سکون۔ ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں نہ بھوک لگے گی نہ سردی اور گرمی کا احساس ہوگا۔ بس نیند ہی نیند ہوگی جس کے لیے ترس کر رہ گیا ہوں۔

کتا میری طرف معذرت بھری نگاہوں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر آ کر لگا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا پتھر اور وہ چیختا چلاتا ہوا ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

کچھ فاصلے پر ایک خوب صورت جوان لڑکی کھڑی ہوئی پتھر چلا رہی تھی۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

”ارے تمہیں تو اس کم بخت نے بری طرح کاٹ لیا ہے۔“

میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا۔ بالکل پہلا کہ کوئی لڑکی میرے قریب آئی تھی۔ اس نے مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ میں کیسا لگ رہا ہوں۔ میرے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ میری ڈاڑھی بے ترتیب ہو رہی ہے اور میرے کپڑے چیکٹ ہو رہے ہیں۔ اس نے ان باتوں پر دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے انسان سمجھ کر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی

بار کسی نے مجھے انسان سمجھا تھا۔

میں اپنی تکلیف بھول کر اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کتنی محبت تھی اس کی آنکھوں میں۔ ''چلو۔ میں تمہیں اسپتال پہنچا دوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں رہنے دیں۔'' میں دھیرے سے بولا۔ ''میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

کیا پاگل ہو گئے ہو، کتے نے کاٹا ہے۔ تم اس طرح ٹھیک نہیں ہو گے۔ تمہیں انجکشن لگیں گے۔'' وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''اگر تم نے اس کا علاج نہیں کیا تو مر بھی سکتے ہو۔''

''اور میں مرنا ہی چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ سمجھ گئی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''شاید زندگی سے مایوس ہو گئے ہو۔''

''مایوس تو ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں زندہ رہنا ہی نہیں چاہتا۔''

''بے وقوف ہو تم۔ زندگی بہت خوب صورت ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم میرے ساتھ ہاسپٹل چلو، تمہارا علاج ہو جائے گا۔''

اور میں نے اسی وقت زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لڑکی کی وجہ سے۔ وہ ناہنجار کتا مجھے کاٹ گیا تھا اس لیے مجھے اب اپنا علاج بھی کروانا تھا۔

اگر وہ لڑکی نہیں ملتی تو شاید میں کبھی علاج نہیں کرواتا۔ لیکن اب مجھے زندہ رہنا تھا اسی لیے میں نے اس لڑکی سے کہا۔ ''سنو۔ تم مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ بہت ہمدرد ہو تم۔ میں صرف تمہاری خاطر جینے کا ارادہ کر چکا ہوں لیکن میری ایک شرط ہو گی؟''

''اوہو۔ اب اس وقت کوئی شرط بھی لگاؤ گے۔''

''ہاں، صرف ایک شرط اور وہ یہ ہے کہ تم مجھ سے ملتی رہو گی۔ میں تمہیں بار بار دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''سمجھ گئی۔'' وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ بھی بہت خوب صورت تھی۔ ''شاید۔ میں تمہیں اچھی لگ رہی ہوں، کیوں یہی بات ہے نا؟''

''ہاں۔ یہی بات ہے۔'' میں نے اعتراف کر لیا۔ ''تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔''

''چلو۔ تو پھر میں تم سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے ملتی رہوں گی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''اب باتیں مت کرو۔ میرے ساتھ اسپتال چلو۔''

''ایک منٹ۔ میں ابھی آیا۔''

میں دوڑتا ہوا کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے پاس آ گیا۔ یہاں میں نے اس کتے کو چھپتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ وہیں موجود تھا اور بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''آخر تم نے ایک انسان سے دوستی کر ہی لی۔''

''ہاں۔ اے دو کوڑی کے جانور۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ تم تو صرف ایک کتے ہو۔ یہ لڑکی میری زندگی میں امید بن کر آئی ہے۔ یہ اپنے ساتھ خوشیاں لائی ہے، جاؤ۔ تم اپنے کچرا گھر میں واپس جاؤ۔ میرا مقام کچھ اور ہے کیونکہ میں انسان ہوں۔ اشرف مخلوق۔ سمجھ گئے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں دوڑتا ہوا لڑکی کے پاس واپس آ گیا۔ وہ میرا انتظار ہی کر رہی تھی۔ ''کہاں چلے گئے تھے تم؟''

میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میں کتے کو اس کی حیثیت یاد دلانے گیا تھا ورنہ اسے یہ اندیشہ ہو جاتا کہ شاید مجھ پر کتے کے کاٹنے کا اثر ہو گیا ہے۔

اس لڑکی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میرے خدا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ بالکل پہلی بار ہو رہا تھا۔ لڑکی کا ملنا ہی قیامت تھا اور اب اس کا ہاتھ تھام لینا۔ ایسی بے خودی اور سرشاری کا احساس پہلی بار ہوا تھا۔

پارک کے گیٹ سے باہر اس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ''چلو بیٹھ جاؤ۔'' وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

''کیا میں...... میں بیٹھوں؟''

''ہاں ہاں۔ میں تم ہی سے کہہ رہی ہوں۔''

''لیکن میں کبھی گاڑی میں نہیں بیٹھا۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے بتا دیا۔

''اوہ۔'' اس نے بہت افسوس بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''یقین نہیں آتا کہ اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کبھی گاڑی میں نہیں بیٹھے۔ خیر اب تم روزانہ بیٹھا کرو گے۔ چلو جلدی کرو ورنہ کتے کا زہر پھیلنے لگے گا۔''

میں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب تو مجھے خود اسپتال پہنچنے کی جلدی ہو رہی تھی کیونکہ زندگی سے محبت ہونے لگی تھی۔ اس زندگی سے جس کو کچھ دیر پہلے میں ایک ناہنجار قسم کے کتے کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔

اسپتال کی طرف جاتے ہوئے اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا نام بتاؤں۔ نام بتانا بھی ضروری تھا اسی لیے میں نے فوراً ہی ایک نام گھڑ لیا۔ ''جی

میرا نام حمید ہے۔'' حمید دراصل یتیم خانے کے منشی کا نام تھا۔ وہ نام مجھے یاد رہ گیا تھا۔

''اور میرا نام روزی ہے۔'' لڑکی نے بتایا۔

اسپتال پہنچ کر لڑکی نے مجھے انجکشن لگوائے۔ اس نے سارے اخراجات خود ادا کیے تھے جبکہ میں اس کی ہر بات کو مانتا چلا گیا تھا۔ واقعی بہت جادو تھا اس لڑکی میں۔

اسپتال سے فارغ ہو کر لڑکی مجھے ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک دکان میں لے آئی۔ یہاں سلے سلائے کپڑے ملتے تھے۔ اس نے میرے ناپ کے چار جوڑے خریدے اور مجھے پھر گاڑی میں بٹھا لیا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے ایک بڑے سے سیلون کے سامنے گاڑی روک کر میرے ہاتھ پر سو کا نوٹ رکھ دیا۔ ''اب جاؤ۔ سامنے جا کر اپنے بال بنواؤ اور پوری ڈاڑھی صاف کرواؤ۔ میں تمہیں انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ایک بات تو بتائیں، آپ مجھ پر اتنی مہربانی کیوں کر رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اب جاؤ۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

اگر اس وقت وہ کتا سامنے ہوتا تو میں اس سے پوچھتا کہ بیٹا اب بتا۔ میں انسان ہوں یا نہیں اور تو کتا ہے اور کتا ہی رہے گا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں سیلون سے باہر آیا تو بالکل بدل گیا تھا۔ سلیقے کے بال اور سلیقے سے بنی ہوئی شیو۔

''واہ!''

لڑکی نے تعریفی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ بات ہوئی نا۔ اب تم انسان کے بچے معلوم ہو رہے ہو۔ بیٹھو گاڑی میں۔'' میں پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

لڑکی مجھے ایک خوب صورت سے مکان میں لے آئی تھی۔ کیا خوب صورت مکان تھا۔ میرے تو خوابوں میں بھی کچرا گھر اور گندے نالے ہی آتے تھے۔ آج پہلی بار قسمت مجھے ایک ایسے مکان میں لے آئی تھی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میرا وقت بدل چکا تھا۔

وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی اور ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ باتھ روم ہے۔ جاؤ اچھی طرح نہا کر یہ کپڑے پہن کر باہر آؤ۔''

میں اس کے باتھ روم کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ کیسا زبردست تھا۔ وہاں ایسی ایسی چیزیں تھیں، میں جن کے نام بھی نہیں جانتا تھا۔ استعمال سے بھی واقف نہیں تھا۔ یہ سب انسانوں کے لیے تھیں اور میں بے چارہ انسان کہاں رہا تھا۔

میں خوب صابن لگا لگا کر دیر تک نہاتا رہا۔ زندگی بھر کی گندگی میرے بدن سے اتر رہی تھی۔ پانی تک گدلا ہو کر بہہ رہا تھا۔

میں نے تقریباً ایک گھنٹا لگایا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب میں نہا دھو کر نئے کپڑے بدل کر باہر نکلا تو خود وہ لڑکی بھی مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ''واہ۔ یہ بات ہوئی نا۔ اب تم ہزاروں نوجوانوں سے بہتر ہو۔''

اس کے ملازم نے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔ یہ سب میرے ساتھ پہلی بار ہو رہا تھا۔ کھانے میں نہ جانے کیا کیا چیزیں تھیں۔ شاید اس شادی ہال میں بھی نہیں ہوتی ہوں گی جس کے باہر ایک کچرا گھر تھا اور جہاں مجھے ایک کتا مل گیا تھا۔

''ہونہہ!'' میں نے نفرت اور بے زاری سے ہونٹ سکیڑے۔ ''تیری اوقات ہی کیا ہے۔ آ دیکھ، انسان کس طرح رہتے ہیں۔''

”کیا بات ہے۔ تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟“ لڑکی نے حیرانی سے پوچھا۔

”کسی سے نہیں۔“ میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ ”بس ایک خیال آ گیا تھا کہ میں نے بھی کیسی زندگی گزاری ہے۔“

”اب اس قسم کے خیال کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اب سب ٹھیک ہے۔ تم میرے پاس آ چکے ہو۔ پچھلی زندگی بھول جاؤ۔ چلو کھانا شروع کرو۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈیڈی سے ملواؤں گی۔“

اتنا زبردست کھانا کھانے کے بعد مجھے نیند سی آنے لگی تھی۔ انسان کا پیٹ بھر جائے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ بھوکا ہو تو نیند غائب ہو جاتی ہے۔

ویسے ایک بات ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے اس کتے کا بھی خیال آ گیا تھا۔ نہ جانے وہ اس وقت کہاں جھک مار رہا ہوگا۔ خیر اب میرا اس سے کیا تعلق تھا۔ میں تو اب ایک مکمل انسان تھا۔

اس وقت وہ لڑکی پہلے سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی اور مجھے یہ پتا چلا کہ جب پیٹ بھرا ہو تو لڑکیاں بہت خوب صورت معلوم ہونے لگتی ہیں۔

”چلو۔ اب تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں ڈیڈی کو لے کر آتی ہوں۔“

میں اس کے شاندار ڈرائنگ روم میں کسی شاندار آدمی کی طرح جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد کسی شخص کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکی بھی کچھ بول رہی تھی۔ لیکن دونوں انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا تو یہ حال تھا کہ جب پوری طرح اردو سمجھ میں نہیں آتی تھی تو انگریزی کہاں سے آتی۔

پھر وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کیم شیم خوش پوش انسان اور وہی لڑکی۔ اس شخص نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ روزی تمہیں کہاں سے پکڑ کر لائی ہے؟“

”ڈیڈ۔ یہ بے چارہ بھی انسان ہے۔“

”انسان۔ تم ہر دوسرے تیسرے دن گندی نالی کے کسی کیڑے کو اٹھا کر لے آتی ہو اور کہتی ہو کہ یہ انسان ہے۔ ختم کرو اپنا یہ احمقانہ تجربہ۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”یہ پاگل لڑکی مختلف طبقوں کے انسانوں کے رویوں پر ریسرچ کرتی پھر رہی ہے۔ اس لیے تمہیں اٹھا کر لائی ہے۔ اب تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”ڈیڈ۔ کوئی تجربہ تو مکمل ہونے دیں۔“

”نہیں، اب کوئی بے وقوفی نہیں۔ بھگاؤ اس کو۔“

”اچھا اچھا بھگاتی ہوں۔“ لڑکی نے پچاس کا ایک نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو پچاس روپے اور جاؤ یہاں سے۔“

”شکریہ میم صاحب۔“ میں تلخ لہجے میں بولا۔ ”میں گندی نالی کا کیڑا ہوں اور کیڑوں کو نوٹوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے اپنے پاس ہی رکھیں اور ہاں، میں نے آپ کے دیے ہوئے کپڑے پہن رکھے ہیں، انہیں کیسے واپس کروں؟“

”انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔“ لڑکی نے کہا۔

میں بہت بوجھل دل سے، نڈھال قدموں اس کمرے سے، اس لان سے پھر اس گیٹ سے باہر آ گیا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں چل رہا تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی۔ میرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میرے اردگرد بے شمار لوگ چل رہے تھے۔ لیکن وہ انسان تھے جبکہ میں انسان نہیں تھا۔ میں تو کچھ اور تھا۔ میں نہ جانے کب تک چلتا ہی رہا، چلتا ہی رہا اور پھر یاد آ گیا کہ میں اسی شادی ہال والے کچرا گھر پر پہنچ چکا ہوں۔ وہ کتا وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پایا تھا۔

”دوست یہ میں ہوں۔“ میں نے آواز لگائی۔ ”تمہارے پاس واپس آ گیا ہوں۔“

”ارے۔ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”تم تو بالکل انسان معلوم ہو رہے ہو۔“

”نہیں دوست؟ میں انسان نہیں ہوں۔ ایک تجربے کی چیز ہوں۔“

”آخر ہوا کیا ہے؟“

میں نے اسے ساری کہانی سنا دی کہ وہ لڑکی مجھے اپنے ساتھ کیوں لے گئی تھی۔

کتے نے افسوس سے اپنی گردن جھکا لی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”اب بتاؤ، اب کیا ارادہ ہے؟“

”مرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے پھر سے کاٹو اور اس بار ایک دو جگہ نہیں، کاٹتے چلے جاؤ۔ کاٹتے چلے جاؤ۔“

اور وہ مجھے کاٹنے لگا۔ یہاں وہاں، ہاتھوں میں، پیروں میں۔ ہر جگہ کاٹتا ہی رہا۔ بے پناہ تکلیف، پھر تکلیف کا احساس بھی ختم۔ سب کچھ ختم، اندھیرا، سکون۔

دوسرے دن اخبار میں ایک کچرا گھر کے پاس ایک آدمی اور ایک کتے کی لاشیں ملنے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔



نوشۂ گنج بخش

ضیا تسنیم بلگرامی

ازل سے دنیا کی تیرگی میں نورِ الٰہی سے اجالا پھیلتا آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس اجالے کا سبب ہمیشہ اپنے برگزیدہ بندوں کو بنایا تاکہ بنی نوع انسان کی راہ نمائی کا سلسلہ تا قیامت چلتا رہے۔ انہی بزرگانِ دین میں حاجی محمد کا شمار بھی ہوتا ہے، جن کی ذات سے کتنی ہی کرامات وابستہ ہیں۔

پیدائش سے قبل ہی دھوم مچانے والے ایک ولی کا زندگی نامہ

موضع گھوگا نوالی کی بی بی جیونی نہ صرف یہ کہ بذات خود نیک اور متقی پرہیزگار تھیں بلکہ ان کے شوہر علاؤالدین حسین غازی کی عظمت اور بزرگی مشہور اور مستند تھی۔ گھوگا نوالی، پھالیہ اور پورا گجرات ان سے عقیدت واحترام سے پیش آتا تھا۔ یہ لوگوں میں حاجی غازی صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ چھ حج کر چکے تھے اور ساتویں کی تیاری کر رہے تھے لیکن بی بی جیونی کی ناسازی طبع ان کے پاؤں پکڑ رہی تھی۔ عزیز رشتے دار اور گاؤں کے دوسرے لوگ نہایت احترام اور عقیدت مندی سے حاضری دیتے اور دریافت کرتے۔

”حضرت! حج کو کب تشریف لے جا رہے ہیں؟“

حاجی غازی صاحب جواب دیتے۔ ”معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میں جب بھی جانے کا ارادہ کرتا ہوں کوئی میرے ارادے کو توڑ کر بے

بس اور مجبور کر دیتا ہے۔"

خاندان کے ایک بزرگ نے کہا۔ "علاؤالدین! تو کن وسوسوں میں گھرا ہوا ہے؟ حج پر جانا چاہتا ہے تو چلا جا، اس میں فکر، تردد یا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

حاجی غازی صاحب نے جواب دیا۔ "یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ اس میں فکر و تردد یا پریشان ہونے والی کیا بات ہے، لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ کوئی غیر مرئی قوت میرے پاؤں پکڑ رہی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس وقت میں سمندر کے ساحل پر کسی بحری جہاز کا انتظار کر رہا ہوتا۔"

اسی دوران، ایک رات خواب میں آپ نے دیکھا، کوئی کہہ رہا ہے۔ "علاؤالدین! تو حج پر جانا چاہتا ہے تو شوق سے جا، لیکن بی بی جیونی کو بتاتا جا کہ اس کے شکم میں جو یکتائے زمانہ فرزند پرورش پا رہا ہے، اس کا بطورِ خاص خیال رکھے۔ کیونکہ تیرا یہ فرزند مقتدائے زمانہ اور فرد یگانہ ہے۔"

حاجی غازی صاحب یہ خواب دیکھ کر بیدار ہوئے تو بڑی دیر تک اس کی تعبیر کے بارے میں سوچتے رہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا یہ خواب غیر معمولی ہے اور خواب میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ حرف بحرف درست ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی، بی بی جیونی کے پاس تشریف لے گئے۔ بیوی نے انہیں فکرمند جو دیکھا تو دریافت کیا۔

"کیوں جناب، خیریت تو ہے، آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں؟" شوہر نے جواب دیا۔ "ہاں میں کل تک واقعی پریشان تھا لیکن آج اس وقت میں بے حد خوش اور ہشاش ہوں۔"

بیوی نے پوچھا۔ "یعنی یہ کیوں؟ خوشی کا سبب کیا غیب سے کچھ ہاتھ آگیا؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "تم یہی سمجھ لو۔" پھر اپنا خواب سنا کر دریافت کیا۔ "کیا یہ سچ ہے تم ان دنوں امید سے ہو؟"

بیوی نے کہا۔ "کمال ہے کہ تمہیں اس کا اب تک علم نہیں۔"

شوہر نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے اس کا علم تھا لیکن محض شبہے کی وجہ سے خاموش تھا۔"

بیوی نے کہا۔ "تمہارے اس سوال کے جواب میں، میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتی ہوں کہ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تم حج پر جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ، کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو خدا جسد خاکی میں روح پھونکتا ہے وہی اس کا محافظ اور پروان چڑھانے والا بھی ہے۔"

حاجی غازی صاحب نے جواب دیا۔ "نیک بخت! جو میں کہہ رہا ہوں۔ اس کا وہ مطلب نہیں، جو تو سمجھ رہی ہے۔ بلکہ میں نے اس بچے کے سلسلے میں ایک خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ حاجی غازی! بی بی جیونی کے شکم میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے۔ وہ مستقبل کا مقتدائے زمانہ اور فرد یگانہ ہے، اس لیے اس کا بطورِ خاص خیال رکھا جائے۔"

بی بی جیونی اس بشارت سے بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ذات پر ناز محسوس کیا لیکن پھر فوراً ہی توبہ و استغفار کر کے خاموش ہو رہیں۔ حاجی غازی فرماتے رہے۔ "بی بی! میں حج کی نیت کر چکا ہوں۔ اس لیے میں ضرور جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے تمہیں یہ ہدایت کروں گا کہ اس بچے کا خاص خیال رکھنا۔ اگر میں جلدی واپس آسکا تو میں خود بھی اس کا خاص خیال رکھوں گا۔ لیکن اگر میں جلدی نہ آسکا تو بچے کی نگہداشت اور حفاظت تمہارے ذمے ہوگی۔"

اس کے بعد حاجی غازی اپنے ساتویں حج پر چلے گئے اور بی بی جیونی آنے والے عظیم انسان کا انتظار کرنے لگیں۔

ساتویں ماہ بی بی جیونی کو ایسا لگنے لگا گویا ان کا پورا وجود ہلکا اور معطر ہے۔ طبیعت ایک ناقابل بیان کیف و سرت سے سرشار رہنے لگی۔ اس عالم میں بی بی جیونی کے چند عزیزوں نے انہیں مطلع کیا کہ مشہور بزرگ اور صاحبِ کرامت صوفی شاہ سلیمان اپنے گاؤں میں تشریف لا رہے ہیں۔

شاہ سلیمان کی ذات ایسی نہیں تھی کہ ان کا تعارف کرایا جاتا۔ وہ خود بھی اپنے دور کے یگانۂ روزگار تھے۔ بی بی جیونی نے اپنے ایک عزیز سے کہا۔ "شاہ سلیمان قیام کہاں کریں گے؟"

عزیز نے جواب دیا۔ "ان کا کیا ہے، وہ کہیں بھی قیام فرما سکتے ہیں۔ کیونکہ اس گاؤں کا ہر آدمی آپ کا معتقد اور عاشق ہے۔ وہ جہاں بھی ٹھہرنا چاہیں گے، ٹھہر جائیں گے۔"

بی بی جیونی نے بڑی حسرت سے کہا۔ "افسوس کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ اگر وہ حج پر نہ گئے ہوتے تو شاہ سلیمان کے استقبال اور مہمانداری کا فرض وہ انجام دیتے۔"

عزیز نے جواب دیا۔ "بی بی جیونی! ان حالات میں تو آپ کو سوچنا بھی نہیں چاہیے اور شاید شاہ سلیمان بھی آپ کے پاس ٹھہرنا پسند نہ فرمائیں۔"

بی بی جیونی نے کہا۔ "نہیں، میں یہ نہیں چاہتی کہ شاہ صاحب میرے غریب خانے میں قیام فرمائیں بلکہ میں یہ چاہتی ہوں کہ ان کے روئے جمال دیکھ کر اپنے دل و دماغ کو تازگی اور فرحت بخشوں۔"

عزیز نے عرض کیا۔ "بی بی! اگر یہ بات ہے تو میں میاں جی کو کسی بھی بہانے اس گھر میں ضرور لاؤں گا۔ آپ ہرگز فکرمند نہ ہوں، یہ میرا ذمہ۔"

عزیز چلا گیا اور شاہ سلیمان کا خوش کن خیال بی بی جیونی کو آسودگی اور فرحت نہیں بخش سکا کیونکہ انہیں اپنے شوہر کی عدم موجودگی کا غم کھائے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس عزیز نے بی بی جیونی کو بڑی بے چینی سے مطلع کیا۔ "بی بی! شاہ سلیمان آپ ہی کے گھر کی طرف چلے آرہے ہیں۔"

بی بی جیونی کو اپنے عزیز کی بات پر یقین نہیں آیا، بولیں۔ "یہ تجھے کس طرح معلوم ہوا کہ شاہ سلیمان میرے ہی گھر کی طرف چلے آرہے ہیں، یہ بات نے کس سے سنی؟"

عزیز نے جواب دیا۔ "بی بی! میں نے خدا کو دیکھا تو نہیں، قیاس اور عقل سے پہچانا ہے۔ اسی طرح میں نے شاہ سلیمان کے بارے میں نہ تو کسی سے کچھ سنا ہے اور نہ ہی خود شاہ جی نے کچھ بتایا لیکن آثار اور قرائن یہی بتا رہے ہیں کہ شاہ سلیمان آپ ہی کے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ کیوں آرہے ہیں، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔"

بی بی جیونی نے کہا۔ "اگر یہ بات درست ہے تو مجھے ان کے قیام و طعام کا بندوبست کرنا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو گھر کی صفائی ستھرائی پر لگا دیا۔

ابھی صفائی ستھرائی کا کام جاری ہی تھا کہ بی بی جیونی کو یہ خبر سنائی گئی کہ شاہ سلیمان، حاجی غازی کے گھر کو شرف میزبانی بخشنا چاہتے تھے بی بی جیونی نے فرطِ خوشی میں شاہ جی کو ایک صاف ستھرے کمرے میں ٹھہرا دیا اور ان کے مریدوں کے لیے اپنے چھوٹے سے باغ میں انتظام کر دیا۔ بی بی جیونی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر شاہ سلیمان اس پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟

شاہ سلیمان نے قیام فرما ہوتے ہی پوچھا۔ "بی بی جیونی! تیرا شوہر کہاں چلا گیا؟ وہ کہیں نظر نہیں آرہا۔"

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ "حضرت اب میں ان کے بارے میں کیا بتاؤں؟ وہ اپنے ساتویں حج پر تشریف لے گئے ہیں۔ جب تک وہ واپس نہیں آجاتے، اس گھر کی رہنمائی اور رہبری میرے ذمے ہے۔"

شاہ سلیمان نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "افسوس کہ مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا کہ اس گھر میں حاجی غازی موجود ہی نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، تم تو موجود ہو اور پھر میں جس مقصد سے آیا ہوں، اسے تم پر ظاہر کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ میں اس گاؤں میں خود نہیں آیا۔ بلایا گیا تو آگیا ورنہ یہ چلنا پھرنا میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔"

بی بی جیونی نے عرض کیا۔ "خیر، اب یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، آپ قیام فرما رہیں گے تو دوسری باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

شاہ سلیمان اپنے مریدوں کے ساتھ حاجی غازی کے گھر میں ٹھہر گئے۔

☆☆☆

شاہ سلیمان نے اس رات کسی بڑی بی کے ذریعے یہ کہلوا دیا کہ چونکہ وہ بات ہی کچھ ایسی ہے جو بی بی جیونی سے نہیں کہی جا سکتی، اس لیے میں اس معمر عورت کے ذریعے بات کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

بی بی جیونی کا دل دھک دھک کرنے لگا، بولیں۔ "حضرت جو کچھ کہنا سننا ہے فوراً ہی کہہ سن ڈالیں۔ مجھے معلوم نہیں کیوں ہول سا اٹھ رہا ہے۔"

شاہ سلیمان نے کہلوایا۔ "میں اپنے گاؤں بھلوال میں بڑے چین سے رہ رہا تھا کہ مجھے حکم دیا گیا کہ سلیمان، موضع گھوگانوالی پہنچو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے سے دریافت کیا۔ 'گھوگانوالی کس کے پاس اور کیوں؟' مجھے حکم دیا گیا۔ 'حاجی غازی کے گھر۔ حاجی غازی حج پر گیا ہوا ہے' تو اس کی بیوی کے پاس جا اور اس نیک بخت سے کہہ دے کہ اس کے شکم میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے، اس کا بے حد خیال رکھنا ہے۔"

بی بی جیونی کی طبیعت قابو میں آئی اور ذرا اطمینان کی سانس لی، بولیں۔ "شاہ سلیمان سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سلسلے میں تشریف نہ بھی لاتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیونکہ میرے شوہر پہلے ہی یہ ہدایتیں دے چکے ہیں۔"

شاہ سلیمان نے کہلوایا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن میں بذاتِ خود اس حکم کی تعمیل پر مجبور تھا جو مجھے دیا گیا تھا کہ بی بی جیونی کو بشارت دے دوں کہ عنقریب وہ جس بچے کی ماں بننے والی ہے، وہ ایک عظیم اور غیر معمولی انسان ہوگا۔ اس لیے بی بی جیونی کو اس کا خاص خیال رکھنا ہے۔"

بی بی جیونی نے جواب میں کہلوا دیا۔ ”میں شاہ صاحب کی زحمت فرمائی سے خوش بھی ہوں اور شرمندہ بھی۔ خوش اس لیے کہ شاہ صاحب نے میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا اور شرمندہ اس لیے کہ شاہ صاحب کو میرے غریب خانے تک زحمت فرمانا پڑی۔“

بی بی جیونی کے اس جواب نے شاہ صاحب کو بہت لطف اندوز کیا۔ آہستہ سے فرمایا۔ ”کیا سلجھی ہوئی عقل ملی ہے، کیا رسا ذہن پایا ہے۔ واللہ!“ بی بی جیونی نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے دن شاہ صاحب نے خود ہی ارشاد فرمایا کہ اب میں واپس چلا جاؤں گا اور اس وقت دوبارہ آؤں گا جب میرا مخاطب بھی اس دنیا میں آچکا ہوگا۔

بی بی جیونی کی طرف سے بڑی بی نے دریافت کیا۔ ”حضرت! بی بی جیونی دریافت فرما رہی ہیں کہ آنے والے شخص کے بارے میں آپ مجھے اور کیا کچھ بتا سکتے ہیں؟ کیونکہ میں نے اس کے بارے میں ابھی تک جو کچھ سنا ہے اس سے میں اپنے اندر ایک قسم کا فخر اور بڑا پن محسوس کر رہی ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قسم کی سرشاری میری اپنی ذات کے لیے ہو اور خدا کو میرے یہ احساسات اور جذبات برے لگے ہوں؟“

شاہ سلیمان نے جواب دیا۔ ”بی بی جیونی سے کہہ دو کہ وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے کیونکہ یہ بچہ ان کے لیے انعامِ الٰہی ہوگا اور خدا کی نعمتوں کا شکر گزار ہونا اور اس پر فخر کرنا دینداری میں داخل ہے۔“

بی بی جیونی نے شاہ صاحب کے جواب پر خدا کا شکر ادا کیا۔

شاہ سلیمان چلے گئے اور بی بی جیونی عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئیں۔ ان دنوں بی بی جیونی کے منہ سے ہر پل خدا کی حمد و ثنا ہو رہی تھی اور وہ سرتاپا عجز و نیاز ہوگئی تھیں۔

دو ماہ اور گزر گئے اور جس کا انتظار تھا، وہ پیدا ہوگیا۔ بی بی جیونی نے اسے بھی گلے سے لگالیا اور خوب خوب پیار کیا۔ وہ نومولود کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتیں اور ان میں بزرگی اور عظمت کے آثار تلاش کیا کرتیں۔ بچہ اپنی ماں کو لاتعلق نظروں سے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔

کچھ دنوں بعد شاہ سلیمان دوبارہ تشریف لائے اور بی بی جیونی سے نومولود کو مانگا۔ ماں نے بچے کو ان کی گود میں ڈلوایا۔ شاہ صاحب نے بچے کو گود میں لے کر سینے سے لگالیا، بولے! ”میں اپنا خزینۂ بطن نومولود میں منتقل کر رہا ہوں۔“

بی بی جیونی نے کہلوایا۔ ”حضرت! بچے کا نام بھی تو تجویز فرمایئے۔“ شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ”میں اس کا نام محمد رکھنا چاہتا ہوں لیکن تنہا محمد، نام رکھنے سے اسم محمد ﷺ کی بے حرمتی ہوگی۔ اس لیے محمد سے پہلے، حاجی، لگائے دیتا ہوں۔ گویا اس بچے کا نام حاجی محمد ہوگا۔ خدا اس نام کو بابرکت کرے۔“

بی بی جیونی نے زیرِ لب نام دُہرایا۔ ”حاجی محمد۔ خوب گویا میرا بیٹا پیدائشی حاجی ہے۔“

شاہ صاحب نے اپنے خرقے کا بقدر رومالی ایک ٹکڑا پھاڑ کر الگ کرلیا اور پھر اس کو درمیان سے گریبان کی طرح چاک کیا اور اسے نومولود کے گلے میں ڈال کر فرمایا۔ ”یہ میرا خرقہ ہے جو امانتاً میرے پاس محفوظ تھا اب میں اسے اس کے سپرد کرکے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوتا ہوں۔“

گھر والوں نے اظہارِ خوشی میں بچے کو باری باری گود میں لیا اور بوسے دینے لگے۔ سب سے آخر میں بی بی جیونی نے اپنی آغوش میں لے لیا اور جی بھر کے پیار کیا۔

باہر شاہ سلیمان واپسی کی اجازت مانگ رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا۔

”میں اپنا خرقہ نومولود کو دے چکا اس لیے یہاں مزید رکنا فضول ہے، اب مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔“

بی بی جیونی نے شاہ صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اب انہیں اپنے شوہر اور بچے کے باپ حاجی غازی کا انتظار تھا۔

اب تک جو کچھ ہوا تھا یا ہو رہا تھا، اس سے پورا گاؤں واقف تھا اور گھوگا تو الی کا بچہ بچہ اس نومولود کا والہ و شیدا تھا۔ صبح سے شام تک گاؤں کے لوگ آتے جاتے رہتے اور اس بچے کا دیدار کرتے رہتے۔ ان میں اکثر بچے کو گود میں لینے کی بھی کوشش کرتے لیکن بی بی جیونی بچے کو کسی کی گود میں نہ جانے دیتیں۔

ایک دن بی بی جیونی گھر کے کام دھندوں میں اس بری طرح پھنسیں کہ بڑی دیر تک بچے کو گود میں نہ لے سکیں۔ اس دوران پڑوس کی ایک عورت گھر میں داخل ہوئی اور بی بی جیونی سے کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگی۔ پوچھا۔ ”بی بی جیونی! اب آپ کا بیٹا کتنے ماہ کا ہوگیا؟“

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ”بہن پورے نو ماہ کا اور یہ نو ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے کچھ پتا ہی نہ چلا۔“

پڑوسن نے کہا۔ ”اور بچے کا باپ اب تک واپس نہیں آیا۔ آخر یہ کون سا حج کرنے گیا ہے؟“

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ”بہن! بچے کے باپ کو کچھ نہ کہو، کیونکہ وہ میرا شوہر بھی ہے اور تم جانو حج پر جانا اور ساتھ خیریت سے واپس

آجانا اتنا آسان بھی نہیں جتنا ہم لوگ غلطی اور نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں۔“

پڑوسن نے عرض کیا۔ ”پھر بھی بہن جیونی بی بی انہیں حج پر گئے بارہ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا۔ اب تو انہیں ہر حال میں واپس آجانا چاہیے۔“

بی بی جیونی نے پھر اپنے شوہر کی وکالت کی، فرمایا۔ ”ہوسکتا ہے حج کے بعد وہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو نکل گئے ہوں۔ ان کی عدم موجودگی میں، میں ہمیشہ یہی دعا مانگتی ہوں کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، خدا کے حفظ و امان میں ہوں۔ میں ان پر اتنا ہی اعتبار کرتی ہوں، جتنا کوئی بیوی اپنے اعلیٰ درجے کے دیندار اور متقی پرہیزگار شوہر پر کرسکتی ہے۔“

پڑوسن نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بچہ سو رہا ہے؟“

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ”شاید اگر وہ جاگ بھی رہا ہوگا تو وہ رو رو کر مجھے پریشان نہیں کرتا، اس لیے اس کا سونا جاگنا میرے لیے یکساں ہے۔“

پڑوسن اس مقدس بچے کو گود میں لے کر کھلانا اور برکت حاصل کرنا چاہتی تھی، بولی۔ ”کیا میں اس بچے کو کچھ دیر کے لیے اپنے گھر لے جاؤں؟“

بی بی جیونی نے فوراً انکار کردیا، بولیں۔ ”بہن! میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ کیونکہ مجھے شاہ سلیمان نے منع کردیا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ بی بی جیونی، اس بچے کو ہر کس و ناکس کی گود میں ہرگز نہ جانے دینا، کیونکہ اس کا اس گود میں جانا بہتر ہوگا جو ہر طرح پاک صاف اور طہارت پر پوری اترتی ہو۔“

پڑوسن چپ ہوگئی اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

کافی دیر بعد، جب بی بی جیونی گھر کے کاموں میں اتنی منہمک ہوگئیں کہ انہیں کسی اور بات کا ہوش ہی نہ رہا تو عورت نے ان سے کہا۔

”بی بی جیونی! اگر تم اجازت دو۔ تو میں بچے کو ایک نظر دیکھ لوں کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟“

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ”کوئی مضائقہ نہیں، لیکن بہن اسے چھیڑنا مت۔“

پڑوسن نے کہا۔ ”بی بی تم خاطر جمع رکھو، میں اسے ایک نظر دیکھ کر ابھی واپس آتی ہوں۔“

بی بی جیونی پڑوسن کو اجازت دے کر کام میں مشغول ہوگئیں اور پڑوسن بچے کے پاس چلی گئی۔ حاجی محمد جھولے میں سوئے ہوئے تھے اور چونکہ بڑی دیر سے کسی نے جھولے کو حرکت نہیں دی تھی، اس لیے وہ ساکت تھا۔ پڑوسن نے جھولے کے پاس پہنچ کر کچھ وقت تو اس کش مکش میں گزار دیا کہ وہ بچے کے چہرے پر سے چادر ہٹائے یا نہ ہٹائے۔ پھر وفورِ شوق میں بے قابو ہوگئی اور بے اختیار چادر ہٹا کر بچے کو گود میں اٹھا لینا چاہا۔ ابھی اس کے دونوں ہاتھ بچے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک کالا سانپ پھن اٹھا کر عورت پر حملہ آور ہوگیا۔ عورت نے ایک چیخ ماری اور بے اختیار پیچھے ہٹی، وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور پھسل کر ڈھیر ہوگئی۔

بی بی جیونی پڑوسن کی چیخ اور گرنے کے دھماکے پر بھاگ کر جھولے کے پاس پہنچیں تو بچے کو چھت کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ بی بی جیونی نے پڑوسن کو اٹھایا اور پوچھا۔ ”بہن! یہ تم چیخی کیوں تھیں اور گر کس طرح گئیں؟ خیریت تو ہے؟“

پڑوسن کی سانپ کے ڈر سے گھگی بندھ گئی تھی، کپکپاتی آواز میں بہ مشکل بولی۔ ”سانپ کالا افعی، بالکل سیاہ رات جیسا کالا سانپ۔“

بی بی جیونی نے حیرت سے پوچھا۔ ”سانپ! کیسا سانپ! کہاں ہے وہ کالا سانپ؟“

پڑوسن اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور دور ہی سے جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہاں، جھولے میں۔ بچے کے داہنی طرف بغل کے پاس۔“ بی بی جیونی نے چادر اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے چادر کو جھاڑا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ سانپ؟“

پڑوسن ابھی تک خوفزدہ تھی، جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہاں جھولے میں۔“

بی بی جیونی نے ہنس کر کہا۔ ”یہاں تو کہیں سانپ وانپ نہیں۔ تمہیں شبہ ہوا ہوگا۔ اگر ہوتا تو مجھے نظر تو آتا۔“

پڑوسن نے اپنے ہاتھ کی کلائی بی بی جیونی کی طرف بڑھا دی، بولی۔ ”بی بی! اگر میں اپنا یہ ہاتھ فوراً نہ ہٹا لیتی تو وہ سانپ مجھے ضرور ڈس لیتا۔ اس نے میرے ہاتھ پر پھن مارا تھا اور اس کے منہ سے زبان کے بجائے ایک شعلہ سا نکلا تھا۔ اگر یقین نہیں آتا تو میرے ہاتھ کی کلائی کے بالوں کو دیکھ لو۔ یہ سب اس شعلے سے جھلس کر رہ گئے ہیں۔“

بی بی جیونی نے ذرا غور سے پڑوسن کی کلائی جو دیکھی تو واقعی سارے بال جھلسے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے ایک بار پھر جھولے میں اس سانپ کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔

پڑوسن پر اتنی دہشت طاری ہوئی تھی کہ وہ مزید رک نہیں سکی، فوراً ہی چلی گئی۔ مارے خوف کے اس کو بخار آگیا۔ بخار کی شدت میں وہ ہذیان بکنے لگی۔ ہذیان بکتے بکتے وہ بے ہوش ہوگئی۔ اس نے عالمِ بے ہوشی میں دیکھا کہ وہی کالا سانپ پھن اٹھائے اس کے

سامنے کھڑا تھا۔ اس نے شدت خوف سے چیخنا چاہا مگر اس کی آواز حلق سے باہر نہ نکل سکی۔ پھر اس نے سانپ کو آہستہ آہستہ انسانی شکل میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ کچھ ہی دیر میں یہ سانپ حاجی محمد کی شکل اختیار کر گیا۔ بی بی جیونی کے بچے کی شکل دیکھ کر عورت کا خوف کسی قدر کم ہوا۔ وہ حیرت سے بولی۔ ”حاجی محمد، یہ تم!“

حاجی محمد نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ میں ہوں، حاجی محمد علاؤ الدین حسین غازی اور بی بی جیونی کا بیٹا۔ تجھے حیرت کیوں ہو رہی ہے؟“

عورت نے کہا۔ ”اور وہ سانپ کیا ہوا؟“

حاجی محمد نے جواب دیا۔ ”وہ میرے غصے اور عتاب کی شکل تھی۔“ عورت نے پھر سوال کیا۔

”غصے اور عتاب کی شکل کا مطلب؟“ بچے نے جواب دیا۔ ”عورت! تو سچ بتا، جس وقت تو مجھے اپنی گود میں لے رہی تھی، کیا تو پاک تھی؟“

عورت نے کہا۔ ”نہیں، میں پاک نہیں تھی، واقعی میں ناپاک تھی۔“ بچے نے خفگی سے کہا۔

”جب تو ناپاک تھی تو مجھے اپنی گود میں کیوں لے رہی تھی؟ بس اس بات پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تجھے خوفزدہ کر کے اپنے پاس سے دور کر دیا۔“

عورت رونے لگی، بولی۔ ”حضرت! واقعی میں نے بڑی غلطی کی تھی، مجھے معاف کر دیجیے۔ اب مجھ سے اس قسم کی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔“

حاجی محمد نے جواب دیا۔ ”اچھا، اب اٹھ کر کھڑی ہو جا میں نے تجھے معاف کر دیا۔“

عورت کی ہذیانی کیفیت دور ہو گئی اور بخار بھی جاتا رہا۔ اس کے آس پاس جو عزیز رشتے دار جمع ہو گئے تھے، انہوں نے عورت کی باتیں سن لی تھیں۔ لیکن حاجی محمد کی باتیں نہیں سن سکے تھے۔ عورت کی بڑبڑاہٹ کو ان سب نے اس کی ہذیانی کیفیت کا نتیجہ قرار دیا تھا لیکن جب عورت نے مسکراتے ہوئے بشاشت سے دونوں آنکھیں کھول دیں تو وہ خوفزدہ ہو گئے۔ انہیں شبہ گزرا کہ یقیناً اس عورت کا دماغ چل گیا ہے۔

کسی ایک نے دوسروں کو رائے دی۔ ”بہتر ہے کہ اس عورت کو باندھ دیا جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ یہ پاگل پن میں کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”خبردار جو کسی نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا۔ کیونکہ میں صحیح الدماغ ہوں اور میں اس وقت جس عذاب میں مبتلا تھی وہ بی بی جیونی کے بزرگ بچے حاجی محمد کا مجھ پر ایک قسم کا غصہ تھا۔“

عورت کے شوہر نے پوچھا۔ ”کیا تو اپنے ہوش میں ہے اس وقت؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”میں بالکل اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ تم لوگ جس طرح چاہو، میرے ہوش و حواس کا امتحان لے سکتے ہو۔“

شوہر نے کہا۔ ”اچھا تو پورا وہ واقعہ سنا دے جس کے عتاب میں خود تیرے بقول تیری یہ حالت ہو گئی تھی۔“

عورت نے سب کچھ صاف صاف بلا مبالغہ شوہر کو بتا دیا اور آخر میں بحالت بے ہوشی حاجی محمد سے جو باتیں ہوئی تھیں، وہ بھی بتا دیں، تو سب کو عورت کی سچائی پر یقین آ گیا۔ اس واقعہ نے بی بی جیونی کے بزرگ بچے کو اور زیادہ مشہور اور محترم بنا دیا۔

☆☆☆

یہ بچہ اسی طرح پرورش پاتا رہا اور کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوتا رہا جس سے بچے کی عظمت اور بزرگی کی شہادت ملتی رہی۔ حاجی غازی ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ یہاں تک کہ حاجی محمد پانچ سال کے ہو گئے۔ بی بی جیونی کی ذمے داریوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ اپنے بیٹے کو حفظ و ناظرہ کی تعلیم دلانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ کام ان کے شوہر حاجی غازی کے ہاتھوں انجام پائے۔ وہ گڑگڑا کر خدا سے دعا کرتی رہتی تھیں کہ ان کا شوہر خیرت سے واپس آ جائے۔

آخر ان کی یہ دعائیں قبول ہوئیں اور حاجی غازی پانچ سال باہر رہ کر واپس آ گئے۔ وہ اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے مضطرب اور بے چین تھے۔ چنانچہ گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی سے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

بی بی جیونی کا خوشی سے برا حال تھا، بولیں۔ ”وہ کون؟ یہ کس کو پوچھ رہے ہو؟“

مارے خوشی کے بی بی جیونی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حاجی غازی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گئے اور اندیشوں نے مضطرب کر دیا، بولے۔ ”بی بی! میں اپنے بچے کی بابت پوچھ رہا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”تم اس محبت اور مشقت کا اندازہ شاید نہیں لگا سکتے، جو مجھے اس بچے کی پرورش، تربیت اور حفاظت میں کرنی پڑی۔“ پھر بیٹے کو آواز دی۔ ”بیٹے حاجی محمد! ادھر آؤ، دیکھو یہ کون آ گیا۔“

حاجی غازی نے بیوی کو قدرے حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ”حاجی محمد، یعنی یہ کیسا نام؟“

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ”یہ نام حضرت شاہ سلیمان نے رکھا ہے۔ صرف ”محمد ﷺ“ نام رکھنے سے اس نام کی بے حرمتی ہوتی۔ اس

لیے اس میں لفظ حاجی کا اضافہ کر دیا۔“

اتنی دیر میں حاجی محمد بھی آ گئے۔ باپ کو ایک نظر دیکھا۔ باپ نے بیٹے پر شفقت کی نظر ڈالی اور پھر دونوں ہی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے۔ حاجی غازی کو اپنے پانچ سالہ بیٹے کو سینے سے لگانے کے لیے خاصا جھکنا پڑا تب کہیں بیٹے کا سر باپ کے سینے سے لگ سکا۔ باپ کی ڈاڑھی بیٹے کے سر اور پشت پر بکھر گئی۔

بی بی جیونی اس دلکش اور روح پرور نظارے سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

حاجی غازی نے بیوی نے پوچھا۔ ”صاحبزادے کچھ پڑھ لکھ بھی رہے ہیں؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”یہ کام میں نے تمہارے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ اب آ گئے ہو تو تم ہی یہ فرض بھی ادا کرو۔“

حاجی غازی نے چند دن آرام کیا۔ اس کے بعد بیٹے کو مولانا حافظ قائم الدین قاری حنفی جاگوئی کی خدمت میں لے گئے اور ان سے درخواست کی کہ بچے کو علوم ظاہری سے مالا مال کیا جائے۔ مولانا قائم الدین اپنے عہد کے مشہور اور لائق ترین عالم تھے۔ حاجی محمد کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ چند ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ مولانا قائم الدین ان کی اس غیر معمولی ذہانت اور حافظے سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کے حلقہ درس میں اس پائے کا ذہین اور فطین شاگرد تو پہلے کبھی آیا تھا اور نہ ان کے بعد آیا۔

علوم معقول اور منقول کی تحصیل کے بعد حاجی غازی نے سلوک قادریہ اور قطبیہ سے آشنا کیا۔

سترہ سال کی عمر میں آپ نے فیصلہ کر لیا کہ دنیا کو ترک کر دیں گے۔ چنانچہ ایک دن آپ نے جملہ اعزا سے کنارہ کشی اختیار کی اور گوندل بار کے جنگل کا رخ کیا۔ اس جنگل کے طول و عرض کا یہ حال ہے کہ تحصیل پھالیہ سے ضلع سرگودھا تک پھیلا ہوا ہے۔ نوجوان حاجی محمد اس وسیع عریض جنگل میں روپوش ہو کر یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ حاجی غازی اپنے نوجوان بیٹے کی گمشدگی سے بیحد پریشان ہو گئے اور انہیں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ اضطراب کا یہ حال تھا کہ جس نے جہاں کی نشاندہی... کی، حاجی غازی بیٹے کی جستجو میں وہیں پہنچ گئے۔ آخر بڑی مشکل سے انہیں معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا حاجی محمد گوندل بار کے جنگل میں کہیں موجود ہے۔ حاجی غازی کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ یہ بیٹے کی تلاش میں اس جنگل میں گھس گئے اور بیٹے تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ باپ سامنے جا کھڑا ہوا مگر ذکر و فکر میں محو اور مشغول نوجوان عابد کو بڑی دیر تک اپنے باپ کی آمد کا علم ہی نہ ہو سکا۔ آخر اس انہماک کو حاجی غازی نے ختم کیا۔ بہ آواز بلند بیٹے کو مخاطب کیا۔ ”بیٹے حاجی محمد! کیا تو میری طرف نہیں دیکھے گا؟“ باپ کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ آنکھیں کھول کر باپ کی طرف دیکھا۔ باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیٹے کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ باپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بیٹے! میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ تو یہاں جنگل میں موجود ہے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”پدر بزرگوار! مجھے ایک ہی رشتہ مضبوط اور دوامی محسوس ہوا۔ باقی سارے ہی رشتے عارضی اور وقتی نظر آئے۔ چنانچہ میرے خیال میں جو رشتہ مضبوط اور دوامی تھا میں نے اس کا انتخاب کر لیا اور اب میں اس کی تلاش میں سرگرم سفر ہوں، اچھے برے انجام کی پروا کیے بغیر۔“

باپ نے کہا۔ ”بیٹے! میں تیری بات پر آمنا و صدقنا کہوں گا لیکن یہ بھی تو سوچ کہ تو جن رشتوں کو عارضی کہہ رہا ہے، ان میں کا ایک رشتہ والدین کا بھی تو ہے۔ کیا ماں باپ اتنے خود غرض ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے جذبۂ مادری اور پدری کا گلا گھونٹ کر کنارہ کشی اختیار کر لیں؟“

بیٹے نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”بزرگوار! میں نے اس گھنے جنگل میں اپنے رب کی تلاش اور جستجو میں خاصا وقت گزارا ہے اور ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ ماسوا کو بھلا دوں۔ اپنے رب کے سوا سبھی کو نظر انداز کر دوں اور اس وقت اگر آپ میرے پاس نہ آ گئے ہوتے تو میں یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب رہا۔“

حاجی غازی نے شفقت سے جواب دیا۔ ”بیٹے! ایک چیز ہے سنت رسول ﷺ۔ اگر تو اس سنت کو ادا نہ کر سکا تو بڑے خسارے میں رہے گا۔“

حاجی محمد نے دریافت کیا۔ ”کون سی سنت؟ اور میں خسارے میں کیوں رہوں گا؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! وہ سنت شادی ہے اور تجھے اس سنت کو بہر قیمت پورا کرنا ہے۔“

نوجوان بیٹے نے عرض کیا۔ ”باوا جان! میں شادی سے کب انکار کر رہا ہوں لیکن شادی کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔“

باپ نے کہا۔ ”بیٹے! شادی کا یہی تو صحیح وقت ہے۔ میں تو تیری شادی کے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔“

حاجی محمد نے پریشان ہو کر عرض کیا۔ ”پدر بزرگوار! اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ آپ مجھے یہاں سے واپس لے جائیں گے۔“

حاجی غازی نے جواب دیا۔ ”بے شک میرا یہی مطلب ہے۔ اب تو گھر چلے گا۔“

بیٹے نے متامل ہو کر عرض کیا۔ ”مجھے گھر چلنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ میری ذات پر منحصر ہوگا کہ میں جب تک چاہوں رہوں اور جب چاہوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر روپوش ہو جاؤں۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا بلکہ میں بار بار یہی کہوں گا کہ تو جہاں بھی چاہے، جا سکتا ہے اور رہ بھی سکتا ہے لیکن اس سے پہلے تو حقوق العباد ضرور ادا کرے گا۔ تو جب تک اس دنیا میں رہے گا حقوق العباد کی ادائیگی ضروری ہے۔ اگر تو نے اپنا یہ فرض ادا کر دیا تو بعد میں کون ہے جو تیرے کسی معاملے میں بھی دخل دے۔ نہ انسان دخل دے سکتا ہے نہ خدا۔ دونوں خاموش ہو جائیں گے۔“

نوجوان حاجی محمد باپ کی دلیلوں سے چپ ہو گئے اور باپ کے ساتھ واپس چلے گئے۔

حاجی غازی نے وقت ضائع کیے بغیر آپ کا رشتہ طے کر دیا اور موضع نوشہرہ کے ایک بزرگ گھرانے کی لڑکی سے آپ کی شادی کر دی۔ آپ نے اسی گاؤں میں سکونت اختیار کر لی۔

رشتۂ ازدواج سے منسلک ہونے کے بعد آپ نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر یادِ الٰہی شروع کر دی۔ سارا دن تو نوشہرہ کی مسجد میں تلاوت قرآن میں مشغول رہتے اور رات کو دریا کے کنارے چلے جاتے اور اللہ اللہ میں پوری رات گزار دیتے۔ آپ کا یہ معمول چند سال متواتر رہا۔

ایک دن آپ کی بیوی کے ایک رشتے دار نے جو آپ کو اس محنت شاقہ میں مبتلا دیکھا تو ازراہِ ہمدردی عرض کیا۔ ”جناب والا! میں نے آپ جیسا عبادت گزار اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اگر آپ میری بات مانیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو مشورہ ضرور دے کیونکہ بہترین مشورہ بھی کارِ خیر ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس پر عمل کر کے میں کوئی خیر حاصل کر لوں۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! اپنے خاندان میں ایک بزرگ ملا کریم الدین ہیں۔ میں نے انہیں بھی شب و روز ذکر و فکر میں مستغرق دیکھا۔ اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ کے ہم پلہ ہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھی اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے ہیں۔ انہوں نے اپنی اصلاح اور تربیت کے لیے بھلوان کے شاہ سلیمان قادری سے رجوع کیا تھا اور آج اپنے انہی پیر و مرشد کے فیضان سے کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو انہی بزرگ کے پاس تشریف لے جائیں۔“

شاہ سلیمان قادری کی ذات ایسی نہیں تھی جس سے آپ نا آشنا ہوتے۔ انہیں یاد آ گیا کہ یہی بزرگ ہیں جو ان کے گھر دو بار تشریف لے گئے اور حاجی محمد نام بھی انہی کا رکھا ہوا تھا پھر بھی تکلف اور لحاظ کے زیرِ اثر حاجی محمد پہلے تو ملا کریم الدین کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ شاہ سلیمان قادری کی صحبت میں پہنچنے کا وسیلہ بنیں چنانچہ ملا کریم الدین کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ملا کریم الدین بھی حاجی محمد کی عظمت اور بزرگی سے کسی حد تک واقف تھے جواب دیا۔ ”بھائی میرے! تم کہتے ہو تو میں چلا چلتا ہوں ورنہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں میرے وسیلے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم تو خود ایک وسیلہ ہو اور اگر میں تمہیں وہاں لے بھی گیا تو اس سے میں عزت اور توقیر حاصل کر لوں گا۔ تم تو پہلے ہی سے معزز اور موقر ہو۔“

حاجی محمد نے ازراہِ عاجزی جواب دیا۔ ”ثمردار شاخیں اسی طرح جھکتی ہیں جس طرح تم نے عاجزی اختیار کی ہے۔ میں تمہارے وسیلے سے شاہ سلیمان قادری کی خدمت میں جاؤں گا اور اس کا ثواب بھی تمہی کو ملے گا۔“ ملا کریم الدین انہیں لے کر شاہ سلیمان کی خدمت میں پہنچ گئے۔

شاہ سلیمان انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور فرطِ جوش میں فرمایا۔ ”اے نوجوان خوش آمدید! تو اب تک کہاں تھا، میں تو تیرا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔“

حاجی محمد نے فرمایا۔ ”حضرت میں تو آپ کی طلبی کا منتظر تھا۔ جیسے ہی آپ نے یاد فرمایا، حاضر ہو گیا۔“

شاہ سلیمان قادری بہت خوش تھے۔ بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔ ”نوجوان! تیری باتوں میں غیریت اور تکلف ہے حالانکہ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جو بظاہر میرا گھر ہے درحقیقت تیرا ہی گھر ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہے تیرا ہے۔ میں جو کچھ بھی تجھے دوں گا تیری امانت سمجھ کر دوں گا۔“

حاجی محمد نے جوشِ عقیدت سے شاہ سلیمان قادری کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور نہایت ادب سے ان کے روبرو بیٹھ گئے۔ شاہ سلیمان نے آپ کو اسی وقت اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔

اب شاہ سلیمان قادری تھے اور حاجی محمد تھے۔ مرشد اپنے شاگرد پر اس طرح توجہ دے رہا تھا گویا وہ شاگرد نہیں مرشد کی متاعِ گم گشتہ تھی جو اچانک مل گئی تھی۔ شاہ سلیمان انہیں منازل سلوک طے کروانے لگے اور جب یہ منازل طے پا گئیں تو مرشد نے اپنے شاگرد اور مرید کو خرقۂ خلافت پہنا دیا اور انہیں نوشہ اور گنج بخش کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

شاہ سلیمان نے آپ پر اتنا اعتماد کیا کہ بعد میں اپنے دونوں فرزند تاج محمود اور رحیم بھی آپ کی نگرانی میں دے دیے۔

☆☆☆

آپ کی گنج بخشی کا شہرہ عام ہو گیا۔ خلق خدا کو آپ سے بے انتہا فائدے پہنچنے لگے۔ غرض مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ ان میں اہل ثروت بھی ہوتے اور مفلس و نادار بھی۔ آپ ہر ایک کے کام آتے، آپ کے خاص ارادت مند آپ کی دربانی میں فخر محسوس کرتے۔ وہ حاجت مندوں کو آپ سے ملاتے اور دردمندوں کی غم گساری کرتے۔

ایک دن حاجت مندوں کی بھیڑ میں ایک ساربان بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ ساربان نے آپ کے ایک ارادت مند کو پاس بلا کر دریافت کیا۔ ”جناب! میں بڑی دیر سے اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں محنت مزدوری کرنے والا انسان یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اگر آج میں حضرت نوشہ گنج بخش سے ملاقات نہ کر سکا تو میرے لیے اس در کی دوبارہ حاضری مشکل ہو جائے گی۔“

ارادت مند نے پوچھا۔ ”دوبارہ حاضری مشکل کیوں ہو جائے گی؟“

ساربان نے جواب دیا۔ ”میں نے عرض جو کر دیا ہے کہ میں ایک مزدور ہوں اور ہر روز یہ وقت نہیں نکال سکتا۔“

ارادت مند نے کہا۔ ”تیرا کام کیا ہے؟“

ساربان نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بیوی ہے اور نابینا ہے، پیدائشی نابینا۔ میں حضرت نوشہ گنج بخش کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ وہ میری بیوی کو بینا کر دیں۔“

ارادت مند نے ساربان کا مذاق اڑایا، کہا۔ ”تو کہتا ہے کہ تیری بیوی پیدائشی نابینا ہے، اس پیدائشی نابینا کو کس طرح بینائی ملے گی میں نہیں جانتا لیکن میں یہ ابھی سے بتائے دیتا ہوں کہ حضرت نوشہ کسی کا مرض تو دور کر سکتے ہیں لیکن پیدائشی نقائص کی تلافی نہیں کر سکتے۔“

ساربان نے چڑ کر کہا۔ ”تو عجیب کج فہم مرید ہے۔ ارے جب حضرت نوشہ مرض دور کر سکتے ہیں تو پیدائشی نقص کیوں نہیں دور کر سکتے اور میں تو یہ فیصلہ کر کے آیا ہوں کہ کچھ بھی ہو میں اپنی بیوی کی بینائی لے کر ہی واپس جاؤں گا۔“

ارادت مند نے ذرا سختی سے کہا۔ ”بلاوجہ کیوں اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ جا اپنا کام کر اور فضول کام میں اپنا قیمتی وقت مت ضائع کر۔“

ساربان بھی اڑ گیا، بولا۔ ”تو مجھے مایوس کرنے والا کون ہوتا ہے۔ میں حضرت نوشہ گنج بخش کے پاس آیا ہوں، تیرے پاس نہیں آیا۔ اس لیے تو اپنی زبان بند رکھ اور مجھے مایوس نہ کر۔“

ارادت مند بھتّے سے اکھڑ گیا اور غصے سے بولا۔ ”اگر تو اڑیل ہے تو میں بھی ایک ضدی ہوں دیکھتا ہوں تو کس طرح اندر جاتا ہے اور حضرت سے ملاقات کرتا ہے۔“

ساربان بات بگڑتی دیکھ کر خاموش ہو گیا اور کچھ دیر بعد ارادت مند کو کسی اور طرف متوجہ دیکھ کر بلا اجازت اندر چلا گیا اور حضرت نوشہ کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ آپ نے اسے اٹھا کر دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے؟ تجھے کیا ہو گیا؟“

ساربان نے جواب دیا۔ ”حضرت! میری مدد کیجیے میں بڑا دکھی انسان ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اپنا دکھ درد بیان کر۔ میں اللہ سے دعا کروں گا۔“

ساربان نے ساری تفصیل سنا کر عرض کیا۔ ”آپ کے ارادت مند نے مجھے مایوس کیا مگر میں پھر بھی اندر آ گیا۔ اب میری مدد کرنا نہ کرنا آپ پر منحصر ہے لیکن باہر میں نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے کہ میں اس در سے ناکام نہیں جاؤں گا۔“

آپ نے اسے تسلی دی، فرمایا۔ ”بہرحال تو پریشان نہ ہو تیری نابینا بیوی کہاں ہے، اسے میرے پاس لے آ۔“

ساربان نے جواب دیا۔ ”اگر میں باہر جاؤں گا تو آپ کا ارادت مند مجھے دوبارہ نہیں گھسنے دے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو مت پریشان ہو، جا اپنی بیوی کو لے آ۔ تجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔“

ساربان نے حسرت سے آپ کی طرف دیکھا اور باہر چلا گیا۔ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور ارادت مند کو سنانے کے لیے کہا۔ ”چل، تجھے میاں جی یاد فرما رہے ہیں۔“

ارادت مند نے بڑی بے بسی سے ساربان کی طرف دیکھا اور شرمندگی سے منہ پھیر لیا۔

ساربان بیوی کو لیے ہوئے حضرت نوشہ کے پاس چلا گیا۔ آپ نے بیوی کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ”تو یہ ہے تیری بیوی، یہ نابینا ہے؟“

ساربان نے جواب دیا۔ ”حضرت اب میں کیا عرض کروں، خود ہی ملاحظہ فرمالیجیے۔“

آپ نے نابینا عورت سے پوچھا۔ ”کیا تجھے کچھ نظر نہیں آتا؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”حضرت! بالکل نہیں۔“

آپ نے کہا۔ ”مگر میری طرف تو دیکھو۔ میں کہتا ہوں کہ میری طرف دیکھو۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں نابینا ہوں۔ مجھے نظر نہیں آتا۔“

آپ نے سختی سے کہا۔ ”میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ میری طرف دیکھو۔“

عورت نے پھر وہی جواب دیا۔ ”حضرت میں کتنی بار یہ کہوں کہ میں نابینا ہوں مجھے دکھائی نہیں دیتا۔“

آپ نے غصے میں کہا۔ ”میں ایک بار پھر حکم دیتا ہوں کہ میری طرف دیکھو۔“

عورت نے بڑی مایوسی سے جواب دیا۔ ”حضرت! میں اندھی ہوں آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں دیکھوں تو کس طرف دیکھوں، مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“

آپ نے ایک بار پھر حکم دیا۔ ”مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تو نابینا ہے، جب میں تجھے یہ حکم دے رہا ہوں کہ تو میری طرف دیکھ تو تجھے میری طرف دیکھنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔“

ساربان نے بھی بیوی کو سمجھایا۔ ”اری نیک بخت! تو حضرت نوشہ کی بات کیوں نہیں سمجھتی یہ گنج بخش ہیں۔ اس در سے کوئی مایوس نہیں جاتا۔ تو میاں جی کی طرف دیکھنے کی کوشش تو کر۔“

عورت نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پلکیں جھپکانے لگی۔ آنکھیں چمچانے لگیں۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کی آنکھوں کے سامنے روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ آنکھوں نے کچھ کچھ دیکھنا شروع کر دیا اور اس نے زندگی میں پہلی بار انسانوں کی شکل و صورت دیکھی۔ اس کے سامنے میاں جی بھی تھے اور اس کا ساربان شوہر بھی۔ آدمیوں کے جسم اور چہرے کی بناوٹ، آنکھ، کان، ناک، سر اور اس کے بالوں کے رنگت، ہاتھ، پاؤں، ڈاڑھی مونچھ اور بہت کچھ۔ ساربان کی صورت دیکھتے ہی پوچھا۔ ”تو کون ہے؟ کیا میرا شوہر؟“

ساربان نے جوش مسرت سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں تیرا شوہر ہوں۔ کیا تو مجھے دیکھ رہی ہے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”ہاں میں تجھے دیکھ رہی ہوں، خوب اچھی طرح دیکھ رہی ہوں۔“

اس کے بعد عورت نے حضرت نوشہ کی طرف دیکھا اور فرط جذبات میں سسکنے اور رونے لگی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اس بزرگ میں یہ غیر معمولی صلاحیت اور معجزاتی یا کراماتی قوت کس نے عطا کر دی کہ اس جیسی پیدائشی نابینا کو بینا کر دیا۔

حضرت نوشہ نے فرمایا۔ ”جا اور اپنے رب کی عبادت کر۔ اس کے ذکر و فکر میں لگ جا۔“

ساربان نے کہا۔ ”حضرت! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”شکریہ میرا نہیں دونوں جہانوں کے رب کا ادا کرو کیونکہ میں نے جو کچھ کیا اپنے خالق اور مالک کی منظوری اور اجازت سے کیا ہے۔“

ساربان نے کچھ دیر بیٹھ کر جانے کی اجازت مانگی۔ ”حضرت اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے گھر جاؤں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اب تو جا سکتا ہے لیکن وہی ایک بات کہ اپنے رب کے ذکر و فکر سے ہرگز غافل نہ رہنا کیونکہ خدا جب خود ہم سب پر کرم فرماتا ہے تو ہمیں بھی اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“

ساربان اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا۔ اس دن وہ دونوں اتنے زیادہ خوش تھے کہ اس سے زیادہ خوشی کا تصور محال ہوگا۔

آپ کے مریدوں میں حافظ معموری کو بڑا مقام حاصل تھا اور بعد میں حافظ معموری ہی کو خلیفہ بھی بنایا گیا۔ حافظ معموری کو کچھ دنوں سے یہ خیال بہت ستا رہا تھا کہ صوفیوں میں یہ جو مشہور ہے کہ روز محشر تمام قومیں اپنے اپنے فرقوں میں بٹ جائیں گی اور ہر گروہ کو الگ الگ علم دیے جائیں گے اور تمام فرقے اپنے اپنے علم کے زیر سایہ ہوں گے۔ حافظ معموری سوچتے کہ معلوم نہیں یہ مسئلہ سچ ہے یا جھوٹ؟

اس فکر اور تردد میں حافظ معموری نے ایک ہفتہ گزار دیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ایسی حالت فکر و تردد میں ایک دن انہیں نیند آ گئی اور وہ گہری نیند سو گئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ہر طرف قیامت برپا ہے۔ لوگوں کا بڑا ہجوم ہے اور ہر طرف علم ہی علم نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک علم کو سب سے اونچا دیکھا اور اس علم کا پھریرا اتنا وسیع و عریض تھا کہ چاروں طرف کے بڑے حصے پر محیط تھا۔ حافظ معموری نے اپنے دل میں سوچا۔ ”پتا نہیں یہ کس کا علم ہے؟ کس فرقے یا قوم کا ہے؟“

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ آواز آئی۔ ”حافظ معموری یہ علم غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر کا ہے۔“

حافظ معموری نے اس علم کے نیچے دوسرے کئی علم دیکھے، وہ ان علموں میں اپنے پیر و مرشد حضرت نوشہ گنج بخش کا علم تلاش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد یہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے اور ایک جگہ حضرت نوشہ کو پا لیا۔ وہ ایک علم اٹھائے ہوئے تھے اور اس علم کے سائے میں اپنے یاروں اور مریدوں کو لیے بیٹھے تھے۔ حافظ معموری نے حضرت نوشہ کو دیکھا اور حضرت نوشہ نے حافظ معموری کو۔ انہوں نے دور ہی سے آواز دی۔ ”حافظ معموری! تو پریشان کیوں ہے؟ ادھر میرے پاس آ جا کیونکہ تیری جگہ میرے علم کے سائے میں ہے۔“

حافظ معموری دوڑ کر اس علم کے سائے میں چلے گئے۔ حضرت نوشہ نے انہیں اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

یہ خواب دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے اور ایک بڑے تردد سے ان کی جان چھوٹی۔ ان کے اندر کی خوشی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

حضرت نوشہ نے مسکرا کر حافظ معموری کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”حافظ معموری! ادھر آؤ میرے پاس۔“ حافظ معموری اپنے مرشد کے قدموں میں جا بیٹھے۔

آپ نے حافظ معموری کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر فرمایا۔ ”تیرا وسوسہ دور ہوا؟ یوم الحشر اور علموں کے نصب ہونے کا مسئلہ تیری سمجھ میں آیا یا نہیں؟“

حافظ معموری نے جواب دیا۔ ”حضرت سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کیا سب کچھ اسی طرح پیش آئے گا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بالکل، جس طرح تم نے دیکھا بالکل اسی طرح ظہور میں آئے گا۔“

حافظ معموری پہلے ہی بہت خوش تھے لیکن پیر مرشد کی زبان سے سن کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔

☆☆☆

موضع باہو کے حجام جیون آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اصرار کیا کہ ”حضرت میرے ساتھ میرے گاؤں باہو تشریف لے چلیے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو مجھے اپنے گاؤں کیوں لے جانا چاہتا ہے؟“

جیون نے جواب دیا۔ ”میری خوشی اس میں ہے کہ آپ میرے گاؤں تشریف لے چلیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر تیری خوشی اسی میں ہے تو میں تیرے گاؤں ضرور جاؤں گا۔“

عصر کا وقت تھا آپ کے مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت یہاں سے باہو کے کا فاصلہ دو کوس (چار میل) ہے چنانچہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت ختم ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ عصر کی نماز یہیں پڑھ لی جائے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اللہ نے چاہا تو باہو کے پہنچ کر ہی نماز عصر ادا کریں گے۔ یہاں پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

مریدوں کی مجال نہ تھی کہ دم مارتے، خاموشی اختیار کی۔ آپ جیون حجام اور مریدوں کو لے کر باہو کے روانہ ہو گئے۔

بیل گاڑی اپنی تمام رفتار سے سوئے منزل رواں تھی اور مریدوں کو یہ دھڑکا پریشان کیے ہوئے تھا کہ باہو کے پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت ختم ہو جائے گا لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب یہ لوگ باہو کے میں داخل ہوئے تو سورج مغربی افق پر بدستور چمک رہا تھا۔ آپ نے جیون حجام سے فرمایا۔ ”میں کچھ دیر آرام کر کے عصر کی نماز ادا کروں گا۔ تو میرے لیٹنے کا انتظام کر دے۔“

جیون حجام نے چارپائی بچھا کر بستر کر دیا۔ آپ کچھ دیر کے لیے لیٹ گئے۔ مرید حیران تھے کہ یہ وقت کے سیل رواں کو کیا ہو گیا؟ آپ کچھ دیر آرام کر کے اٹھے اور مریدوں سے فرمایا۔ ”وضو کر لو تاکہ عصر کی نماز پڑھ لی جائے۔“

ایک مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آج وقت کو کیا ہو گیا؟ ایسا لگتا ہے گویا ٹھہر گیا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے وضو کا حکم دیا ہے اس لیے باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔“

تمام مریدوں نے وضو کیا۔ ان کے ساتھ خود آپ نے بھی۔ اس کے بعد سب نے آپ کی امامت میں عصر کی نماز ادا کی اور جب اس سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا۔ ”دوستو! تم سب حیران ہو کہ یہ وقت ٹھہر کیوں گیا؟ وقت کہاں ٹھہرا؟ مشیت ایزدی اور حکم خداوندی سے باہر کوئی چیز نہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچیں یا وقت ٹھہرا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے میری آبرو رکھ لی اور میں نے نماز عصر باہو کے میں ادا کر لی۔“

اس کے بعد جیون حجام آپ کو اپنی زمین پر لے گیا اور آپ سے خیر و برکت کی دعا چاہی۔ آپ نے جیون حجام کے حسب دل خواہ دعا کی اور ایک رات باہو کے میں گزار کر اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔

☆☆☆

حافظ معموری کے صاحبزادے شیخ تاج الدین آپ کے قریب ہی سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپ سے ذرا دور فاصلے پر مٹی کا دیا روشن تھا۔ شیخ تاج الدین کی نظریں آپ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد آپ نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور کسی کو منع کرنے کے انداز میں ارشاد فرمایا۔ ”نہ مار، نہ مار، میں تجھے منع کرتا ہوں کہ اسے مت مار۔“

تاج الدین اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ حضرت نوشہ کس کو منع فرما رہے ہیں؟ لیکن وہاں دوسرا کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ اس وقت یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے لیکن مارے رعب کے دریافت نہ کر سکے۔ صبح فجر کی نماز کے بعد تاج الدین نے اس واقعہ کا ذکر دوسرے مریدوں سے کر دیا اور درخواست کی کہ آپ لوگ اپنے طور پر معلوم کریں کہ حضرت نوشہ یہ کس کو منع کر رہے تھے۔ آخر ان میں سے کسی نے رات کے واقعے کا ذکر کر پوچھا۔ ”حضرت! یہ معاملہ کیا تھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ٹھہر جاؤ۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

ابھی یہ فقرہ پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ پانڈو وال کا چودھری شمشیر بھی آ گیا۔ آپ نے اسے دیکھتے ہی دریافت کیا۔ ”چودھری شمشیر! رات تو خیریت سے گزری؟ یہ معاملہ کیا تھا؟“

چودھری شمشیر بھرے ہوئے جام کی طرح چھلک پڑا، بولا۔ ”حضرت! میں رات کے واقعے اور اس میں آپ کی استعانت کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”یہ معاملہ کیا تھا؟“

چودھری شمشیر نے جواب دیا۔ ”بس کیا عرض کروں، حضور کی توجہ سے میری جان بچ گئی، ورنہ آج میرا لاشہ کہیں پڑا ہوتا۔“

آپ نے کہا۔ ”میں واقعے کی تفصیل سننا چاہتا ہوں۔“

چودھری نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں سویا ہوا تھا اور میرے دشمنوں نے میرے قتل کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ پہلے چالیس پچاس آدمی میرے گاؤں پانڈو وال پر حملہ آور ہوں۔ کچھ آدمی میرے دوست بن کر مجھے اور میرے دوستوں کو جگا کر اپنے ساتھ لیں اور ورغلا کر کسی ایسی جگہ لے جائیں جہاں میرے دشمن پہلے ہی سے چھپے میری گھات میں بیٹھے ہوں۔ جب میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان چھپے ہوئے لوگوں کے پاس پہنچوں تو وہ مجھ پر ایک دم حملہ کر کے قتل کر دیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ اپنے منصوبے کے مطابق میرے گاؤں پانڈو وال میں داخل ہو گئے تو اتفاق سے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیدار تھا۔ میرے گاؤں پر حملہ ہوا تو میں اپنے دوستوں کو لے کر ادھر ادھر ہو گیا۔ اس افراتفری میں ہم لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اندھیری رات، آسمان پر چاند بھی نہیں تھا۔ میں نے اس اندھیرے میں اپنے دوستوں کو آواز دی کہ تم لوگ کدھر چلے گئے؟

میرے دشمن جو میری گھات میں چھپے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے دور سے جواب دیا۔ ”ادھر آ جاؤ، ہم سب یہاں ہیں۔“

میں دھوکے میں آواز کی طرف چل پڑا اور جب ان کے پاس پہنچا تو مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نیزوں اور تلواروں سے لیس میری طرف بڑھے۔ اس وقت میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”حضرت نوشہ گنج مدد! خدا کے لیے مجھے ان موذیوں سے بچائیے۔“

پھر اچانک میں نے دیکھا کہ آپ بہ نفس نفیس وہاں پہنچ گئے ہیں اور انہیں منع فرما رہے ہیں کہ۔ ”مت مارو، یہ کیا کر رہے ہو؟“ آپ کو دیکھتے ہی میں بے ہوش ہو گیا اور جب ہوش میں آیا تو وہاں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میرے دشمن فرار ہو چکے تھے۔“ شیخ تاج الدین اور دوسرے مرید یہ روداد حیرت سے سنتے رہے اور آخر میں بے اختیار نعرہ لگایا۔ ”حضرت نوشہ کے رموز یہ خود ہی جانیں۔ ہماری ناقص عقلیں کیا جانیں۔“

آپ کا یہ طریقہ تھا کہ اگر آپ کی مسجد میں مسافروں اور مسکینوں کی آمد ہو جاتی تو ان کے لیے اپنے گھر سے طعام مہیا کرتے اور اگر گھر سے طعام مہیا نہ کر پاتے تو گاؤں والوں کے پاس جاتے اور ان سے سامان طلب کرتے۔ ایک بار ایک ایسے ہی موقع پر آپ مستی نام کے ایک شخص کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ آپ نے کھانا طلب کیا۔ گھر میں بیوی موجود تھی مگر یہ بڑی کنجوس تھی۔ اس وقت عورت کے ہاتھ میں آٹے کا برتن تھا۔ اس نے برتن کو ران کے نیچے چھپا لیا اور جواب دیا۔ ”حضرت آج گھر میں آٹا نہیں ہے ورنہ ضرور حاضر کر دیتی۔“ آپ نے سکوت اختیار کیا اور واپس چلے گئے۔

آپ کے جاتے ہی عورت نے آٹے کا برتن اس کی جگہ پر رکھ دینا چاہا لیکن وہ برتن اس کی ران سے چمٹ چکا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ برتن کو ران سے چھڑا لے لیکن وہ نہ چھڑا سکی۔

جب خاوند آیا اور اس نے بیوی کو اس حال میں مبتلا دیکھا تو بہت پریشان ہوا اس نے اصل واقعہ پوچھا تو بیوی نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بھاگا بھاگا حضرت نوشہ کی خدمت میں پہنچا اور بڑی عاجزی اور انکساری سے معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ ”تیری بیوی کو جھوٹ نہیں بولنا تھا۔ جا، گھر میں جا کر دیکھ، برتن چھوٹ گیا۔“ شوہر گھر واپس گیا تو واقعی برتن ران سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

یہ شاہجہان کا دور حکومت تھا۔ اسے قندھار کی مہم بہت پریشان کر رہی تھی اس نے آپ سے استدعا کی کہ قندھار کی فتح کے لیے دعا فرمائیں۔ آپ نے دعا فرمائی اور قندھار فتح ہو گیا۔ اس نے اس خوشی میں مصارف لنگر کے لیے موضع ٹھٹھہ عثمان اور بادشاہ پور نذرانے میں عطا فرمائے۔

آپ کا سن ولادت یکم رمضان 959ھ (21 اگست 1552ء) ہے اور سن وفات آٹھ ربیع الاول 1064ھ (17 جنوری 1654ء) بروز سہ شنبہ (منگل) ہے۔ یہ شاہجہان کا عہد تھا۔ آپ کا روضہ مبارک ساہنپال شریف گجرات (پنجاب) سے نصف میل دور جانب شمال مرجع خلائق ہے۔ مادۂ تاریخ ”فیض قدس“ ہے۔

☆☆☆

ماخذات: اذکار نوشاہیہ۔ حضرت شرافت نوشاہی۔ انوار نوشاہیہ انوار نوشاہیہ۔ تحفۃ الابرار۔ مرزا آفتاب بیگ۔ تذکرہ اولیائے ھند۔ مرزا احمد اختر کیرانوی۔ خزینتہ الاصفیا۔ مفتی غلام سرور لاھوری

محمد الیاس

بلا

ہمیں اکثر اپنے اردگرد بلا اور بھائی جان جیسے کردار نظر آجاتے ہیں مگر... اس ماحول میں آزادی اور جبر کا کوئی تناسب نظر نہیں آتا۔ اٹھارہ سال بعد بلا جیسے بیٹے کو پیدا کرکے باوا جان نے شاید بڑے بیٹے سے نافرمانی کا کوئی انتقام لیا تھا لیکن... کیا خبر تھی کہ بلا کو قدم قدم پر اس محبت کا تاوان یوں بھرنا پڑے گا... اس حبس زدہ موسم میں کسی خوشگوار جھونکے کا اسے شدت سے انتظار تھا اور ایک دن اس کی قوت برداشت اسے اذیت پسندی کی انتہا پر لے گئی۔

خواہشوں اور خوابوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے رشتوں کی آزمائش

جو شخص بھری جوانی میں صرف دس روپے کی خاطر سگے باپ کو حوالات بھجوا دے، وہ اگر کسی بدنصیب کا بڑا بھائی ہو تو ”سگ باش برادر خورد مباش“ جیسی ضرب المثل کی صداقت پر شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تقریباً تین دہائیاں گزر گئیں مگر رشتہ دار اور برادری والے آج بھی اس شرمناک قصے کو نہیں بھولے۔ بات کچھ یوں ہے کہ ابا جی نے سرکاری جنگل سے ایک درخت رات کے اندھیرے میں کاٹ لیا اور اپنی زمین میں لا کر دبا دیا۔ آبائی ڈھوک



کے گھر میں ایک کمرا زیرِ تعمیر تھا، جسے بعد میں صفہ کا نام دیا گیا۔ ڈیڑھ دو ماہ کا وقفہ دے کر والد صاحب نے صفہ کی چھت ڈال دی۔ ابھی ڈھوک والوں کی مبارکیں دھڑا دھڑا وصول کر رہے تھے کہ محکمۂ جنگلات کے اہلکار آئے اور ابا جی کو نہ صرف حراست میں لے لیا بلکہ صفہ کی تازہ پڑی ہوئی چھت اکھاڑ کر دونوں شہتریاں بھی ہمراہ لے گئے۔ سستا زمانہ تھا لہٰذا سابق فوجی کی سفید پوشی کا خیال کرتے ہوئے صرف دس روپے نقد جرمانہ ادا کرنے کا حکم ہوا۔ مسروقہ لکڑی چونکہ پہلے ہی قبضے میں لی جا چکی تھی، لہٰذا تادم ادائی رقم جرمانہ والد صاحب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

بھائی جان ان دنوں گورڈن کالج میں سال دوم کے طالبِ علم تھے۔ صرف ایک بھینس ہی ذریعہ معاش تھی، صبح ڈھوک سے کالج آتے ہوئے دودھ لے آتے اور راجا بازار کے ہوٹل میں دے دیا کرتے۔ بعض لوگ پیدائشی طور پر ہی اقتصادی معاملات میں بڑے طاق ہوتے ہیں۔ ماں کی ممتا اولاد کے ہاتھوں چکمہ کھانے پر ہر دم آمادہ رہتی ہی ہے اور پھر اتنے طویل راستے میں کئی مقام ایسے پڑتے ہیں، جہاں پانی بہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ یوں ایک سیر دودھ کی قیمت آٹھ آنے روزانہ بڑی ہوشیاری سے پس انداز ہو رہی تھی۔ باپ پر بپتا پڑی تو اکلوتے بیٹے نے یوں منہ بنا لیا جیسے اس جیسا مسکین اور بے بس بندہ روئے زمین پر کوئی نہ ہو۔ ماں نے دہائی دی کہ بائیسکل بیچ کر باپ کو چھڑا لاؤ مگر زیرک بیٹے نے جواب دیا۔ ”اماں جلد بازی میں ایسے اہم فیصلے نہیں کیے جاتے۔ روزگار کا وسیلہ یہی سواری ہے، بیچ دی تو تینوں بھوکے مریں گے۔ خطۂ پوٹھوہار میں گو بھوک ننگ کا راج ہے مگر اس سرزمین کے سپوت بڑے بہادر اور سخت جان ہیں۔ اتحادیوں نے انہی کے بل بوتے پر دونوں عالمی جنگیں جیتی ہیں۔ کہاں کہاں کی قید کاٹ آئے۔ میرے والد صاحب کا صرف نام ہی بہادر نہیں وہ خود بھی بہادر ہیں۔“

پھر کالج کے پروفیسروں اور طالبِ علم ساتھیوں کی مدد سے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور ہفتہ دس دن میں بغیر ایک پیسا سوری والا خرچ کیے، بھائی جان اپنے والد بزرگوار کو رہائی دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس افراتفری کے عرصے میں ایسا تہلکہ مچا کہ کسی بدبخت رشتہ دار نے بھائی جان سے متعلقہ ایک ایسا سربستہ راز طشت ازبام کر دیا کہ پوری برادری اور علاقے کے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ بھائی نے شہر کے ڈاک خانہ میں جانے کب سے کھاتہ کھلوا رکھا ہے، جس میں چار روپیہ سات آنہ سود سمیت کل ایک صد تیرہ روپیہ پانچ آنہ کی خطیر رقم جمع ہے۔ والد صاحب سر پیٹ کر رہ گئے کہ ایسا شقی القلب بیٹا کہیں دیکھا نہ سنا، جس نے اچھی بھلی رقم ہوتے ہوئے بھی پورے نو دن باپ کا حوالات میں رہنا گوارہ کر لیا۔ اکلوتی اولاد کے لیے اس نے کیا کیا منصوبے بنا رکھے تھے کہ تن من بیچ کر بھی پڑھانا لکھانا ہے۔ اولین ترجیح ہوگی کہ بیٹا فوج میں کمیشن حاصل کرے۔ نہ ہو سکا تو ایل ایل بی کر کے وکالت کرنے لگے گا۔ چونکہ پوٹھوہار کی مٹی سے اتنا جھاڑ جھنکاڑ گھاس نہیں اگتی، جتنے مقدمے اگتے ہیں۔ کوئی مدعا علیہ ہاتھ نہ آئے تو بور ہو کر بھائی سگے بھائی کے خلاف ہی درخواست دائر کر دیتا ہے۔

راجا بہادر خان نے کس چاؤ سے بیٹے کا نام سخی بہادر رکھا تھا۔ وہ ایسا کمینہ ثابت ہوا کہ برادری اور علاقے بھر میں ناک کٹوا دی۔ ہر کوئی ٹھٹا اڑانے لگا۔ بیوی سے کئی بار کہا کہ ایسی اولاد سے کوئی امید رکھنا سراسر حماقت ہے۔ بعید نہیں کہ آخری عمر میں ذلیل و خوار کر کے رکھ دے۔ اکلوتے بیٹے کے لیے جائداد بچا رکھنے کے بجائے کیوں نہ اونے پونے بیچ کر دونوں میاں بیوی چار دن عیش کریں اور کچھ بڑھاپے کے لیے پس انداز کر لیں۔ مگر بیوی نے تائید نہ کی۔ تاہم ذہنی خلفشار کے اس عرصے میں میاں بیوی کے مابین ہم آہنگی زیادہ بڑھ گئی یا قدرت کو کرشمہ دکھانا مقصود تھا کہ اٹھارہ برس کی طویل خشک سالی کے بعد سُونے آنگن میں کونپل پھوٹ پڑی اور یہ خاکسار راجا سلطان بہادر خیر سے تولد ہوا۔

کہتے ہیں، ابا جی نے میرے پیدا ہونے کی بڑی خوشی منائی۔ بڑے بیٹے سے رویہ کچھ ایسا تھا جیسے اس کی بے وفائی کا بدلہ بڑے بھرپور انداز سے چکا لیا ہو۔ چار پانچ برس تک دونوں نے خوب میرے ساتھ لاڈ پیار کیا۔ اس عرصہ میں نئے دارالخلافہ کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ خوش حالی نے اس خطے میں ڈیرے ڈال لیے۔ ایسے لوگ جو کبھی سوتے جاگتے خواب دیکھا کرتے تھے کہ پانچ چھ سو روپے فی کینال کے حساب سے زمین بک جائے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ جن اِکا دُکا کے ہاں پہلے ہی گاڑیاں تھیں، وہ نئی مرسڈیز میں گھومنے لگے۔ مگر خوش حالی کی زندگی بسر کرنا ہر کسی کا مقدر نہیں ہوا کرتا۔ میں، راجا سلطان بہادر ابھی پورے پانچ برس کا نہیں ہوا تھا کہ چند ماہ کے وقفے سے ماں اور باپ دونوں راہی عدم ہوئے۔ جتنا عرصہ وہ زندہ رہے، مجھ سے جی بھر کے پیار کیا۔ جلد مرجانے والے والدین کے سینے میں اللہ جل شانہٗ اتنے محبت بھرے دل کیوں ڈال دیتا ہے۔

میں نے پٹیشن باز ایڈووکیٹ بھائی کے زیرِ سایہ بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کیا۔ وہ دولت سمیٹنے کے لیے ”اٹھ کھی“ جنگ لڑ رہے تھے۔ وکالت، پراپرٹی ڈیلنگ، ذخیرہ اندوزی اور امپورٹ ایکسپورٹ کے ساتھ، کاروں کا شوروم اور ریکروٹنگ ایجنسی بھی چلا رہے تھے۔ اس آپا دھاپی اور دولت کمانے کے جنون میں باقاعدہ شادی کر کے گھر بسانے کا ہوش ہی نہ رہا۔ کوئی نہ کوئی ڈھنگ کی موکلہ اس وقت تک قابو کیے رکھتے اور تاریخ پر تاریخ لیے جاتے، جب تک کہ وہ ”تنگ آمد بجنگ آمد“ کے مصداق وکالت نامہ منسوخ نہ کر دیتی۔ آخر کوئی کب تک بے وقوف بنا رہے۔ رفتہ رفتہ بھائی اس حد تک بدنام ہو گئے کہ کوئی موکلہ نزدیک بھی نہ پھٹکتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پولیس چھاپوں میں پکڑی جانے والیوں کو قانونی مدد فراہم کرنے کی ازخود پیشکش کرنے لگے...... لیکن وہ موصوف کے ذریعے ضمانت پر رہائی پانے سے کہیں بہتر سمجھتیں کہ متبادل انتظام ہونے تک مختصر وقفے کے لیے حوالات میں رہ لیا جائے۔ پیشہ وارانہ دیانت اور مہارت کے مکمل فقدان کا یہ نتیجہ نکلا کہ بھائی صاحب ایک وکیل کے بجائے بلیک میلر کے طور پر مشہور ہو گئے۔

مجھ پر یہ عقدہ کسی طور کھل نہیں پا رہا تھا کہ بھائی جان اتنی زیادہ دولت کس مقصد کے لیے جمع کیے جا رہے ہیں۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، پڑھنا لکھنا، کہیں آنا جانا، حتیٰ کہ سانس لینا بھی بڑے بھائی کی ترجیحات کے طابع تھا۔ میرا دکھ سمجھنے کے بجائے ہمارے ملازم اور جان پہچان کے لوگ بھائی کے پروپیگنڈا کا شکار ہو گئے اور کم و بیش سبھی نے باور کر لیا کہ راجا سخی بہادر نے چھوٹے بھائی کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ زندگی اس کے لیے وقف کر دی اور شادی بھی نہ کی۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ جس دن آخری موکلہ ہاتھ سے نکلی تھی، انہوں نے اپنے آفس میں نئی سیکرٹری رکھ لی تھی سویٹی، جو کچھ زیادہ ہی پرسنل ہو گئی۔ غالباً اپنے تئیں باور کر لیا کہ بہت موٹا مرغا پھنس گیا ہے۔ گو عمر چوالیس سے تجاوز کر گئی ہے، مگر ایسا چھڑا چھانٹ کروڑپتی مرد ملے گا بھی کہاں۔ ایک دیور بے چارے کی گھریلو ملازم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ باس شروع سے چھوٹے بھائی کو بلّا کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔

رشتہ داروں سے میل جول رکھنا مجھے پسند تھا لیکن بھائی جان سختی سے منع کرتے۔ تاہم میں چوری چھپے مل لیا کرتا تھا۔ آبائی ڈھوک اور زمین میرے ہوش سنبھالنے سے

> **دائیں اور بائیں**
>
> ایک خاتون بہت موٹی تھی۔ موٹاپا دور کرنے کے لیے وہ ڈاکٹر کے پاس گئیں اور مشورہ مانگا۔ وہ بھی مفت۔
>
> ڈاکٹر صاحب نے چند لمحوں کے لیے سوچا۔ پھر گویا ہوئے آپ نے سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلانا ہے۔
>
> خاتون نے پوچھا۔ ”دن میں کتنی بار؟“
>
> ”صرف اس وقت جب کوئی آپ کو کھانے کے لیے کہے۔“
>
> مرسلہ: ریاض بٹ از حسن ابدال

بہت پہلے ہی محکمۂ مال کے لٹھے سے معدوم ہو کر سی ڈی اے کے ماسٹر پلان میں ضم ہو چکی تھی۔ موجودہ پراپرٹی میں میرا کچھ بھی نہ تھا۔ جو کرولا میرے زیرِ استعمال تھی، رجسٹریشن کے مطابق اس کے مالک بھی وہی تھے۔ میری زندگی کی واحد خوشی اور تاریک ترین شب و روز میں امید کی کرن، مفتی غلام مصطفیٰ کے گھرانے سے وابستہ ہو کر رہ گئی، جن کی بڑی بیٹی شفق اب میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وہی لمحے جو ہم ایک دوسرے کے قریب گزار لیتے، میری زندگی کا حاصل تھا۔ وہ فتویٰ دینے والے مفتی نہیں تھے بلکہ کلین شیو اور دستیاب وسائل میں رہتے ہوئے ممکنہ حد تک ماڈرن بھی تھے۔ ایکسپورٹ پروموشن بیورو سے اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائر ہو کر بھائی کے ایکسپورٹ آفس میں بہ طور منیجر بھرتی ہو گئے۔ مفتی صاحب کے ساتھ میرے ذاتی مراسم چار پانچ سال پرانے تھے۔ جن کاروباری امور میں رازداری رکھنا مقصود ہوتی، وہ کسی ملازم کے بجائے ہمیشہ میرے ذمے ڈال دیے جاتے۔ اسی لیے میری تعلیم بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ کاغذات لانے لے جانے کے لیے اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔

اپنی سوچوں میں پوری طرح واضح نہ ہونے کے باوجود، میرے ذہن کے کسی دھندلے گوشے میں ایک عجیب سا دوسوسا پھن اٹھائے پھنکارتا ہوا محسوس ہوتا۔ بندہ خواہ بلّا ہی کیوں نہ ہو، پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی تعلیم کے خصوصاً آخری سال تک کچھ نہ کچھ باتیں سمجھ آنے لگ ہی جاتی ہیں۔ حد سے بڑھے ہوئے اختیارات اور بے پناہ دولت کا ارتکاز، فساد برپا کر سکتا ہے۔ اسی طرح بے مثال حسن بھی

پیچیدہ مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مفتی فیملی خطرناک حد تک خوب صورت نہ ہوتی تو شاید میرا ذہنی سکون تباہ نہ ہوا ہوتا۔ میں اس زاویے سے سوچنے لگا کہ شفق کاش اتنی زیادہ حسین نہ ہوتی مگر قدرت کی طرف سے ملا ہوا ایسا انمول خزانہ کون واپس لوٹاتا ہے۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہ چھپائی۔ میں جان گیا تھا کہ مفتی صاحب دونوں بیٹیوں کے لیے اچھے رشتوں کی تلاش میں ہیں۔ ان کی ایک ہی خواہش تھی کہ بیٹیاں آسودہ گھروں میں جائیں۔ ماڈرن ہونے کے باوجود اندر سے کنزرویٹو تھے۔

جس روز میں نے آخری پرچہ دیا، بھائی نے مجھے اپنے دفتر میں بلالیا۔ ٹیبل کے دائیں ہاتھ والی کرسی پر بٹھا کر سویٹی کو انٹرکام پر ہدایات دیں کہ جب تک وہ میٹنگ میں ہیں، کوئی مخل نہ ہو۔ میرے سامنے فل اسکیپ کاغذ پر فوٹو اسٹیٹ کیے ہوئے پاکستان کے چار نقشے رکھے اور چار عدد پوسٹ کارڈ سائز کے رنگین فوٹو گراف، جن میں بہت ہی صاف اور حقیقت کے قریب ترین چار مختلف اقسام کے سانپوں کی تصویریں تھیں۔ اتنی مہارت سے فوٹو گرافی کی گئی تھی کہ سانپوں کی آنکھوں میں دیکھ کر مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں ان میں سے صرف کوبرا ہی پہچان پایا۔ باقی تینوں کے نام مجھے بھائی نے بار بار ذہن نشین کرائے، رسل وائپر، لیف نوز وائپر اور سا سکیل وائپر۔ پاکستانی نقشوں پر ان جگہوں کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں جہاں یہ سانپ بہتات سے پائے جاتے ہیں۔ بھائی، ہمیشہ مجھے اتنی ہی بات بتایا کرتے، جتنی کام نکلوانے کے لیے ازحد ضروری ہوتی۔ تاہم اتنا پتا چل گیا کہ بھائی کو ان سانپوں کی ایکسپورٹ کا بڑا آرڈر ملا ہے اور سوئٹزر لینڈ والی پارٹی نے بھائی کی سہولت کے لیے تمام ضروری معلومات خود بھجوائی ہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے ملک کے بارے میں غیر ہم سے زیادہ بہتر معلومات رکھتے ہیں۔

حکم ہوا کہ جلد سے جلد سندھ کے لیے روانہ ہوجاؤں۔ ابھی امتحانوں کی تھکن بھی نہ اتری تھی اور پھر شفق اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر کچھ ملاقاتیں کرنے کے بڑے خوب صورت منصوبے بنا رکھے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے، بڑے بیٹے کی طرف سے اپنے ساتھ ہونے والے بے رحمی کے سلوک کا انتقام جو میری پیدائش کی صورت میں لیا تھا، اس کا حساب رہ رہ کر مجھے چکانا پڑ رہا تھا۔ دولت سمیٹنے کی بے مہار ہوس نے ہم دونوں بھائیوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ میں نے دبی دبی زبان میں اتنا ہی کہا کہ ایک پراپرٹی کے بزنس کا پیسا ہی نہیں سنبھالا جا رہا تو سانپوں جیسے موذی جانور کی ایکسپورٹ سے کیوں نہ بچا جائے۔ مختصر سی زندگی میں مجھے یہ تلخ تجربہ ہوا ہے کہ ایک وکیل سے کوئی بھی میرے جیسا شریف انسان بحث میں پورا نہیں اتر سکتا۔ فوراً بولے۔ ''اوہ بللیا! میرا مقصد صرف پیسا کمانا نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ موذی کو نماز چھوڑ کر مارئیے۔ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق اس ڈیل کا چیلنج، جذبہ حب الوطنی اور پوری اسلامی اسپرٹ سے قبول کیا ہے۔ اول یہ کہ موذی کو اسلام دشمن گوری قوم کے ملک میں بھیج کر قیمتی زرمبادلہ کماؤ اور ملک وقوم کی خدمت کا حق ادا کرو، دوسرا بلکہ تیسرا فائدہ بھی کم اہم نہیں۔ انسان کے دشمن اس جانور کی ایکسپورٹ سے اپنے ملک کے بھائی محفوظ ہوجائیں گے...... جاؤ، تم تیاری کرو۔ کل نہیں تو پرسوں نکل جانا۔ عمرکوٹ کا اسسٹنٹ کمشنر راشد سومرو تمہارا منتظر ہے۔ آگے مٹھی اور نگر پارکر تک وہ اپنے اعتماد کے دو بندے تمہارے ساتھ بھیجے گا۔ وہ سب جانتا ہے۔ ایک دو سپیرے پابند کر رکھے ہیں۔ فی الحال صرف معاملات کا جائزہ لے کر واپس آجانا ہے۔''

بھائی جان ہر چند لمحوں کے بعد گھونٹ گھونٹ پانی پی رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کے ہونٹ یوں خشک تھے جیسے دن بھر روزے سے رہے ہوں۔ چوالیس برس کی عمر میں وہ پچپن سے زیادہ کے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان پر نقاہت طاری ہو رہی ہے۔ کہنے لگے۔ ''میں خود چلا گیا ہوتا لیکن آج کل شوگر اور بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہو رہا۔ ملازم کوئی بھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتا اور پھر ممکن ہے مجھے خود سوئٹزرلینڈ جانا پڑے۔ یہاں کا کام تم سنبھالو گے۔''

پانی کا گھونٹ لے کر بھائی نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ سویٹی اندر آئی۔ اس کو کیا اشارہ دیا کہ فوراً سمجھ گئی اور ان کے بائیں پہلو سے لگ کر دراز کھولی۔ بی پی چیک کرنے کا آلہ نکال کر میز پر رکھا اور پروفیشنل ڈاکٹر کی طرح اسٹیتھسکوپ کانوں سے لگالیا۔ ظالم عورت جینز میں تباہی مچا رہی تھی۔ بھائی کی ریوالونگ چیئر کو ذرا سا اپنی طرف گھمایا۔ اپنا دایاں گھٹنا باس کے دونوں گھٹنوں سے مس کرتے ہوئے ان کی آستین کا بٹن کھولنے لگی۔ گو میں اس منظر کی تاب لانے کی پوری سکت رکھتا تھا لیکن پھر بھی اٹھ آیا تاکہ وہ پوری آزادی سے باس کا بلڈ پریشر چیک کرسکے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میرا بھائی بڑی تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

چہرے کی جلد بے رس، بے جان اور قدرے ڈھلکی ہوئی سی۔ گندمی رنگت پر سیاہ چمکیلے چھدرے بال اور بھاری مونچھیں زرا نہیں جچ رہی تھیں حالانکہ صبح منہ اندھیرے شبنم سے بھیگی گھاس پر ننگے پاؤں چلتے اور یوگا کی ورزشیں کرتے مگر دن کا آغاز ہی دوائیوں سے ہوا کرتا۔ کچھ عرصہ سے میں دیکھ رہا تھا کہ سویٹی میں ان کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔

کاش انہوں نے اپنی گوناں گوں مصروفیات پر بھی نظرِ ثانی کی ہوتی۔ تمام تر جسمانی آزار کے باوجود کاروباری سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں۔ سپریم کورٹ میں ان کا داخلہ بند تھا، مگر وہ گاہے بہ گاہے لوئر کورٹس میں کسی نہ کسی مسئلے پر درخواست گزار دیا کرتے۔ روز کوئی نہ کوئی بیان داغ دیا کرتے اور اس کی مناسب اشاعت کے لیے اخبارات کے دفاتر میں جاکر تڑی لگایا کرتے۔ اکثر بے عزت ہوکر نکلتے۔ زیادہ تر کالے کوٹ اور کالی ٹائی میں دکھائی دیتے۔ لوگوں کو دبانے کی خاطر اپنی گاڑی پر ایڈووکیٹ کے بڑے نمایاں اسٹیکر لگا رکھے تھے۔ سرکاری و نجی دفاتر میں دندناتے ہوئے گھس جاتے مگر بعض مواقع پر رہی سہی عزت گنوا کر خلاصی ہوتی۔ اسلام آباد جی پی او والا ذلت آمیز سانحہ شاید میں قبر میں بھی نہ بھلا پاؤں۔ میں ان دنوں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ باہر کھڑکی پر کھڑے ہونے کے بجائے کاؤنٹر کے اندر چلے گئے اور رجسٹریشن کلرک کے سر پر کھڑے ہوکر تحکمانہ انداز میں ہدایات دینے لگے کہ مکتوب الیہ کا پتا رسید پر بہت خوش خط لکھے۔ نوجوان کلرک نے بے جا مداخلت کو برا محسوس کرنے کے باوجود حکم کی تعمیل شروع کردی مگر بھائی نے رسید پر معمولی سی کٹنگ ہونے پر بری طرح ڈانٹ دیا تو الٹی بلا گلے پڑ گئی۔ اس نے رسید پھاڑ کر لفافہ باہر پھینک دیا اور غضب ناک ہوکر بولا۔

"Get out from my office, howyou dare to enter"

شور وغوغا بلند ہونے پر پورا عملہ متوجہ ہوگیا۔ کسی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''کیہی گل اوئے کیہی گل اے؟'' (کیا بات ہے او! کیا بات ہے؟)

کلرک نے چیختے ہوئے ساری بات بتائی تو وہ بول پڑا۔ ''پھڑ لو اوئے، پھڑ لو ایدھی......'' (پکڑ لو او، پکڑ لو، اس کی......)

پینڈو نے بھائی کو کالی ٹائی سے پکڑ کر کھینچنا شروع کردیا۔ میں کاؤنٹر کے باہر کھڑا زور زور سے رونے لگا اور دہائی دی کہ میرے بھائی جان کو چھوڑ دو۔ پینڈو نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا۔ فوراً نرم پڑ گیا اور بھائی کو چھوڑتے ہوئے بولا۔

''چھڈ دیو اوئے چھڈ دیو...... (چھوڑ دو او! چھوڑ دو بچہ رو رہا ہے۔'' اور بھائی کے سینے پر زور کا دھکا مار کر کہا۔ ''جا اوئے دفع ہوجا۔ تجھے بچے کے طفیل چھوڑ دیا ہے۔''

بھائی نے آتے ہی مجھے تھپڑ مارا اور بازو سے کھینچتے ہوئے گاڑی میں لے گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر مزید تھپڑ مارے کہ میں نے رو کر راجوں کی بڑی بے عزتی کی ہے۔ شروع سے آج تک بھائی کا یہی وتیرہ رہا ہے۔ جب بھی کہیں سے بے عزت ہوتے، میری اور ملازموں کی کم بختی آجاتی۔

حیرت کی بات ہے کہ بھائی جیسی خسیس روح کہاں سے آگئی۔ پوٹھوہار کا مزاج گو عسکری ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ زیادہ تر لوگ زندہ دل، جی دار اور خوش مزاج بھی ہیں۔ مہمان نوازی اور یار باشی میں گھر اجاڑ دینے والے۔ میلوں ٹھیلوں کے شوقین، جب یہاں مفلسی کا راج تھا، تب بھی زندگی ہنستی مسکراتی تھی۔ ان کی ثقافت کے کئی رنگ ہیں۔ پوٹھوہار مانس کا مسکن، جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ دو کروڑ سال پہلے بھی اس خطے پر زندگی سانس لیتی تھی۔ بھائی جان وہ خود اپنی ذات کے لیے بھی باعثِ آزار تھے۔

مفتی صاحب جوں ہی دفتر پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے تو میں نے چند منٹ بعد ان کے گھر کا فون نمبر ملا کر صرف تین گھنٹیاں بجنے دیں اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد مسجد آگیا اور گاڑی میں بیٹھا رہا۔ دونوں بہنیں سامنے والی گلی میں داخل ہوتی نظر آئیں۔ تقریباً دس منٹ بعد شفق حجاب اور عبایا میں گلی سے نکلی اور گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ ہم روز اینڈ جیسمین گارڈن آگئے۔

شفق بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے تسلی دی اور کہا۔ ''سندھ سے واپس آتے ہی بھائی سے دوٹوک بات کروں گا اور اگر وہ نہ مانے تو میں ان سے الگ ہوجاؤں گا۔ تم مجھ سے بے وفائی نہ کرنا۔ مجھے امید ہے، مفتی صاحب ہمارا ساتھ دیں گے۔ میں اب مزید تم سے دور نہیں رہ سکتا۔''

وہ کہنے لگی۔ ''میں تم سے بے وفائی کبھی نہیں کروں گی مگر مجھے ابا جی سے کوئی امید نہیں۔ جب سے وہ آپ لوگوں کے ملازم ہوئے ہیں، تمہارے بارے میں ان کی سوچ بدل گئی ہے۔ بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے، ذاتی مالی حیثیت کے حوالے سے سلطان بالکل ہی زیرو ہے۔'' لمحہ بھر کو خاموش رہی اور ایک نگاہ میرے چہرے پر

ڈال کر دوبارہ بولی۔ ”اباجی، تنگ دستی کی زندگی سے بڑے خوف زدہ ہیں۔ خود انہوں نے عمر کا بیشتر حصہ مشکل میں بسر کیا ہے۔ اولاد کے بارے میں وہ یہی چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل محفوظ ہو۔“

میرا دل بیٹھنے لگا لیکن میں بہ ظاہر مضبوط رہا۔ روش پر لوگ آجا رہے تھے۔ ہم دونوں ذرا سا ایک طرف ہٹ کر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ میں نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا۔ ”شفو! مفتی صاحب کا خیال غلط ہے۔ بھائی جان نے جس سرمائے سے کاروبار شروع کیا، وہ ہمارا مشترکہ ہے۔ سی ڈی اے کی طرف سے ملنے والے معاوضے سے، جو آبائی زمین اور جائداد کے عوض ملا۔ ہر قانونی اور اخلاقی ضابطے سے میں برابر کا حصہ دار ہوں، تم فکر نہ کرو۔ سندھ سے واپس آتے ہی سب سے پہلے یہی مطالبہ کروں گا کہ میرا حصہ الگ کردیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انکار کی کوئی گنجائش نکلتی ہے۔ برادری اور رشتہ داروں نے اکثر میری توجہ اس معاملے کی طرف دلائی ہے لیکن اس سے پہلے میں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ بس یہ ہے کہ تم میرا ساتھ دو۔ اپنے والد صاحب سے کہو کہ وہ مجھ پر اعتماد رکھیں۔ تمہارے مستقبل کے بارے میں انہوں نے جو خواب دیکھے ہیں، میں تمہارے لیے آسائشیں مہیا کروں گا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے...... ایک بات اور...... تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں آخری حد سے بھی آگے نکل جاؤں گا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، مرجاؤں گا لیکن پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“ شفق کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ وہ خوشی کے تھے، حسرت ویاس یا کامل اطمینان کے، میں سمجھ نہیں پایا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے رخِ روشن سے نقاب ہٹایا اور فوراً ڈھانپ لیا۔

میں زندگی میں پہلی بار سندھ آیا تھا، وہ بھی عمرکوٹ میں جہاں کے بارے میں اتنا پڑھ رکھا تھا کہ یہاں دربدری کے زمانے میں مغل بادشاہ ہمایوں رہا تھا اور اسی عرصے میں اکبر پیدا ہوا، جو بعد ازاں اکبر اعظم کے طور پر مشہور ہوا۔

اسسٹنٹ کمشنر اپنے حلقۂ اختیار میں بادشاہ ہی ہوتا ہے اور سومرو خاندان نے سندھ پر تقریباً ایک سو چالیس برس تک حکومت کی۔ لیکن راشد سومرو نے جس خلوص اور محبت سے میری میزبانی کی، میں اس کا گرویدہ ہوگیا۔ اس کا ہندو دوست ڈاکٹر پرکاش بھی اتنی ہی دلآویز شخصیت کا مالک ثابت ہوا۔ میرے میزبانوں کے عمومی رویے سے یوں گمان گزرتا، گویا ان کے نزدیک پوٹھوہار سے آئے ہوئے مہمان کو اہمیت دینے سے بڑھ کر کوئی معاملہ اعتنا کے لائق ہی نہ ہو۔ پرکاش، شکل صورت کے حوالے سے اپنے دوست راشد سومرو سے بھی زیادہ پرکشش تھا۔ لبوں پر ہر لمحہ دھیمی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تاہم مجھے اس کی خوش مزاجی کے پس پردہ ایک مبہم سی اداسی تیرتی محسوس ہوا کرتی۔ میرا دل چاہتا کہ میں اس کے ساتھ بہت زیادہ باتیں کروں۔

میرے اصل میزبان، راشد سومرو کی شخصی خوبیاں بھی قابلِ قدر تھیں۔ وہ ہر بات کا جواب یوں بے تکلفی سے دیا کرتا جیسے مہمان سے کچھ بھی چھپانا ضابطۂ میزبانی کے خلاف ہو۔ پرکاش کے بارے میں میری جستجو کے جواب میں اس کے روبرو ہی بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا۔ ”سئیں! یہ میرا دوست سوختۂ جان عاشق ہے۔ کچھ نہ پوچھو۔ جن دنوں یہ کراچی ضیاالدین میں میڈیکل پڑھ رہا تھا، اس کے بڑے بھائی نے بے چارے کی محبوبہ کے ساتھ جلدی جلدی پھیرے ڈال لیے۔ لوگ کہتے ہیں، سچے عشق نے اس میں خاص شکتی بھر دی اور اڑنے والا سانپ بن کر لمحوں میں گھر پہنچ گیا۔ بھائی کو سہاگ رات بھی نہیں منانے دی اور اس کے ہونٹوں پر ڈس لیا۔ دلہن چھپر کھٹ کے ایک کونے میں سمٹی بیٹھی رہی اور دلہا دیکھتے ہی دیکھتے نیلا ہوگیا۔ اب وہ بڑے چین سے ودھوا کی زندگی بسر کررہی ہے اور میرے دوست نے عمر بھر کنوارا رہنے کی سوگند کھا رکھی ہے۔ ویسے دوسرا مفروضہ بھی غور طلب ہے۔ محترمہ کہتی ہیں۔ ایشور نے مجھے بنایا ہی پرکاش کے لیے ہے۔ کوئی اور کیسے چھو لیتا۔ پچھلے کئی جنموں میں ہم دونوں ایک تھے۔ اس جنم میں نہیں مل سکے تو کیا ہوا، اگلے میں سہی۔“

مجھے ان جانے میں گویا کوبرا نے ڈس لیا تھا اور زہر خون کی گردش کے ساتھ پورے بدن میں پھیل رہا تھا۔ میرے نیم والبوں سے کوئی ایک لفظ بھی ادا نہ ہو پایا اور یک ٹک انہیں دیکھے گیا۔ پرکاش کے روشن چہرے پر گو بدلی سی چھا گئی مگر ہونٹوں پر وہی دل فریب مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ سوگوار مردانہ وجاہت کا خوب صورت روپ میرے روبرو تھا لیکن دل جوئی کے وصف سے عاری میں پوٹھوہار کا باسی گنگ ہوا بیٹھا رہا۔ راشد سومرو نے ہاتھ بڑھا کر مجھے چھوا تو میں چونک گیا۔ وہ ہنس کر بولا۔ ”کیا بات ہے سئیں! ادھر ہی ہو عمرکوٹ میں یا اسلام آباد پہنچ گئے ہو؟“

میں نے جھرجھری لی اور ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ”حد ہوگئی......“ کوئی بات نہ سوجھی تو سر جھٹک کر رہ گیا۔ اپنی ذات میں گم ہوا سوچتا رہا۔ شفق کو امرتا پریتم سے عشق

اس کی پنجابی شاعری کا انتخاب ازبر کر رکھا ہے۔ شاید ...ں کے مابین آبائی مٹی کی سانجھ بھی ایک قدر مشترک ہو۔ ...نڈ جیسمین گارڈن میں ہونے والی آخری ملاقات کے ...ام پر جو مصرع سنایا تھا، یاد آگیا۔ دل ہی دل میں کہا۔ ...پہلا دوسرا ورق یاد بھی کرلوں تو کیا گارنٹی ہے۔ یہاں عشق ...پی ایچ ڈی کیے ہوئے صبر سے بیٹھ رہے ہیں۔ ایک ...ے رہ رہ کر نوک زبان پر آرہی تھی، بالآخر کہہ دی۔ ”ڈاکٹر ...ب سوگند توڑ کیوں نہیں دیتے۔ وہ ان کی محبت ہے، ...ی کی موت کے بعد کون سی رکاوٹ باقی رہ گئی۔“ ڈاکٹر ...لحظہ بھر کو میری آنکھوں میں دیکھا۔ غم کی پرچھائیں سی ...ا گئی، تاہم مسکراہٹ معدوم نہیں ہوئی۔ وہ خاموش رہا۔ ...س کی بجائے سومرو نے جواب دیا۔

”یہ اس کے دھرم اور برادری کا معاملہ ہے۔ ہم جن ...ستوں سے محبت کرتے ہیں، ان کے ذاتی معاملات اور ...صوصاً عقائد کے حوالے سے سوال نہیں کرتے۔“

”اوہ!“ بڑی بے ساختگی سے یہ لفظ میرے لبوں ...ے پھسل گیا۔ واقعی، جن سے محبت اور دوستی کا رشتہ ہو، ان ...ے عقیدے پر بات نہیں کرنی چاہیے۔

پرکاش اس موقع پر پہلی مرتبہ بولا۔

”راجا صاحب! آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟“

میری پوٹھوہاری سرشت کو گویا تازیانہ لگا، پھٹ سے ...ول دیا۔ ”اپنی محبت کو پانے کے لیے گھر بار اور برادری کو چھوڑنا پڑتا تو چھوڑ دیتا...... اور شاید انتہا سے گزر جاتا...... ...یرا مطلب......“

میں جو کچھ ذہن میں سوچ رہا تھا، مزید زبان پر نہ ...رسکا۔ سومرو کو پہلے مرحلے پر گویا حیرت کا جھٹکا لگا اور پھر اس ...ر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ پرکاش نے گردن جھکا دی اور ...پنے حقیقی تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیے۔ چند لحظے خاموشی ...اری رہی اور پھر سومرو بول پڑا۔ ”میں اللہ سے تمہاری ...خیریت کی دعا کرتا رہوں گا۔“ سومرو نے میرا دایاں ہاتھ ...پنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور محبت آمیز لہجے میں بولا۔ ...ہم گھر آئے مہمان سے اختلافی معاملات پر بحث نہیں کیا ...کرتے بلکہ دکھ دینے والی باتوں کا ذکر چھیڑنا بھی گناہ تصور ...کرتے ہیں۔“

”ہاں! میں جانتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں سر ...ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ...من میں میری محبت کے سوا زندگی کی کوئی اور خوشی سرے سے ہے ہی نہیں۔ میری عمر پانچ برس کے لگ بھگ تھی جب والدین وفات پاگئے۔ میں نے چوبیس پچیس برس کے عرصے میں اپنی محبوبہ کے سوا کسی انسان کے منہ سے اپنے لیے محبت کے بول نہیں سنے۔ تقریباً اکیس سال اس انمول جذبے کے لیے ترستے ہوئے گزارے ہیں۔ میں اپنی محبت کے لیے کوئی سی بھی قربانی دینے پر تیار ہوں۔“

ڈاکٹر پرکاش کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی اور وہ بول پڑا۔ ”میں نے Holy prophet کی پوری زندگی کے بارے میں بڑی تفصیل اور گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ پوری تاریخ میں مجھے ایک مثال نہیں ملی کہ انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ہر موقع پر حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ لیکن اس ملک کا ماحول سراسر جذباتی ہے۔ میں مذہب بدل کر اکثریت کی آنکھوں کا تارا بن سکتا ہوں لیکن میرے اپنے لوگوں کا اعتماد کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارے سچے پریم کو بھی لاج لگے گی۔ میں نے اپنی محبوبہ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرلیا ہے کہ ہم اگلے جنم میں ضرور ملیں گے......“

سندھی زبان بڑی میٹھی اور رسیلی ہے۔ اس کے کئی خوب صورت الفاظ کے مطالب و معانی سے وہاں آشنائی ہوئی۔ ملیر کا مطلب ہے، سرسبز و شاداب۔ عمرکوٹ کے قیام کا عرصہ طویل ہونے لگا تھا۔ محبت بھری محفلوں اور رت جگوں کے دورانیے میں وقفے وقفے سے دور نزدیک کے ایسے تمام اہم مقامات کے دورے مکمل کرلیے جہاں سے مطلوبہ چار اقسام کے سانپ وافر تعداد میں دستیاب تھے۔ اللہ ڈینو سپیرا سفر میں ہمراہ ہوا کرتا۔ موسم ہی ایسا تھا کہ صحرا کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ جابجا بچھے سبزے پر جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسراروں بھری اس دھرتی پر ٹولیوں کی صورت میں رنگ برنگے روایتی گھاگھرے پہنے، لمبے گھونگھٹ کاڑھے، عورتیں، صدیوں پرانی داستانوں کا کردار دکھائی دیتیں۔

عمرکوٹ سے منسوب مومل رانو اور عمر ماروی کی رومانی داستانیں بڑی مشہور ہیں۔ میری سوچیں عجیب رخ اختیار کر گئیں۔ اکثر خیال آتا کہ حسن و عشق کی اس سرزمین میں یقیناً کوئی خاص تاثیر ہوگی جو یہاں کے لوگ وفائیں نبھاتے ہیں۔ نہ جانے کس ظالم نے کب ہمارے علاقے کے بارے میں یہ بات کہہ دی جو ضرب المثل کی طرح مشہور ہوگئی کہ ”زمین ہموار نہیں، درخت پھل دار نہیں، موسم کا اعتبار نہیں اور لوگ وفادار نہیں۔“ ہم دوستوں سے اس

معاملے پر الجھ جایا کرتے اور کبھی چڑ بھی جاتے تھے۔

جانے کیوں یہ خواہش مجھے بے چین کرنے لگی کہ میں شنو کو یہاں عمر کوٹ لے آؤں۔ ہم دونوں ہمیشہ کے لیے اِدھر ہی کہیں آس پاس رہ جائیں، ملیر نامی بستی میں، جہاں کبھی ماروی ہوا کرتی تھی۔ دو ماہ ہونے کو آئے تھے، تھر کی زمین نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ مجھے اب واپس لوٹنا تھا۔ تمام مطلوبہ معلومات حاصل کرلی تھیں۔ ان ہی دنوں خبر آئی کہ حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر کینوس کا تھیلا کھل جانے پر بہت سے زہریلے سانپ آزاد ہوکر پلیٹ فارم پر ادھر ادھر رینگنے لگے اور وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ مزید تفصیلات سے پتا چلا کہ راولپنڈی کا کوئی سپلائر باقاعدگی سے زہریلے سانپ اس علاقے سے حاصل کرکے نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز اسلام آباد کے لیے بک کروایا کرتا ہے جہاں علاج کی خاطر ویکسین تیار ہوتی ہے۔ تقریباً دو مہینوں تک سپیروں کے ساتھ معاملات طے کرنے اور کئی طرح کے سانپ بار بار دیکھنے کے باوجود اس خطرناک جانور کا خوف میرے دل سے نکل نہ پایا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کوئلوں کی دلالی میں اگر ہاتھ منہ اور کپڑے کالے ہوسکتے ہیں تو سانپوں کے بیوپار میں موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ اتنی تعداد میں سانپ بھلا کہاں سے مل سکیں گے کہ بڑے پیمانے پر ان کی برآمد ہوسکے۔ بس یہ کہ بڑے بھائی کی ضد ہے، لہٰذا سندھ کا ایک چکر ہی لگانا ہوگا۔ لاحاصل سفر کرکے واپس لوٹ آؤں گا اور رپورٹ دوں گا کہ منصوبہ ناقابل عمل ہے۔ بدقسمتی سے میرے تمام مفروضے باطل ثابت ہوئے۔ سانپ بوروں کے حساب سے دستیاب تھے اور وہ بھی برائے نام قیمت پر پہلے سے ہی دھڑا دھڑ نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز اسلام آباد کو سپلائی کیے جارہے تھے۔

اللہ ڈینو سے میری خوب بے تکلفی ہوچکی تھی۔ میری مایوسی اور بے زاری کی وجہ پوچھنے لگا تو میں نے صاف بتادیا کہ دراصل مجھے سانپوں کی نقل و حمل سے خوف آتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے تھوڑی دیر بعد بول پڑا۔

"سئیں! ایک طریقہ اور بھی ہے...... مجھے اتنا تو پتا ہے کہ یہاں سے جو سانپ اسلام آباد اور باہر کے ملکوں کو جاتے ہیں، ڈاکٹر لوگ ان کا زہر نکال کر دوائی بناتے ہیں۔ تم خریدار سے، وہ ادھر کا ہے یا باہر ملک کا، صلاح کرلو کہ سانپ کی مصیبت میں خود کو مت ڈالو، جن چار نسلوں کے سانپ کا فوٹو تم نے دکھایا ہے، ان کا زہر الگ الگ بوتل میں، جتنا مانگو، ہم بالکل خالص دے گا۔ اس طرح ہماری روزی کھل جائے گی اور تم کو ذرا بھی مشکل نہیں پڑے گی۔"

بات بڑی معقول معلوم دیتی تھی۔ ہم دیر تک منصوبے کے اس پہلو پر غور کرتے رہے۔ اللہ ڈینو اپنے پیشے کے اعتبار سے خاصا ماہر اور پراعتماد ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی بات کی مزید وضاحت کردی۔ "سئیں! میں جس بوتل میں کسی سانپ کا زہر محفوظ کروں گا، اس پر اسی کی نشانی لگی ہوگی۔ مغالطہ پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس تم اللہ پر یقین رکھو اور اس کام سے ڈر کر پیچھے نہ ہٹو۔"

شام کو اللہ ڈینو واپس آیا تو تھرموس کپڑے میں لپیٹ کر بغل میں دبا رکھا تھا۔ اس کے اندر چھوٹی سی شیشی تھی، جس طرح کی انجیکٹ کرنے والی انگریزی دوا محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ بوتل تھرموس میں ڈال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"راجا سئیں! اس میں کوبرا کا زہر ہے۔ اتنے زہر سے دو اونٹ منٹوں میں مرسکتے ہیں۔ بالکل خالص ہے جدھر سے مرضی ہے، اس کو ٹیسٹ کراؤ۔ سانپ جتنے چاہو، مل جائیں گے اور زہر بھی بہت۔"

اگلے روز دس بجے کے قریب پتا چلا کہ راولپنڈی کا کوئی شخص ملنے آیا ہے۔ مجھے یہاں کون ملنے آسکتا ہے، یہ سوچ کر حیرانی ہوئی۔ عجلت میں اپنے کمرے سے نکلا۔ وہ لگ بھگ چھ فٹ اونچا، خوب تنومند، درمیانی عمر کا قبول صورت شخص تھا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا۔

"میرا نام شاہد ہے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کا رہائشی ہوں۔ شروع سے ہی ہر سال نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز اسلام آباد کا ٹینڈر میرے نام کھلتا ہے...... اس لیے نہیں کہ ہیرا پھیری کرتا ہوں۔" وہ ہنس پڑا اور دوبارہ بات شروع کی۔ "میں کھلی کھلی بات کرنے کا عادی ہوں۔ سانپوں کے کاروبار میں ہماری پوری روٹین اور سیٹ اپ بنا ہوا ہے۔ اگر آپ نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز کے لیے تیاری کررہے ہیں تو اگلے سال نیا ٹینڈر کھلنے تک انتظار کریں۔ وہاں ہمارا اور آپ کا کھلا مقابلہ ہوگا۔ گڈ لک۔ ہاں! کوئی اور آرڈر ہے تو ہماری خدمات اور تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ جتنی تعداد میں جہاں آپ چاہیں، مال آپ کو پہنچایا جاسکتا ہے۔"

سانپوں کی نقل و حمل کے حوالے سے میری سوچوں میں کئی اڑچنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کاروبار سے کوئی دلچسپی بھی نہ تھی لیکن یوں ہی تبصرہ کردیا۔

"یہ کام بڑا خطرناک ہے۔ اس میں کئی طرح کے

ت ہوسکتے ہیں۔ لینے کے دینے بھی پڑسکتے ہیں۔ دو روز پہلے کی خبر ہے کہ آپ کی کنسائنمنٹ میں سے کوئی کھل گیا اور زہریلے سانپ پلیٹ فارم پر نکل ے۔ زہریلا جانور ہے، ایک دوسرے کو کاٹ کر ختم سکتے ہیں۔"

شاہد کے لبوں پر بڑی واضح مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کو ہنسی آرہی ہے۔ حیرت بھی ی کہ پہلے وہ بڑی بے تکلفی سے ہنستا رہا ہے، اب کیا امر ع ہے، کہنے لگا۔ "یہ بڑا شریف جانور ہے، انسانوں کی رح لڑائی جھگڑا بالکل نہیں کرتا اور کھاتے بھی خوب ہیں۔"

اس نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی لیکن ہنسی چھوٹ ئی۔ قدرے توقف سے بولا۔

"آئی ایم سوری۔ میں مذاق کررہا تھا۔ آپ کو فی مال سانپوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں وں گی۔ یہ جاندار کئی مہینے بغیر کھائے زندہ رہ سکتا ہے...... یں نے اسی لیے پیشکش کی تھی کہ مال پہنچا کردیں گے۔ پ یہ بتائیں کہ مال جانا کہاں ہے؟"

بھائی کے ساتھ رہ کر میں اتنا اچھی طرح جان گیا تا کہ کاروباری راز کو کسی پر افشا نہیں کیا جاتا اور پھر وہ اس والے سے مجھ پر جا بے جا سختی بھی کیا کرتے تھے۔ اسی ے اللہ ڈینو یا میرے میزبانوں کو بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ تاہم شاہد کو اتنا ہی کہا۔ "میں یہاں صرف معلومات اکٹھی کرنے آیا تھا۔ تفصیلات کے بارے میں معلوم نہیں۔ اسلام آباد جاکر بھائی جان کو آپ سے رابطہ کرنے کا کہوں گا۔ آپ اپنا تعارفی کارڈ دے دیں۔"

وہ ذرا سا چونک گیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ لحظہ بھر بعد بولا۔ "اسلام آباد!...... کیا نام ہے آپ کے بھائی جان کا؟"

میں نے بھائی جان کا نام بتایا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ کہنے لگا۔ "کمال ہے...... تین ماہ پہلے راجا بخشی بہادر ایڈووکیٹ سے میرا باقاعدہ معاہدہ ہوا ہے۔ ریٹ طے ہیں، رف اتنا معلوم کرنا باقی ہے کہ کنسائنمنٹ کراچی دینی ہے یا سلام آباد...... پھر آپ کو یہاں کس لیے بھیج دیا؟"

ذرا سا توقف کرکے اس نے پوچھا۔ "کیا آپ بائی آئے ہیں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو اسے مزید حیرانی ہوئی، کہنے لگا۔

"کمال کردیا، آج کل ہائی وے پر اتنے ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ حالات بہت خراب ہیں۔ کتنے ہی لوگ قتل ہوئے اور تاوان کے لیے اغوا کرلیے گئے۔"

بہ ظاہر میں آرام سے بیٹھا ہوا تھا مگر اس انکشاف پر اندر سے ہل کر رہ گیا کہ جب معاہدہ ہوچکا ہے تو مجھے کس جرم کی سزا کے طور پر گھر سے نکالا اور وہ بھی سڑک کے ذریعے تن تنہا قیمتی کار پر طویل سفر کرنے پر مجبور کیا۔

ہمارے پاس زیر بحث موضوع پر مزید بات کرنے میں دلچسپی رہی نہ معقول جواز۔ مہمان نے خود ہی رخصت چاہی اور الوداع ہوتے ہوئے مسکرا کر روایتی جملہ ادا کیا۔

"انشاء اللہ ملاقات ہوگی، اپنے شہر میں۔"

ڈاکٹر پرکاش کے ہاں میری آخری دعوت ہوئی۔ کیا کمال کے لوگ تھے سب۔ شاید میری روح محبت کی پیاسی تھی اس لیے محبت آمیز سلوک اور تپاک فراواں دل میں اتر جایا کرتا۔ تمام تر مدارات کے بعد پرکاش نے مجھے ایک پیکٹ دیا اور کہا۔ "اس میں ہماری ہونے والی بھابی کے لیے ایک پوشاک ہے......" اس کے لبوں پر پھیکی افسردہ مسکراہٹ مزید نمایاں ہوئی اور بولا۔ "سندھی کڑھائی کا نمونہ ہے۔ میری ودھوا بھابی نے تب اپنے لیے بڑے شوق سے بنایا تھا، جب میں میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ کہتے ہیں، سال بھر کی نظر اور دماغ سوزی کا حاصل ہے یہ عروسی جوڑا۔ مگر جوں کا توں پڑا رہ گیا۔"

مزید کچھ کہنے کا یارا رہا نہ رہا، مجھ میں سننے کی تاب نہ تھی۔ میں شکریہ کا لفظ بھی نہ بول سکا۔ یہ لفظ اس انمول تحفے کے مقابلے میں بہت بے وقعت ہوکر رہ گیا...... میں نے پرکاش کو سینے سے لگالیا۔ جانے کیوں میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ حالانکہ ہم پوٹھوہاری، سخت جان ہی نہیں اکثر سخت دل بھی ہوتے ہیں۔ اللہ جانے، محبت کے جذبے میں کیا تاثیر ہے کہ پتھر کی کیمسٹری تبدیل ہونے لگتی ہے اور موم کے مانند نرم ہوجاتا ہے۔ سومرو نے مجھے اجرک اور سندھی ٹوپی کا تحفہ دیا۔

میں جلد از جلد واپس اسلام آباد پہنچنا چاہتا تھا لیکن کوئی معجزنما اسم اعظم یاد نہیں تھا جس کے طفیل گاڑی کے پر نکل آتے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مارگلہ کے دامن میں بسے کنکریٹ اور لوہے کے عظیم الشان شہر کی کسی ویران سڑک پر لینڈ کرجاتی۔ تمام سفر کے دوران میں ایک ہی سوچ غالب رہی کہ میرا اکل کھرا بھائی کیا سلوک کرے گا۔ مجھے میرا جائز حصہ دے گا یا وہی تخریبی ذہن رکھنے والا وکیل پوری ڈھٹائی سے خم ٹھونک کر سامنے آجائے گا۔ یہ عقدہ مجھ پر کسی طور پر کھل نہیں پارہا تھا کہ بھائی نے مجھے کس مقصد کے لیے اتنے

ڈور دراز سفر پر بھیجا جبکہ متعلقہ معاملات اس نے شاہد کے ساتھ پہلے سے طے کر رکھے تھے، تاہم میرے لیے یہ سفر اس حوالے سے وسیلۂ ظفر ثابت ہوا کہ مجھے بہت اچھے دوست مل گئے اور پھر ماروی کا دل نواز تصور ہمہ وقت میرے ساتھ ساتھ رہا جس نے اپنے محبوب کی خاطر دنیاوی شان و شوکت ہی نہیں ٹھکرائی، بلکہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

نسبتاً مختصر روٹ اختیار کرتے ہوئے میں فتح جنگ پہنچ گیا۔ بھائی کی سرشت کے منفی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی جانب سے متوقع بدترین سلوک کی صورت میں اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنے لگا۔ کل کاروبار میں سے صرف گاڑیوں کا شوروم ہی شروع سے میری نگرانی میں چلا آرہا تھا۔ راجا موٹرز کی سیل ایک دو روز تک میں اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا جو بعض اوقات چار پانچ لاکھ تک بھی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ خاصی معقول رقم تھی جس سے کہیں بھی عملی زندگی کی شروعات کی جاسکتی تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ بھائی راہ راست پر نہ آیا تو عقل مندی کا تقاضا ہے کہ میں اس کو مشتعل کرنے کے بجائے سر تسلیم خم کردوں اور اتنی رقم ہاتھ آنے پر چپکے سے کسی روز شفو کو ہمراہ لے کر سندھ کی طرف نکل جاؤں جہاں ماروی کے دیس میں امن اور محبت کی چھاؤں میں باقی کی زندگی بسر کردوں۔

ترنول کی جانب سے دن کے تقریباً ساڑھے دس بجے اسلام آباد کے بے وفا شہر میں داخل ہوا جو مفلوک الحال عوام کے جسدِ ناتواں سے بوند بوند خون نچوڑ کر پروان چڑھا۔ یہاں سے صرف حکمرانوں اور افسر شاہی کو مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ شاہراہ کشمیر پر گولڑہ چوک میں پھوپی زاد بھائی راجا افراسیاب کو کھڑے دیکھ کر گاڑی روک لی اور انہیں بٹھا کر دوبارہ چل پڑا۔ ان سے پتا چلا کہ پھوپو ڈیڑھ مہینا سے بہت بیمار ہیں۔ علاج میں کسر نہیں چھوڑی اور دعائیں بھی خوب کیں۔ پھوپو کی تیمارداری مجھ پر واجب ہوگئی تھی۔ ویسے بھی افراسیاب بھائی کو گھر ڈراپ کرنے جانا ہی تھا۔ راستے میں انہوں نے میرے بڑے بھائی کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ وہ شروع سے ہی انہیں پھمیر کہا کرتے تھے۔ یعنی پھن والا۔ کہنے لگے۔ ”پھمیر گزشتہ دو اڑھائی ماہ سے اپنی مکمل اوور ہالنگ کروا رہا ہے۔ اسلام آباد کے سب سے مشہور امریکا پلٹ ڈاکٹر سے جو بے اولاد جوڑوں کا گارنٹی کے ساتھ علاج کرتا ہے۔“ چہرے کا رخ میری طرف موڑتے ہوئے مسکرائے اور دوبارہ بولے۔ ”مفت بری کرتے کرتے سب انجر پنجر ڈھیلے کروا لیے۔ اسی لیے انتہائی پیمانے پر علاج کروانا پڑا ہے۔ سمجھ نہیں آرہی، اتنا مال کیوں خرچ کر رہا ہے۔ بیوی بچوں کا روگ پالنے والا وہ بندہ ہی نہیں۔“

لمبے سفر کی تھکن سے میری آنکھیں، ذہن اور جسم بوجھل ہوا پڑا تھا لیکن اس نئے انکشاف پر میں چوکس ہوگیا۔ اسی دوران ہم پھوپو کے گھر پہنچے تو پھوپو نے گلے لگایا، منہ چوما اور آنسو بہاتے ہوئے اتنی دعائیں دیں کہ میری تھکن دور ہوگئی۔ کہنے لگیں۔ ”مھاڑا پتر (میرا بیٹا) سلطان دنیا پر بادشاہی کرے گا۔ لمبی حیاتی ہوگی۔ زندگی میں ہر خوشی دیکھے گا اور اس کے دشمن برباد ہوں گے۔“ رخصت ہوتے ہوئے میں نے پھوپو کے گھٹنے چھوئے تو انہوں نے میرے ہاتھ چوم لیے۔ گاڑی میں بیٹھا تو مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے جسم میں نئی توانائی عود کر آئی ہے۔

راستے میں یہی سوچتا آیا تھا کہ اسلام آباد پہنچ کر سب سے پہلے شفو کو ملنے کی تدبیر کروں گا لیکن میرا ذہن کوئی واضح اشارہ نہیں دے رہا تھا کہ کیا صحیح ہوگا اور کیا غلط...... یہی مناسب خیال کیا کہ پہلے سیدھا گھر جاؤں، تھوڑا سا کھانا کھاؤں اور لمبی نیند لوں، جب تک دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہو کر بھائی جان واپس گھر نہیں لوٹ آتے۔ کل ہفتہ وار چھٹی ہے۔ رات کو اگر وہ پوچھیں تو صرف عمر کوٹ کی رپورٹ پیش کردوں۔ ان کے مزاج کا جائزہ لوں اور جہاں تک ممکن ہو، اپنے لائحہ عمل پر ٹھنڈے دل سے مزید غور کروں۔ البتہ شاہد سے ہونے والی ملاقات کا ذکر یوں سرسری انداز میں کردوں، گویا میں واقعی بلبلا ہوں اور بڑے بھائی کے بارے میں مجھے کوئی بدگمانی نہیں۔

گھر پہنچتے ہی غسل کیا اور کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ جھلملاتے، مسکراتے اور مہکتے لمحات نے مجھے پیار سے تھپکتے ہوئے بہت جلد گہری نیند سلا دیا۔ کوئی خوب صورت خیال تھا، دل و دماغ سے لپٹا ہوا یا سندر سپنا، یوں گمان ہونے لگا جیسے شفو اور میں ازدواجی رشتے میں جانے کب سے منسلک ہیں اور لمحۂ موجود میں اس کے دم سے میرا پہلو آباد ہے۔ سوتے جاگتے کی سی کیفیت طاری تھی کہ لاؤنج کی طرف سے آواز سنائی دی۔ ”اوئے شعبان! بلبلا کب سویا تھا؟“

”راجا جی! بارہ بجنے والے تھے، جب وہ کھانا کھا کر کمرے میں گئے۔“ خانساماں نے جواب دیا۔

”شمروز سے کہو، اس کو جگا کر برتن لگائے اور تم چھٹی کرو۔“ بھائی کی تحکمانہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں نے بستر میں بازو پھیلایا اور بستر پر جہاں تک رسائی ممکن ہوسکی، ہاتھ پھیرتا رہا۔ خود کو تنہا پایا۔ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا اور سائیڈ لیمپ روشن کر دیا۔ اس اثنا میں شمروز نے دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکا اور واپس ہو لیا لیکن کواڑ نہیں بھیڑے۔ لاؤنج میں پڑے ٹی وی پر نو بجے کا خبرنامہ جاری تھا۔ تازہ دم ہونے کے لیے میں واش روم چلا گیا۔

کھانے کی میز پر میں نے تھرپارکر کے دورے کی چیدہ چیدہ باتیں بتادیں اور شاہد سے ہونے والی ملاقات کا ذکر بھی کر دیا۔ بھائی نے مجھے لمحہ بھر کو غور سے دیکھا مگر اپنے حقیقی ذہنی تغیر کو حسب معمول چھپا گئے۔ کہنے لگے۔ ”معاہدہ میں نے سوچ سمجھ کر اپنی شرائط پر کیا ہوا ہے۔ اب دیکھ لیں گے کہ اس نے ہماری لاعلمی سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا۔“ بھائی کے پاس ہر سوال کا گھڑا گھڑایا جواب تھا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے شمروز نے چائے کے برتن لاؤنج میں لا رکھے اور ایک استفہامیہ سی نگاہ اپنے آقا پر ڈالی تو انہوں نے ہاتھ جھلا کر گویا چھٹی کرنے کا عندیہ دے دیا۔ ہم دونوں بھائی اکیلے رہ گئے۔ میں نے اس دوران میں کئی بار نظریں چرا کر بھائی کے چہرے اور جسم کا جائزہ لیا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر نظر آرہے تھے۔ طے کرلیا کہ صبح ناشتے کے بعد بات کروں گا۔ خدانخواستہ معاملہ بگڑتا نظر آیا تو اشتعال میں آنے کے بجائے متبادل راستہ تلاش کروں گا۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ بھائی بول پڑے۔ ”تمہاری غیر موجودگی میں اپنے اور تمہارے بارے میں بڑے اہم فیصلے کیے ہیں۔ آج دوپہر کو تمہارے گھر پہنچنے کی اطلاع مجھے دفتر میں دی گئی تو میں نے اسی وقت مفتی صاحب کو بلا کر کل گیارہ بجے کا وقت مقرر کرلیا۔ تمہیں سرپرائز دینے کے لیے میں نے پہلے نہیں بتایا کہ ان کے گھر تمہارا رشتہ کر چکا ہوں۔ کل بڑی سادگی سے نکاح سے ہوگا۔“

لبوں تک آیا ہوا پیالہ سنبھالنا محال ہوگیا۔ لگا جیسے چھلک ہی گیا ہے۔ پورا جسم خصوصاً دایاں بازو لرزنے لگا۔ پیالہ واپس طشتری میں رکھا تو قدرے زور سے، یوں جھنکار سنائی دی، گویا لمحہ بھر کو الارم بج کر بند ہوگیا ہو۔ دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا کہ مجھے اس کے فیل ہونے کا خدشہ لاحق ہوگیا۔ فوری طور پر یقین نہیں آیا۔ شک گزرا کہ سننے میں مغالطہ ہوا ہے۔ مگر الفاظ بڑے واضح تھے۔ وہ اب بھی کچھ بولے جارہے تھے۔ ”رشتہ داروں اور برادری کے بارے میں کہ لوگ اچھے نہیں۔ کسی کو دعوت نہیں دی۔ ولیمہ کی دعوت ایک ہفتے کا وقفہ ڈال کر فائیو اسٹار ہوٹل میں دیں گے۔ صرف ہائی جینٹری بلائی جائے گی۔ مفتی صاحب سفید پوش ہیں۔ میں نے جہیز کے لیے سختی سے منع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے جو چیز بھی وہ دیں گے، سب اسٹینڈرڈ کی ہوگی، کہاں رکھیں گے۔ بیوی کو باندی بنا کے رکھنے کا یہ بہترین نسخہ ہے کہ اس کو میکے سے ایک پیسے کی چیز بھی لانے کی اجازت نہ دی جائے۔“

مجھ پر طاری اضطرار میں قدرے تخفیف ہوتی محسوس ہوئی تو دل میں بے اختیار خواہش بیدار ہونے لگی کہ اٹھ کر بھائی سے لپٹ جاؤں۔ بوسے لوں اور ہاتھ چوموں، روؤں گڑگڑاؤں اور پاؤں پکڑ کر معافیاں مانگوں۔ میں ان کے بارے میں کیا سوچتا رہا اور وہ واقعی حقیقی باپ کی طرح شفیق اور دم ساز ثابت ہوئے۔ فرط جذبات سے میرا دل بھر آیا وہ کہہ رہے تھے۔ ”میں نے اپنی آرگنائزیشن سے فی میل اسٹاف کو فارغ کردیا ہے۔ سوہنی بڑے اونچے خواب دیکھنے لگی تھی۔ داناؤں نے بہت صحیح کہا ہے کہ عورت ذات پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے دل کو بھیڑیے کے بھٹ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ دل بستگی کے سامان سے زیادہ اہمیت کبھی نہ دو۔ عورت اور گھوڑا، ران تلے دبا کے رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ مرد کی چالاکیاں جہاں ختم ہوجاتی ہیں، عورت کا مکروفریب وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے آنسوؤں سے کبھی دھوکا نہ کھا جانا۔“

عورت کے بارے میں بھائی کے فرمودات میرے دل پر گراں گزر رہے تھے۔ میں بھلا شفو کے ساتھ اس طرح کا ناروا سلوک کیسے کرسکتا ہوں۔ وہ میری محبت ہے۔ ناز نخرے دکھائے تو سہی۔ میں خندہ پیشانی سے کیوں نہ اٹھاؤں۔ دل کی ملکہ کو باندی بنا کر کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ یہ تصور ہی میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ بحث مباحثے اور حجت بازی میں میرے جیسا کوئی بھی شریف انسان، وکیل سے نہیں جیت سکتا۔ بھائی نے غافل پا کر مخاطب کیا اور بولنے لگے۔

”میں نے تمہیں رشتہ داروں کے ساتھ میل جول رکھنے سے کئی بار منع کیا ہے لیکن تم چوری چھپے انہیں ملتے ہو۔ برادری کے کچھ بزرگ فارغ ہیں اور اب بیٹھے بٹھائے کھانے کو ملنے لگا ہے، اس لیے ان کو شرارتیں سوجھنے لگی ہیں۔ میں اردگرد سے غافل کبھی نہیں رہا اور اپنے سے متعلقہ ہر معاملے پر نگاہ رکھتا ہوں۔ وہ سب باہم صلاح مشورہ کر رہے ہیں کہ جرگہ کی صورت میں مجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تمہارا حصہ الگ کردوں۔ ماما بنارس تجھے گمراہ کرسکتا ہے۔ ہماری ماں نہ رہی تو اس کے بھائی سے کیا رشتہ رہ گیا۔ وہ بوڑھے شیطان کا رول ادا کر رہا ہے۔ اگر تم نے ان کو حمایتی بنایا ہے تو سن لو۔ جو رقم ابا جی نے

دی تھی، وہ پائی پائی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا سرکاری ریکارڈ بھی موجود ہے۔ اتنی رقم میں نے تم پر پانچ سال میں خرچ کر دی تھی۔ تعلیم، رہائش، خوراک لباس اور دیگر ضروریات پر۔ باقی کے سولہ سترہ سال جو تمہاری کفالت کی ہے، وہ صرف صلۂ رحمی کے جذبے سے کرتا رہا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ کسی بھی وقت کوئی شیطان تمہیں بہکا سکتا ہے، اس لیے پورا حساب رکھا ہوا ہے۔ چاہو تو اکاؤنٹنٹ مجید کے پاس ایک نظر دیکھ لینا۔ لاکھوں روپے بنتے ہیں۔ دنیا کا کوئی قانون بڑے بھائی کو پابند نہیں کرتا کہ وہ زیرِ کفالت بھائی کو اپنی ذاتی جائداد میں سے حصہ بھی دے......"

میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہی بھائی جو چند ہی لمحے پہلے شفقت و محبت کا پیکر بنا، مہربان فرشتہ دکھائی دے رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر پر سینگ نکلے اور جبڑے سے نوکیلے دانت جھانکنے لگے۔ وہ ہیبت ناک ابلیس کا روپ اختیار کر گیا۔ دل سے التجا بلند ہوئی۔ اے اللہ! میں اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مالی معاملات اور جھگڑوں میں آج تک اس سے کوئی بھی نہیں جیت سکا۔ میں یہ تسلیم کرلوں کہ بچپن میں چونکہ یتیم ہو گیا اس لیے تہی دست ہوں۔ سرِدست زندگی کی سب سے بڑی خوشی اتنی آسانی سے مل رہی ہے تو دامن دل میں سمیٹ لوں۔ وقت کا انتظار کروں اور جب بھی مناسب موقع ملے، بیوی کو ہمراہ لے کر اس خوفناک عفریت کے چنگل سے نکل بھاگوں۔

شیطانی آواز ایک بار پھر میرے دماغ میں چھید کرنے لگی۔ "تم میرے لاکھوں کے مقروض ہو مگر میں بڑا بھائی ہونے کے ناتے تقاضا نہیں کروں گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ ہم دونوں بھائی ہمیشہ اکٹھے رہیں۔ اس طرح تم ہر دستیاب نعمت سے برابر لطف اندوز ہوتے رہو گے۔ تمہیں میں نے سگی اولاد کی طرح پالا ہے۔ اسی لیے گھر نہیں بسایا۔ دل سے وعدہ کر رکھا تھا کہ دونوں بھائی اکٹھے شادی کریں گے۔ زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ میرے مخلص ہونے کا اتنا ہی ثبوت کافی ہے کہ جس گھر سے میں نے شادی کی اسی سے کل تمہاری بیوی لا رہا ہوں۔ تمہارے عمرکوٹ روانہ ہونے کے ایک ہفتہ بعد میں نے مفتی صاحب کی بڑی بیٹی سے نکاح کرلیا تھا لیکن رخصتی موخر کر دی۔ طے یہ ہوا کہ تمہارے واپس آنے پر دونوں بہنیں ایک ساتھ دلہن بن کر ہمارے گھر میں آئیں۔ کل ہم دونوں بھائیوں کی سہاگ رات ہے۔ میں اپنے ہر امتحان میں پورا اترا ہوں۔ مفتی صاحب کے کچھ تحفظات تھے جو میں نے پورے کر دیے۔

دونوں بہنوں کے نام ایف سیون والی کوٹھیاں لکھ دی ہیں۔ واضح شرط کے ساتھ کہ وہ جب تک ہماری بیویاں رہیں گی، اس جائداد کی حق دار ہیں۔ کہاں جائیں گی کوٹھیاں!......اور ہاں! ولیمے کے بعد میں بیوی کے ہمراہ ہنی مون منانے یورپ چلا جاؤں گا، دو چار ماہ کے لیے۔"

ہیروشیما اور ناگاساکی پر الگ الگ وقفے سے ایٹم بم گرائے گئے تھے۔ مجھ پر ایک ساتھ دونوں بم گرے اور میری ہستی خاکستر ہو گئی۔ بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں سونے جا رہا ہوں، تم بھی جاؤ اور خوب میٹھی نیند لو۔ کل بڑے کام ہیں۔"

کلاک پر گیارہ بجے تھے۔ بھائی کے بیڈروم کی روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔ مجھ سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جیسے ٹانگیں مفلوج ہو گئی ہوں۔ میرا ذہن اندھا، گونگا اور بہرا ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر پرکاش کا چہرہ نظروں کے سامنے سے ہٹ نہیں رہا تھا جس کی محبوبہ اس کی غیر موجودگی میں بھابی بنی اور رودھوا ہوئی۔ دونوں اگلے جنم میں ملن کی آس میں یہ جنم گنوا رہے ہیں۔ میری زندگی کی واحد خوشی مجھ سے چھن گئی تو کیسے کٹے گی۔ کاش! یہ رات پورے جنم پر محیط ہو جائے۔ مگر قانون قدرت کے خلاف کچھ بھی ہونا ممکن نہیں۔

بھائی کی ساری گفتگو میں نے حسبِ عادت بغیر ایک لفظ منہ سے بولے، خاموشی سے سنی تھی۔ یہی طرزِ عمل ہمیشہ میرے حق میں بہتر رہا ہے۔ جب بھی کوئی عذر پیش کیا، خواہ کتنا ہی جائز کیوں نہ ہوا، بڑی سخت ڈانٹ پڑی۔ میں یہی سوچتا آیا تھا کہ اشتعال میں نہیں آؤں گا تاکہ بدترین حالات میں بھی کوئی متبادل حل سوچ سکوں لیکن ایسا تو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا تھا کہ میرا بھائی میری محبت ہی لوٹ کر لے جائے گا۔ جس طرح وہ کئی جھوٹے مقدمے بھی جیت گیا۔ کچھ کرنا ہوگا، مجھے سوچنا چاہیے۔ ہمت ٹوٹ گئی تو مارا جاؤں گا۔ ہر حال میں خود کو سنبھالنا ہے تاکہ سلب ہوئے پڑے جسم کی توانائی کسی طرح بحال ہو۔ نصف رات ابھی باقی ہے اور بھائی کی سہاگ رات آنے میں کم و بیش بیس گھنٹوں کا وقفہ حائل ہے۔ زندگی کی بقا کے لیے کبھی کبھی چند لمحے ہی کافی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس وقت گھر میں ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ صرف ایک چوکیدار ہے جو صبح تک گیٹ کے باہر پہرا دیتا ہے۔ بندھے ٹکے معمول کے مطابق وہ فجر پڑھ کر گارڈ روم میں سو جائے گا۔ صبح تقریباً ساڑھے سات بجے شعبان آجائے گا۔ وکٹ گیٹ کی چابی اس کے پاس ہوتی ہے۔ شمروز اس کے ہمراہ ہوگا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے

بعد سے مالی اور ڈرائیور آجائیں گے۔

دو تین گھنٹے میں چپ چاپ باہر لان میں ٹہلتا رہا۔ پھر واپس آکر ٹیلی فون سیٹ اپنے کمرے میں لے آیا۔ مفتی صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا ہی تھا کہ دوسری جانب گھنٹی بجنے کی گویا نوبت ہی نہ آئی اور ہینڈ سیٹ اٹھا لیا گیا۔ دبی دبی آواز سنائی دی۔ "سلطان! میں مرجاؤں گی۔" سسکیاں سنائی دیں اور اس نے امرتا پریتم کا شعر پڑھا۔ "وے میں ترے کے گھڑے دا پانی، کل تک نہیں رہنا۔"

میں نے اتنا ہی کہا۔ "شنو! اگر میں صبح تک زندہ رہا تو تم نہیں مرو گی...... میں مر گیا تو جو جی میں آئے کرنا۔ میں بجھتا ہوا گھڑا دل کے نہاں خانے میں محفوظ کرلوں گا۔ ایک بوند بھی نہیں گرے گی۔ مقدر نے میرے دامن میں سوائے تمہاری محبت کے کچھ بھی نہیں ڈالا۔ شاید میں نے اب بھی صبر کرلیا ہوتا، اگر بھائی کے دل میں انسانیت کی ذرا سی رمق بھی ہوتی، تم تصور بھی نہیں کرسکتیں کہ وہ عورت کے بارے میں کیسے تصورات رکھتا ہے۔ تمہارے باپ نے تمہیں دہکتے ہوئے دوزخ میں دھکیلا ہے۔"

شفق نے سسکتے ہوئے کہا۔ "باپ کی محبت سے میرا اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ بہ ظاہر پرکشش شخصیت کا مالک اندر سے اتنا کمزور اور مفلسی کی زندگی سے خوفزدہ...... دونوں کوٹھیوں کے کاغذات ہمارے سامنے رکھ دیے اور خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اپنی بیٹیوں سے شدید محبت کرنے والا باپ ایسے خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ کروڑوں اربوں کی جائداد کے وارث چھڑے چھانٹ سگے بھائی، جن کے ساتھ رشتوں کا کوئی جھمیلا ہی نہیں۔ تقدیر نے تم دونوں بہنوں کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا ہے۔ میں نے نکاح نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تو ابا نے چھری سے اپنی کلائی زخمی کرلی......"

لائن یک لخت بے جان ہو گئی۔ میں نے صرف دو مرتبہ "ہیلو" کہا اور ہینڈ سیٹ رکھ دیا۔ ٹیلی فون سیٹ لا کر لاؤنج میں اسٹینڈ پر رکھا اور بھائی کے بیڈروم کا دروازہ ذرا سا دھکیلا۔ وہ حسبِ معمول اندر سے بند تھا۔ بھائی دروازہ ہمیشہ اندر سے بند کر کے سوتا ہے۔ لیکن مجھے سختی سے حکم دے رکھا ہے کہ دروازہ کھلا رکھا کروں۔ ایک بار پھر لان میں نکل آیا۔ رات کے پچھلے پہر کی خوشگوار خنک ہوا بدن میں سرایت کرنے لگی۔ مخملیں گھاس پر لیٹ کر لمبے سانس لیے اور ذہن کو یکسو کرنے لگا۔ میرے اردگرد تھرپارکر آباد ہونے لگی، ماروی کی بستی، جسے تھرپارکر نے محیط کرلیا، وہ ڈاکٹر پرکاش کا دیس ہے جہاں کی ودھوا اسلام آباد کی شنو کے لیے اپنی قیمتی متاع بہ طور

تحفہ بھجوا دیتی ہے۔ لوہے، کنکریٹ اور تارکول سے بسایا گیا بے حس اور بے وفا شہر جس کے نخی بہادر ایڈووکیٹ، نکاح کی آڑ میں عورتوں کو باندیاں بنا لیتے ہیں۔

فجر کی اذان خاموش فضا میں بلند ہوئی اور گارڈ روم کے دروازے کا کھٹکا سنائی دیا۔ میں نے لیٹے لیٹے نگاہوں کا رخ بدلا اور چوکیدار کرنیل خان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ پوٹھوہار میں کئی والدین بیٹوں کے نام اسی طرح کے رکھتے ہیں۔ کرنیل خان نماز پڑھ کر رات کا رکھا ہوا کھانا کھا کے سو جائے گا۔ مجھے خیال آیا کہ میں بھی آج وضو کر کے نماز پڑھوں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں۔ وہ دلوں کے حال جانتا ہے، اس کو اپنی سابقہ اور مجوزہ لغزشوں کا جواز پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ عاجزی سے گڑگڑانا اور اظہار ندامت کرنا ہی کافی ہے۔

ایک نماز چاہے کتنے ہی خشوع خضوع سے ادا کی جائے، قضا نمازوں کا کفارہ نہیں ہو سکتی۔ تاہم انسانی زندگی میں بعض ایسے کٹھن مراحل بھی آتے ہیں کہ ان میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے سے ہی سکون قلب نصیب ہوتا ہے۔ جائے نماز سے اٹھا تو طبیعت میں خاصا ٹھہراؤ آچکا تھا۔ کچن میں رات کا سالن گرم کیا اور ساری بوٹیاں نکال کر کھا لیں۔ ڈبل روٹی کے چند سلائس اور شامی کباب بھی کھائے۔ چائے بنا کر پی اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

پانچ بج کر سترہ منٹ پر میں نے پورچ میں کھڑے ہو کر لان کی طرف نگاہ ڈالی۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ لان کے بائیں پہلو پر گارڈینیا کی اونچی باڑھ کے ساتھ گھاس پر لیٹ کر بھائی ایکسرسائز کر رہا تھا۔ سر میری طرف اور پاؤں گیٹ کی جانب کیے، پیٹھ پوری طرح گھاس کے فرش سے لگائے، ٹانگیں آہستہ آہستہ اٹھا کر تقریباً نوے درجے کے زاویے پر کھڑی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح آہستگی سے واپس لے جا کر نیچے ڈال دیتا۔ لیکن آسمان کی طرف ٹانگیں ایستادہ ہونے پر اس کے حلق سے دبی دبی "ہائے" کی آواز برآمد ہو جاتی۔ مجھے سویٹی کے مادر زاد حالت میں پٹنے پر چیخنے چلانے اور آہ و بکا کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے چشم تصور سے میں نے دیکھا کہ وہ سویٹی نہیں، میری شنو ہے۔ بے اختیار میرے قدم بھائی کی طرف اٹھتے گئے۔ سر کے قریب پہنچا تو اس کی ٹانگیں آہستہ آہستہ اٹھتی ہوئی نوے درجے کے زاویے سے بھی قدرے آگے جھک آئیں۔ اس کی آنکھیں گو بند تھیں لیکن اس مرتبہ لبوں سے برآمد ہونے والی آواز "ہائے" اور "آہ" کا ملغوبہ تھی اور نسبتاً بلند۔ آن واحد میں اپنا بایاں بازو بڑھایا اور بھائی کی دونوں پنڈلیاں لپیٹ میں لے کر سینے کے ساتھ بھینچ لیں۔ اس کی بائیں ٹانگ دائیں کے اوپر تھی۔ اسی لمحے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا جس میں سرنج پکڑ رکھی تھی۔ کوئی غیبی قوت شامل حال رہی اور سرنج کی سوئی دو تین سیکنڈ کے اندر اندر بھائی کے بائیں ٹخنے سے چند انچ اوپر پنڈلی میں اتر گئی۔ ہیجانی کیفیت غالب آنے پر انگوٹھا ذرا زیادہ دب گیا۔ میں نے دیکھا کہ سرنج تقریباً خالی ہو گئی ہے۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی عجلت میں سوئی باہر کھینچ لی اور پہلے سوراخ کے قریب ہی دوبارہ گھسیڑ دی۔ سوئی دونوں مرتبہ کم و بیش عمودی رخ پر پنڈلی میں کھبی تھی۔

رات بھر کی سوچ بچار کے بعد ذہن میں طے شدہ پروگرام کے مطابق کام مکمل ہو گیا تو ایک نگاہ بھائی پر ڈالنے کا خیال آیا۔ سارے جسم کا خون سمٹ کر اس کے چہرے اور آنکھوں سے گویا پھوٹنے کو تھا۔ حلق سے غراہٹ نما خرخر کی آوازیں یوں سنائی دیں، جیسے گلے میں پھندا پڑ گیا ہو۔ میں نے اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں تو وہ دھم سے نیچے آ رہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بھائی ہاتھ ہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھ سے وہاں مزید کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ بھاگ کر سرونٹ کوارٹرز سے ملحقہ اسٹور میں آیا اور مالی کے اوزاروں میں سے وہ پلاس نما امپورٹڈ کٹر اٹھا لیا، جس سے مجھے خود بھی پودوں کی شاخیں تراشنے کا مزہ آیا کرتا تھا۔ مین ہول کا ڈھکنا پہلے ہی ہٹا رکھا تھا، جس میں شیشی کی کچھ کرچیاں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ سرنج والا بایاں ہاتھ نیچے مین ہول میں بڑھایا اور کٹر سے اس کے ٹکڑے کر دیے۔ ڈھکنا جما کر چھت پر چلا گیا اور پانی کی ٹینکی خالی کرنے کی غرض سے رکھے گئے دو انچ قطر کے پائپ کا والو پوری طرح کھول دیا جس سے پانی بہت زیادہ مقدار میں غیر معمولی رفتار سے نیچے سیوریج لائن میں بہنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد والو بند کیا اور نیچے آ گیا۔

بھائی کے کمرے سے خواب آور گولیوں کی ڈبل ڈوز لی اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھے گیا۔ اضطراب، اطمینان اور غم کی باہم متضاد لہریں ایک ساتھ میرے جسم میں گردش کرنے لگیں۔ مجھے مستقبل کے حوالے سے کوئی غم تھا نہ فکر و اندیشہ، گو بھائی مجھے بللا سمجھتا ہی نہیں، بلکہ اسی نام سے پکارا بھی کرتا تھا۔ حالانکہ کاروبار چلانے کی صلاحیت بھائی کے مقابلے میں مجھ میں زیادہ تھی اور اسٹاف سے میرا رویہ بھی شروع سے دوستانہ رہا ہے۔ میری راہ میں حائل ڈاکٹر پر کاش والی پیچیدگی بھی نہیں تھی۔ میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کا نمائندہ فرد ہوں۔ وہ مسلمان جو مذہب پر

...ں بالکل نہیں کرتے مگر اس کی دی ہوئی رعایتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میرے مذہب میں بیوہ کے مستقبل کی بابت جو حکم الٰہی ہے، اس کو عملی جامہ پہنانا ...ے لیے اگر زندگی موت کا مسئلہ تھا تو اللہ کے نزدیک ...ئی مستحسن۔ سب رشتہ داروں اور پوری برادری کے لیے ... گھر کے دروازے اسی روز کھل جانے تھے۔ مناسب ...ت آنے پر میرے بزرگ از خود ہی بیوہ بھابی کے مستقبل ...ی فکر کرتے ہوئے خاندان کی آزمودہ روایت پر عمل درآمد کروائیں گے۔ انہی لمحات کے دوران ہی میں نیند کی گہری پرسکون آغوش میں اترتا چلا گیا۔

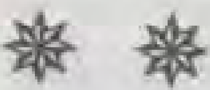
میں بھائی کی موت پر بہت رویا تھا۔ اللہ گواہ ہے، میرے آنسو سو فیصد اصلی تھے۔ اس سے ہر طرح کی ذلت اٹھا کر اور سختی برداشت کر کے بھی کبھی یہ تمنا نہ کی کہ وہ مر جائے۔ ساری برادری اور دور نزدیک کے تمام رشتہ دار میرے غم میں شریک ہوئے۔ بہت سوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ صرف میری دل جوئی کے لیے آئے ہیں۔ مرنے والے نے اپنی زندگی میں انہیں بہت ستایا۔ قبر میں اتارنے کے موقعے پر مفتی صاحب اور دو تین اور لوگوں نے آخری دیدار کرنے کو کہا تو ماموں جی راجا بنارس نے انہیں بری طرح ڈانٹ دیا اور کہا۔ "کیوں تنگ کرتے ہو لوگو کو۔ خبردار! اب کسی نے منہ دیکھنے کو کہا تو۔" ماموں نے دور سے ہی اپنے بڑے بیٹے صادق کو بہ آواز بلند حکم دیا۔ "اتارو اس کو اور پڑیاں رکھو، اللہ سوہنے کے حوالے۔" پڑیاں رکھی گئیں تو میں مٹی ڈالنے کے لیے قبر پر چلا گیا۔

بھائی کا رشتہ چھن گیا مگر درجنوں رشتے مل گئے۔ میں نے سب مذہبی رسمیں پوری کیں، جن رشتے داروں سے میں چوری چوری ملنے جایا کرتا تھا، وہ سب میرے گھر میں میرے آس پاس تھے۔ حالانکہ قبر کو مٹی دینے کے بعد فوراً ہی مجھے صبر آ گیا تھا اور حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ میرے گھر میں اسی طرح رونق لگی رہے۔ مفتی صاحب تمام ملازموں کو اپنی نگرانی میں لے کر بھائی کی تدفین کے بعد کوٹھی کا کونا کونا چھانتے رہے۔ کئی طرح کی جڑی بوٹیاں منگوا کر گھر کے اندر باہر ہر کونے کھدرے میں دھونی دلوائی۔ مگر کہیں بھی خطرناک سانپ نظر نہ آیا۔ ماموں نے حسب عادت خوب کھڑک کر کہا۔ "مفتی صاحب! سنا ہے سانپ اڑنے والے بھی ہوتے ہیں۔" انہوں نے کھڑے کھڑے باقاعدہ ایکشن دکھایا۔ بائیں ہتھیلی پھیلا کر سر سے ذرا بلند کی اور دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کی پوریں باہم جوڑ کر پھن کی شکل دے لی۔ میں نے یہ سن لیا اور خیال عمرکوٹ کی طرف چلا گیا۔ میرے دل نے گواہی دی۔ "سچی محبت میں واقعی بڑی شکتی ہوتی ہے۔ کوئی ہتھیارا بیچ میں حائل ہو جائے تو وہ پنڈلی یا ہونٹوں پر ڈس لیا جاتا ہے۔" ماموں جی راجا بنارس بڑے دبنگ بزرگ تھے۔

بھائی کی وفات کے ایک ہفتے بعد ہمارے کاروباری ادارے کے سارے شعبے کھل گئے اور میری ہدایت پر مفتی صاحب نگرانی کرنے لگے تاہم شام کو چھٹی کر کے دن بھر کی رپورٹ دینے آ جاتے۔ ماموں نے بہ مشکل دسویں تک صبر کیا اور اگلے روز مہمانوں سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم میں مفتی صاحب کو اپنے ساتھ بٹھا کر خوب کھڑک کر بولے۔ "بھائی صاحب! میں ذرا رف سا بندہ ہوں، میری بات کا برا نہیں منانا۔ ہم منگیتر نہیں چھوڑا کرتے، یہاں تو نکاح ہو چکا ہے۔ آپ کے گھر میں ہماری عزت ہے، وہ اب آپ کی نہیں ہماری بیٹی ہے۔ ہمارے خاندان میں رواج ہے کہ بہو بیوہ ہو جائے تو دیور پندرہ بیس سال چھوٹا ہو یا جیٹھ اتنا ہی بڑا، گھر کی عزت گھر میں رکھتے ہیں اور یہاں تو اللہ کے فضل سے معاملہ ہی فٹ فاٹ ہے۔"

ماموں کی کھری کھری دوٹوک بات پر میں ششدر رہ گیا لیکن مفتی صاحب نے ان کو دائیں بازو کے گھیرے میں لے کر کہا۔ "راجا صاحب! آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔ جب مناسب سمجھیں، حکم کر دیں، فوراً تعمیل ہوگی۔"

ماموں مجھے بازو سے پکڑ کر قریب قریب کھینچتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ بڑی بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہولے سے بولے۔ "ٹھیک کیا ہے ناں!!!" میں ہونقوں کی طرح دیکھے گیا۔ منہ ذرا سا کھل گیا، کچھ بول نہ پایا لیکن سر از خود ہی اثبات میں ہلنے لگا۔ ہنس کر کہنے لگے۔ "مرد کی مردانگی یہی ہے کہ بات نبھائے، چاہے سامنے سگا بھائی کیوں نہ آ جائے۔ میں نے خود تم دونوں کو شکر پڑیاں پارک میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ ذرا سی جاسوسی کرانے سے معلوم ہو گیا کہ یونیورسٹی سے چکر چل رہا ہے اور یہ بھی کہ لڑکی کہاں رہتی ہے، کس کی بیٹی ہے۔" یہ سن کر میرے جسم میں جان نہ رہی، یوں جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ انہوں نے پیٹھ پر دھپ مارتے ہوئے مجھے پہلو سے لگایا اور باہر لے جاتے ہوئے بولے۔ "ہمت کر، مرد بن، تیرا ماماں تیرے ساتھ ہے۔"



آشوبِ وفا

محی الدین نواب

دنیائے ادب کا نامور قلم کار شیکسپیئر، اس کا شہرہ آفاق ڈراما "مرچنٹ آف وینس"، ڈرامے کا یہودی سود خور شائیلاک اور اس کا اپنے قرض دار انطونیو کے جسم سے زندہ گوشت کا ایک پاؤنڈ کاٹ لینے کا وحشیانہ مطالبہ کون نہیں جانتا۔ شیکسپیئر جو کچھ لکھتا تھا، بہت سوچ سمجھ کر لکھتا تھا۔ اس نے یہ رمز پالیا تھا کہ یہودی قوم چمڑی جائے، دمڑی نہ جائے کے گندے اصول کی پیروکار ہے۔ اپنے اسی ادراک کے تحت اس نے شائیلاک کا کردار تخلیق کرکے صیہونیوں کو آئینہ دکھادیا۔ عام آدمی سے پیشواؤں تک ان میں سب ہی زرپرست ہیں... عصائے موسیٰ اور زروجواہر سے اثاث بھرے ہوئے تابوت یہودا کی بازیابی کا جذباتی نعرہ دے کر انہوں نے کروڑوں کا ایک عالمی فنڈ قائم کیا اور اپنی قوم کو سمجھایا کہ ہیکل سلیمانی کے بارہ سورما جب ظاہر ہوکر وہ تابوت منظرِ عام پر لائیں گے تو اس کی برکت سے کرۂ ارض پر یہودیوں کو بے مثال عروج حاصل ہوجائے گا اور وہ سب قوموں پر حکمرانی کریں گے... سادہ لوح یہودی دل کھول کر اس سازشی فنڈ میں عطیات دیتے ہیں... ایک طرف صیہونی تقدس کے پیرہن میں چھپے شیطانی وجود پوری آلِ موسیٰ کو ورغلا رہے تھے تو دوسری طرف حریت کے لیے برسرپیکار آزادی کے متوالے تھے... زرگزیدہ ربیوں کے نزدیک وہ حریت پسند باغی تھے جنہیں سفاکی سے کچل دینا ان کا حق تھا... موہوم روایتوں اور حرص وہوس کے غبار میں سازشوں کی جنگ نے ان کو دشمن کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کردیا... سورماؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے وہ اتنے گر گئے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو چارہ بناکر سورماؤں کو خریدنا شروع کردیا... حریت پسندوں نے اپنی منصوبہ بندی سے ان سب کی ہوسِ زر کو خوب ہوا دی، وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح خون کی ہولی کھیلنے لگے، طاقت اور بربریت ان طاغوتی پیشواؤں اور رہنماؤں کا سہارا تھی۔

تحیر، تجسس، سنسنی اور چشم کشا حقیقتوں کے جال میں بنی ایک انوکھی داستان

کبھی کوئی بھی دن فائرنگ اور دھماکوں کے بغیر بھی گزر جاتا اور کوئی رات سکون سے بیت جاتی تھی۔ پھر بھی فلسطینی کچی نیند سونے کے عادی ہو گئے تھے۔ خواب غفلت بھول چکے تھے۔ سونے کے دوران ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نقش رہتی تھی کہ اچانک دھماکے ہوں گے اور وہ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں گے۔ اکثر اسی طرح نیندیں غارت ہو جایا کرتی تھیں۔

غزہ کے جنوب میں مصر ہے۔ مشرق اور شمال میں اسرائیلی فوجی مورچے ہیں اور مغرب میں سمندر ہے۔ پچیس میل کی لمبائی تک سمندری ساحل پر فلسطینی ہیں۔ باقی شمالی ساحل اسرائیل کے قبضے میں ہے۔ رات ہوتے ہی بڑی بڑی سرچ لائٹس روشن ہو جاتی ہیں۔ دور سمندر میں مخالف حملہ آوروں اور اسمگلروں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ حماس اور دیگر اسلامی تنظیموں کے مجاہدین سمندری راستے سے اسرائیلی آبادی میں گھس آئیں گے۔ لہٰذا وہ رات کو زیادہ چوکنے رہنے لگے تھے۔

وقفے وقفے سے ٹریسر گولیاں داغتے تھے۔ وہ سیدھی آسمان کی طرف جا کر پھٹتی تھیں۔ پھر ان میں سے روشنی کی اتنی تیز شعاعیں نکلتیں کہ سمندر میں دور تک جیسے دن کا اجالا پھیل گیا ہو۔ ایان کو جب تک نیند نہ آتی، تب تک وہ کھڑکی سے لگا رات کو دن ہوتے دیکھتا رہتا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ جیسے آتش بازی کا مظاہرہ ہو رہا ہو۔ پھر وہ تیز روشنی دھیرے دھیرے معدوم ہونے لگتی تھی۔ اس کے بعد آسمان پہلے کی طرح تاریک ہو جاتا اور سمندر پر سرچ لائٹس کی محدود روشنیاں رہ جاتی تھیں۔

اس نے سر گھما کر دیکھا، ساتھ والے بیڈ روم میں اس کے ماں باپ تھے۔ اس نے پھر ایک بار ماں کی ہلکی سی کراہیں سنیں۔ وہ دونوں کچھ اس طرح باتیں کر رہے تھے، جیسے کسی بات پر جھگڑ رہے ہوں۔

بیٹے نے چشم تصور سے دیکھا۔ باپ اس کی ماں کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کی پٹائی کر رہا تھا۔ وہ بے چین ہو کر درمیانی دیوار کے پاس آ گیا۔ کان لگا کر سننے لگا۔ دھیمی دھیمی سی آوازیں آ رہی تھیں لیکن الفاظ واضح نہیں تھے۔

جب اس نے پہلی بار ماں کی آہیں اور کراہیں سنی تھیں تو دوڑتا ہوا اس کمرے میں گیا تھا۔ اس وقت باپ اس کی ماما کو دونوں بازوؤں میں دبوچ کر اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ بیٹا تڑپ گیا۔ اس نے ایک لکڑی اٹھا کر پیچھے سے حملہ کیا۔ "چھوڑو میری ماما کو..... چھوڑو نہیں تو مار ڈالوں گا۔" باپ نے ماں کو چھوڑ کر بیٹے کو پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے لکڑی چھین کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ رنگ میں بھنگ ڈالنے تم کہاں سے آ گئے؟ میں ابھی دیکھ کر آیا تھا، تم سو رہے تھے۔"

"میں جاگ رہا تھا۔ تم میری ماما کو مارتے ہو۔ تم اچھے نہیں ہو۔ گندے ہو۔ ہمارے گھر سے چلے جاؤ۔"

پھر اس نے ماں کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ دبا کر ہنس رہی تھی۔ باپ نے اس کا سر سہلایا پھر ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے کہا۔ "بارہ برس کے ہو گئے ہو۔ اونٹ کی طرح قد نکال رہے ہو اور بات سمجھتے نہیں ہو۔"

وہ اس کے کمرے میں آ کر بولا۔ "تم نے دیکھا، تمہاری ماں ہنس رہی تھی؟"

وہ حیران تھا۔ باپ نے کہا۔ "اگر میں اس پر ظلم کرتا تو وہ روتی..... بولو روتی ناں؟"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں پلے نہیں پڑ رہی تھیں اور ماں کی ہنسی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ باپ نے تھپک کر کہا۔ "اپنے بیڈ پر آرام سے سو جاؤ۔ اب ہمارے کمرے میں نہ آنا۔ میں دروازہ اندر سے بند کر رہا ہوں۔" وہ اس کی پیشانی چوم کر چلا گیا۔ دوسرے دن ماں نے بھی سمجھایا۔ "تمہارے پاپا بہت اچھے ہیں۔ جتنا تم پیار کرتے ہو، اتنا وہ بھی مجھے پیار کرتے ہیں۔"

اس رات کے بعد ماں محتاط ہو گئی تھی۔ منہ بند رکھتی تھی۔ بیٹے نے پھر اس کی آہیں اور کراہیں نہیں سنیں اور اب کئی دنوں کے بعد پھر ماں کی آہوں اور کراہوں نے اسے چونکا دیا۔ اس بار لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ ایک دوسرے سے کیا بول رہے ہیں؟

وہ سر جھکا کر بیڈ کے پاس آیا۔ سرہانے والی میز پر ایک ریوالور اور ایک کلاشنکوف رکھی ہوئی تھی۔ باپ نے اسے دیتے ہوئے کہا تھا، "اسے زیتون سے صاف کرو پھر لوڈ کرو۔ میں صبح جاتے وقت لے جاؤں گا۔ وہاں بچوں اور بچیوں کو اسلحہ پکڑنے اور نشانہ لگانے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ وہ بھی اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ عسکری ٹریننگ بھی حاصل کرتا رہا تھا۔

وہ یکبارگی اچھل پڑا۔ ماں کی چیخ سنائی دی تھی۔ جس کی لوریاں سن کر بڑا ہوا تھا، اس کی چیخ نے لرزا دیا۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے سے باہر آیا پھر دوسرے کمرے کے دروازے کو دھکا مار کر کھولنا چاہا تو وہ اندر سے بند تھا۔ ماں کی

گھٹی گھٹی سی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دروازے پر ہاتھ مار کر چیخنے لگا۔ "دروازہ کھولو..... بابا! میری ماما کو چھوڑ دو۔"

اندر ماں نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ "ایان! پڑوسیوں کو بلاؤ۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔"

اُس نے دروازے تک جانے نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں دشمن نہیں ہوں۔ مگر منہ بند نہیں رکھو گی تو ہمیشہ کے لیے تمہاری زبان بند کر دوں گا۔"

ایان نے کھڑکی کے پاس آ کر دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کلثوم کا گلا دبا رہا تھا اور وہ خود کو چھڑانے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ ایان دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ اس نے بیڈ کے سرہانے رکھے ہوئے ریوالور کو اٹھایا۔ پھر اتنی ہی تیز رفتاری سے کھڑکی کے پاس آ گیا۔ پڑوسیوں کے پاس جانے کا وقت نہیں تھا۔ ماں کی جان جانے والی تھی۔ اس نے کھڑکی کی جالی سے ریوالور کو اندر کرتے ہوئے للکارا۔ "چھوڑ دو میری ماں کو..... نہیں تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ فوراً ہی گولی نہ چلا سکا۔ اس وقت کلثوم نے خود کو چھڑا لیا تھا لیکن پھر گرفت میں آ گئی تھی۔ ویسے پوری طرح اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں کھینچ تان میں ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ ایان باپ کو للکار رہا تھا اور نشانہ لے رہا تھا۔ ایسے وقت وہ ٹارگٹ سے باہر ہو جاتا تھا۔ اس نے ٹریننگ حاصل کی تھی۔ مگر عمر کے لحاظ سے ابھی کچا تھا۔ ایسے وقت ماں نے چیخ کر کہا۔ "ایان! مجھے بچاؤ۔ یہ دشمن....."

وہ آگے نہ بول سکی۔ اس کے منہ پر ایک زور کا ہاتھ پڑا۔ ایسے ہی وقت ایان نے گولی چلا دی۔ نشانہ درست تھا لیکن وہ مار کھا کر لڑکھڑائی تو بیٹے کے نشانے پر آ گئی۔ اس کے حلق سے آخری چیخ نکلی۔ اس نے گرتے گرتے بڑی ممتا سے، بڑی بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔ "آہ..... میرے بچے! اس غلطی پر افسوس نہ کرنا۔ میں نے دودھ بخش دیا ہے۔"

وہ فرش پر گر کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئی۔ ایان کے چہرے پر بدن کا تمام لہو کھنچ آیا تھا۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس نے پیدا کرنے والی ماں کو مار ڈالا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "بابا! تم کہاں ہو؟ ماما کو فوراً اسپتال لے چلو۔"

وہ اپنے بچاؤ کے لیے کھڑکی کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہاں۔ اسے اسپتال لے جانا ہو گا۔ پہلے تم ریوالور پھینکو۔"

اس نے ریوالور کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ باپ نے فوراً ہی اسے اٹھا کر دروازے کو کھولا۔ بیٹا روتا ہوا، دوڑتا ہوا ماں کے پاس گیا اور اس نے دوڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ کر کلاشنکوف پر قبضہ جما لیا۔ بیٹے پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ وہ ماں کو مردہ پا کر پھر اس کی جان کا دشمن بن سکتا تھا اور یہی ہوا۔ وہ واردات والے کمرے میں واپس آیا تو ایان اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ بولتی نہیں ہیں۔ آنکھیں نہیں کھول رہی ہیں۔ یہ مر چکی ہیں۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔"

وہ دوڑتا ہوا آ کر باپ کو دونوں ہاتھوں سے مارنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک مار کھاتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ بیٹا آخر اپنا ہی لہو تھا۔ اس کی دشمنی کے جواب میں دشمن نہیں بن سکتا تھا۔ ابھی اسے ماں کا صدمہ تھا۔ جوش و جنون میں باپ کو دشمن سمجھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی معصومیت کو اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکتا تھا۔

ایسے وقت باہر سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔ پڑوسی پوچھ رہا تھا۔ "جلالت بھائی! کیا تم نے گولی چلائی ہے؟ خیریت تو ہے ناں؟"

وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اسے کھینچتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف جانے لگا۔ وہ ماں کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اور باپ اسے اسلحہ کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ زبردستی گھسیٹ کر وہاں سے لے آیا۔ پھر دروازہ کھولا۔ باہر دو پڑوسی اور رضا کار کھڑے تھے۔ انہوں نے ایان کو باپ سے ہاتھ چھڑانے کی کوششیں کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

جلالت اسرار نے کہا۔ "اندر آؤ اور آنکھوں سے دیکھو۔ اس نے اپنی ماں پر گولی چلائی ہے۔ وہ مر چکی ہے۔"

رضا کار نے ایان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آؤ یہاں بیٹھو۔ ہمیں بتاؤ، تم نے گولی کیوں چلائی تھی؟"

پڑوسی نے انفارمیشن سینٹر میں اطلاع دی کہ جلالت اسرار کے گھر میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں تنظیم کے لیڈر اور کئی اکابرین آ گئے۔ جلالت نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنی ماں کا ایسا دیوانہ ہے کہ اس کے قریب باپ کو بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔ اب سے پہلے بھی اس نے ایک لکڑی اٹھا کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔"

ایان سے پوچھا گیا۔ "کیا یہ درست ہے، تم نے باپ پر حملہ کیا تھا؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "یہ دشمن ہیں۔ میری ماما کو تکلیف پہنچاتے تھے۔"

جلالت نے کہا۔ ”یہ بتاؤ‘ میں تکلیف پہنچاتا تھا تو وہ ہنستی کیوں تھی؟“

اس بات کو وہ سمجھتا نہیں تھا یا ماں کی محبت میں سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس ماں کی ہنسی کا جواز نہیں تھا۔ وہ چپ رہا۔

جلالت اسرار نے کہا۔ ”اس عمر کے لڑکے عورتوں کے متعلق خاصی معلومات رکھتے ہیں لیکن یہ عقل سے پیدل ہے۔“

تمام مردوں نے سر ہلا کر تائید کی۔ آنے والوں کے لیڈر غالی ارتضیٰ نے کہا۔ ”یہ ابنارمل ہے۔ یہ صدمہ اسے ذہنی مریض بنا دے گا کہ اس نے ماں کو قتل کیا ہے۔ اسے مینٹل اسپتال میں لے جاؤ۔ نفسیاتی امراض کے ماہرین اس کا علاج کریں گے۔“

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ کلثوم کی تدفین ہونے تک رضا کاروں نے ایان کو سخت نگرانی میں رکھا۔ اسے قبرستان لے گئے۔ پھر مینٹل اسپتال لے آئے۔

کلثوم کی موت سے پھر آپس کے اختلافات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ جلالت اسرار اپنی پارٹی کا ایک شیر دل کارکن تھا۔ اسے چاہنے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ پارٹی کے ووٹ بینک میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اب حکمران پارٹی کے ووٹ بینک کو توڑنے اور جلالت اسرار کو قانونی گرفت میں لینے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اپوزیشن نے اپیل کی کہ جلالت اسرار اپنی بیوی کلثوم کا قاتل ہے۔ وہ اپنے معصوم بچے پر قتل کا الزام لگا رہا ہے۔ اس معاملے کی تحقیقات کی جائیں اور فیصلہ ہونے تک جلالت کو حراست میں رکھا جائے۔

اس اپیل کی نتیجے میں جلالت کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے ساتھی کارکن طیش میں آگئے۔ وہ اقتدار میں رہنے والی پارٹی تھی۔ ان کی ضمانت پر جلالت کو عارضی طور پر رہا کر دیا گیا۔ اس کی رہائی پر اپوزیشن میں رہنے والے طیش میں آگئے۔ ان مخالفین کے درمیان پہلے ”تُو تُو میں میں“ ہوئی پھر گالم گلوچ ہوئی۔ اس کے بعد گولیاں چل پڑیں۔ وہ آپس کی دشمنی میں مارے جا رہے تھے۔ دشمن مطمئن تھے کہ پانچ پانچ‘ دس دس کی تعداد میں مرنے والوں کے حساب سے فلسطینی اسی طرح کم ہوتے جائیں گے۔

ایان مینٹل اسپتال کے ایک کمرے میں تھا۔ باہر دروازے پر دو مسلح گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ کسی بھی پارٹی کے کارکن یا لیڈر کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ڈاکٹر اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر در پردہ اپوزیشن کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ ایان کے دماغ میں یہ بات نقش کرتا رہتا تھا کہ ماں کی روح کو سکون پہنچانا چاہتے ہو تو اس دشمن کو باپ نہ سمجھو۔ اس سے انتقام لو۔ پھر ماں خوش ہو کر تمہارے خوابوں میں آئے گی۔ اس نے بڑے جذبے سے پوچھا۔

”کیا سچ کہتے ہو؟ ماما میرے خوابوں میں آئیں گی؟“

”وہ تب آئیں گی‘ جب تمہارے دشمن باپ کو سزا ملے گی۔“

”بابا کو سزا کیسے ملے گی؟“

”جب تم یہ کہو گے کہ ماں پر تم نے نہیں‘ تمہارے باپ نے گولی چلائی تھی۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مت سوچو۔ جو کہتا ہوں‘ وہی بولو۔“

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ”ماما جھوٹ بولنے سے منع کرتی تھیں۔“

”تب تمہاری ماما کو یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہارا باپ دشمن ہے۔ اب ایک چھوٹا سا جھوٹ بول کر اس کی روح کو سکون پہنچاؤ۔“ وہ ایان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم خود کو قاتل کہو گے تو تمہیں سزا ملے گی۔ اس اسپتال سے جیل بھیج دیا جائے گا۔ پھر تم ماں کی قبر پر بھی نہیں جاسکو گے۔“

وہ مچل کر بولا۔ ”جاؤں گا۔ میں ماما کی قبر پر ضرور جاؤں گا۔ ان کے لیے دعائیں مانگوں گا۔“

”تم سلاخوں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ پھر ماں کی قبر پر کیسے جاؤ گے؟“

”میں جاؤں گا۔ جو تم بولو گے‘ وہی بولوں گا۔ میرے بابا نے گولی چلائی تھی۔“

وہ ڈاکٹر جب بھی آتا تھا۔ اسے یہی سبق پڑھاتا تھا اور تاکید کرتا تھا کہ دوسرے ڈاکٹر کو اور وہاں آنے والوں کو یہ نہ بتائے کہ وہ عدالت میں کیا بیان دینے والا ہے۔

جب ایک ہفتے بعد اقوام متحدہ کے آفس میں پیشی ہوئی تو اس نے باپ کے خلاف رٹا ہوا سبق سنا دیا۔ جلالت اسرار اور پارٹی کے لیڈر پریشان ہو گئے۔ اس سے بار بار کہا گیا کہ وہ سچ بولے۔ مگر وہ رٹے ہوئے سبق پر اڑا رہا۔ اسرائیلی اور اقوام متحدہ کے نگراں یہی چاہتے تھے کہ جلالت سزا کے مرحلے پر پہنچے تو اسے اسرائیل کے جیل خانے میں پہنچا دیا جائے۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق جلالت اسرار کو سزا سنا دی گئی۔ اسے اسرائیل کے اس جیل خانے میں پہنچا دیا گیا‘ جہاں تقریباً ڈیڑھ سو فلسطینی قید بامشقت جھیل رہے تھے۔

☆☆☆

جلالت اسرار دیکھنے میں کچھ پراسرار سا لگتا تھا۔ وہ فطرتاً خاموش رہنے کا عادی تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کچھ عجیب طرح کی کشش تھی۔ وہ زبان سے نہیں بولتا تھا۔ کسی کو بھی آنکھوں کی کشش سے اپنا بنا لیتا تھا۔

اسے قد آور پہاڑ کہا جاتا تھا۔ اس کے پورے جسم کی طرح چہرہ بھی ایسا سخت تھا‘ جیسے چٹان کو تراش کر اس میں روح پھونک دی گئی ہو۔ اس نے بچپن سے عسکری تربیت حاصل کی تھی۔ جدید ہتھیاروں سے کھیلنے کا ماہر تھا۔

اس کا نام اسرائیلی آرمی کی بلیک لسٹ میں تھا۔ دو برس پہلے آرمی کے ایک افسر اور چھ سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ تنہا تھا‘ مقابل فوجیوں کے پاس اسلحہ زیادہ تھا۔ لیکن وہ چھپتا چھپاتا ایسی حکمت عملی سے لڑ رہا تھا کہ جو سپاہی مارا جاتا‘ اس کا تمام اسلحہ حاصل کر کے کاؤنٹر فائرنگ جاری رکھتا تھا۔ اس تنہا شخص سے گھنٹوں جنگ جاری رہی۔ ان کے چھ میں سے تین سپاہی مارے گئے۔ گولیاں ختم ہو گئیں۔ جلالت اسرار کی طرح وہ دشمن بھی نہتے ہو گئے۔ ان حالات میں خالی ہاتھوں سے لڑائی ہوئی تو مقابلہ کرنے والوں کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے حیرانی سے خوفزدہ ہو کر دیکھا۔ اس نے ایک سپاہی کو کراٹے کا ہاتھ مارا تھا۔ وہ چکرا کر ایسا گرا کہ پھر زمین سے اٹھ نہ سکا۔ پھر اس نے دوسرے سپاہی کے سر کو گرفت میں لے کر اس کی گردن توڑ دی۔

یہی سمجھ میں آیا کہ وہ آدمی نہیں‘ فولادی روبوٹ ہے۔ فوجی افسر نے باقی دو سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہو کر اپنی جان بچائی۔ انہوں نے بعد میں معلوم کیا کہ اس کا نام جلالت اسرار ہے اور وہ حماس کا ایک مجاہد ہے۔ شکست خوردہ افسر نے حکم دیا کہ اس کی فائل بنائی جائے اور اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ اسے کسی بھی طرح زندہ گرفتار کر کے اسرائیلی جیل خانے میں لایا جائے۔

دو برس بعد فلسطین میں عدالت نے اسے اپنی بیوی کلثوم کا قاتل ثابت کر کے مطلوبہ جیل میں پہنچا دیا۔ جیلر کے کمرے میں وہ مات کھانے والا افسر اپنے دو سینئر افسران کے ساتھ موجود تھا۔ جلالت کو صرف ہتھکڑی ہی نہیں پہنائی گئی بلکہ پیروں میں بیڑیاں بھی ڈالی گئی تھیں۔ یہ خوف تھا کہ وہ غیر معمولی جسمانی قوت کا حامل ہے۔ ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہی اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ جب وہ افسران کے سامنے آیا تو ایک سپاہی نے حکم دیا۔ ”جھک جاؤ۔ گھٹنے ٹیک دو۔“

حقیقت نگاری

حنیف راجا بتا رہے تھے کہ البیلا اداکاری میں بھی ان کا جواب نہیں، ایک اسٹیج ڈرامے میں مرنے کا سین کیا، لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

عمر شریف بولے۔ ”یہ تو کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے ایک اسٹیج ڈرامے میں مرنے کا سین کیا تو میرا انشورنس ایجنٹ فوراً اٹھا اور گھر جا کے میری بیوی کو میرے بیمے کی رقم دے آیا۔“

مرسلہ: محمد مقبول عاشق، خوشاب

اس نے بڑی سنجیدگی سے سپاہی کو دیکھا اور اپنی عادت کے مطابق تن کر کھڑا رہا۔ شکست خوردہ افسر نے اس کے پاس آ کر ایک الٹا ہاتھ منہ پر رسید کیا۔ زور کا ہاتھ پڑا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے برعکس وہ اپنا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر سپاہیوں سے کہا۔ ”اسے جھکاؤ۔ ڈنڈے مارو۔ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرو۔“

سپاہیوں نے ڈنڈے اٹھا لیے اور اس کے پیروں پر ضربیں لگانے لگے۔ وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا‘ لیکن چیخنا کراہنا اور کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب وہ کھڑے رہنے کے قابل نہ رہا‘ تب بھی ان کے آگے نہیں گرا‘ پیچھے کی طرف گر کر چاروں شانے چت ہو گیا۔

یہ بات غصہ دلانے والی تھی کہ اس نے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے۔ وہ سینئر افسران بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ فوجی بوٹوں سے ٹھوکریں مارنے لگے۔ وہ چپ چاپ مار کھاتا رہا۔ فرش پر ادھر سے ادھر لوٹتا رہا۔ ایسا ڈھیٹ تھا کہ رحم کی بھیک نہیں مانگ رہا تھا۔ ٹھوکریں مارنے والے بری طرح ہانپ رہے تھے۔

وہ تینوں افسران کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ اپنی سانسیں درست کرنے لگے۔ جلالت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اور غصہ دلانے والی بات تھی۔

ایک سینئر افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”اسے مارو۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دو۔“

پہلے دو سپاہی تھے‘ پھر چار ہو گئے۔ اسے مارنے اور طرح طرح سے اذیتیں پہنچانے لگے۔ وہ افسران غصے سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ ”اسے مارتے رہو۔ اس نے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اسے چیخنے پر مجبور کرو۔ رونے اور گڑگڑانے پر

مجبور کرو۔"

وہ تمام سپاہی ٹارچر سیل کے اور تھرڈ ڈگری کے تمام حربے استعمال کرنے لگے۔ آخر وہ انسان تھا' تشدد حد سے بڑھا تو بیہوش ہوگیا۔ افسران جھنجلا کر رہ گئے۔ کیونکہ اس پتھر کے حلق سے ایک چیخ بھی نہیں نکلی تھی۔

☆☆☆

جلالت اسرار آہنی سلاخوں کے پیچھے ٹھنڈے اور گیلے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ کسی دوا یا تدبیر کے بغیر ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ دونوں پیروں پر خصوصاً گھٹنوں پر بڑی ظالمانہ ضربیں لگائی گئی تھیں۔ ہڈیوں کا کچومر بن جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ عارضی طور پر تکلیف میں مبتلا ہو کر گر پڑا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑا ہوگیا۔ وہ کوئی سپر مین یا ماورائی قوتوں کا حامل نہیں تھا۔ صرف غیر معمولی قوت برداشت کا حامل تھا۔ البتہ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ بے انتہا تشدد کے باوجود نہ اس کی ہڈیاں ٹوٹی تھیں' نہ ہی ورم آیا تھا۔ دیوار کے ساتھ سیمنٹ سے بنی ہوئی بنچ ۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ سر جھکائے سوچنے لگا۔ ماں نے بتایا تھا کہ اس کا باپ بہت شہزور تھا۔ دشمن اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ آخر اس کے ماں باپ نے تنگ آ کر ارضِ مصر کو خیر باد کہہ دیا۔ سرحد پار کر کے فلسطین آ گئے۔

اُن دنوں فلسطین پر مسلمانوں کا قبضہ تھا لیکن دوسرے ہی دن اقوام متحدہ کے فیصلے کے مطابق اسرائیلی ریاست قائم ہونے والی تھی۔ اس کے ماں باپ سرحد سے سفر کرتے ہوئے ہیکل کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا' دشمن بھی سرحد سے پیچھا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ دونوں ہیکل میں آ کر چھپ گئے۔ وہ ایسا وقت تھا کہ جلالت اسرار جنم لینے والا تھا۔ زچگی کا وقت قریب آ چکا تھا۔ اس کا باپ باہر دشمنوں سے نمٹ رہا تھا۔ ان کے درمیان وقفے وقفے سے فائرنگ ہو رہی تھی اور ماں ہیکل کے ایک اُجاڑ حصے میں تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ اس کی آواز سن کر دشمن ادھر چلے آئیں گے۔

بڑی مجبوری تھی۔ دردِ زہ کی تکلیف یقیناً ناقابلِ برداشت ہوتی۔ اس نے بڑی قوتِ ارادی سے منہ بند رکھا تھا۔ ہیکل کی دیوار کے ساتھ ایک گہرا گڑھا تھا۔ وہ اس گڑھے میں جا کر لیٹ گئی۔ اس حد تک چھپنے کے باوجود اندیشہ تھا کہ بچہ دنیا میں آتے ہی روئے گا۔ منہ سے آواز نکالے گا تو دشمن دوڑے چلے آئیں گے۔ باہر فائرنگ کی آواز بند ہوگئی تھی۔ وہ اللہ اللہ کرتی رہی اور دانت پر دانت جمائے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے تکلیف برداشت کرتی رہی۔

آخر مشکل آسان ہوگئی۔ بچہ دنیا میں آ گیا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر سوچا' بچہ کہاں ہے؟ اس کی آواز کیوں نہیں آ رہی ہے؟ آدھی رات ہو چکی تھی۔ ہیکل میں کہیں روشنی ہوگی۔ گڑھے میں گہری تاریکی تھی۔ دیوار کے ساتھ گڑھے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہیکل کی بنیاد میں پیدا ہوا تھا مگر کہاں تھا؟

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آگے کی طرف جھک کر اندھیرے میں ٹٹولنے لگی۔ ایسے ہی وقت ٹارچ کی روشنی بھٹکتی ہوئی اُدھر آئی۔ ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ "او خدایا! یہ یہاں پڑی ہے۔"

ٹارچ کی روشنی میں بیٹا مل گیا۔ ماں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ دنیا کے تمام بچے پیدا ہوتے ہی روتے ہیں یا منہ سے تھوڑی بہت آواز نکالتے ہیں۔ جلالت اسرار اپنی پیدائش کے پہلے لمحے سے رونا اور کراہنا نہیں جانتا تھا۔ ان عورتوں نے اس کی ماں کو سہارا دے کر اس گڑھے سے باہر نکالا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں کے پیش امام نے اسے دیکھا تھا اور اپنے گھر کی عورتوں سے کہا تھا' اسے ڈھونڈو۔ وہ مصیبت زدہ ہیکل میں کہیں ہے۔

یوں ماں بیٹے کو مسلمانوں کے ہاں پناہ مل گئی تھی۔ ماں نے پناہ دینے والوں سے کہا۔ "میرا شوہر ہیکل کے باہر دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ خدا کے لیے اس کی مدد کرو۔"

پیش امام نے کہا۔ "یہاں بڑی بھگدڑ اور افراتفری ہے۔ اسرائیلی ریاست قائم ہو رہی ہے۔ ان کے فوجی محاصرہ کر رہے ہیں۔ ہماری خواتین اور بچے غزہ جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلی جائیں۔ آپ کے شوہر زندہ سلامت ہوں گے تو ہمارے پاس آئیں گے۔ ہم انہیں آپ کے پاس پہنچا دیں گے۔"

وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ خلا میں تکتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "اسرائیلی ریاست 14 مئی 1948ء میں قائم ہوئی تھی۔ میں تیرہ اور چودہ مئی کی درمیانی شب پیدا ہوا تھا۔ ماں نے کہا تھا' میں اپنے باپ دادا کی طرح عجیب و غریب ہوں۔ جسمانی طور پر ناقابلِ شکست ہوں اور دماغی طور پر ارادوں کا پکا ہوں۔ جو بات دل میں ٹھان لیتا ہوں' وہ کر کے ہی رہتا ہوں۔ میری پیدائش عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ میں ہیکل کی بنیاد میں پیدا ہوا تھا۔ ماں مجھے بڑے پیار سے ہیکل کا سورما کہتی تھی۔ جبکہ ہیکل کے سورماؤں کو یہودی مانتے ہیں۔"

جلالت اسرار زیر لب بڑبڑایا۔ "ہیکل کے سورما... یہ الفاظ میں نے پہلی بار اپنی ماما کی زبان سے سنے تھے۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھے ہیکل کا سورما کہا تھا۔ اس لیے کہا تھا کہ مجھ میں کچھ غیر معمولی باتیں ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ پھر خلا میں تکتے ہوئے کہنے لگا۔ "اے ماما! تمہاری روح مجھے دیکھ رہی ہے۔ میری باتیں سن رہی ہے۔ آؤ ماما! ایک بار میرے کان میں پھر سے بولو! کیا میں واقعی ہیکل کا سورما ہوں؟"

☆☆☆

آرمی انٹیلی جنس والے ریکارڈ چیک کر رہے تھے۔ کمپیوٹر بتا رہا تھا کہ جلالت اسرار کے باپ کا نام اسرار احمد تھا۔ وہ تیرہ اور چودہ مئی 1948ء کی درمیانی شب پیدا ہوا تھا اور ٹھیک اسی دن اسرائیلی ریاست وجود میں آئی تھی۔ انکوائری کے نتیجے میں معلوم ہوا' اسی دن تیرہ مئی کو اسرار احمد نامی ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ مصر کی سرحد پار کر کے فلسطین آیا تھا۔ اِسکندریہ کی ایک یہودی جماعت نے یہ دستاویزی رپورٹ خاص طور پر اس لیے محفوظ رکھی تھی کہ اسرار احمد نومسلم تھا۔ اس نے یہودی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔

یہ تجسس پیدا ہوا کہ وہ یہودی مذہب سے پھرنے والا اسرار احمد کون تھا؟ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اِسکندریہ کی یہودی جماعت سے جو رپورٹ ملی' اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسرار احمد جس کا پہلا یہودی نام رابرٹ رابن تھا، وہ ایک انتہائی پراسرار شخص تھا۔ قدیم عبرانی زبان جانتا تھا۔ جسمانی طور پر غیر معمولی قوتوں کا حامل تھا۔ تنہا دشمنوں کو زیر کر دیتا تھا اور مقابلے پر آنے والوں کی گردنیں توڑ دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا' اسے یہ طاقت اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملی ہے۔ میرا جو بیٹا ہوگا' وہ بھی ایسا ہی جواں مرد اور ناقابلِ شکست ہوگا اور... ہیکل کا محافظ بن کر رہے گا۔

ان آخری الفاظ نے آرمی افسران کو چونکا دیا۔ قدیم زمانے کے ربیوں نے اپنی کتابوں میں لکھا تھا کہ نائٹ ٹیمپلرز یعنی ہیکل کے سورما کن خصوصیات کے حامل ہوں گے اور وہ بارہ ہی ہوں گے۔ اپنی تمام غیر معمولی خصوصیات نسل در نسل اپنی اولادوں میں منتقل کرتے رہیں گے۔ جلالت اسرار کے باپ کا نام اسرار احمد تھا۔ نومسلم اسرار احمد سے جلالت اسرار کی کڑیاں مل رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی حاملہ بیوی نے اسی رات ایک بیٹے کو جنم دیا ہوگا اور جلالت اسی نومسلم کا بیٹا ہوگا۔

اِسکندریہ کی یہودی جماعت نے اسرار احمد کی جسمانی قوت کا جس طرح ذکر کیا تھا' وہ قوت جلالت اسرار میں موجود تھی۔ پھر وہ تھرڈ ڈگری کی تمام درندگی اس پر آزما چکے تھے۔ اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کے ربی ہیکل کے سورماؤں کی جو خصوصیات بیان کرتے آئے تھے' وہ تمام خصوصیات جلالت اسرار میں موجود تھیں۔ وہ قیدی جسے وہ ٹارچ سیل میں ہی مار ڈالنا چاہتے تھے۔ اب ان کے ایک اہم دینی معاملے میں اہمیت اختیار کر رہا تھا۔

آرمی افسران نے اپنے دو معزز ربیوں کو بلایا۔ انہیں جلالت اسرار اور اس کے باپ اسرار احمد کے بارے میں تفصیلات بتائیں پھر پوچھا۔ ''کیا ہم یقین کرلیں کہ یہ جلالت ہیکل کے بارہ سورماؤں میں سے ایک ہے؟''

ایک ربی نے کہا۔ ''وہ کہاں ہے؟ اسے سامنے لاؤ۔''

جلالت کو پچھلے روز ایک اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ جب اسے سپاہیوں کے نرغے میں لایا گیا تو افسران اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ سینہ تان کر اپنے پیروں پر چلتا ہوا آیا تھا۔

ایک افسر نے کہا۔ ''محترم ربی! کل اسے ٹارچ سیل میں پہنچایا گیا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں' یہ اپنے پیروں سے چلنے کے قابل نہیں رہا تھا مگر اب دیکھیں! پہاڑ کی طرح تن کر آیا ہے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''اس کی ایک آدھ ہڈی یا پسلی ٹوٹنی چاہیے تھی لیکن ایسا کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔''

دونوں ربی اسے توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''تمہیں کسی بھی مذہبی پیشوا کا احترام کرنا چاہیے۔''

جلالت نے کہا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں' میں نے آپ کے آگے احتراماً دونوں ہاتھ باندھ لیے ہیں۔''

''سر بھی جھکانا چاہیے۔''

''یہ سر صرف خدا کے آگے جھکتا ہے۔''

دونوں ربی نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ایک نے کہا۔ ''شاباش! یہ نشانیاں ہم دیکھ رہے ہیں۔''

دوسرے نے پوچھا۔ ''کیا یہ چیختا' چلاتا اور رحم کی بھیک مانگتا ہے؟''

ایک افسر نے کہا۔ ''آپ سوچ بھی نہیں سکتے' یہ کتنا ڈھیٹ ہے' کل اذیتیں برداشت کرتے کرتے بیہوش ہو گیا تھا لیکن منہ سے کراہنے کی بھی آواز نہیں نکالی۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''یہ مضبوط قوت ارادی اور مستقل مزاجی ہے۔ ہم نشانیاں دیکھ رہے ہیں۔''

ایک افسر نے کہا۔ ''ہماری دینی کتاب ہیکل کے سورما کے مطابق یہ یہودی نہیں ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''جیسا کہ تم لوگوں نے ابھی بتایا ہے' اس کا باپ یہودی تھا۔ اس یہودی نے زبان سے اسلام قبول کیا ہے۔ جسمانی طور پر نمازیں پڑھی ہوں گی لیکن رگوں میں دوڑنے والا لہو تو ہزاروں برسوں سے یہودی ہے۔ اس قیدی کی رگوں میں یہودیت گرم رفتار ہے۔ یہ اسلام سے سحر زدہ ہے۔ ابھی خوابیدہ ہے۔ ہم اسے بیدار کریں گے تو یہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کی طرف لوٹ آئے گا۔''

جلالت اسرار خاموش کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسرائیلی فوجی افسران اسے یہودی کیوں بنانا چاہتے ہیں؟

ایک ربی نے کہا۔ ''ابھی ایک اہم نشانی باقی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''جلالت اسرار! جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے' تمہاری ماں نے سفر کے دوران تمہیں جنم دیا اور تمہارا باپ کہیں دشمنوں سے مقابلے میں مارا گیا۔ کیا تمہیں معلوم ہے' تمہاری ماں نے سفر کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے تمہیں کہاں جنم دیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہیکل میں...۔''

وہ مختصر سا جواب ایسا تھا' جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ دونوں ربی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے احترام میں تمام افسران بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ربی نے پوچھا۔ ''کیا زچگی کے وقت تمہاری والدہ ہیکل میں تھیں؟ پلیز' ہمیں ایک ایک بات بتاؤ۔ تمہاری پیدائش کی رات کیا ہوا تھا؟''

جلالت اسرار اپنی ماں سے جو کچھ سن چکا تھا' اُسے من و عن بیان کرنے لگا۔ وہ دونوں ربی سن رہے تھے' بڑی عقیدت سے اسے دیکھ رہے تھے اور ایک ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''ہاں۔ اُن دنوں ہیکل کی دیوار سے لگا ہوا ایک گڑھا تھا۔''

دوسرے ربی نے کہا۔ ''گویا تم ہیکل کی بنیاد میں پیدا ہوئے تھے۔''

پہلے ربی نے افسران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج سے دو ہزار سال پہلے ہمارے ایک ربی نے کتاب ''ہیکل کے سورما'' لکھی تھی۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے کہ وہ بارہ سورما تابوت سکینہ لے کر آئیں گے اور ان میں سے جو پہلا سورما ہوگا' وہ ہیکل سے نمودار ہوگا۔''

چند لمحوں کے لیے سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ان لمحات میں سب ہی پورے یقین سے اور عقیدت سے جلالت اسرار کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ان ربیوں نے اچانک ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا پھر اسے چوم کر کہا۔ ''اے خداوند یہووا! تیرا وعدہ پورا ہونے والا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''قیامت قریب ہے۔ ہمارا نجات دہندہ دجال اکبر آئے گا اور ہیکل کے بارہ سورما تابوتِ سکینہ میں مقدس امانتیں لے کر آئیں گے۔''

پہلے ربی نے کہا۔ ''اس کی زنجیریں کھولو۔ یہ معزز ہے' محترم ہے۔ مقدس امانتوں کا پہلا امین ہے۔''

آرمی افسران اگرچہ جلالت سے متاثر ہو گئے تھے' کھلی نشانیوں کے مطابق وہ ہیکل کا پہلا سورما ثابت ہو رہا تھا لیکن فوجی قوانین کے مطابق اسے رہا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ زنجیریں کھلتے ہی وہ ان پر چڑھ دوڑے گا۔ ٹارچ سیل کا تمام حساب بے باق کر دے گا۔ ایک افسر نے کہا۔ ''محترم ربی! یہ بہت خطرناک قیدی ہے۔ زنجیریں کھلتے ہی ہماری جان کو آجائے گا۔ حقیقتاً دیکھا جائے تو یہ فلسطین کا باغی شہری ہے اور ہم اسرائیلیوں کا جانی دشمن ہے۔ حماس کے لیڈر اس کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''

ربی نے کہا۔ ''تم اس کی ظاہری دنیاوی حیثیت بیان کر رہے ہو۔ ہم روحانی معاملات کو سمجھتے ہیں۔ آج کا دن ہمارے لیے بہت بڑا ہے۔ بہت اہم ہے۔ بارہ میں سے ایک سورما آج ہمارے درمیان ظاہر ہوا ہے۔ اسے عزت اور احترام دو۔ اس کے متعلق بہت سی باتیں کہنے کو رہ گئی ہیں۔ وہ باتیں ہم تنہائی میں کریں گے۔''

دوسرے ربی نے کہا۔ ''تم اپنے فوجی قوانین پر عمل کرو لیکن اسے ایک آرام دہ چار دیواری میں نظر بند رکھو۔ زنجیریں کھول دو۔ جتنی عزت اور احترام دے سکتے ہو' دیتے رہو۔ ہم وہاں جا کر اس سے ملاقات کرتے رہیں گے۔''

یہ مشورہ قابل قبول تھا۔ جلالت اسرار کو ایک آرام دہ بنگلے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس بنگلے کے چاروں طرف مسلح گارڈز کا سخت پہرا لگا دیا گیا۔ اندر وہ پوری طرح آزاد تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ یہودیوں کی نظروں میں مجرم نہیں ہے۔ بلکہ معزز ہو گیا ہے۔ ماں نے ایک بار کہا تھا کہ وہ ہیکل کا سورما ہے۔۔۔ اب وہ بات درست ثابت ہو رہی تھی۔

اس معاملے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے یہودی حکمرانوں' فوجی افسروں اور موساد تنظیم سمیت دیگر انٹیلی جنس والوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں چھ بزرگ اور معزز ربی بھی شریک تھے۔

اجلاس کے آغاز میں تمام ربیوں نے یہ کہہ دیا کہ دو ہزار سال پرانی کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت ہو چکا ہے' وہ ہیکل سے نمودار ہونے والا پہلا سورما ہے اور اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک حاکم نے کہا۔ ''قدیم کتابوں کے مطابق وہ بارہ سورما یہودی ہیں۔ جبکہ یہ نمودار ہونے والا پہلا سورما مسلمان ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''اگر اس کے باپ نے مسلمان ہونے کی غلطی کی ہے تو اس غلطی کو مٹایا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس سفلی جادوگر اور ہپناٹزم کے ماہرین ہیں۔ وہ اس کا برین واش کریں گے تو موجودہ اسلامیت مٹ جائے گی۔ وہ کٹر یہودی بن جائے گا۔''

اجلاس میں سب ہی اس مشورے پر بحث کرنے لگے۔ آخر کار راضی ہو گئے۔ ربی نے کہا۔ ''صرف تنویمی عمل ہی نہیں کیا جائے گا۔ پہلے کالے جادو کے ذریعے اس کے دماغ کو کمزور بنایا جائے گا۔ ہم اسے کئی آزمائشی مراحل سے گزاریں گے۔ جب وہ کسی شک و شبے کے بغیر یہودی بن جائے گا' تب ہم اس پر بھروسا کریں گے۔''

موساد اور آرمی انٹیلی جنس کے افسران نے کہا۔ ''ہم بھروسا کرنے کے باوجود اسے کڑی نگرانی میں رکھیں گے۔ اس کا برین واش ہو جائے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

جلالت اسرار ایک چھوٹے سے محل میں رہنے لگا۔ وہاں آرام و آسائش کا اور ضروریات کا تمام سامان موجود تھا۔ اس کی خدمت کے لیے انتہائی خوبصورت کنیزیں تھیں۔ وہ بات بات پر ہنستی کھلکھلاتی تھیں۔ دل کو لبھانے والی ادائیں دکھا کر گزر جاتی تھیں۔ ان طرحدار حسیناؤں کی ادائیں گناہ کی ترغیب دیتی تھیں۔ اس نے ان سب کو جھڑک دیا تھا۔ غصے سے حکم دیا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ۔ ورنہ ایک ایک کو اُٹھا کر چھت پر لے جاؤں گا اور نیچے پھینک دوں گا۔''

وہ سب کی سب سہم کر چلی گئیں۔ اس نے رنگ محل کے منتظم اور نگراں افسر سے کہا۔ ''میری خدمت کے لیے مرد ملازم رکھے جائیں۔ مجھے عورتوں کی موجودگی پسند نہیں ہے۔''

وہ کھانے پینے کے معاملے میں بھی محتاط رہتا تھا۔ بند کمرے میں تنہا بیٹھ کر کھاتا تھا۔ پہلے ہر کھانے اور مشروب کو چکھتا تھا۔ جس میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا' اس کا تھوڑا حصہ کموڈ میں ڈال دیتا تھا۔ یہ تاثر دیتا تھا کہ انہیں حلق سے اتار

چکا ہے۔ اس نے چکھنے کے دوران ہی مضر رساں دواؤں کے اثرات کو محسوس کیا تھا اور یہ شکایت کرنے لگا تھا کہ اعصابی کمزوری محسوس کرنے لگا ہے۔ ڈاکٹر آکر اسے چیک کرتے تھے۔ تسلیاں دیتے تھے اور دوائیں دے کر چلے جاتے تھے۔

وہ تدبیریں سوچ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ آرمی کے شکنجے سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ان کے دینی پیشوا اور تمام یہودی ہاتھ آئے ہوئے ایک سورما کو کبھی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے برعکس ان کا سورما بن کر سب ہی دشمنوں کا اعتماد حاصل کرسکتا تھا۔ یہ بات اس کے دماغ میں پک رہی تھی کہ یہودیوں کی ہاں میں ہاں ملائے' ان کا حامی بن کر رہے اور گھر کا بھیدی بن کر لنکا ڈھاتا رہے۔

اس نے دوسرے ہی دن ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ دماغی اور جسمانی طور پر کمزور بن گیا۔ بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ رہا۔ دو ڈاکٹروں نے آکر معائنہ کیا۔ دو ربی اور افسران بھی آکر اس کی حالت دیکھنے لگے۔

انہیں پورا یقین ہو گیا کہ ان کی دی ہوئی دوائیں اپنا اثر دکھا چکی ہیں۔ انہوں نے افسران سے اور ربیوں سے کہا۔ ''اس کا دماغ کمزور ہو چکا ہے۔ اب اس پر آسانی سے تنویمی عمل کیا جاسکے گا۔''

اسی دن ہپناٹزم میں مہارت رکھنے والے ایک ربّی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ تنویمی عمل کے لیے ایک خالی کمرا تھا۔ کمرے کے در و دیوار اور پردے بالکل سیاہ تھے۔ اس کے اندر جا کر یوں لگتا تھا' جیسے تاریک قبر میں اتر آئے ہوں۔ جلالت کو وہاں لاکر ایک اسٹریچر نما بیڈ پر لٹا دیا گیا۔

وہاں کیمرے اور مائیکرو فون نصب کیے گئے تھے۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے ربی اور اعلیٰ افسران بڑی سی اسکرین پر دیکھ سکتے تھے کہ اسے کس طرح ہپناٹائز کیا جارہا ہے؟ عامل کیسے سوالات کررہا ہے اور معمول بن جانے والا جلالت اپنے عامل کو کیا جواب دے رہا ہے؟

جب ہپناٹائز کرنے والے ربّی نے اس پر عمل شروع کیا تو وہ دماغی طور پر کمزور نہیں رہا تھا۔ عامل کی باتوں اور حرکتوں سے سحر زدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنی پلاننگ کے مطابق ٹرانس میں آگیا۔ یہ تاثر دینے لگا کہ ان کا معمول بنتا جارہا ہے۔

عامل نے پہلے اپنے عمل کے ذریعے اسے دنیا کے تصور اور اس دنیا سے آنے والی آوازوں سے محروم کردیا۔

پھر پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا سن رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''گہری تاریکی ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔''

عامل نے حکم دیا۔ ''دو ہزار سال پیچھے جاؤ۔ وہاں خود کو تلاش کرو۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر جلالت نے کہا۔ ''کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔''

اس نے حکم دیا۔ ''اپنے آبا و اجداد میں سے کسی کو دیکھو۔''

پھر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ جلالت نے سوچ رکھا تھا کہ اسے سوالوں کے جوابات کس طرح دینے ہیں؟ اس نے کہا۔ ''میں ایک اجنبی ہیکل کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے باپ کی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ یہ دعویٰ کررہا ہے کہ میرا باپ ہے۔''

عامل نے کہا۔ ''اس سے کہو' اگر وہ گیارہ سورماؤں کا پتا ٹھکانا بتائے گا تو تم اسے اپنا باپ تسلیم کرلو گے۔''

وہ ذرا خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''یہ کہتا ہے' گیارہ سورما اسی دنیا میں موجود ہیں۔ وہ بھی میری طرح باسٹھ برس کے بوڑھے ہوں گے۔ مگر صحت مند نظر آئیں گے۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کا پتا ٹھکانا نہیں جانتا۔''

''معلوم کرو' ان سورماؤں کو کیسے تلاش کیا جائے گا؟''

''انہیں تلاش نہ کیا جائے۔ جس طرح میں خود ہی نمودار ہوا' اسی طرح میرے وہ گیارہ ساتھی ایک کے بعد ایک از خود سامنے آئیں گے اور اس کے لیے لازم ہے کہ میں سورماؤں کا طرزِ حیات اختیار کروں۔''

''پوچھو کہ سورماؤں کا طرزِ حیات کیا ہے؟''

جلالت نے ذرا خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''سورما کسی مظلوم اور بے گناہ پر نہ ظلم کرتے ہیں' نہ ان پر ظلم ہوتے دیکھتے ہیں۔ سورما صرف اپنے مذہبی پیشوا کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔''

وہ عامل اپنے معمول کو دیکھنے لگا پھر وہ یہودیت کا سبق پڑھانے لگا۔ جلالت اسرار اسے خوش فہمی میں مبتلا کررہا تھا۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے یہودی اکابرین اسے ہپناٹائز ہوتے دیکھ رہے تھے۔ یہ اطمینان ہو رہا تھا کہ وہ پہلا سورما ان کے تاریخی ہیکل کے سورماؤں کی طرح یہودی بن چکا ہے۔

تنویمی عمل کی پختگی یقین دلا رہی تھی کہ ایسا ہو چکا ہے اور آئندہ جلالت اسرار کی گفتار اور رفتار سے یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ ان کا وفادار یہودی بن چکا ہے یا نہیں؟

☆☆☆

ایان مینٹل اسپتال سے گھر آگیا تھا۔ اب گھر میں ماں تھی' نہ باپ تھا۔ ماں کو اس نے گولی ماردی تھی اور باپ کو یہودیوں کے شکنجے میں پہنچا دیا تھا۔ خالی گھر میں ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک بار اندر جا کر پھر باہر آگیا۔ ایک چبوترے پر ماتمی انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

باپ سزا بھگتنے چلا گیا تھا لیکن ماں اب تک خواب میں نہیں آئی تھی۔ اسے مظلوم اور مقتول ماں کا پیار نہیں مل رہا تھا۔ آئے دن کی گولہ باری کے باعث کتنے ہی گھر اجڑتے رہتے تھے۔ حماس والوں نے ایک اجڑی ہوئی فیملی کو ایان کے ساتھ رہنے کے لیے اس کے گھر بھیج دیا تھا۔ اس طرح اسے بزرگوں اور نئے منہ بولے رشتوں کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔

اس وقت وہ نئی فیملی کے بزرگ ذابر العمرو کے ساتھ بیٹھا باتیں کررہا تھا۔ اچانک ہی غزہ کی پوری پٹی میں خطرے کا سائرن گونجنے لگا۔ وہ دونوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ذابر نے کلاشنکوف اٹھائی اور ایک رائفل کو ایان کی طرف اچھالا۔ ایان نے اسے کیچ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چھت پر جاتا ہوں۔ تم یہاں رہو۔''

وہ جواب سنے بغیر دوڑتا ہوا سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا دھماکا ہوا۔ ایسے وقت فوراً ہی انفارمیشن سینٹر کو اطلاع دی جاتی تھی کہ اسرائیلی فوجی کہاں حملے کررہے ہیں؟ پھر تمام فلسطینی باشندے اپنے اپنے موبائل فون کے ذریعے انفارمیشن سینٹر سے صحیح معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔

معلوم ہوا' شمالی غزہ کے علاقے بیت الجیہ میں اسرائیلی طیاروں نے ایک گاڑی کو میزائل سے نشانہ بنایا ہے۔ گاڑی تباہ ہو گئی تھی۔ دو فلسطینی شہید ہو چکے تھے۔ باقی دو زخمیوں کو اسپتال پہنچایا گیا تھا۔

فلسطینیوں کے معاملات اور امورِ خارجہ سے نمٹنے والے سیکریٹری نے اسرائیلی حکام سے فون پر احتجاج کیا اور اقوامِ متحدہ کے دفتر میں شکایت درج کرائی۔ فلسطینی اسی طرح این جی اوز اور دیگر سماجی و سیاسی تنظیموں کے ذریعے ساری دنیا میں اپنی فریاد پہنچاتے رہتے تھے۔

تمام ربی اور آرمی کے افسران جلالت اسرار کو طرح طرح سے آزما رہے تھے۔ کئی ربیوں نے اسرائیلی اکابرین کو یقین دلایا تھا کہ یہ وہی سورما ہے' جس کا ہزاروں سال سے انتظار کیا جارہا تھا۔ اب یہ آزمایا جارہا تھا کہ تنویمی عمل کس حد تک کامیاب رہا ہے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے دین کو بھول چکا ہے۔ اس نے بے انتہا ظلم و ستم کے باوجود پہلے دن قید خانے میں نمازیں پڑھی تھیں۔ تنویمی عمل کے بعد نمازیں بھول گیا تھا۔ بسم اللہ اور انشاء اللہ جیسے الفاظ زبان پر نہیں آتے تھے۔

وہ نکاح پڑھائے بغیر کسی حسینہ کو اپنے قریب برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس نے تمام حسیناؤں کو اپنی رہائش گاہ سے باہر نکال دیا تھا۔ اب اس کا مزاج بدل گیا تھا۔ پارسائی ہوا ہو گئی تھی۔ وہ حسین لڑکیوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ان کے ساتھ راتیں گزارنے لگا تھا۔

میجر ہارپر نے سینی گاگ میں آکر ایک ربّی سے شکایت کی کہ اس کے برین واشنگ میں خامی رہ گئی ہے۔ ابھی اس کے اندر اسلام باقی ہے۔ وہ آج بھی کسی مسلمان عورت کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

ربی نے پوچھا۔ ''کیا کہتا ہے؟''

''وہ کہتا ہے' کسی کو مظلوم بنا کر اس کی عزت سے نہیں کھیلے گا۔''

ربّی نے کہا۔ ''وہ تنویمی عمل کے دوران کہہ چکا ہے کہ ہیکل کے سورما کسی مظلوم اور بے گناہ پر نہ ظلم کرتے ہیں اور نہ ان پر ظلم ہوتے دیکھتے ہیں۔ سورما صرف اپنے مذہبی پیشوا کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔''

میجر نے کہا۔ ''جب وہ یہودی بن چکا ہے تو فلسطینیوں کا سر کچل سکتا ہے۔''

''بے شک سورماؤں کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے۔ کوئی حملہ کرے تو منہ توڑ جواب دیتے ہیں۔''

جلالت اسرار رات کے آٹھ بجے آرمی ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔ وہاں اسے پہننے کے لیے فوجی وردی دی گئی۔ یہ بریفنگ دی گئی کہ کس طرح غزہ کی سرحد پر پہنچ کر پیش قدمی کرنی ہے؟

جلالت نے کہا۔ ''سوری۔ میں پیش قدمی نہیں کروں گا۔ جب تک دشمن ہمارے علاقے میں نہیں آئیں گے' تب تک ان پر گولی نہیں چلاؤں گا۔''

ایک آرمی افسر نے غصے سے کہا۔ ''واٹ نان سنس؟ کیا وہ ہمارے علاقے میں گھس آئیں گے' ہم پر گولیاں چلائیں گے' ہمیں موت کے گھاٹ اتاریں گے تب تم ان پر گولیاں چلاؤ گے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جب وہ گولیاں چلاتے ہوئے

داخل ہوں گے تو میں ضرور جوابا گولیاں چلاؤں گا۔ لیکن گولیاں چلانے کے لیے ان کی سرحد میں نہیں جاؤں گا۔"

وہ میجر ہارپر کے ساتھ رات کے دس بجے وہاں سے روانہ ہوا۔ ایک درجن گاڑیوں میں مسلح فوجی تھے۔ فاضل اسلحہ بھی تھا۔ وہ پوری تیاریوں کے ساتھ بارڈر لائن پر پہنچے۔ وہاں خاموشی اور گہری تاریکی تھی۔ ان کے پاس اینٹی ڈارک لینسس تھے۔ وہ اندھیرے میں دور تک دیکھ سکتے تھے۔ اپنی پلاننگ کے مطابق دائیں بائیں پھیل گئے تھے۔ میجر ہارپر درمیان میں تھا۔ اس نے جلالت سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جلالت مقابلے پر آنے والے کتنے فلسطینیوں کو گولی مارے گا؟ مارے گا بھی یا نہیں؟

فلسطینی مجاہدین اپنی سرحدی لائن میں ہوں گے۔ اسرائیلی زمین پر نہیں تھے۔ کسی کو مشتعل کیا جائے، تب ہی وہ بھڑ کتا ہے۔ میجر ہارپر نے دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ منی ٹائم بم پھینکے جائیں۔

یہ منی بم سائز میں دو انچ کے ہوتے تھے۔ ان میں جو ٹائم فکس کیا جاتا تھا، وہ ٹھیک اسی وقت بلاسٹ ہوتے تھے۔ اس ایک ننھے سے بم کے ذریعے تباہی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ایک یا دو دشمن ضرور مارے جاتے تھے۔

دو سپاہیوں نے میجر کے حکم کے مطابق ٹائم فکس کرکے دو بم سرحد پار پھینکے۔ مجاہد مستعد رہا کرتے تھے۔ ان بموں کے بلاسٹ ہوتے ہی انہوں نے سمجھ لیا کہ دوسری طرف سے اشتعال انگیزی ہو رہی ہے۔ وہ زمین پر لیٹ کر رینگتے ہوئے سرحدی لائن پر آگئے۔

انہوں نے اپنے آگے مصنوعی جھاڑیاں بنا رکھی تھیں۔ ان جھاڑیوں کو آگے بڑھانے کے بعد خود آگے رینگتے جاتے تھے۔ ایسے وقت دو سپاہی اور ان کا ایک جونیئر آفیسر ڈارک لینس لگائے دور تک دیکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک درخت کے پیچھے تھا۔ آگے کی طرف جھک کر دیکھ رہا تھا۔ ایک گولی سیدھی اس کی پیشانی پر آکر لگی۔ حلق سے بس ایک کراہ نکلی۔ پھر وہ بولنے کے قابل نہ رہا۔

دو جھاڑیوں کے پیچھے تھے، انہیں اچھی طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آخری بار دیکھنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے تو تڑاتڑ کی آوازوں کے ساتھ ہی چیخیں مارتے ہوئے موت کے اندھیروں میں گم ہو گئے۔ اسرائیلیوں نے جوابی فائرنگ کی۔ بڑی دیر تک رات کا سناٹا گونجتا رہا۔ مگر وہ کس پر فائر کر رہے تھے؟

سامنے جھاڑیاں تھیں۔ مجاہدین ان کے پیچھے سے رینگتے ہوئے دور چلے گئے تھے۔ انہوں نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ دشمن صرف ساٹھ یا ستر گز تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اب وہ ان کے دائیں بائیں جا رہے تھے۔

جلالت اسرار دوسروں کی طرح زمین پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ مجاہدین اندھیرے میں اسے نہیں پہچانیں گے۔ گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ لہٰذا وہ اپنی سلامتی کے سلسلے میں بھی محتاط تھا۔

میجر ہارپر اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ زمین پر اوندھے منہ پڑا زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ باغی کہاں مر گئے ہیں؟ انہوں نے جوابی فائرنگ نہیں کی ہے اور ہماری فائرنگ سے کسی کے چیخنے یا کراہنے کی آواز بھی نہیں آئی ہے۔"

اچانک ہی ان کے دائیں بائیں سے فائرنگ ہونے لگی۔ کئی سپاہیوں کی چیخیں سنائی دیں۔ پیچھے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے بھاگنے کے دوران فائرنگ کی۔ دو چار مجاہدین نشانے پر آگئے۔

جلالت نے بھاگنے کے دوران میجر کے قریب ہو کر کہا۔ "یہ میرا یا تمہارا آخری وقت ہوسکتا ہے۔ تمہارے ایک اعلیٰ افسر نے کہا تھا، تم یہودیوں کی نظروں میں مسلمان ہونا ایک گالی ہے۔"

وہ اس کے ساتھ دوڑتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ "کلمہ کبھی بھلایا نہیں جاتا۔ گالی مٹا دی جاتی ہے۔ چلو مٹ جاؤ۔"

جلالت نے اس کی پشت پر دو گولیاں ماریں۔ ہر سمت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایسے وقت یہ سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ کس نے کس پر گولی چلائی ہے؟ وہ چیخ مار کر گرا پھر ہمیشہ کے لیے چیخنا بھول گیا۔

جلالت نے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو آواز دی۔ "میجر کو گولیاں لگی ہیں۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ۔"

تین سپاہی دوڑتے ہوئے آئے ان میں سے دو نے اس لاش کے دو ہاتھ پکڑے۔ تیسرے نے ٹانگیں پکڑیں۔ پھر اسے اٹھا کر دوڑنے لگے۔ وہ میدان نہیں چھوڑ رہے تھے۔ فلسطینیوں کے حصار سے نکلتے ہی رک گئے۔

دوسرا افسر گائڈ کر رہا تھا۔ وہ تمام سپاہی دائیں بائیں پھیلتے ہوئے فائرنگ کرنے لگے۔ مجاہدین انہیں دور تک رگیدتے ہوئے ان کی زمین پر آگئے تھے۔ لہٰذا جوابی فائرنگ کرتے ہوئے اپنی سرحد کی طرف واپس جانے لگے۔

ایک طرح سے اب وہ مجاہدین کو رگید رہے تھے۔ وہ تعداد میں کم تھے۔ ان کی تعداد اور کم ہو رہی تھی۔ اسرائیلی

فوجی خاصی تعداد میں ہلاک ہوئے تھے۔ جلالت اسرار تاریکی سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ زمین پر رینگتا ہوا سپاہیوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ ایک ایک، دو دو کرکے ان کی تعداد کم کر رہا تھا۔

مجاہدین اپنی سرحد میں واپس آگئے تھے۔ لیکن اسرائیلی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اس لیے جھنجلا رہے تھے کہ ان کے سپاہی خاصی تعداد میں مر چکے تھے۔ وہ حساب برابر کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مجاہدین کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر نقصان اٹھا رہے تھے۔ وہاں دیگر تنظیموں کے مجاہدین آگئے تھے۔ اب وہ بھاری پڑ رہے تھے۔

ایسے ہی وقت جلالت نے بہت قریب سے اپنی پارٹی کے ایک لیڈر غالی ارتضیٰ کو دیکھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پاس زخمی حالت میں تھا۔ وہاں سے رینگتا ہوا دور جانا چاہتا تھا۔ لیکن فوجی افسر نے سامنے آکر گن تان لی۔ پھر کہا۔ "تم غالی ہو۔ ہم نے آج بہت نقصان اٹھایا ہے۔ مگر منافع میں تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔ کم آن... جانوروں کی طرح رینگتے ہوئے میرے آگے آگے چلو۔"

غالی نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ اس کی گن خالی ہوچکی تھی۔ ایک بھرا ہوا ریوالور کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کرتا تو مارا جاتا۔ یوں بھی قیدی بن کر ذلتیں اٹھانے کے بعد مرنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنی سلامتی کی خاطر آخری کوششیں کرتا۔

جلالت چھپا ہوا دیکھ رہا تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا لیڈر جان پر کھیل جانے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی اس نے فوجی افسر کو گولی مار دی۔ غالی نے ریوالور اٹھا لیا۔ حیرانی سے اندھیرے میں دیکھنے کی کوششیں کرنے لگا کہ کس نے اس دشمن سے نجات دلائی ہے؟

جلالت نے آواز اور لہجہ بدل کر کہا۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً یہاں سے جاؤ۔ ان کے دو افسران مارے گئے ہیں۔ یہ واپس جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

غالی رینگتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ جلالت اس افسر کی لاش کو اٹھا کر کاندھے پر لاد کر دوڑتا ہوا سپاہیوں کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "یہ ہمارا دوسرا افسر بھی مارا گیا ہے۔ اب ہمیں کمانڈ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

اس نے لاش کو زمین پر ڈال دیا۔ دوسرے سپاہی اسے اٹھا کر لے جانے لگے۔ واقعی وہ کسی کمانڈر یا جونیئر افسر کے بغیر جنگ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر یہ دیکھ رہے تھے کہ مجاہدین کی تعداد اچانک بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا تمام سپاہی احتیاطاً فائرنگ کرتے ہوئے فلسطینی زمین سے باہر آگئے۔ گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس جانے لگے۔

انہوں نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر حساب لگایا۔ ان کے اٹھارہ سپاہی اور دو افسران مارے گئے تھے۔ جلالت نے دل ہی دل میں حساب کیا۔ اس نے دو افسران اور آٹھ سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر دل ہی دل میں کہا۔ "یا اللہ! مجھے معاف فرما۔ یہ یہودی بے حد و حساب قوتوں کے مالک ہیں۔ ان سے لڑنے کے لیے مجھے یہ ہتھیار مل گیا ہے۔ میں عارضی طور پر اپنے دین سے دور ہو کر یہودی بن گیا ہوں۔ لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا بن گیا ہوں۔ آئندہ بھی یہودی بن کر ان کے چودہ طبق روشن کرتا رہوں گا۔"

اس کے پاس دو منی ٹائم بم تھے۔ جو چیزیں اس نے استعمال نہیں کی تھیں، انہیں ہیڈ کوارٹر میں جمع کرنا تھا اور وہ ایک ٹائم بم کسی ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

اس نے ایک مردہ سپاہی کی جیب سے ضرورت کی یہ چیز حاصل کی تھی۔ پھر اسے اپنے سر پر رکھ کر بالوں کے درمیان ایک ٹیپ سے چپکا لیا تھا۔ اس کے بال گھنے اور لانبے تھے۔ وہ منی ٹائم بم کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔

اس نے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ کر تمام ہتھیار اور دو منی ٹائم بم اس رپورٹ کے ساتھ جمع کردیے کہ انہیں استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے وردی بھی اتار دی۔ اپنا لباس پہن کر نگرانی کرنے والے افسران اور سپاہیوں کے ساتھ اپنی رہائش گاہ میں واپس آگیا۔

☆☆☆

پچھلی تمام رات گولیوں کی گونج میں اور بم کے دھماکوں میں گزری تھی۔ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو کر آیا تھا۔ صبح سے شام تک گہری نیند سوتا رہا۔ شام کو آنکھ کھلی تو اپنے متعلق سوچنے لگا۔ "کیا واقعی میں ہیکل کا سورما ہوں؟ دوسرے سورماؤں کے متعلق یہ پیشگوئی ہے کہ وہ سب عجیب و غریب انداز میں نمودار ہوتے رہیں گے۔ آخری بارہواں سورما سب سے اہم ہے۔ وہی گیارہ سورماؤں کو بتائے گا کہ تابوتِ سکینہ کہاں ہے؟"

جلالت چاروں شانے چت لیٹا چھت کو تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ "پتا نہیں وہ آخری سورما کب نمودار ہوگا؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ ملحقہ ڈائننگ روم میں کھانا لگایا جا رہا تھا۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی دھن پر پانچ کنیزیں رقص کر رہی تھیں۔ ان میں سے چار جانی پہچانی تھیں۔ ایک نئی تھی۔ ایک کنیز سے اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ مونیکا ہے۔ سترہ برس کی ہے۔''

دوسری کنیز نے کہا۔ ''یہ اَن ٹچڈ ہے۔ پہلے تمہارے پاس آئی ہے۔''

تیسری کنیز نے کہا۔ ''دیکھ رہے ہو' کتنی حسین و جمیل ہے۔ ہمیں تو بھلا دیتے ہو۔ اسے کبھی بھلا نہیں پاؤ گے۔''

چوتھی بھی کچھ بولنا چاہتی تھی۔ جلالت نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''بس ...... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جاؤ یہاں سے۔ صرف مونیکا رہے گی۔''

وہ چاروں مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ جلالت کھانے کی میز پر آگیا۔ مونیکا اس کی پسند کے مطابق ڈشیں اٹھا کر پیش کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''یہاں بیٹھو۔ میرے ساتھ کھاتی رہو اور بولتی رہو۔''

وہ اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اپنے بارے میں کہنے لگی۔ ''میں نہیں جانتی' میرے ماں باپ کون ہیں؟ میری پرورش ایک ایسے ٹریننگ سینٹر میں ہوئی ہے' جہاں غیر ملکی حکمرانوں کی میزبانی کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ انہیں خوش کرنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔''

وہ کھانے کے دوران بولتی رہی۔ اس سے بے تکلف ہوتی رہی۔ رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ وہ کھانے کے بعد ٹیرس پر آکر ٹہلنے لگے۔ اس رنگ محل کے باہر بہت اونچی خاردار چار دیواری تھی۔ احاطے کے اندر اور باہر مسلح گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ وہاں کوئی بڑا سرکاری عہدیدار بھی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔

وہ دونوں کھلے آسمان کے نیچے ٹہلتے رہے اور ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے رہے۔ پھر جلالت نے کہا۔ ''میں جوس پینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم سونے جائیں گے۔''

وہ جوس تیار کرنے کے لیے نیچے چلی گئی۔ جلالت اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ وہ کچھ پراسرار سی لگ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس اسے محتاط رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر ٹیرس سے اتر کر کمرے میں آگیا۔

وہ ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سامنے ایک تپائی پر جوس سے بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔ وہ دوسری کرسی پر آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھ گئی۔ جلالت کھانے پینے سے پہلے ہر چیز کو سونگھتا تھا یا ذرا سا چکھتا تھا۔ مونیکا نے کھانے کے دوران اسے ایسا کرتے دیکھا تھا۔ اس نے جوس کے گلاس کو اٹھا کر سونگھا۔ پھر سوچا' جوس کی مہک کے علاوہ ایک اور ہلکی سی بو محسوس ہوئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مونیکا کو دیکھا۔

وہ ذرا پریشان ہو کر بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

اس نے گلاس کو تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے دو گھونٹ تم پیو۔''

وہ ایکدم سے سیدھی ہو کر یوں بیٹھ گئی' جیسے وہاں سے بھاگنے ہی والی ہو لیکن اس کی اجازت کے بغیر کمرے سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ جلالت نے کہا۔ ''یہ میرا حکم ہے' گلاس اٹھاؤ اور پینا شروع کر دو۔''

وہ شکست خوردہ سی ہو کر بولی۔ ''پینا ہی پڑے گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ کر آئی تھی کہ تمہیں زہر دینے کے بعد شاید ہی یہاں سے زندہ جا سکوں گی۔ باہر سیکیورٹی والے مجھے مار ڈالیں گے۔''

اس نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم جان پر کھیل کر مجھے زہر دینے کیوں آئی ہو؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ گلاس کو اٹھا لیا۔ جلالت نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ پھر گلاس لے کر تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میری بات کا جواب دو۔ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ تم میری جان کیوں لینا چاہتی ہو؟''

وہ اچانک ہی حقارت سے بولی۔ ''میں یہودیوں کو زمین کا بوجھ سمجھتی ہوں۔ اب تک چار کو مار چکی ہوں۔ کہیں تو مجھے پھنسنا ہی تھا۔ یہاں آکر پھنس گئی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تعجب ہے۔ تم یہودی ہو کر یہودیوں سے نفرت کرتی ہو؟''

''میں یہودی نہیں ہوں۔ الحمدللہ مسلمان ہوں۔''

یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ جلالت نے بے یقینی سے مگر ذرا اپنایت سے اسے دیکھا۔ ''تم ... تم مسلمان ہو؟ میں کیسے یقین کروں؟''

''تمہارے یقین نہ کرنے سے مجھے کیا فرق پڑے گا؟ مجھے تو ابھی مرنا ہی ہے۔''

''اگر جھوٹ نہیں بولو گی۔ اپنی حقیقت بیان کرو گی تو تمہاری موت ٹل جائے گی۔''

اس نے بھرپور نظروں سے جلالت کو دیکھا پھر کہا۔

''سچ یہ ہے کہ میں ایک عرب مہاجر ڈاکٹر رشیدہ کی بیٹی ہوں۔ جب ہم ہجرت کر کے یہاں آئے تو میں دس برس کی تھی۔ عبرانی زبان اچھی طرح لکھتی پڑھتی اور بولتی تھی۔

یہ اسرائیلی چاہتے ہیں' یہاں زیادہ سے زیادہ یہودی آکر آباد ہوں۔ میرے والد نے مجھ سے کہا کہ ہمیں یہودی بن کر رہنا چاہیے۔

یہ بات سراسر ہمارے دینی جذبات کے خلاف تھی۔ میرے والد نے مجھے سمجھایا کہ وہ بوڑھے اور بیمار ہیں .... زندگی کسی وقت بھی رخصت ہو سکتی ہے۔ میں دس برس کی مہاجر لڑکی ہوں۔ کوئی میرا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ لوگ مجھے بازار میں لے جا کر بٹھا دیں گے۔

یہاں یہودی مہاجروں کو روٹی کمانے کے وسائل' رہنے کے لیے مکان اور بڑی بڑی رقمیں دی جا رہی تھیں۔ میں باپ کے کہنے پر یہودی بن گئی۔ ہمیں سرکاری طور پر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ میرے والد کے انتقال کے بعد مجھے ایک سرکاری ٹریننگ سینٹر میں پہنچایا گیا۔ وہاں میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہودیوں کے نظریے کے مطابق مجھ میں سیاسی شعور پیدا کیا گیا۔ مجھے جاسوسہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ پھر غیر ملکی حکمرانوں کو خوش کرنے کے ہتھکنڈے بھی سکھائے گئے۔''

جلالت نے کہا۔ ''تم ضرورتاً یہودی بن گئیں۔ نہ دین کی رہیں نہ دنیا کی۔ پھر ابھی خود کو مسلمان کیوں کہہ رہی ہو؟''

''یہی بتانے جا رہی ہوں۔ میں اٹھارہ برس کی ہوگئی۔ ایک امریکی عہدیدار اسرائیلی حکمرانوں کی اہم ضرورتیں پوری کرنے یہاں آیا تھا۔ مجھے میزبانی کے لیے اس کے حوالے کر دیا گیا۔

اس وقت مجھے اپنے والد کی باتیں یاد آئیں۔ انہوں نے کہا تھا' میں ایک مسلمان مہاجر لڑکی ہوں۔ کوئی مجھ سے ہمدردی نہیں کرے گا۔ لوگ مجھے بازار میں بٹھا دیں گے۔ میں یہودی بن کر محفوظ رہوں گی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''عورت کہیں محفوظ نہیں رہتی۔ اس رات معلوم ہوا کہ میں یہودیوں کے مہذب سیاسی چکلے میں پہنچ گئی ہوں۔ اس رات میں نے پندرہ برس کی اُس مسلمان لڑکی کو دیکھا' جو اپنا دین ہار کر آبرو بھی ہار چکی تھی۔ مجھے ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ میں دوسرے دن اپنی رہائش گاہ میں آکر اس مسلمان لڑکی کی میت پر روتی رہی۔ اتنا تو ہوا کہ پہلی بار مجھے یہودیوں سے نفرت ہوگئی۔ پچھتاوا یہ تھا کہ پھر سے مسلمان بن کر نہیں رہ سکوں گی۔ توبہ کروں گی' خدا کے آگے سجدے کروں گی تو اسرائیلی آقا مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔ میری بوٹی بوٹی نوچ کر پھینک دیں گے۔''

جلالت کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''ابھی تم نے کہا تھا' چار یہودیوں کو ہلاک کر چکی ہو۔ تم نے تنہا ایسی واردات کیسے کی ہوگی؟''

''میں کچھ نہیں بولوں گی۔ یہ زہریلا جوس پی کر مر جاؤں گی یا تم مجھے کتوں کے حوالے کر دو۔ وہ مجھے اذیتیں دے دے کر مار ڈالیں گے۔''

جلالت نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر جوس سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ٹوائلٹ میں آئی۔ جلالت نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کموڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو۔ اسے پھینک دو۔''

اس نے چونک کر مہربان ہونے والے کو دیکھا۔ پھر کموڈ کے پاس جا کر تمام جوس وہاں انڈیل دیا۔ فلش کر کے اسے بہا دیا۔ وہ جاتے ہوئے بولا۔ ''گلاس کو اچھی طرح دھو کر کمرے میں آؤ۔''

وہ دروازہ کھول کر وہاں سے آگیا۔ وہ پہلی بار اس رنگ محل میں آیا تھا تو اس کے کمرے میں خفیہ مائک اور کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ اس کی باتیں دوسرے کمرے میں سنی جاتی تھیں اور ٹی وی اسکرین پر اسے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے شدت سے اعتراض کیا تو وہ مائک اور کیمرے ہٹا دیے گئے تھے۔

اس نے باتھ روم سے کمرے میں آکر اچھی طرح ایک بار پھر ایک ایک گوشے کو اور ایک ایک سامان کو دیکھا۔ یہ اطمینان ہوا کہ کہیں بھی خفیہ مائک اور کیمرا نہیں تھا۔ وہ نگرانی کرنے والے بڑی حد تک اس پر اعتماد کرنے لگے تھے۔

وہ دھلا ہوا گلاس لے کر آئی۔ پھر اسے ایک ٹیبل پر رکھ کر اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ''میرے قریب آؤ۔''

وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے حماس کے ایک مجاہد جلالت اسرار کے بارے میں کبھی کچھ سنا ہے؟''

''ہاں۔ اس کے دلیرانہ کارناموں کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔''

"وہ جلالت اسرار میں ہی ہوں۔"

وہ ایکدم سے پیچھے ہٹ کر اسے بڑی توجہ سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "اسے تو اسرائیلی قیدی بنا کر غزہ سے یہاں لے آئے تھے۔ اب پتا نہیں کہیں چھپا کر رکھا ہے یا مار ڈالا ہے؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ ان کے معزز ربیوں نے مجھ میں کچھ ایسی نشانیاں دیکھی ہیں جو ہیکل کے سورماؤں میں بیان کی گئی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے مجھے ہیکل کا پہلا سورما مان لیا ہے۔"

"اگر تم مسلمان ہو اور جلالت اسرار ہو تو مجھے خوشی ہوگی لیکن میں ٹھوس ثبوت کے بغیر یقین نہیں کروں گی۔"

وہ اپنی شرٹ اتارتے ہوئے بولا۔ "میں نے بیشمار زخم کھائے ہیں۔ بڑے سے بڑا زخم دو چار دنوں میں بھر جاتا ہے۔ پھر جسم پر کوئی نشان نہیں رہتا۔ میرا یہ بازو دیکھو۔ یہ پیدائشی نشان ہے۔ یہ ایک ستارے کی طرح ہے۔ یہی میری پہچان ہے۔ سیکڑوں فلسطینی گواہی دیں گے کہ ایسا نشان صرف جلالت اسرار کے دائیں بازو پر ہے۔"

"جب میں یہاں سے جاؤں گی تو اپنے طور پر معلوم کروں گی۔"

"انشا اللہ تمہیں جلد ہی یقین ہوجائے گا پھر تم مجھ پر بھروسا کروگی۔"

"پھر تو میری خوشی کی انتہا نہیں ہوگی۔ لیکن جب تک مجھے یقین نہ ہوجائے تم میرے متعلق کوئی سوال نہ کرو۔ میں تم پر اعتماد کرنے کے بعد اپنے بارے میں ضرور سچ بولوں گی۔"

"میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ آئندہ جہاد کو جاری رکھنے کے لیے مجاہدین سے رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں سے جانے کے بعد کیسے رابطہ رکھوگی؟ یہاں میری فون کالز ریکارڈ کی جاتی ہیں۔"

"تمہاری حقیقت معلوم کرنے کے بعد تم سے ملنے کے لیے بے چین ہوجاؤں گی۔ کیا تمہارے پاس جو حسینائیں آکر چلی جاتی ہیں انہیں کبھی دوبارہ کال کرتے ہو؟"

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "ایک حسینہ ایسی تھی جسے دوبارہ طلب کیا تھا۔"

"اگر میں دوبارہ یہاں آسکتی ہوں تو مجھے کل صبح جانے دو۔ پھر کل رات طلب کرو۔ میں ایک دن میں جلالت اسرار کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرلوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ کل صبح چلی جاؤ۔"

وہ قریب آکر بیٹھ گئی۔ جلالت نے کہا۔ "تم نے ابھی کہا تھا کہ عبرانی زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتی ہو؟"

"ہاں۔ جانتی ہوں۔"

"میں قدیم عبرانی زبان جانتا ہوں۔ اس زبان کے بیشتر الفاظ اور گرامر اب تبدیل ہوچکے ہیں۔ کل رات تم یہاں آؤگی تو میں تمہیں وہ تمام الفاظ اور گرامر یاد کراؤں گا۔"

"کیا ایک ہی رات میں یاد کرسکوں گی؟"

"میں تمہیں دو چار راتوں تک رکھوں گا۔ یہ ظاہر کروں گا کہ تم نے مجھے دیوانہ بنادیا ہے۔"

"کیا اس قدیم زبان سے ہم کوئی فائدہ اٹھاسکیں گے؟"

"ہاں۔ ابھی یہ تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے کہ تم اپنے فون کی سم بدل کر ہیکل کا دوسرا سورما بن کر قدیم عبرانی زبان میں میسج دوگی۔ ہم یہ شوشا چھوڑیں گے کہ دوسرا سورما کہیں ہے اور پہلے سورما کو تلاش کررہا ہے۔ اندازہ کرو کہ یہودی قوم اور تمام ربی کس طرح میرے اور عقیدت مند ہوجائیں گے۔ تب میں ان سے مطالبہ کروں گا کہ مجھے پابندیوں میں نہ رکھا جائے۔ نگر نگر جاکر دوسرے سورما کو تلاش کرنے دیا جائے۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "اس طرح تو تمہیں بہت کچھ کرنے کے مواقع ملیں گے۔ بہت اچھی تدبیر ہے۔"

وہ سر جھکا کر اپنی نوزائدہ تدبیر پر ہر پہلو سے غور کرنے لگا۔ اس کے فون پر قدیم عبرانی زبان میں میسج آئے گا تو تمام ربی اور دیگر یہودی پیشوا یہی کہیں گے کہ ہزاروں برس پہلے کی یہ زبان آج کے چند بڑے یہودی علما جانتے ہیں یا پھر ہیکل کے سورما جانتے ہوں گے۔

لہٰذا میسج دینے والا یقیناً ہیکل کا دوسرا سورما ہے اور وہ پہلے سورما کو ڈھونڈ رہا ہے۔ یوں جلالت سے تمام ربیوں کی عقیدت اور بڑھ جائے گی۔ وہ اس کا مطالبہ تسلیم کریں گے۔ اسے بڑی حد تک آزادی دیں گے۔

اگر ایسا ہوگا تو جلالت کو دشمن کے خلاف محاذ آرائی کی بڑی سہولتیں حاصل ہوں گی اور محاذ آرائی میں مونیکا اور اس کے ساتھی جی جان سے ساتھ دیں گے۔

☆☆☆

غالب ارتضٰی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہوچکی تھی۔ اس کے آس پاس پارٹی کے تمام بڑے رہنما موجود تھے۔ غالب انہیں بتا رہا تھا کہ پچھلی رات بارڈر لائن پر ایک نادیدہ فرشتے نے اس کی مدد کی تھی۔

سب ہی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہورہا تھا کہ وہ نادیدہ فرشتہ کون تھا؟ ایک رہنما عمر محمود نے کہا۔ "وہ کوئی بھی

تھا، یہ بات اس چار دیواری سے باہر نہ جائے۔ ورنہ اسرائیلی آرمی تک یہ بات پہنچے گی تو وہ اپنے درمیان چھپے ہوئے اس مجاہد کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ پھر اس تنہا جہاد کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ وہ اُس نامعلوم مجاہد کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔ وہ تمام لیڈر وہاں غالب کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے اور عیادت کرنے آئے تھے۔ ویسے کبھی ایک چھت کے نیچے یکجا ہونے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ دشمن انہیں گھیر کر آسانی سے ہلاک کرسکتے تھے۔

ایسے وقت عمر محمود نے فون پر میسج پڑھا۔ وہ میسج کوڈ ورڈز میں تھا۔ عمر نے سمجھ لیا کہ مونیکا اس سے مخاطب ہے۔ اس نے پوچھا تھا۔ "کیا جلالت اسرار اسرائیلی قید میں زندہ ہے؟"

عمر نے جواب دیا۔ "خدا کرے، وہ زندہ ہو۔ ہم سب اس کے لیے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔"

مونیکا نے پوچھا۔ "اس کی کوئی اہم شناخت بتاؤ اگر وہ زندہ ہے تو ہم اسے کیسے پہچانیں گے؟"

"اس کے دائیں بازو پر ایک پیدائشی نشان ہے۔ وہ نشان ایک ستارے کے مانند ہے۔"

"شکریہ۔ ہم اسے تلاش کریں گے۔"

مونیکا نے رابطہ ختم کردیا۔ یہ نہیں بتایا کہ وہ جلالت اسرار سے مل چکی ہے اور پھر ایک بار ملنے والی ہے۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ ہیکل کا سورما کہلانے والا یہودی ایک مسلمان مجاہد ہے، جو یہودیوں کے رنگ میں رنگنے کے باوجود ایک فلسطینی مجاہد ہے اور اس نے اپنے طور پر جہاد کو جاری رکھا ہوا ہے۔

مونیکا اپنی رُوداد جلالت اسرار کو سنا چکی تھی۔ وہ پیدائشی مسلمان تھی۔ باپ کے کہنے پر دس برس کی بچی یہودی بن گئی تھی۔ لیکن جوانی میں یہودیوں کی طرف سے اسے دھچکا لگا تھا۔ وہ بکاؤ مال بن کر ذہنی اذیتوں میں مبتلا رہی۔ ایسے وقت ایک مسلمان اس کی زندگی میں آگیا۔

وہ ایک چھوٹے سے سرکاری بنگلے میں تنہا رہتی تھی۔ ایک رات ایک فلسطینی مجاہد بنگلے میں گھس آیا۔ اس نے مونیکا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر دھمکی دی۔ "خبردار! شور مچاؤ گی تو اس سے پہلے ہی گولی ماردوں گا۔"

اس نے کہا۔ "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ شور نہیں مچاؤں گی۔ ویسے تم ہو کون؟"

وہ بولا۔ "یہودی مجھے باغی سمجھتے ہیں اور مسلمان مجھے فلسطینی مجاہد کہتے ہیں۔ تم جو چاہو سمجھ لو۔ وہ میرے پیچھے لگے ہیں۔"

"پھر تو وہ یہاں ضرور آئیں گے۔ اپنی گن ہٹاؤ، مجھ پر بھروسا کرو۔ میں تمہیں کسی طرح چھپانے کی کوشش کروں گی۔"

"میں تم پر کیسے بھروسا کروں؟"

"بھروسا تو کرنا ہی ہوگا۔ مارنے کے بعد یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکوگے۔ بہتر ہے اللہ توکل مجھ پر اعتماد کرو۔"

اس مجاہد کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے مجبوراً بھروسا کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ مونیکا نے باتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھول کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "ہم پولیس اور انٹیلی جنس والے ہیں۔ ایک باغی ادھر آیا ہے۔ دروازہ کھولو۔"

وہ ایک بڑا سا تولیا لپیٹ کر باتھ روم سے باہر آئی۔ بدن کا بہت کم حصہ چھپا ہوا تھا۔ باقی تمام حصوں پر صابن لگا تھا۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "میں دروازے اندر سے لاکڈ رکھتی ہوں۔ بھلا یہاں کون آسکتا ہے؟"

وہ بولتی ہوئی پھر باتھ روم میں چلی گئی۔ ایک افسر نے کہا۔ "وہ چھت کے راستے آسکتا ہے۔ ہمیں اپنی تسلی کرنے دو۔"

وہ دروازے کے پیچھے چھپ کر انہیں دیکھنے لگی۔ چار سپاہی چھت کے اوپر گئے۔ تین سپاہی کمروں میں، الماری کے پیچھے اور بیڈ کے نیچے اسے ڈھونڈنے لگے۔ افسر نے مایوس ہوکر سپاہیوں سے کہا۔ "وہ آس پاس کے کسی بنگلے میں ہوگا۔ چلو یہاں سے۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے باہر جانے لگے۔ افسر نے کہا۔ "میڈم! دروازہ اندر سے بند کرلو۔ چھت کا دروازہ ہم نے بند کردیا ہے۔ وہ ادھر نہیں آسکے گا۔"

وہ اسی طرح تولیا لپیٹے باہر آئی۔ پھر بیرونی دروازے کو اندر سے لاک کرکے باتھ روم میں آگئی۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "وہ جاچکے ہیں۔ اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، تم ایسی تدبیر سے مجھے چھپاؤ گی۔ کسی نے تم پر شبہ نہیں کیا۔"

"عورت چاہے تو آنکھوں کے سامنے سے پہاڑ اوجھل کردے تم تو ایک انسان ہو۔"

مونیکا کو جانباز ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا۔ "میرا نام مونیکا ہے۔ اور خدا مجھ گناہ گار کو معاف کرے۔ میں مسلمان ہوں۔"

"میرا نام ابوالخیر ہے۔ تم مسلمان ہو۔ پھر یہودی بن

کر کیوں رہتی ہو؟''

وہ اپنی روداد سنانے لگی۔ ''جب پہلی بار مجھے ایک غیر مسلم مہمان کی خوابگاہ میں جانے کا حکم دیا گیا تو میں چپ رہی۔ لیکن اندر سے سلگتی رہی۔ کچھ عرصے بعد ایک امریکی اعلیٰ عہدیدار کو خوش کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ عہدیدار اتنا اہم تھا' جیسے یہودیوں کا مائی باپ ہو۔ اس کے اطراف سیکیورٹی بہت سخت تھی۔ اس کی خوابگاہ میں جانے سے پہلے میری بھی سر سے پاؤں تک تلاشی لی گئی تھی۔ لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''تم خالی ہاتھ گئی تھیں۔ اسے ہلاک نہیں کر سکتی تھیں۔''

''میں نے اسے اسی وقت ہلاک نہیں کیا۔ سلیو پوائزن دیا۔ صبح وہاں سے واپس آئی تو وہ زہر رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھانے لگا۔ شام تک اس کا طبی معائنہ ہوتا رہا۔ زہر کے توڑ کی دوائیں دی گئیں۔ امریکا سے ڈاکٹر بلائے گئے لیکن دوسرے دن وہ مر گیا۔

اسرائیل سے امریکا تک کھلبلی مچ گئی۔ انتہائی شاطر قسم کے جاسوسوں نے مجھے حراست میں لے کر معلوم کرنا چاہا کہ میں نے اسے کیسے زہر دیا تھا؟

میں نے کہا' یہاں سیکیورٹی گواہ ہے کہ میرے پاس زہر کی شیشی یا پڑیا جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ لیڈی گارڈز نے میرے لباس کے اندر تلاشی لی تھی۔ آپ حضرات میرے پیچھے نہ پڑیں۔ وہاں شراب اور کھانے پینے کی چیزیں لائی گئی تھیں۔ وہ جہاں سے لائی گئی تھیں' وہاں جا کر انکوائری کریں۔

میں بچپن سے سرکاری انکوائری سینٹر میں تربیت حاصل کرنے والی ایک یہودی لڑکی سمجھی جاتی ہوں اور قابل اعتماد ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر چکی ہوں۔ بڑے سخت محاسبے کے بعد میری جان چھوٹ گئی۔''

ابوالخیر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''مگر تم نے اسے کیسے ہلاک کیا جبکہ اس کی خوابگاہ میں زہر لے کر نہیں گئی تھیں؟''

وہ اپنی انگلیاں دکھاتے ہوئے بولی۔ ''لے گئی تھی۔ یہ عورتوں کا فیشن ہے۔ یہ لانبے ناخن کس دن کام آتے ہیں؟ میں ایک ناخن میں زہریلا سفوف بھر کر لے گئی تھی۔''

ابوالخیر کے دیدے حیرانی سے پھیل گئے۔ اس نے پوچھا۔ ''تم کیا چیز ہو؟''

''ابھی تو کچھ نہیں ہوں۔ آئندہ یہودیوں کے لیے عذاب بن جانا چاہتی ہوں۔ یہ بتاؤ' تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

''تم میرے ساتھ چلو۔ ہمارا ایک گروہ ہے۔ اسرائیلی فلسطینیوں کی تعداد کم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اسرائیلیوں کی تعداد کم کرتے رہتے ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی تو کہیں چھپ کر نہیں رہ سکوں گی۔ بو سونگھنے والے کتے مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ میں نے اچھی طرح ان کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ مجھے یہیں رہنا چاہیے۔ ہمارے درمیان خفیہ طور پر رابطہ رہے گا۔ میں تمہیں بتاتی رہوں گی کہ غیر ملکی عہدیدار یہاں کب آتے ہیں؟ تربیت یافتہ لڑکیوں میں کون ان کی میزبانی کرنے لی ہے اور ان مہمانوں کے اطراف کس طرح سیکیورٹی کے اقدامات کیے گئے ہیں؟''

''اگر تم اس طرح کی معلومات فراہم کرتی رہو گی تو ہم جان پر کھیل کر بڑے بڑے سرکاری عہدیداروں کو نشانہ بناتے رہیں گے۔''

پہلے وہ تنہا تھی۔ ابوالخیر سے دوستی ہوتے ہی خفیہ راستے کے ذریعے اور کئی مجاہدین سے دوستی ہو گئی۔ وہ بھیس بدل بدل کر رابطہ کرتی رہتی تھی۔ اس نے ایک برس کے اندر مجاہدین کے تعاون سے تین مزید غیر ملکی مہمانوں اور سرکاری عہدیداروں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ یوں اس کا نام اور اس کے کارنامے پارٹی کے رہنماؤں تک پہنچے تھے۔ ان سے بھی خفیہ رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

وہ جلالت اسرار کی خوابگاہ میں جانے سے پہلے ابوالخیر کو اطلاع دے چکی تھی۔ یہ کہہ چکی تھی کہ وہ اسرائیلیوں کے سب سے بڑے مہرے ہیکل کے سورما کو ہلاک کرنے جا رہی ہے۔ زندہ واپس لوٹنے کی امید کم ہے۔ لیکن وہ ناکام نہیں ہوگی۔ اسے مار کر ہی مرے گی۔

اس نے جو سوچا بھی نہیں تھا' وہ پیش آیا۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہیکل کا سورما نہیں ہے۔ بلکہ ایک جانباز معروف مجاہد جلالت اسرار ہے۔ پارٹی کے ایک رہنما نے تصدیق کی تھی کہ اس کے دائیں بازو پر پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہے۔ پیدائشی نشان کی تصدیق ہوتے ہی وہ جلالت تک پہنچنے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔

☆☆☆

جلالت اسرار نے رنگ محل کے نگراں افسران سے کہا۔ ''مونیکا میرے دل کو بھا گئی ہے۔ اسے آج بھی پیش کیا جائے۔ جب تک اس سے دل نہیں بھرے گا' یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔''

اس کی فرمائش پر دوسری رات مونیکا خوابگاہ میں

ہی۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے پورے کمرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں جو بولنا چاہتی ہوں' بول سکتی ہوں؟''

جلالت نے کہا۔ ''میں اطمینان حاصل کر چکا ہوں۔ یہاں خفیہ مائک اور کیمرے نہیں ہیں۔''

وہ تیزی سے قریب آ کر رک گئی۔ پھر بولی۔ ''میں بہت خوش نصیب ہوں۔ ایک ایسے عظیم مجاہد سے دوسری بار مل رہی ہوں جس کے لیے تمام فلسطینی فکر مند ہو کر سوچ رہے ہیں کہ وہ زندہ ہے یا اسرائیلی درندوں نے اسے شہید کر دیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اللہ سلامتی دینے والا ہے۔ مجھے اپنے معبود سے سلامتی مل رہی ہے۔ آؤ بیٹھو مجھے بتاؤ' تم نے کیسے تصدیق کی ہے کہ میں ہی جلالت اسرار ہوں؟''

''میں پارٹی کے رہنماؤں سے رابطہ رکھتی ہوں۔ ان کے ایک رہنما عمر محمود نے تمہارے پیدائشی نشان کی تصدیق کی ہے۔''

''کیا تم نے میرے متعلق انہیں کچھ بتایا ہے؟''

''میں نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی ہے۔''

''شاباش! اب اپنے متعلق مزید کچھ بتاؤ؟''

وہ بتانے لگی کہ کس طرح ابوالخیر نامی ایک مجاہد سے ملاقات ہوئی تھی پھر اس کے ذریعے ایسے مجاہدین سے رابطے ہونے لگے جو اسرائیلی شہروں میں یہودی اور عیسائی بن کر رہتے ہیں اور فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کا انتقام یہودی سرمایہ داروں اور سرکاری عہدیداروں سے لیتے رہتے ہیں۔

جلالت نے کہا۔ ''تم یہاں کئی راتیں گزار سکو گی۔ میں تمہیں قدیم عبرانی زبان کے مطلوب' الفاظ اور گرامر یاد کراؤں گا۔ میری پلاننگ کے مطابق یہاں سے جا کر اس زبان میں میسج دیا کرو گی۔ میسج کے ذریعے باتیں کیا ہوں گی' یہ بھی تمہیں سمجھاؤں گا۔''

وہ اس سے قدیم عبرانی زبان سیکھنے لگی۔ کم سے کم وقت میں بہت کچھ سیکھنا تھا۔ وہ بہت ذہین تھی۔ کمال کی یادداشت رکھتی تھی۔ جو سنتی' پڑھتی تھی' اسے فوراً ذہن نشین کر لیتی تھی۔ اس نے چار راتوں میں بڑی حد تک وہ زبان سیکھ لی۔ وہ دن کو واپس جا کر اپنے بنگلے میں بھی تمام سبق دہراتی رہتی تھی۔

پانچویں رات جلالت نے کہا۔ ''میں مطمئن ہوں۔ ایک تو تم پہلے سے عبرانی زبان اچھی طرح جانتی تھیں۔ اب

انمول موتی

☆زبان کی حفاظت دولت سے زیادہ مشکل ہے۔

☆غریب لوگوں پر احسان کرو کیونکہ غریب ہونے میں وقت نہیں لگتا۔

☆اگر عبادت نہیں کر سکتے تو گناہ بھی نہ کرو۔

☆دنیا یہ نہیں دیکھتی کہ تم پہلے کیا تھے بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ تم اب کیا ہو۔

☆جہاں اپنی بات کی قدر نہ ہو وہاں چپ رہنا بہتر ہے۔

مرسلہ: عدنان یوسف، بنوں

تم نے بڑی حد تک یہ قدیم زبان بھی سیکھ لی ہے۔ میں مطمئن ہوں۔ تم میری پلاننگ کے مطابق یہ زبان استعمال کر سکو گی۔ اب کل سے نہیں آؤ گی۔''

اس نے کہا۔ ''فی الحال فون سے بھی رابطہ نہیں رہے گا۔ تم صرف ہیکل کا دوسرا سورما بن کر میسج دیا کرو گی۔''

''میں دعا کروں گی کہ تمہارا یہ منصوبہ کامیاب رہے۔ تم اس چار دیواری سے باہر نکل سکو۔ تمہیں آزادی نصیب ہو۔''

جلالت نے اسے بڑی اپنائیت سے دیکھا پھر کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ میں تمہیں اپنا لینا چاہتا ہوں۔''

وہ مسرتوں سے سرشار ہو کر بولی۔ ''میں اس یقین کے ساتھ بدترین حالات سے لڑتی رہوں گی کہ انعام میں تم ملنے والے ہو۔''

جلالت نے کہا۔ ''تمہارے جانے کے بعد میں زہر کی ایک خوراک حلق سے اتاروں گا۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میرے پاس ایک ایسا زہر ہے جو ہلاک نہیں کرتا مگر ہلاکت کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ میرے جسم کا اندرونی نظام ایسا ہے کہ معمولی زہر اور اعصابی کمزوریوں کی دوائیں مجھ پر زیادہ دیر تک اثر انداز نہیں ہوتیں۔ کوئی زخم دیر پا نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑا زخم چوبیس گھنٹوں میں بھر جاتا ہے۔''

وہ سن رہی تھی۔ اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم زہر پینے کا خطرہ کیوں مول لینا چاہتے ہو؟''

"تم پر یہ الزام لگانا ضروری ہے کہ تم یہودیوں کی آستین کا سانپ ہو۔ یہودی بن کر انہیں دھوکا دے رہی ہو اور مجھ جیسے یہودی ہیکل کے سورما کو ہلاک کرنے آئی تھیں۔"

"پھر تو میں یہاں سے اپنے بنگلے میں نہیں جاؤں گی۔ سیدھی مجاہدین کی ایک پناہ گاہ میں چلی جاؤں گی۔"

"تمہیں یہی کرنا ہوگا۔ ان یہودیوں کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے درمیان دوستی اور محبت ہے اور ہم کسی منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔"

دوسری صبح جلالت اسے رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ وہ پیچھے سے آکر اچانک ہی لپٹ گئی۔ جذبوں سے لرزتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے آغوش میں نہیں لیتے ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ بس ابھی جاتے جاتے مجھے لگنے دو۔ جو جنگ لڑنے جا رہی ہوں۔ اس میں مجھے موت آسکتی ہے۔"

"خدا پر بھروسا رکھو۔ ہم ایک دوسرے کے لیے زندہ رہیں گے۔ خود کو سنبھالو۔ مجھے چاہتی ہو تو اپنی قربت سے نہ بھڑکاؤ۔ شاباش تم بہت اچھی ہو۔ اب جاؤ خدا حافظ..."

اس نے دروازے کو کھولا۔ وہ فوراً ہی الگ ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ جلالت واپس آکر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ جس منصوبے پر عمل ہونے والا تھا۔ اس کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا۔

تقریباً تین گھنٹے بعد اس نے اندازہ کیا کہ مونیکا مجاہدین کی پناہ میں پہنچ گئی ہوگی۔ تب اس نے وہ دوا نکالی جو خطرناک حد تک اعصابی کمزوری میں مبتلا کرتی تھی اور کمزور اعصاب والوں کو ہلاک کر دیتی تھی۔

اب سے پہلے بھی جب آرمی افسران اور ربیوں نے اس پر تنویمی عمل کر کے اس کا برین واش کرنا چاہا تھا تو انہوں نے جلالت کو ذہنی طور پر کمزور بنانے کے لیے یہی دوا اسے پلائی تھی۔ اس نے دوسری بار وہ تھوڑی سی دوا جوس میں ڈال کر پی لی۔ پھر بیڈ پر لیٹ کر کال بیل کا بٹن دبانے لگا۔

ایک منٹ کے اندر ہی ایک نگراں افسر دو مسلح سپاہیوں کے ساتھ دوڑتا چلا آیا۔ جلالت نے بڑی نقاہت سے کہا۔ "وہ... وہ میرے جوس میں زہر ملایا گیا ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو کال کرو۔"

ایک ڈاکٹر وہاں موجود رہتا تھا۔ اس نے فوراً ہی قے کرنے والی دوا کھلائی۔ تھوڑی دیر میں ہی کھایا پیا الٹ کر باہر آنے لگا۔ جلالت نے بہت کم مقدار میں وہ مضر رساں دوا پی تھی۔ اس پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ پھر یہ کہ فوراً ہی طبی امداد پہنچ گئی تو وہ خطرے سے باہر ہو گیا۔

تمام حکمرانوں، آرمی کے افسروں اور ربیوں تک یہ خبر پہنچی کہ ہیکل کے سورما کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو ناکام ہو گئی ہے۔

کئی ربی اس رنگ محل میں دوڑے چلے آئے۔ تمام متعلقہ افسران کو غصہ دکھانے لگے کہ وہ ہیکل کے ایک سورما کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ آئندہ بارہ سورماؤں کی حفاظت کیسے کریں گے؟

یہ سیدھی سی بات سمجھ میں آگئی کہ مونیکا نے اس سورما کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ جاسوس اور پولیس والے اس کی رہائش گاہ میں پہنچے تو وہ وہاں نہیں تھی۔ اسے تلاش کیا گیا یہ یقین ہو گیا کہ وہ گرفتاری کے خوف سے فرار ہو گئی ہے۔

انہوں نے فوراً ہی ایئرپورٹ، بندرگاہ اور ہائی وے کی ناکا بندی کی۔ ٹی وی کے ذریعے اس کی تصاویر نشر کرتے ہوئے اعلان کرنے لگے کہ اس کا نام مونیکا ہے۔ اس نے ہمارے ہیکل کے سورما کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ جو اسے گرفتار کرنے میں قانون کی مدد کرے گا، اسے دس لاکھ امریکی ڈالرز دیے جائیں گے۔

وہ کہاں روپوش ہے؟ اس کی خفیہ پناہ گاہ کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ بلڈ ہاؤنڈ کے ذریعے مونیکا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ تربیت یافتہ خونخوار کتے اس کی بو سونگھ کر اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

انہوں نے اتنی سختی سے ناکا بندی کی تھی کہ وہ اسرائیلی حدود سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اسے تلاش کرنے کے لیے تین ٹیمیں بنائی گئیں۔ ہر ٹیم کے پاس تین کتے تھے۔ مونیکا کی رہائش گاہ سے اس کی اُترن حاصل کی گئی۔ اس کے اسکرٹ اور بلاؤز کو ان کتوں کے سامنے ڈالا گیا۔ وہ انہیں سونگھنے لگے اور بھونکنے لگے۔

ان کے ٹرینرز پریشان ہو کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک افسر نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

ایک ٹرینر نے کہا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں، یہ چند کتے شمال کی سمت منہ اٹھا کر بھونک رہے ہیں۔ باقی جنوب کی سمت غرا رہے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "مونیکا ایک ٹارگٹ ہے۔ وہ بیک وقت دو سمتوں میں کیسے چھپی ہوگی؟"

ایک افسر نے کہا۔ "وہ بلا کی مکار ہے۔ زبردست چال چل رہی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک سمت میں موجود ہوگی۔ فی الحال دو ٹیمیں بنا کر دو سمتوں میں چلو۔"

وہ لوگ مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ہر ٹیم کے پیچھے مسلح سپاہیوں سے لدی ہوئی چار گاڑیاں تھیں۔ یہ اندیشہ تھا کہ مونیکا کو تحفظ دینے والے مجاہدین سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ کتے بھونکتے ہوئے جدھر جاتے تھے، گاڑیاں ادھر ہی مڑ جاتی تھیں۔ سپاہی بندوقیں تانے گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھے ہر سو دیکھ رہے تھے۔ مجاہدین سے خطرہ تھا، وہ اچانک ہی کہیں سے آسکتے تھے۔ جبکہ اسرائیلی آبادی میں مجاہدین نے کبھی گروہ کی صورت میں حملے نہیں کیے تھے۔

وہ کتے انہیں شہر سے باہر لے آئے تھے۔ ان کا رخ بتا رہا تھا کہ کوہِ سینا کی سمت جا رہے ہیں۔ افسران گاڑیوں میں بیٹھے دوسری ٹیم سے رابطہ کر رہے تھے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی شہری آبادی سے دور نکل آئے ہیں۔ پہاڑ کے قریب کتوں کی رفتار بڑھ گئی۔ ان کے بھونکنے میں شدت آگئی۔ وہ ایک غار کی طرف جا رہے تھے۔ یقیناً مونیکا وہاں چھپی ہوگی۔ گاڑیاں رک گئیں۔ تمام افسران اور سپاہی ان کتوں اور ٹرینرز کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ایک افسر نے ٹرینر سے کہا۔ "ان کتوں کو روکو۔ غار کے اندر مسلح باغی ہو سکتے ہیں۔"

ٹرینر کتوں کی زنجیریں کھینچتے ہوئے ان کی رفتار سست کرنے لگے۔ پہلے دو سپاہی گنیں لے کر غار کے اندر گئے۔ ان کے پیچھے کتے، ٹرینر اور سپاہی تھے۔ وہ سب دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ غار کے ایک موڑ پر پہنچ کر وہ سب ٹھٹک گئے۔

ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے مونیکا کا لباس جھلک رہا تھا۔ کتے پاگلوں کی طرح بھونکتے ہوئے لپکنا چاہتے تھے۔ ٹرینرز بڑی مشکلوں سے انہیں قابو میں کر رہے تھے۔ ایک افسر نے پتھر کے پاس آکر مونیکا سے کہا۔ "سامنے آجاؤ ورنہ ہم تم پر کتے چھوڑ دیں گے۔"

اس دھمکی کا اس پر اثر نہیں ہوا۔ وہ پتھر کے پیچھے سے نہیں نکلی نہ اس نے کوئی حرکت کی۔ افسر نے کہا۔ "ہمیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ اس کے بدن کی اترن ہمیں دکھائی دے رہی ہے۔"

دوسرے افسر نے دو سپاہیوں سے کہا۔ "جاؤ اسے پکڑ کر لاؤ۔ وہ نہ ہو تو اس کا لباس ادھر لاؤ۔"

دو سپاہی پتھر کے پیچھے گئے۔ وہ نہیں تھی۔ اس کا لباس کسی چیز پر رکھا ہوا تھا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس لباس کو اٹھایا تو اس کے ساتھ لگا ہوا تار کھنچ گیا۔ وہ تار بڑی قوت کے آر ڈی ایکس بم سے منسلک تھا۔

پھر ہونا کیا تھا؟ ایک دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا۔ چیخیں سنائی دیں۔ غار کے اندرونی پتھر اور چٹانیں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اوپر سے گرنے والے پتھروں کے باعث غار کا دہانہ بند ہو گیا۔ جو بھاگتے ہوئے باہر آسکے وہ بچ گئے۔ باقی وہاں زندہ دفن ہو گئے۔

سب گاڑیاں چھوڑ کر بھاگتے ہوئے بہت دور آکر رک گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر گنتی کی۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا، دو افسر اور سات سپاہی حرام موت مارے گئے ہیں۔

ایک سپاہی نے فون پر دوسری ٹیم کو اپنے حالات بتائے۔ انہیں تاکید کی کہ کہیں مونیکا کی اترن دکھائی دے تو اس کے قریب نہ جائیں۔ اس کی اترن سے منسلک ایک بم چھپا کر رکھا گیا تھا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم ایک کھنڈر میں پہنچے ہیں۔ یہاں ایک شکستہ دیوار پر اس کی اترن دکھائی دے رہی ہے۔ کتے بھونک رہے ہیں اور اس لباس کی طرف لپک رہے ہیں۔ جبکہ وہ لباس اونچی دیوار پر ہے۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اس اترن کے قریب بھی نہ جاؤ۔ فوراً دور..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فون کے ذریعے ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکے کے ساتھ انسانی چیخیں گڈمڈ ہو گئیں۔ پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں۔ جواب نہیں مل رہا تھا۔ موت ایک کی ہو یا اجتماعی ہو۔ سب کو خاموش کر دیتی ہے۔

وہ دو بھیانک وارداتیں ایسی تھیں کہ اسرائیلی اکابرین پر چند لمحوں تک سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ عالمی سطح پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ فلسطینیوں نے انتقامی کارروائی کی ہے۔ ان کے افسران اور دیگر سپاہی، مجاہدین سے مقابلہ کرنے نہیں گئے تھے۔ بلکہ اپنے ہی علاقے میں ایک لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔

☆☆☆

مونیکا اس روز جلالت سے رخصت ہو کر مجاہدین کے پاس آئی تھی۔ مجاہدین نے اس کے موجودہ حالات کے پیش نظر ایک گھنٹے کے اندر اسے چور راستے سے مصری سرحد پار کرائی تھی۔ وہاں دوسرے مجاہدین اسے اسکندریہ لے گئے تھے۔

رات کے تیسرے پہر تک وہ قاہرہ پہنچ گئی۔ یہ سوچ لیا تھا کہ جلالت سے بہت دور جا کر فون پر میسج کا سلسلہ شروع کرے گی۔ میسج ٹریس کرنے والے دشمنوں کو معلوم

ہوگا کہ دوسرا سورما مصر کے کسی علاقے میں ہے۔ پھر وہ پہلے میسج کے بعد جگہ بدل دے گی۔ ہوسکا تو فلسطین جا کر پارٹی کی پناہ میں رہے گی۔

تل ابیب کے دو ربی ہر دوسرے تیسرے دن جلالت سے ملاقات کرنے آتے تھے۔ انہوں نے دوسرے دن اس کے پاس آکر بڑی عقیدت سے مصافحہ کیا۔ پھر افسوس کا اظہار کیا کہ سیکیورٹی کی نااہلی کے باعث مونیکا زہر چھپا کر لائی تھی۔ شکر ہے کہ اس زہر کا فوراً ہی توڑ کیا گیا۔ اسے ایک نئی زندگی ملی ہے۔

ایک نے کہا۔ ”یہی تو ہماری دینی کتابوں کی سچائی کا ثبوت ہے کہ تم زہر پینے کے بعد بھی زندہ ہو۔“

اسی وقت فون پر میسج کی ٹون سنائی دی۔ جلالت سمجھ گیا۔ لیکن انجان بن کر فون اٹھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”تعجب ہے مجھے تو کوئی میسج نہیں دیتا پھر یہ کون ہے؟“

دونوں ربی سوالیہ نظروں سے فون کو تکنے لگے۔ اس نے بٹن دبا کر میسج کی تحریر پر ایک نظر ڈالی۔ پھر حیرانی سے کہا۔ ”یہ تو قدیم عبرانی زبان میں ہے۔“

دونوں چونک کر قریب آگئے۔ ایک نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر پڑھنے کی کوشش کی پھر کہا۔ ”میں قدیم عبرانی زبان کے چند الفاظ جانتا ہوں۔ اس میں لکھا ہے تابوتِ یہودا... اس کے بعد سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“

دوسرے ربی نے فون لے کر دیکھا۔ پھر جلالت سے کہا۔ ”تم ہیکل کے سورما ہو۔ کیا تم پڑھ سکتے ہو؟“

اس نے فون لے کر پڑھا۔ ”تابوتِ یہودا کے امین! ہم نہیں آئیں گے۔ اگر آئیں گے تو ہمیں بھی تمہاری طرح کسی چار دیواری میں قید کردیا جائے گا۔“

تینوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔ جلالت نے بٹن دبا کر میسج دینے والے کے نمبر پڑھے۔ پھر کہا۔ ”یہ میسج کرنے والا میری طرح کوئی ہیکل کا سورما ہے۔ مجھے تابوت یہودا کا امین کہہ رہا ہے۔“

ایک ربی نے کہا۔ ”اسے کال کرو۔“

جلالت نے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف سے رابطے کی بیل سنائی دینے لگی۔ پھر لائن کٹ گئی۔ جلالت نے پھر نمبر پنچ کیے۔ مونیکا سے یہ طے ہوا تھا کہ فون پر صرف میسج کے ذریعے باتیں ہوں گی۔ اس لیے دوسری بار بھی رابطہ ختم کردیا گیا۔ جلالت نے ربیوں کو دیکھ کر کہا۔ ”وہ فون اٹینڈ نہیں کررہا ہے۔“

ربی نے کہا۔ ”میسج کے ذریعے پوچھو' وہ کون ہے؟ تمہیں کیسے جانتا ہے اور خود کہاں ہے؟“

جلالت نے اس کی ہدایت کے مطابق اسی قدیم زبان میں سوال کیا۔ جلد ہی جواب آیا۔ ”ایک حادثے میں میری زبان جل گئی ہے۔ میں بول نہیں سکتا۔ میں بھی تابوت یہودا کا امین ہوں۔ نائٹ ٹیمپلر (ہیکل کا سورما) ہوں۔ کیا تمہیں قید سے نکال کر لے جاؤں؟“

جلالت نے جواب دیا۔ ”میں قیدی نہیں ہوں۔ میری سلامتی کی خاطر مجھے سیکیورٹی میں رکھا جاتا ہے۔“

ادھر سے جواب آیا۔ ”ہم بارہ سورماؤں کو کبھی سیکیورٹی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جب تک ہم یہودی قوم کو تابوت یہودا پیش نہیں کریں گے۔ ہمیں کوئی دشمن ہلاک نہیں کرسکے گا۔ اگر وہ ہلاک ہوگا تو سمجھ لو کہ وہ جعلی سورما تھا۔“

ربیوں نے یہ میسج سنا تو فوراً ہی اپنے پیشوائے اعظم سے فون پر رابطہ کیا اور کہا۔ ”بہت بڑی خوشخبری ہے۔ دوسرے سورما کا سراغ مل رہا ہے۔ اس مسئلے میں ایک ذرا پیچیدگی ہے۔ آپ فوراً اعلیٰ حکام اور آرمی کے اعلیٰ افسران کو طلب کریں اور قدیم عبرانی زبان کے جو پروفیسر ہیں' انہیں بھی ضرور طلب کریں۔“

ادھر جلالت کے فون پر میسج آیا۔ ”اے امین! پابندیوں میں رہنا سورماؤں کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہم سورما صرف پیشوائے اعظم کی اور اپنے ربیوں کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔“

ربیوں نے یہ میسج سنا تو خوشی سے پھول گئے۔ کیونکہ وہ سورما ان کی ہدایات پر عمل کرنے اور ان کا پابند رہنے کی بات کہہ رہا تھا۔

ایک سورما آچکا تھا۔ دوسرا اپنے وجود کی اطلاع دے رہا تھا۔ اس کی بھی آمد آمد تھی۔ اس لیے چند گھنٹوں کے بعد ہی تمام اسرائیلی اکابرین ایک کانفرنس ہال میں جمع ہوگئے۔

اس کانفرنس ہال میں اسرائیل کے شاطر سیاستدان اور جارحانہ عزائم رکھنے والے فوجی افسران بھی تھے۔ جو اپنی ضد پر اڑ جاتے تو نہ اقوام متحدہ کا فیصلہ مانتے تھے' نہ اپنے سرپرست امریکا اور یورپی یونین کے مشورے تسلیم کرتے تھے۔ لیکن مذہبی معاملات میں پیشوائے اعظم اور ربیوں کے آگے سر جھکاتے تھے۔ وہ سب ہی اپنی مصروفیات ترک کرکے وہاں یکجا ہوگئے تھے۔

پیشوائے اعظم نے تمام حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری کامیابی اور دنیا میں حکمرانی کے دن قریب آرہے ہیں۔ آپ سب کو مبارک ہو۔ ہیکل کا دوسرا

سورما آنے والا ہے۔“

اس نے جلالت اسرار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے پہلے سورما سولومن یہودا نے آج صبح اچانک اس کا ایک میسج ریسیو کیا ہے۔ وہ پیغام ہماری قدیم عبرانی زبان میں ہے۔ جسے سولومن یہودا نے پڑھا پھر میں نے پڑھا۔ اب آپ کے سامنے قدیم زبانوں کے ماہر پروفیسر ڈی فرائیڈ اسے پڑھیں گے۔“

پروفیسر اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈیسک کے قریب آیا۔ پیشوائے اعظم نے اسے فون دیتے ہوئے حاضرین سے کہا۔ ”یہ ہمارے سورما سولومن یہودا کا فون ہے۔ وہ پیغام اس میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ آپ حضرات توجہ سے سنیں۔“

پروفیسر فون کا بٹن دبا کر میسج پڑھنے لگا۔ جلالت نے جو جوابات دیے تھے' اسے بھی پڑھ کر سنانے لگا۔ پیشوائے اعظم نے کہا۔ ”میں اعلیٰ حکام اور آرمی کے اعلیٰ افسران سے گزارش کرتا ہوں۔ وہ بتائیں کہ اس پیغام سے کیا تاثر ملتا ہے؟“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہم نے پہلے سورما کو قیدی بنا رکھا ہے۔“

ایک ربی نے کہا۔ ”اور اس کا یہ حتمی فیصلہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ہیکل کے تمام سورما صرف پیشوائے اعظم اور ربیوں کی ہدایات کے پابند رہتے ہیں۔ کسی اور کی غلامی یا پابندی قبول نہیں کرتے۔“

اعلیٰ حکام اور فوج کے اعلیٰ افسران ایک دوسرے سے مشورے کرنے لگے۔ صرف جلالت ہی نہیں' پیشوائے اعظم اور تمام ربی بھی کہہ رہے تھے کہ پہلے سورما سولومن یہودا کو آزادی دی جانے ورنہ کوئی سورما یہاں قیدی بن کر رہنے نہیں آئے گا۔

وہ تمام اکابرین گیارہ سورماؤں کا راستہ روک نہیں سکتے تھے۔ راستہ کھولنے اور انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے آزادی کی ضمانت لازمی ہوگئی تھی۔ لہٰذا وہ سب متفق ہوکر جلالت اسرار پر سے تمام پابندیاں اٹھانے کے لیے راضی ہوگئے۔

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”مسٹر سولومن یہودا! تمہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی لیکن تم اسرائیل سے باہر کسی ملک میں نہیں جاؤ گے۔“

جلالت نے کہا۔ ”مجھے اس ملک سے باہر جانے کا شوق نہیں ہے۔ اگر کسی سورما سے ملنا ہوگا' اسے کسی دوسرے ملک سے لانا ہوگا تو میں کسی ربی کے ساتھ اسرائیل سے باہر ضرور جاؤں گا۔“

تمام ربی خوش ہوگئے۔ کانفرنس کے اختتام پر انہوں نے جلالت اسرار کو آزادی کی مبارک باد دی پھر کہا۔ ”دوسرے سورما کو میسج دو۔ اسے آزادی کی خوشخبری سناؤ۔“

جلالت نے مونیکا کے اس خفیہ نمبر پر رابطہ کیا۔ وہ اپنے فون کی سم بدل چکی تھی۔ اس لیے رابطہ نہیں ہوا۔ جلالت نے ان سے کہا۔ ”اس کا فون آف ہے۔ پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔“

پھر اس نے کہا۔ ”میں اس رنگ محل میں نہیں رہوں گا۔ میرے لیے گاڑی رکھی جائے۔ میں خود ڈرائیو کروں گا۔ تل ابیب اور حیفہ کی سیر کرتے ہوئے اپنے لیے نئی رہائش گاہ پسند کروں گا۔“

اس کی یہ خواہش پوری کی گئی۔ مونیکا نے اسے چند مجاہدین کے نام اور پتے ٹھکانے بتائے تھے۔ ان سے رابطہ کرنے کے سلسلے میں کوڈ ورڈز بھی یاد کرائے تھے۔ ان میں سے ایک بظاہر عیسائی بن کر رہتا تھا۔ اس کا نام ڈیوڈ براؤن تھا۔ وہ ایک جنرل اسٹور کا مالک تھا۔ جلالت خریداری کے لیے وہاں پہنچ گیا۔

دکان میں دو چار گاہک تھے۔ دکان کا مالک کیش کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ جلالت محتاط انداز میں دیکھتا آرہا تھا کہ اس کی نگرانی ہورہی ہے یا نہیں؟

اب تک کوئی تعاقب کرتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر دکان کے اندر آکر شوکیس کے شیشوں سے باہر دیکھا۔ کوئی اس کی ٹوہ میں نہیں تھا۔

اس نے کیش کاؤنٹر پر آکر کہا۔ ”میں مسٹر ڈیوڈ براؤن سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”میں ہی ڈیوڈ براؤن ہوں۔ آپ کون ہیں؟“

وہ بولا۔ ”میرا نام سولومن یہودا ہے۔“

اس نے چونک کر دیکھا۔ جلالت نے دھیمی آواز میں کوڈ ورڈز ادا کیے۔ ”ہم فلسطین کے لیے ہیں' فلسطین ہمارے لیے ہے۔“

وہ ایکدم سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جواباً دھیمی آواز میں کوڈ ورڈز ادا کیے۔ ”فلسطین ہمارے لہو سے سرسبز رہے گا۔“

پھر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آیئے! جو خریدنا چاہتے ہیں۔ میں ان تمام آئٹم کی کوالٹی آپ کے سامنے پیش کروں گا۔“

پھر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”اس طرح ہم اپنے مقصد کی باتیں کرتے رہیں گے۔“

وہاں مختلف سامان کی مختلف قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ جلالت نے اس کے ساتھ دو قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”میں فوراً مونیکا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے تھوڑی دیر پہلے اس سے رابطہ کرنا چاہا تھا۔ اس کا فون بند ہے۔ ویسے وہ جلد ہی کال بیک کرے گی۔ تم اس سے کوئی ضروری کام لینا چاہتے ہو تو شاید میں تمہارا وہ کام کرسکوں گا۔“

”میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری پلاننگ کے مطابق مجھے آزادی مل گئی ہے۔“

”یہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے، مونیکا نے تمہیں میری پلاننگ کی تفصیلات بتائی ہیں۔“

”جی ہاں۔ ہم ایک دوسرے کو تمام حالات سے اور معاملات سے باخبر رکھتے ہیں۔“

وہ گفتگو کے دوران کبھی کبھی پیسٹ، ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان دیکھ رہا تھا۔ رک رک کر ضرورت کی چیزیں اٹھا کر ٹرالی میں ڈال رہا تھا۔ یوں پوری دکان میں گھومنے کے بعد وہ کاؤنٹر پر واپس آگئے۔ کام کی تمام باتیں ہوگئیں۔

جلالت نے سامان کا بل ادا کیا پھر مصافحہ کرکے دکان کے باہر آیا۔ ملازم نے تمام سامان کار میں لاکر رکھ دیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی پھر ڈرائیو کرتا ہوا تل ابیب کے ساحل پر آگیا۔ وہاں اس نے ایک خوبصورت سا بنگلا رہائش کے لیے پسند کیا۔ وہ کرائے کے لیے خالی تھا۔

اس نے فون کے ذریعے ایک ربّی کو بلایا۔ ربّی نے سرکاری کارندے کے ذریعے اس ویل فرنشڈ بنگلے کو اس کے لیے کرائے پر حاصل کرلیا۔ اس کی خدمت کے لیے وہاں ملازم رکھے۔ یوں شام تک وہ اس رہائش گاہ میں آگیا۔

وہاں ربی کی موجودگی میں دوسرے سورما کا میسج آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”کیا ابھی تک آزادی کے نام پر چار دیواری میں قید ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”تھینکس گاڈ! آزادی مل گئی ہے۔ میں اپنی پسند کے بنگلے میں آگیا ہوں۔ اس ساحلی بنگلے میں تمہارے لیے بھی گنجائش ہے۔“

ربی وہ میسج پڑھتا جارہا تھا۔ جواب موصول ہوا۔ ”فوراً نہیں آؤں گا۔ معلوم کرتا رہوں گا، دیکھتا بھی رہوں گا کہ تم کس حد تک آزاد ہو؟ اگر در پردہ نگرانی نہیں ہوگی اور تمہاری سماجی مصروفیات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا تو میں اچانک سب سے پہلے کسی بھی ربی کے پاس آؤں گا۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ ادھر ربّی خوش ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ”آج سے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے اعلان کیا جائے گا کہ ہماری دینی کتاب کی پیشگوئی کے مطابق ہیکل کا ایک سورما آچکا ہے اور اب دوسرا سورما عنقریب آنے والا ہے۔ یوں پوری دنیا تمہاری تصویر دیکھے گی۔“

ملازم نے آکر کہا۔ ”ہمارے شہر کے میئر آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

جلالت نے کہا۔ ”انہیں آنے دو۔“

ملازم چلا گیا۔ ربّی نے کہا۔ ”کل میئر کی بیٹی دلہن بن رہی ہے۔ وہ دعوت دینے آیا ہوگا۔“

”کیا مجھے اس دعوت میں جانا چاہیے؟“

”بیشک جانا چاہیے۔ کل حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور بڑی بڑی شخصیات وہاں ہوں گی۔ سب ہی تم سے ملنا چاہیں گے۔ ٹی وی چینلز کے لیے اس تقریب کی کوریج کی جائے گی۔“

میئر اپنے پی اے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا۔ جلالت نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ میئر نے اس سے بڑی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر سولو من یہووا! ہمارا دین، ہماری کتابیں کہتی ہیں کہ آپ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ ہماری قوم بڑی عقیدت سے آپ کے سامنے سر جھکاتی رہے گی۔ کل میری بیٹی کی شادی ہے۔ میں آپ کو مدعو کرنے آیا ہوں۔ آپ آئیں گے تو تقریب یادگار ہوجائے گی۔“

جلالت نے دعوت نامہ قبول کیا پھر پوچھا۔ ”وہ مونیکا جو مجھے ہلاک کرنا چاہتی تھی، کیا اب تک لاپتا ہے؟“

میئر نے کہا۔ ”سالی جائے گی کہاں؟ گرفتار ہوجائے گی تو میں حکم دوں گا کہ اسے جنسی جنون میں مبتلا رہنے والے پاگلوں کے آگے ڈال دیں۔ وہ اس کی بوٹی بوٹی نوچتے رہیں گے۔ اس کی چیخیں سن کر ہمارا کلیجا ٹھنڈا ہوگا۔“

جلالت تصور میں مونیکا کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ”میری جان! میں آزاد ہوگیا ہوں۔ تمہارا محافظ ہوں۔ یہ میئر اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے ٹھنڈا کردوں گا۔ بیٹی کو دلہن بنانے کی خوشی ماتم میں بدل جائے گی۔“

☆☆☆

ایک وسیع و عریض عمارت میں شادی کی تقریب تھی۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور بڑے بڑے سرمایہ دار آرہے تھے۔ عمارت کے اندر اور باہر مسلح سپاہی خاصی تعداد میں

تھے۔ سیکیورٹی کے سخت انتظامات کیے گئے تھے۔

جلالت اسرار دو ربیوں کے ساتھ آیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ کار سے باہر نکلا تو عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سیکیورٹی گارڈز نے جلالت کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ معزز مہمانوں سے اپیل کررہے تھے کہ وہ سورما سے دور رہیں۔ وہ ایک سورما سیکڑوں عقیدت مندوں سے مصافحہ نہیں کرسکے گا۔ جلالت عمارت کے اندر آیا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ آتی جاتی، ہنستی کھلکھلاتی نظر آرہی تھی۔ انہیں معلوم ہوا کہ ہیکل کا سورما آیا ہے تو وہ بڑے شوق سے اس کے قریب آنے لگیں۔ مسلح گارڈز انہیں بھی روکنے لگے۔

میئر نے تیزی سے آکر اس سے مصافحہ کیا۔ اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے ساتھ اعلیٰ عہدیداروں کے پاس لے گیا۔ وہ سب بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے متعارف ہونے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”آپ کی آمد سے یقین ہوگیا ہے کہ یہودی قوم تا قیامت افضل اور برتر رہے گی۔ دوسرے مذاہب ختم ہوجائیں گے۔“

ایک خاتون تیزی سے چلتی ہوئی آئی۔ اس نے بڑے جذبے اور اپنایت سے جلالت کا بازو تھام کر کہا۔ ”اوہ گاڈ! آپ ہیں نائٹ ٹیمپلر...؟ جیسا سنا تھا، اس سے بھی زیادہ خوبرو، اسمارٹ اور پرکشش ہیں۔ عورتیں تو آپ پر مرتی ہوں گی۔“

جلالت نے پوچھا۔ ”آپ بھی مرنے آئی ہیں؟“

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ میئر نے تعارف کرایا۔ ”یہ ہمارے ایک منسٹر کی اہلیہ میڈم سوزانہ ہیں۔“

میڈم نے کہا۔ ”وہ غیر ملکی دورے پر ہیں۔ آج کل میں بالکل تنہا ہوں۔ کل آپ سے کسی وقت ملنے آؤں گی۔ پلیز اپنا فون نمبر بتائیں؟“

جلالت نے نمبر بتائے۔ اس نے وہ نمبر اپنے فون میں محفوظ کرلیے۔ پھر کہا۔ ”میں جارہی ہوں۔ کل ملاقات ہوگی۔“

وہ وہاں سے جاتے ہوئے مہمانوں کے ہجوم میں گم ہوگئی۔ جلالت نے کہا۔ ”یہ عورت ہے یا بجلی؟ لہراتی ہوئی آئی، جھلک دکھا کر فون نمبر لے کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔“

معزز عہدیدار ہنسنے لگے۔ میئر نے کہا۔ ”یہ منسٹر کی وائف ہے۔ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ویسے فلرٹ ہے۔ ذرا بچ کر رہیں۔ پلٹ کر آسکتی ہے۔“

وہ سب میڈم سوزانہ کی باتیں کرکے مزے لے رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ جلالت نے اپنے فون پر کالنگ ٹون سنی۔ اس نے فون نکال کر ان لوگوں سے ذرا دور ہوکر بٹن دبایا۔ پھر کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو کون؟“

دھیمی سی راز دارانہ سرگوشی سنائی دی۔ ”وہاں کسی کو معلوم نہ ہو، میں سوزانہ بول رہی ہوں۔ ان سے دور ہوکر مجھ سے دو باتیں کریں گے تو فائدے میں رہیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”میرے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”ایک ایسا راز ہے، جس کی تم توقع نہیں کرسکتے۔ فون پر نہیں بول سکتی۔ سامنے کوریڈور میں بائیں طرف آؤ۔ میں اس ہجوم میں دروازے پر نظر آؤں گی۔“

وہ کوئی راز بتانا چاہتی تھی۔ تجسس پیدا کردیا تھا۔ جلالت نے کہا۔ ”اوکے۔ میں آرہا ہوں۔“

اس نے فون بند کرکے میئر پر ایک نظر ڈالی۔ وہ مہمانوں سے باتوں میں مصروف تھا۔ جگہ جگہ شراب کی ٹرالیاں چل رہی تھیں۔ لوگ کھانے پینے سے شغل کررہے تھے۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا کوریڈور میں آگیا۔ پھر بائیں طرف مڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ قریب ہی وہ ایک دروازے کے پاس کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے قریب آتے ہی اس نے دروازہ کھول کر کہا۔ ”اندر چلو۔“

وہ ایک کمرے میں آیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ کیا کررہی ہو؟ لوگ کیا سوچیں گے؟“

وہ روبرو آکر بولی۔ ”کیا تم جانتے ہو تمہارے کتنے دشمن ہیں؟“ وہ آستین میں چھپے ہوئے سانپ نظر نہیں آئیں گے۔ ایک دشمن تو میری انگلیوں پر ناچتا ہے۔ اپنے سرکاری راز بھی مجھے بتاتا رہتا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”وہ میرا شوہر سیموئل ڈیسوزا ہے۔ مجھ سے جوڑ رشتہ رکھو گے تو بتاؤں گی کہ تمہاری لاعلمی میں کیا ہورہا ہے؟ میں جنونی ہوں۔ تمہیں حاصل نہ کرسکی تو مرجاؤں گی۔ مجھے ایک بار آغوش میں لو۔“

”پہلے کام کی بات کرو۔ کسی اہم معاملے میں میرے کام آؤ گی تو میں تمہارے کام آؤں گا۔“

وہ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں بھڑک رہی ہوں۔ مجھے جنون میں آنے سے پہلے شانت کردو۔ تم جس اندھے کنوئیں میں ہو، اس میں سے میں ہی

تمہیں نکال سکتی ہوں۔"
جلالت نے اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھرلیا۔ اس کے ہاتھ سے پرس چھوٹ کر فرش پر آگیا۔ وہ آہنی شکنجے میں کراہنے لگی۔ زیرلب بڑبڑانے لگی۔ "بائی گاڈ! تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ اس طرح تمہارے کام آتی رہوں گی کہ تمہاری اہم ضرورت بن جاؤں گی۔ تم خود ہی مجھے طلب کرتے رہوگے۔"
جلالت نے اچانک ہی اسے ایک جھٹکے سے الگ کردیا۔ وہ پھر تڑپ کر اس سے لگنے کے لیے آئی۔ اس نے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہاری پہلی فرمائش پوری کردی۔ اب میرے کام کی بات کرو۔"
"میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی۔ پلیز مجھے لگنے تو دو۔"
"اب اگر تم نے ضد کی تو میں دروازہ کھول کر چلا جاؤں گا۔ دوستی اسی شرط پر ہوگی کہ پہلے تم میرے لیے اہم بن جاؤ۔"
اس نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا جانتے ہو کہ دوسرا سورما کب آئے گا؟"
"جلد ہی آئے گا۔ اس کی آمد کا کوئی دن مقرر نہیں ہے۔"
"لیکن میرا خاوند ڈیسوزا جانتا ہے' وہ آج سے دو دنوں کے بعد دس تاریخ کو آئے گا۔"
جلالت نے چونک کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "ڈیسوزا نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں۔ دراصل آنہیں رہا ہے' لایا جارہا ہے۔"
وہ بڑی سنجیدگی سے سوزانہ کو تکنے لگا۔ وہ جنسی جنون میں مبتلا رہنے والی عورت تھی۔ مگر خطرے کی گھنٹی بجا کر اس پر احسان کررہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "تم بہت اچھی ہو۔"
وہ خوش ہوکر بولی۔ "مجھے اپنی آغوش میں لو۔ پیار کرو۔"
"ذرا صبر کرو۔ پہلے دشمنوں کی سازش سے مجھے پوری طرح آگاہ کرو۔ مسٹر ڈیسوزا کے علاوہ اور کتنے سرکاری عہدیدار اور آرمی کے افسران میرے مخالف ہیں؟"
وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "یہ بتاؤ' اپنے مخالفین کے خلاف کیا کام لینا چاہتے ہو؟"
"سیدھی سی بات ہے' ان کی موت میری زندگی ہوگی۔ یہ نہیں چاہوں گا کہ تم کسی کو موت کے گھاٹ اتارو۔ البتہ پلاننگ کرکے انہیں میرے نشانے پر لاسکتی ہو۔"
"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں تم سے آزادی سے ملتے رہنے کے لیے اپنے منسٹر شوہر کو قیامت کی نیند سلاسکتی ہوں۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہوگا۔"
"اس پر آخری وقت لانا ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ پہلے یہ معلوم کرو وہ لایا جانے والا سورما کون ہے؟ میں اس کی آمد سے پہلے اس کی شہ رگ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"
"پہلے تمہارے بیڈروم میں جاؤں گی۔ پھر اس ڈمی سورما کی پوری ہسٹری معلوم کرکے آؤں گی۔"
جلالت نے کہا۔ "ابھی اس تقریب میں مجھے ایک اہم معاملے سے نمٹنا ہے۔ ایک مشکل کام ہے۔ اسے کرنے کے بعد ہم یہاں سے جائیں گے۔"
"کام کیا ہے؟ مجھے بتاؤ' شاید میں وہ مشکل آسان کردوں۔ میں جلد سے جلد تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔"
"میں تمہاری بے چینی اور دیوانگی سمجھ رہا ہوں۔ ابھی تم میرے لیے کسی بھی خطرے سے کھیل سکتی ہو اور میں بھی تمہیں رازدار بنا کر خطرہ مول لے رہا ہوں۔"
جلالت نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے وہاں گھنے بالوں کے درمیان ایک ڈیڑھ انچ کا ٹائم بم ٹیپ کے ذریعے چپکا کر رکھا گیا تھا۔ اس نے اسے وہاں سے نکال کر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس ننھی سی چیز کو ابھی میئر کی جیب میں ڈال سکتی ہو؟"
اس نے پوچھا۔ "کیا ہے یہ؟"
"یہ ٹائم بم ہے۔"
اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ جلالت نے پوچھا۔ "کیا ڈر گئیں؟"
"ہرگز نہیں۔ میں تمہاری خاطر جان پر کھیل جاؤں گی۔ مجھے یہ بتاؤ' بم کیسے بلاسٹ ہوگا؟"
اس نے سمجھایا۔ "دیکھو یہ ننھا سا بٹن ہے۔ اسے دوبار دبا کر میئر کی جیب میں ڈالوگی تو یہ دو منٹ بعد بلاسٹ ہوگا۔"
اس نے اس ننھے سے کھلونے کو لے کر اپنے گریبان میں رکھ لیا۔ پھر وہ دونوں دروازہ کھول کر باہر آگئے۔ کوریڈور میں عورتیں اور مرد آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ سوزانہ اور جلالت نے ایک دوسرے سے فاصلہ قائم کرلیا۔ وہ میئر کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ کسی دوسری طرف دوسرے مہمانوں کو کمپنی دے رہا تھا۔
اچھے خاصے مہمانوں کا ہجوم تھا۔ وہاں ہر طرف کھانے پینے کی ٹرالیاں چل رہی تھیں۔ ایک جگہ میئر بوڑھی

اور جوان عورتوں کے درمیان دکھائی دیا۔
سوزانہ نے اس سے کچھ فاصلے پر رک کر ایک ٹرالی سے شراب کا جام اٹھالیا۔ اسے ہونٹوں سے لگا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ وہ مستقل میئر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں یہ بات پکار رہی تھی کہ اسے کیسا طریقہ کار اختیار کرنا ہے؟
تھوڑی دیر میں ہی میئر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جگہ میزبانی کے فرائض ادا کرتا آرہا تھا۔ وہ خواتین سے معذرت کرتے ہوئے اس کے پاس چلا آیا۔ "ہائے میڈم! تنہا کیوں ہو؟"
وہ ایک گھونٹ حلق سے اتار کر سرد آہ بھر کر بولی۔ "مقدر میں تنہائی ہے۔ میرا شوہر تو بیچارہ منسٹر ہے۔ ہمیشہ دورے پر رہتا ہے اور مجھ بے چاری پر جوانی کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔ آہ! میں شاید خوبصورت اور پرکشش نہیں ہوں۔ کوئی مجھے کمپنی نہیں دیتا ہے۔"
وہ قریب آکر بولا۔ "تم بہت حسین اور دلنشین ہو۔ لگتا ہی نہیں کہ شادی شدہ ہو۔ پھر بچے بھی نہیں ہیں۔ ٹین ایجر لگتی ہو۔"
"اگر سچ کہہ رہے تو آؤ مجھے کس کرو۔"
اس نے ہچکچاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ اگرچہ سر عام ایک دوسرے کو چومنا ان کی تہذیب کے مطابق تھا لیکن وہ ایک منسٹر کی وائف کے ساتھ کوئی اسکینڈل کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کیا کرتا' وہ تھی ایسی کہ بے اختیار ہوکر اسے بازوؤں میں بھرلیا۔ پھر جھک کر اس کے لبوں پر اتر گیا۔ وہ بلاشبہ عمر رسیدہ نہیں تھی۔ منسٹر کی وائف ہونے کے باعث میڈم کہلاتی تھی۔
ان لمحات میں میئر اپنا بڑھاپا بھول گیا۔ طلسم ہوشربا نے ہوش اڑا دیے۔ مدہوشی میں معلوم نہ ہوسکا کہ موت اس کی جیب میں پہنچ گئی ہے۔
سوزانہ ایکدم سے الگ ہوکر بولی۔ "او گاڈ! تم تو غضب کے آدمی ہو۔ میں آج رات تمہارے ساتھ گزارنا چاہوں گی۔ بعد میں فون پر بتاؤں گی کہ ہم کہاں مل سکتے ہیں؟"
وہ بڑی دلربائی سے مسکراتی ہوئی تیزی سے پلٹ کر اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ جلالت کو ڈھونڈنے لگی۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "آگے چلتی رہو۔ میں پیچھے ہوں۔ عمارت سے باہر نکلو۔"
باہر نکلتے ہی ایک دھماکا سنائی دیا۔ ایکدم سے بھگدڑ مچ گئی۔ عورتوں' مردوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اگرچہ بڑا دھماکا نہیں ہوا تھا۔ لیکن سب ہی دہشت زدہ ہوکر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ جلالت نے سوزانہ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر اسے بازوؤں میں اٹھالیا۔ اس نے خوش ہوکر اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کردیں۔ مہمانوں کی بھگدڑ جاری تھی۔ وہ ان سے ٹکراتے ہوئے جارہے تھے۔
جلالت نے باہر آکر پارکنگ ایریا میں اسے بازوؤں سے اتارتے ہوئے کہا۔ "اپنی کار لے آؤ۔"
وہ تیزی سے ایک طرف چلی گئی۔ جلالت نے کالنگ ٹون سن کر فون کو کان سے لگایا۔ ربی گھبرایا ہوا تھا۔ پوچھ رہا تھا۔ "تم کہاں ہو؟"
وہ بولا۔ "میں خیریت سے ہوں۔ بائی داوے یہ دھماکا عمارت کے اندر کہاں ہوا ہے؟"
"کچھ نہ پوچھو۔ معمولی سا دھماکا تھا۔ لیکن میئر مارا گیا ہے۔"
"میں سوزانہ کے ساتھ جارہا ہوں۔ آپ کسی وقت بھی میری کار یہاں سے لے جائیں۔"
سوزانہ اپنی کار لے آئی۔ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم نے کمال کردیا۔ ابھی ربی نے بتایا ہے' میئر ختم ہوچکا ہے۔"
وہ کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "عورت دغا بھی ہے اور وفا بھی۔ تھوڑی دیر پہلے میرے ایک بوسے نے اسے موت دی۔ جو بوسہ تمہیں دوں گی' وہ وفاداری کی ضمانت ہوگا۔"
وہ رہائش گاہ میں پہنچ گئے۔ کہیں بجتی ہے شہنائی' کہیں ماتم بھی ہوتے ہیں۔ یہی انسانوں کی پیچ در پیچ زندگی ہے۔ جہاں شہنائی بج رہی تھی' اب وہاں ماتم ہورہا تھا۔ جلالت کی خوابگاہ میں جہاں تنہائی اور خاموشی رہتی تھی' وہاں رات بھر شہنائی بجتی رہی۔

☆☆☆

وہ تھک ہار کر سوگئی تھی۔ کالنگ ٹون نے اسے جگایا۔ وہ آنکھ کھولنے کے باوجود جیسے خواب میں اس فاتح سورما کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ وہ بیڈ پر نہیں تھا۔ اس کی جگہ فون پکار رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ "ہیلو...؟"
جلالت نے کہا۔ "صبح ہوگئی۔ تمہیں واپس جانا چاہیے۔"
"تم کہاں ہو؟"
"کھڑکی سے دیکھو' گارڈن میں ہوں۔"
"آل رائٹ۔ میں شاور لے کر آرہی ہوں۔"
وہ شاور لے کر فریش ہونے کے بعد گارڈن میں آئی۔

پھر بولی۔ ”کب تک ورزش کرتے رہو گے؟ اندر چلو۔“

”میں خوب سمجھتا ہوں' اندر جاؤں گا تو پھر تم باہر نہیں نکلو گی۔ میں نے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔ یہاں سے باہر ہمارا اسکینڈل نہیں بننا چاہیے۔“

اسی وقت فون نے سوزانہ کو مخاطب کیا۔ وہ نمبر پڑھ کر چونک گئی پھر بولی۔ ”میرے شوہر کا فون ہے۔ پتا نہیں اتنی صبح کیوں کال کر رہا ہے؟“

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو ڈیسوزا! کہاں ہو؟ کیسے ہو؟“

”میں صبح کی فلائٹ سے گھر آیا ہوں۔ معلوم ہوا ہے' میئر بم دھماکے میں مارا گیا ہے۔ تم کہاں ہو؟ اس تقریب میں تھیں۔ خیریت سے تو ہو؟“

”میں خیریت سے ہوں۔ اچانک دھماکے کے باعث مجھے شاک پہنچا ہے۔ میری سہیلی مجھے اپنے گھر لے گئی تھی۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے بڑی حسرت سے جلالت کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا' اسکینڈل سے اور شک و شبے سے بچتی رہو۔ کیا یہ سوچ سکتی تھیں کہ وہ اچانک آ جائے گا؟“

”درست کہتے ہو۔ آئندہ محتاط رہوں گی۔ لیکن جلد ہی ڈیسوزا کو اپنی زندگی سے نکال دوں گی۔“

وہ اپنی کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ کار کی کھڑکی پر جھک کر بولا۔ ”کیا کرنے والی ہو؟ میری بات ذہن نشین کر لو۔ ابھی اسے زندہ رہنے دو۔ شبہات سے بالاتر رہو۔ ورنہ میرا کھیل ادھورا رہ جائے گا۔“

وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں تمہارا کھیل بگڑنے نہیں دوں گی۔“

وہ کار آگے بڑھاتی ہوئی احاطے کے گیٹ سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ بیڈ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ سوزانہ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

اس نے پچھلی رات خطرہ مول لے کر بہت بڑا کام کیا تھا۔ وہ کسی شک و شبے کے بغیر اس پر اعتماد کر سکتا تھا۔ مونیکا کے بعد یہ دوسری عورت تھی' جو یہودیوں سے نمٹنے کے لیے ایک زبردست ہتھیار بن گئی تھی۔

جلالت نے دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے وفاداروں اور جاں نثاروں کی ایک مضبوط ٹیم بنتی جا رہی تھی۔

ربی نے اسے فون پر مخاطب کیا اور کہا۔ ”ہم نے تمہاری کار بھیج دی ہے۔ یاد رکھو! آج شام انٹرویو کے لیے ایک اسٹوڈیو میں پہنچنا ہے۔“

ناشتا کرنے کے دوران اس کی گاڑی آ گئی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا جنرل اسٹور کے سامنے آ کر رک گیا۔

ڈیوڈ براؤن نے مسکرا کر کہا۔ ”ویل کم مسٹر سولومن! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے مستقل گاہک بن رہے ہیں۔“

وہ دونوں پھر سامان کی قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ جلالت نے کہا۔ ”ایک نئی اطلاع ہے۔ میرے مخالفین مجھے مسلمان ثابت کرنے یا جعلی سورما ثابت کرنے کے لیے ایک ڈمی سورما تیار کر چکے ہیں۔ وہ پرسوں دس تاریخ کو کہیں سے نمودار ہونے والا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”یہ تو ہمارے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس بہروپیے کی تو ایسی کی تیسی کرنی ہوگی۔“

”ایک منسٹر کی وائف میری رازدار اور وفادار بن گئی ہے۔“

”تعجب ہے۔ ایک یہودی عورت اور وفادار بن گئی ہے؟“

جلالت نے پوچھا۔ ”کیا تم نے سنا ہے کہ کل رات میئر ایک بم دھماکے میں مارا گیا ہے؟“

”ہاں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے یہ خبریں نشر کی جا رہی ہیں۔“

”سوزانہ نے میری پلاننگ کے مطابق اسے جہنم رسید کیا ہے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کمال ہے پھر تو واقعی وہ آپ کی رازدار اور وفادار بن کر رہے گی۔“

اس نے جلالت کو ایک مجاہد وکی موسس کا فون نمبر اور پتا بتایا۔ وہ ایک ٹی وی چینل میں میک اپ مین تھا۔

فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ ڈیوڈ نے اپنے فون پر نمبر پڑھے پھر کہا۔ ”مونیکا کی کال ہے۔“

جلالت نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے۔ لاؤ مجھ سے بات کراؤ۔“

ڈیوڈ نے فون کا بٹن دبایا۔ پھر اسے کان سے لگاتے ہوئے کوڈ ورڈز ادا کیے۔ اس کے بعد کہا۔ ”مجھ سے پہلے ان سے بات کرو۔“

”کس سے بات کروں؟“

”ایک سرپرائز ہے۔ بات تو کرو۔“

جلالت نے اس سے فون لے کر کہا۔ ”مونیکا! میری جان!“

وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ”ہائے یہ تم ہو؟ جب سے جدا ہوئی ہوں' تمہاری آواز سننے کے لیے ترس رہی ہوں۔ تم سے ملنے کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔“

”چلو میں دعا کی قبولیت بن گیا ہوں۔“

”آواز سننے کی دعا قبول ہوئی ہے۔ میں تم سے کب ملوں گی؟ اُدھر تم آزاد ہوئے' اِدھر میں بچھڑ گئی ہوں۔“

”فی الحال ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تم یہاں واپس نہیں آ سکو گی۔ پتا نہیں جن کتوں کو تمہاری بو سونگھائی گئی ہے' وہ کب تک اسے یاد رکھیں گے؟“

”میں کیا کروں؟ یہ دل تم سے ملنے کو تڑپ رہا ہے۔“

”صبر کرو۔ ہمارا معبود بگڑی بنانے والا ہے۔ ملنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ تمہیں فون پر زیادہ لمبی اور جذباتی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ کوئی کام کی بات کرنی ہو تو مسٹر براؤن سے کرو۔“

اس نے فون ڈیوڈ کو دیا۔ کوئی خاص بات نہیں کرنی تھی۔ مونیکا نے رابطہ ختم کر دیا۔ جلالت کو بھی ڈیوڈ کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہیے تھا۔ لہٰذا وہ اپنی رہائش گاہ میں واپس آ گیا۔

بڑی مصروفیات تھیں۔ بڑے اہم معاملات سے نمٹنا تھا۔ دشمن سورما کی آمد کا معاملہ سب سے اہم تھا۔ جلالت کو یقین تھا کہ سوزانہ اس کے بارے میں کچھ معلوم کر کے ہی آئے گی۔ لیکن اس کا شوہر دورے سے واپس آ گیا تھا۔ وہ آزادی سے ملنے نہیں آ سکتی تھی۔

راستے ہموار بھی ہو رہے تھے اور رکاوٹیں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔

وہ شام کو ایک ٹی وی چینل کے اسٹوڈیو میں پہنچ گیا۔ وہاں پیشوائے اعظم اور دو ربی موجود تھے۔ وہ بھی انٹرویو کے اس پروگرام میں ہیکل کے سورماؤں کے متعلق بہت کچھ کہنے والے تھے۔

وہاں ان کے بیٹھنے کے لیے ایک سیٹ بنایا گیا تھا۔ تابوت یہودا کی ایک سنہری رنگین تصویر بنائی گئی تھی۔

جب میزبان یہ کہتا کہ ناظرین دو ہزار سال پہلے کی پیشگوئی کے مطابق ہیکل کا پہلا سورما آ چکا ہے۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالیں۔ وہ آ رہا ہے۔

تب رنگا رنگ لائٹس جلتی بجھتی رہتیں۔ موسیقی گونجتی رہتی پھر اچانک ہی دیوار پر بنا ہوا تابوت یہودا زوردار آواز کے ساتھ جیسے پھٹ پڑتا' دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ تاریکی چھا جاتی۔ پھر اسپاٹ لائٹس کی دائرے نما روشنی میں جلالت اسرار ہیکل کے سورما کی حیثیت سے نظر آتا۔ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا پیشوائے اعظم اور ربیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا۔

ابھی کیمرا آن ہونے اور پروگرام شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ لائٹس مین مختلف زاویوں سے لائٹنگ کے انتظامات کر رہے تھے۔ ایسے وقت وہاں سوزانہ آ گئی۔ جلالت نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیسے؟“

وہ بولی۔ ”کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ کیا تھوڑا وقت دے سکتے ہو؟“

وہ پیشوائے اعظم سے اجازت حاصل کر کے سوزانہ کے ساتھ میک اپ روم میں آ گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ گلے کا ہار بن گئی۔ جلالت نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تمہارے منسٹر شوہر نے تمہیں آنے کیسے دیا؟“

”میں اس کی پابندیوں میں نہیں رہتی۔ ویسے اس نے خود ہی مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ وہ چاہتا ہے' میں اپنی اداؤں سے تمہیں ٹریپ کروں۔ پرسوں دس تاریخ کو وہ ڈمی سورما جہاں نمودار ہوگا' تمہیں وہاں نہ جانے دوں۔ ایسے وقت تمہیں پھانس کر کسی دوسری جگہ مصروف رکھوں۔“

پھر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”وہ تمہارے ساتھ تنہائی میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لیے خود ہی مجھے آزادی دے رہا ہے۔“

اُدھر سیٹ پر مکمل لائٹنگ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ پیشوائے اعظم اور دونوں ربی آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے روبرو پروگرام کا میزبان آ کر بیٹھ گیا۔ ان کے پیچھے دیوار پر بڑا سا سنہری تابوت یہودا جگمگا رہا تھا۔

ایسے ہی وقت اچانک تاریکی چھا گئی۔ ڈائریکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ ”لائٹس آن کرو۔“

ایک لائٹ مین کی آواز سنائی دی۔ ”سر! تمام لائٹس آن ہیں۔ لگتا ہے' کسی تار یا سوئچ میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

اس کی بات مکمل ہوتے ہی ایک محدود اسپاٹ لائٹ روشن ہو گئی۔ پھر سب ہی چونک گئے۔ اس کی محدود روشنی میں وہ تابوت یہودا ایک زوردار آواز سے پھٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر اس کے پیچھے ایک قدآور شخص کا سایہ دکھائی دینے لگا۔

وہ سب دم بخود ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سایہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا تو لائٹس ایک ایک کر کے آن ہونے لگیں۔ آنے والا واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ اسکرپٹ کے مطابق جلالت اسرار کو ایسے ڈرامائی انداز میں آنا چاہیے تھا مگر وہ تو میک اپ روم میں سوزانہ کو خراج تحسین

ادا کر رہا تھا۔

وہ آنے والا پہاڑ جیسا شخص کوئی اور تھا۔ اس نے پیشوائے اعظم کے روبرو آکر گھٹنے ٹیک دیے۔ پھر اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کہا۔ ”میں ہوں تابوتِ یہودا کا امین۔۔۔۔ ہیکل کا ایک اور سورما۔۔۔“

پیشوائے اعظم اور دونوں ربی حیرت و مسرت سے لرزتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ سورما نے ایک ہاتھ بڑھا کر مٹھی کھولی۔ اس کی ہتھیلی پر چاندی کی ایک انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرے باپ دادا نے کہا تھا‘ یہ انگوٹھی ہزاروں سال سے نسل در نسل چلی آرہی ہے۔ ہیکل کی یہ امانت آج میرے پاس ہے۔“

پیشوائے اعظم نے انگوٹھی کو اس کی ہتھیلی پر سے اٹھا کر دیکھا۔ اس پر قدیم عبرانی زبان میں کندہ تھا۔ ”امین۔۔۔“

پیشوائے اعظم نے انگوٹھی کو بڑی عقیدت سے چوم لیا۔ ربیوں نے بھی اسے چوم کر سورما کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ پھر کہا۔ ”ہمارے سامنے گھٹنے نہ ٹیکو۔ کھڑے ہوجاؤ۔“

وہ کھڑا ہوگیا۔ ایسے وقت وہ تینوں اس کے دائیں بازو کو دیکھتے ہی چونک گئے۔ ان کے پہلے سورما کی طرح اس کے بازو پر بھی ایک پیدائشی نشان ستارے کے مانند تھا۔

حالات نے اچانک ہی پلٹا کھایا تھا۔ ایسے وقت جبکہ جلالت اسرار اور اس کے مخالفین اپنے طور پر ایک ایک سورما پیدا کرنے والے تھے۔ اُن سے پہلے ہی شاید ایک اصلی سورما نمودار ہوگیا تھا۔

☆☆☆

مخالفین کے منصوبے کے مطابق ان کا سورما بڑے ہی ڈرامائی انداز میں عجائب گھر سے نمودار ہونے والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی توقع کے خلاف ہیکل کا ایک سورما اسی وقت اسٹوڈیو کے سیٹ پر نمودار ہوگیا تھا۔

جلالت دھماکے کی آواز سن کر سوزانہ سے بولا۔ ”یہ کیسا دھماکا ہے؟“

سوزانہ نے کہا۔ ”اسٹوڈیو کا بھاری سامان گر پڑا ہوگا۔“

”نہیں۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ چلو یہاں سے۔ ہم شوٹنگ کے بعد اپنے بنگلے میں جائیں گے۔ یوں بھی تمہارے شوہر نے مجھے پھانسنے کے لیے تمہیں کھلی چھٹی دے دی ہے۔“

وہ میک اپ روم سے نکل کر تیزی سے چلتے ہوئے سیٹ پر آئے۔ وہاں کی ایک پچھلی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ شوٹنگ کے مطابق جلالت کو ہارڈ بورڈ کی وہ دیوار توڑ کر کیمرے کے سامنے یعنی ناظرین کے روبرو آنا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس سے پہلے ہیکل کا دوسرا سورما آگیا ہے۔ پیشوائے اعظم نے جلالت کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”سولومن یہودا! ہفتے کا دن ہمارے لیے مبارک ہوتا ہے۔ یہ دیکھو تمہارا دوسرا بھائی۔ تمہارا دوسرا ساتھی‘ ہیکل کا دوسرا سورما آگیا ہے۔“

اس نے دوسرے سورما کو دیکھا۔ وہ بھی اسے گہری اپنایت سے دیکھ رہا تھا۔ جلالت نے اس سے کہا۔ ”ابھی ہمارے درمیان جان پہچان ہوگی۔ اعتماد پیدا ہوگا۔ چونکہ پیشوائے اعظم تمہیں ہیکل کا سورما کہہ رہے ہیں۔ اس لیے میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔“

جلالت دونوں بازو پھیلا کر آگے بڑھا۔ دوسرا اس کے سینے سے آکر لگ گیا۔ اس نے کہا۔ ”برادر سولومن یہودا! میرا نام بنجامن یہودا ہے۔ مجھے اپنے باپ دادا سے جو باتیں معلوم ہوتی رہیں‘ وہ میں بیان کرتا رہوں گا۔ شاید تمہارے باپ دادا نے بھی تمہیں وہی باتیں بتائی ہوں گی۔“

پیشوائے اعظم اور دونوں ربّی فون کے ذریعے اعلیٰ حکام اور فوج کے اعلیٰ افسران کو دوسرے سورما بنجامن یہودا کے متعلق خوشخبری سنا رہے تھے‘ ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ سب ابھی اس کا استقبال کرنے کے لیے اسٹوڈیو آجائیں۔

ان اکابرین کے آرام میں خلل پڑ رہا تھا۔ وہ سوالات کر رہے تھے کہ جو اجنبی اسٹوڈیو میں آیا ہے‘ اس پر کیسے یقین کرلیا گیا کہ وہ ہیکل کا دوسرا سورما ہے؟ تمام اکابرین نے پیشوائے اعظم سے کہا۔ ”آپ ٹی وی پروگرام ریکارڈ کرانے کے بعد دونوں سورماؤں کو آرمی ہیڈ کوارٹر میں لائیں۔ ہم وہاں ان کا استقبال کریں گے۔“

وہ پروگرام ریکارڈ ہونے کے تین گھنٹے بعد نشر کیا جانے والا تھا۔ لہٰذا اس کی ریکارڈنگ شروع ہوگئی۔ کیمرا آن ہوتے ہی میزبان نے کہا۔ ”ناظرین! آج ہم آپ کے سامنے ہیکل کے ایک سورما کو پیش کرنے والے تھے۔ مگر یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اچانک ہی دوسرا سورما بھی نمودار ہوگیا ہے۔“

میزبان کے بعد پیشوائے اعظم اور ربیوں نے دنیا کے تمام یہودیوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ بارہ سورما یکے بعد دیگرے آرہے ہیں۔ جب یہ یکجا ہوجائیں گے تو ہمیں

تابوت یہودا کی سوغات پیش کریں گے۔

پھر انہوں نے سولومن یہودا اور بنجامن یہودا کو پہلے اور دوسرے سورما کے طور پر پیش کیا۔ یہ بتایا کہ یہ سورما غیر معمولی ذہنی اور جسمانی قوتوں کے حامل ہیں۔ یہ جب تک یہودی قوم کو تابوت یہودا پیش نہیں کریں گے‘ تب تک انہیں موت نہیں آئے گی اور نہ ہی کوئی انہیں ہلاک کرسکے گا۔

ان بارہ سورماؤں کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان سب کے دائیں بازو پر ایک خاص پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہے۔

کیمرے کے ذریعے سولومن اور بنجامن کے بازوؤں کو کلوز شوٹ میں دکھایا جارہا تھا۔ سوزانہ دور کھڑی شوٹنگ دیکھ رہی تھی۔ اس نے سیٹ سے باہر آکر فون نکالا۔ پھر اپنے منسٹر شوہر ڈیسوزا سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”میں یہاں اسٹوڈیو میں سولومن یہودا کو ٹریپ کررہی ہوں۔ اگر وہ اب بھی مسلمان ہوگا تو میں اس کے اندر سے بہروپیے مسلمان کو باہر نکال لاؤں گی۔“

”ہم یہی چاہتے ہیں۔ اگر تم اسے بے نقاب کرو گی تو پھر ہم ڈمی سورما کا ڈراما نہیں رچائیں گے۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اصل اصل ہی ہوتے ہیں۔ اصل سورماؤں میں جو غیر معمولی صلاحیتیں ہیں‘ وہ صلاحیتیں ہم ڈمی میں پیدا نہیں کرسکیں گے۔“

”تم گھر کب لوٹو گے؟“

”میری مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ آرمی ہیڈ کوارٹر کی میٹنگ کے بعد چند افسران میجر گورین کی رہائش گاہ میں ذاتی میٹنگ کے لیے جمع ہوں گے۔ مجھے واپس آنے میں صبح ہوجائے گی۔“

سوزانہ خوش ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ”میں بھی صبح تک واپس آؤں گی۔“

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ جلالت آرمی ہیڈ کوارٹر سے فارغ ہوکر آتا تو وہ اس کے ساتھ باقی رات گزار سکتی تھی۔

جلالت شام کو اسٹوڈیو آیا تھا۔ رات کے آٹھ بجے شوٹنگ ختم ہوگئی۔ ہیکل کے سورماؤں کا وہ پروگرام رات دس بجے پوری دنیا کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔

وہ دوسرے سورما بنجامن اور پیشوائے اعظم کے ساتھ مصروف تھا۔ ان کے ساتھ آرمی ہیڈ کوارٹر جارہا تھا۔

وہ دونوں اپنے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ایک ائیر کنڈیشنڈ گاڑی میں جارہے تھے۔ پیشوائے اعظم نے کہا۔ ”بنجامن یہوداہ! اپنی ہسٹری بتاؤ۔ تم کون ہو اور اب تک کہاں تھے؟“

وہ بولا۔ ”مجھے بچپن ہی سے پہلوانی کا شوق تھا۔ میری ماں کہتی تھی‘ میرے باپ دادا جسمانی طور پر بہت ہی طاقتور تھے۔ پچیس برس کی عمر میں ماں کا انتقال ہوگیا۔ میں نے ریسلنگ کے مقابلے میں اپنا نام درج کرایا۔ میں کتنا طاقتور ہوں‘ اس وقت مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا۔

جب ہزاروں تماشائیوں کے سامنے مقابلے شروع ہوئے تو سب ہی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں نے مقابلے پر آنے والے نامی گرامی پہلوانوں کو اٹھا اٹھا کر رنگ کے باہر پھینک دیا تھا۔

ریسلنگ کے آرگنائزر نے مجھے دس لاکھ ڈالرز دیے۔ اگرچہ یہ بڑی رقم تھی لیکن میں دوبارہ ریسلنگ کے لیے نہیں گیا۔ مجھے غیر معمولی جسمانی قوت کی نمائش گوارا نہیں تھی۔

میں تنہا تھا۔ مختلف اداروں میں سیکورٹی افسر کے طور پر ملازمت کرتا رہا۔ میرے اندر اچھی عادتیں ہیں لیکن ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ میں حسین عورتوں کا رسیا ہوں۔“

ایک ربی نے جلالت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سولومن بھی ایسا ہی ہے۔ ہم اس کی طرح تمہاری بھی ہر ضرورت پوری کرتے رہیں گے۔“

بنجامن نے کہا۔ ”جب میں پچاس برس کا ہوا تو ایک رات خواب میں ہیکل کا منظر دیکھا۔ تب سے میرا من مزاج بدل گیا۔“

ایک ربی نے پوچھا۔ ”تم نے خواب میں کیا دیکھا؟“

وہ بولا۔ ”میں نے دیکھا‘ رات کا وقت ہے۔ میں کچھ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ ہم سب نے سر سے پاؤں تک سفید لبادہ پہنا ہوا تھا۔ ہمارے اوپری آدھے چہرے چھپے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں روشن شمع دان تھیں‘ ہم ہیکل کے کسی حصے سے گزر رہے تھے اور زیرلب قدیم عبرانی زبان میں کہتے جارہے تھے۔۔۔

ہم ہیں تابوت یہودا کے امین۔۔۔۔ خداوندِ یہودا! ہم ہیں تابوت یہودا کے امین۔۔۔۔“

پیشوائے اعظم اور دونوں ربّی بڑے ہی جذباتی انداز میں جیسے دم سادھے سن رہے تھے۔ جلالت اسرار بڑی توجہ سے بنجامن کو تک رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ ایک سچا خواب بیان کررہا ہے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم شمع دان اٹھائے ہیکل کے ایک ایسے حصے میں پہنچے‘ جہاں کا فرش دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

ہمارے سامنے چار فٹ کا خلا پیدا ہو گیا۔ نیچے ایک تہ خانہ تھا۔ ہم آگے پیچھے دو دو کی تعداد میں سیڑھیاں اترنے لگے۔ تب میں نے گنتی کی، ہم بارہ افراد تھے۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "یعنی تم ہیکل کے گیارہ سورماؤں کے ساتھ تھے؟ پلیز یاد کرو اور بتاؤ' ہیکل کے کس حصے میں وہ تہ خانہ ہے؟"

وہ بولا۔ "میں کبھی ہیکل میں نہیں گیا۔ پہلی بار اسرائیل آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے آگے بولو۔ اس تہ خانے میں تم سب کہاں گئے تھے؟"

"وہاں ایک بہت بڑا صندوق تھا۔ وہ خالص سونے کا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک نے اس پر لگے ہوئے تالے کو کھینچ کر دیکھا پھر یک زبان ہو کر کہا' یہ محفوظ ہے۔"

ربی نے کہا۔ "یقیناً وہ تابوتِ یہودا تھا۔ آگے بولو۔"

"آگے کچھ نہیں تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ خواب کا منظر گم ہو گیا۔ میں جیتی جاگتی دنیا میں آ گیا۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "تمہارا خواب سچا ہے۔ تم یہودی قوم کی امانت تک گئے تھے۔"

بنجامن نے کہا۔ "میری ماں نے مجھے قدیم عبرانی زبان سکھائی ہے۔ میں نے دو ہزار برس پہلے لکھی ہوئی کتاب "ہیکل کے سورما" پڑھی ہے۔ میری ماں کہتی تھی' کتاب میں جو نشانیاں دی گئی ہیں۔ ان کے مطابق تم ہیکل کے سورما ہو۔

ماں کی یہ بات میرے ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔ ایک بار میں نے ایک میگزین میں ہیکل کی تصویر دیکھی تو مجھ پر وجد طاری ہو گیا۔ میں آگے پیچھے جھومنے لگا۔

پھر یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ مجھے اسرائیل جانا چاہیے۔ وہاں ہیکل کی چار دیواری میں جاؤں گا تو دلی سکون حاصل ہوگا۔

آج سے تین دن پہلے اخبار میں مختصر سی خبر پڑھی۔ لکھا تھا' اسرائیلی ربیوں کے دعوے کے مطابق ہیکل کا پہلا سورما آ گیا ہے۔ جلد ہی دوسرا بھی آئے گا۔

یہ پڑھتے ہی میں نے سفر کی تیاری شروع کی۔ آج یہاں ایک بجے کی فلائٹ سے آیا۔ پھر ہوٹل میں سامان رکھ کر سیدھا ہیکل میں گیا۔ وہاں تھوڑی دیر عبادت کی تو مجھ پر سحر طاری ہونے لگا۔

شام کو وہاں سے نکلا تو اپنے آپ میں نہیں تھا۔ رینٹڈ کار ڈرائیو کرتا ہوا ٹی وی اسٹوڈیو میں چلا آیا۔ مجھ پر ایک بے خودی کا عالم تھا۔ اسٹوڈیو کے اندر آیا تو اچانک ہی بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا تھا' تاریکی میں ایک ہارڈ بورڈ کی دیوار نے راستہ روکا۔

میں کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ اس کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں نے دیوار پر ایک گھونسا مارا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ایسے وقت روشنی بھی ہو گئی۔ اس وقت جیسے میری ماں میرے اندر سما گئی تھی' وہ کہہ رہی تھی کہ میں ہیکل کا سورما ہوں اور میں یہی کہتا ہوا پیشوائے اعظم کے قدموں میں جھک گیا۔"

پیشوائے اعظم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خداوند یہودا ہم پر مہربان ہے۔ ہماری کامیابی و کامرانی کے دن آ رہے ہیں۔"

وہ آرمی ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ وہاں ایک بڑے ہال میں تمام اکابرین موجود تھے۔ دو سورماؤں کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے لیے انواع و اقسام کی ڈشیں تھیں اور شراب کی ٹرالیاں بھی چل رہی تھیں۔

اکابرین نے بڑی گرمجوشی سے بنجامن یہودا کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے۔ وہاں صرف دو سورما اور مذہبی رہنما تھے' جو شراب سے پرہیز کر رہے تھے۔ جلالت کی طرح بنجامن یہودا بھی نشے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

آرمی کے ایک افسر نے پوچھا۔ "آپ شراب کو منہ نہیں لگاتے اور عورت کو.....!"

بنجامن نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ ہماری ضرورت ہے۔ پھر اسے ہماری ضرورت ہو تو ہم ہمیشہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ورنہ اسے چھوڑ کر دوسری کی آرزو کرتے ہیں۔"

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ہم نے سنا ہے' سولومن یہودا کی طرح بنجامن یہودا کے دائیں بازو پر بھی ایک پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہے؟"

"بے شک ہے۔ دونوں کے بازوؤں پر یکساں نشان ہے۔ آپ حضرات قریب آ کر دیکھ سکتے ہیں۔"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "آپ مائنڈ نہ کریں' ہم نے پلاسٹک سرجری کے دو ماہرین کو یہاں بلایا ہے۔ ایسے نشانات سرجری کے ذریعے بنائے جا سکتے ہیں۔"

بنجامن نے کہا۔ "میں مائنڈ نہیں کروں گا۔ آپ کے ماہرین آئیں اور معائنہ کریں۔"

دو ماہرین اس کے قریب آئے۔ انہوں نے بازو کے اس نشان پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس پر لوشن لگا کر ایک

منٹ تک انتظار کیا۔ اس کے بعد محدب شیشوں کے ذریعے بہ غور معائنہ کرنے لگے۔

پھر انہوں نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "پلاسٹک سرجری نہیں ہے۔ یہ واقعی پیدائشی نشان ہے۔"

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "پہلے سورما سولومن یہودا میں یہ عجیب و غریب بات ہے کہ یہ ناقابل برداشت اذیتیں سہنے کے دوران نہ چیختا اور تڑپتا ہے' نہ کراہتا ہے۔"

ایک ربی نے کہا۔ "بنجامن یہودا بھی ایسی ہی قوتِ برداشت کا حامل ہے۔"

وہاں سوزانہ کا شوہر' جلالت کا دشمن منسٹر ڈیسوزا بھی موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم بنجامن کی قوتِ برداشت کو آزمائیں گے۔"

بنجامن نے کہا۔ "بے شک آزمائیں۔ لیکن فرسٹ ایڈ کا سامان بھی رکھیں تاکہ مجھے فوری طبی امداد دی جا سکے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ یہاں پہلے سے تمام انتظامات کیے جا چکے ہیں۔"

منسٹر ڈیسوزا ایک چھوٹا سا پش فائر لے کر دونوں سورماؤں کے قریب آیا پھر بنجامن سے بولا۔ "میں آگ لگا رہا ہوں۔ تم اسے خود بجھاؤ اور اس کی جلن برداشت کرو۔"

پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سب ہی کی نظریں بنجامن پر جمی ہوئی تھیں۔ منسٹر نے اس سے چار قدم کا فاصلہ رکھ کر پش فائر کا بٹن دبایا۔ "شوں۔ اوں اوں..." کی آواز کی ساتھ ایک شعلہ سا لپکا اور بنجامن کے لباس میں آگ لگ گئی۔

آگ ایسی زبردست تھی کہ اسے فوراً بجھایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے اپنا لباس پھاڑتے ہوئے اسے جسم سے اتار کر دور پھینک دیا۔ ذرا سی دیر میں اس کے بدن پر آبلے پڑ گئے۔ کہیں کہیں سے کھال جل گئی تھی اور گوشت جھلک رہا تھا۔

اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اب بھی کس قدر آگ کی جلن محسوس کر رہا ہوگا؟ لیکن منہ سے کراہنے کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ناقابل برداشت تکلیف کو کمال صبر و ضبط سے برداشت کر رہا ہے۔

ایک ربی نے چیخ کر کہا۔ "اینٹی فائر لوشن لگایا جائے۔ ہمارا یہ سورما آزمائش سے گزر چکا ہے۔"

دشمنی تو جلالت سے تھی۔ اچانک ہی منسٹر نے اس کی سمت پش فائر کا بٹن دبایا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور جلالت آگ میں نہا گیا۔

منسٹر کی شامت آ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا۔ جلالت اپنا جلتا ہوا لباس اتار کر پھینکنے کے بجائے چھلانگ مار کر اس سے لپٹ گیا۔

گویا موت اس سے لپٹ گئی۔ آگ اسے بھی جلانے لگی۔ وہ چیخیں مار کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوششیں کرنے لگا مگر آہنی شکنجے میں تھا' نکل نہیں سکتا تھا۔ تمام اکابرین چیخ رہے تھے۔ "سولومن! اسے چھوڑ دو۔ دوڑو۔ پانی لاؤ۔ ان پر ڈال دو۔"

سب چیخ رہے تھے۔ کوئی آگ کے قریب نہیں آ رہا تھا۔ بنجامن نے آگے بڑھ کر دونوں کو الگ کیا۔ جلالت کے لباس کو پھاڑ کر دور پھینک دیا۔ پھر منسٹر کی طرف دیکھا۔ وہ فرش پر گر کر تڑپ رہا تھا۔

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "بنجامن! اس کا لباس بھی الگ کر دو۔ اسے بھی بچاؤ۔"

وہ گرج کر بولا۔ "ہرگز نہیں۔ یہ صرف مجھے آزمانے آیا تھا۔ پھر اس نے میرے برادر سورما سے دشمنی کیوں کی؟ ہم سورما ہیں۔ دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔"

اس وقت تک پانی لا کر اس پر ڈالا گیا۔ آگ بجھ گئی۔ لیکن وہ بری طرح جلنے کے باعث بیہوش ہو گیا تھا۔ آرمی کے جوان اسے فوراً ہی اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال لے جانے لگے۔

چند اکابرین غصہ دکھا رہے تھے۔ جلالت کے خلاف بول رہے تھے۔ میجر گورین نے کہا۔ "اگر منسٹر ڈیسوزا کی موت ہو گی تو سولومن کو سزائے موت دی جائے گی۔"

جلالت نے کہا۔ "موت میری نہیں ہو گی۔ سزائے موت دینے والوں کی ہو گی۔ تم اپنی خیر مناؤ۔"

بنجامن نے کہا۔ "تم کتنے خود غرض لوگ ہو۔ اپنے منسٹر کو تو اسپتال پہنچا دیا۔ ہم دو سورما بری طرح جل چکے ہیں۔ ہمیں کوئی مرہم تک نہیں لگا رہا ہے۔"

ایک ربی نے ہال میں داخل ہو کر کہا۔ "میں تمہارے لیے مرہم لینے گیا تھا۔ یہ زود اثر ہے' ابھی آرام آ جائے گا۔"

دونوں سورماؤں نے وہ مرہم لے کر ایک دوسرے کے بدن پر لگایا۔ وہ اس بری طرح جل گئے تھے کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اور سب لوگ یہ دیکھ رہے تھے کہ وہ ایسی حالت میں بھی تکلیف سے نہیں کراہ رہے تھے۔ یہ ثابت کر چکے تھے کہ وہ ہیکل کے سورما ہیں۔

فون کال کے ذریعے اطلاع ملی کہ منسٹر ڈیسوزا نے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہے۔ جلالت کے مخالفین چیخ چیخ کر مطالبہ کرنے لگے کہ سولومن کو گرفتار کر کے آہنی

سلاخوں کے پیچھے ڈالا جائے۔ اسے سزائے موت نہ ملی تو ہم اسے گولی ماردیں گے۔

مخالفین کم تھے۔ ان سورماؤں سے متاثر ہونے والے حمایتی زیادہ تھے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مسٹر ڈیسوزا نے خوامخواہ دشمنی کی تھی۔ پہلے اس نے سولومن کو آگ سے جلانا چاہا۔ اس کے بعد سولومن نے جوابی کارروائی کی۔ اس کی آگ اسے ہی لگادی۔“

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”مسٹر ڈیسوزا اپنی لگائی ہوئی آگ سے خود ہی جل مرا ہے۔ سولومن یہودا بے قصور ہے۔“

اکابرین کی اکثریت جلالت اسرار کی حمایت میں بولنے لگی۔ یوں آرمی ہیڈ کوارٹر میں ہونے والی میٹنگ برخاست ہوگئی۔

پیشوائے اعظم نے دونوں سورماؤں سے کہا۔ ”جلے ہوئے بدن کا علاج انتہائی نگہداشت میں کیا جائے گا۔ تم دونوں وی آئی پی اسپتال کے آئی سی یو میں رہو گے۔“

جلالت نے کہا۔ ”ہمارے علاج کے لیے یہ مرہم ہی کافی ہے۔ کل شام تک آپ ہمارے جسموں کو جلا ہوا نہیں پائیں گے۔ فی الحال بنجامن یہودا کے لیے رہائش گاہ کا انتظام کریں۔ میں اپنے بنگلے میں جاکر آرام کروں گا۔“

وہ ان سے رخصت ہوکر بنگلے میں آیا۔ سوزانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بدن کو حیرانی سے دیکھنے لگی۔ وہ صرف ایک نیکر پہنے ہوئے تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں ڈیسوزا کی موت کی اطلاع نہیں ملی؟“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”ہاں۔ میں ابھی اسپتال میں اس کی جلی ہوئی لاش دیکھ کر آرہی ہوں۔“

”اس کی تدفین سے پہلے تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”ابھی اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ پولیس کارروائی ہوگی۔ کل دوپہر سے پہلے تدفین نہیں ہوسکے گی۔ مجھے جانا ہوگا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔“

وہ قریب آکر دور نہیں جانا چاہتی تھی لیکن گھر جاکر ماتمی لباس پہن کر ایک بیوہ کا رول ادا کرنا تھا۔ لہٰذا حالات سے مجبور ہوکر چلی گئی۔

☆☆☆

مونیکا قاہرہ سے ٹرین کے ذریعے اسکندریہ آئی پھر ایک ٹیکسی میں مصر اور اسرائیل کے سرحدی شہر رفاہ پہنچ گئی۔ اس شہر کے مضافات میں خانہ بدوشوں کی بستی ہے۔ یہ خانہ بدوش خیموں میں رہتے ہیں۔ گھریلو کھانے پینے کے سامان، ٹی وی، کمپیوٹر اور جدید اسلحہ غیر قانونی طور پر فروخت کرتے ہیں۔ جب مصری اور اسرائیلی آرمی چھاپا مارتی ہیں تو یہ فرار ہوجاتے ہیں۔ پھر ان کے جاتے ہی پلٹ آتے ہیں۔ ان کا کچھ سامان آرمی والے لے جاتے ہیں لیکن ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ اسمگلنگ کا مال ہوتا ہے۔ مفت میں آتا ہے، مفت میں چلا جاتا ہے۔ وہ خانہ بدوش اسمگلر فلسطینیوں سے معقول رقم، بھیڑ بکریاں، کینو اور مالٹے لے کر انہیں اناج سے لے کر اسلحہ تک دیتے ہیں اور کسی ضرورت مند کو چور راستوں سے غزہ پہنچادیتے ہیں۔

انہوں نے مونیکا کو بھی غزہ پہنچایا تھا۔ حماس کے لیڈروں نے بڑی گرمجوشی سے اس استقبال کیا۔

عمر محمود نے کہا۔ ”فی الحال تمہاری دربدری ختم ہوگئی ہے۔ یہاں اسرائیلی کتے تمہاری بو سونگھتے ہوئے نہیں آئیں گے۔“

ایک اور رہنما عبدالباری نے کہا۔ ”ہم جلالت اسرار کے بارے میں بہت کچھ سننا چاہتے ہیں۔ تمہیں پہلے تمہارے گھر پہنچائیں گے۔ وہاں تم غسل کروگی۔ کھا پی کر تھکن دور کروگی۔ پھر ہم باتیں کریں گے۔“

مونیکا نے حیرانی سے پوچھا۔ ”میرا گھر یہاں کہاں ہے؟“

عبدالباری نے پوچھا۔ ”کیا جلالت اسرار کا گھر تمہارا گھر نہیں ہے؟“

وہ خوش ہوگئی۔ عمر محمود نے کہا۔ ”وہاں جلالت کا بیٹا ایان ایک مختصر سی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ آؤ۔ ہم وہاں چلتے ہیں۔“

مونیکا اپنے جلالت اسرار کے گھر میں پہنچی۔ عمر محمود نے پہلے ایان کا تعارف کرایا۔ ”یہ جلالت کا بیٹا ہے۔ بارہ برس کا ہے مگر اپنے باپ کی طرح قدآور ہوتا جارہا ہے۔“

مونیکا نے اس کے دونوں شانوں پر یوں ہاتھ رکھا، جیسے جلالت کو چھو رہی ہے۔

غزہ کے ہر گھر میں بھیڑ بکریاں پالی جاتی تھیں۔ وہ مویشی ان کا بہت بڑا سہارا تھے۔ جب سرحدیں کھلتی تھیں تو وہ ان مویشیوں کے عوض اناج حاصل کرتے تھے۔

اسرائیلی اس خوش فہمی میں تھے کہ جب چاہیں گے، سرحدیں بند کرکے انہیں بھوکا ماردیں گے۔ لیکن خدا نے جب پیدا کیا ہے تو پیٹ بھرنے کے وسائل بھی پیدا کیے ہیں۔

ان محصور مسلمانوں سے زرخیز زمینیں چھین لے گئی تھیں۔ انہوں نے اناج اور دیگر ضروری چیزیں حاصل کرنے کے چور راستے نکال لیے تھے۔ یہ راز بہت عرصے بعد کھلا کہ وہ محنت کش فلسطینی زیرزمین سرنگیں کھودتے ہوئے

اسرائیل اور مصر کے ایسے ویران علاقوں میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں اسمگلر ان کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ کینو، مالٹے اور سیکڑوں بھیڑ بکریوں کے عوض انہیں اناج کی بوریاں اور اسلحہ دیتے ہیں۔ مصر اور اسرائیل میں روپوش رہنے والے فلسطینی اور عرب مہاجر انہیں امریکی ڈالرز، برطانوی پاؤنڈز اور یورو دیتے ہیں۔ جن کے عوض وہ اسمگلروں سے زیادہ مال خرید کرلے جاتے ہیں۔

زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ انسان کا حوصلہ اپنی ضرورت پوری کرنے لیے آسمان پر کمند ڈالتا ہے اور زمین کی تہ میں سرنگیں بناتا ہے۔

وہ فلسطینی بھی یہی کررہے تھے۔ انہوں نے باہر کی دنیا سے کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے زمین کے اندر راستے بنائے ہیں۔

کئی جرائد نے لکھا ہے۔ ”انہوں نے زیرزمین میلوں دور تک سرنگیں بنائی ہیں۔ ان کی محنت و مشقت اور حوصلے کی مثال نہیں ملتی۔ یہ اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے کتنی سرنگیں بنائی ہیں اور ان کے ذریعے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے غزہ سے باہر کہاں کہاں نکل آتے ہیں؟“

یہ انکشاف ہوتے ہی اسرائیلی چونک گئے تھے۔ ان کے جاسوس غزہ کے اطراف میلوں دور تک سرنگوں کا سراغ لگانے لگے۔ کئی دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ دو سرنگوں کے دہانے تک پہنچ گئے۔ یہ یقین تھا کہ فلسطینی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کسی دن، کسی وقت وہاں سے باہر نکلیں گے۔ انہوں نے وہاں مورچے بنالیے، ان کی تاک میں بیٹھ گئے۔ دو دن، چار دن گزر گئے۔ پھر ہفتہ گزر گیا۔ ایک چوہا بھی وہاں سے نہیں نکل رہا تھا۔ وہ جھنجلا گئے۔

اگر چاہتے تو ان سرنگوں میں داخل ہوکر غزہ کی آبادی میں پہنچ جاتے مگر زندہ واپس نہ آتے۔ یہ سمجھ گئے تھے کہ مسلح فلسطینی ان کی مورچہ بندی سے آگاہ ہوچکے ہیں اور ان سرنگوں میں دور کہیں مقابلے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

انہوں نے دونوں سرنگوں کے دہانوں پر بم دھماکے کیے۔ ادھر سے باہر کی دنیا میں آنے کے راستے بند کردیے۔ پھر وہاں چند فوجیوں کو پہرے داری کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔

اُن خفیہ سرنگوں کے متعلق جو سچائی ہے، اسے یہاں آشکار نہیں کیا جائے گا۔ جانباز فلسطینیوں کا راز تمام مسلمانوں کا راز ہے اور مسلمانوں کی دعا ہے کہ اسرائیلی ان سرنگوں تک کبھی نہ پہنچیں۔

یا اللہ! مسلم حکمران کچھ نہیں کرتے۔ عام مسلمان کیا کریں؟ صرف تجھ سے ہی فلسطینیوں کی اور فلسطین کی سلامتی اور بقا چاہتے ہیں۔

☆☆☆

مونیکا کا اسلامی نام ورقہ رکھا گیا تھا۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر دوسرے کمرے میں پارٹی کے رہنماؤں کے پاس آگئی۔ ذابر کی بیوی نے سب کے لیے کھانا لگایا۔

عمر محمود نے کہا۔ ”باہر سے زیادہ گھر کے دشمن خطرناک ہوتے ہیں۔ یہاں کئی اسرائیلی ایجنٹس ہیں، جو گھر کے بھیدی بن کر یہاں کے راز اسرائیلیوں تک پہنچاتے ہیں۔“

ورقہ نے کہا۔ ”ہمارے لوگ یقیناً ان پر نظر رکھتے ہوں گے؟“

”ہاں۔ وہ سب ہماری نظروں میں ہیں اور غزہ کے مغربی کنارے رہتے ہیں۔ ہم انہیں اپنی بستیوں میں آنے نہیں دیتے پھر بھی آستین میں چھپے ہوئے سانپ دکھائی نہیں دیتے۔ کچھ ایسے ہیں، جو ہماری آبادیوں میں گھل مل گئے ہیں۔ انہیں ڈھونڈ نکالنا بہت ضروری ہے۔“

”میں یہاں کی ہر عورت اور مرد پر کڑی نظر رکھوں گی۔“

عبدالباری نے کہا۔ ”ہمارا سب سے اہم راز خفیہ سرنگیں ہیں۔ ہم ان سرنگوں کے داخلی راستوں کو بہت خفیہ رکھتے ہیں۔ اگر اسرائیلیوں کو ان راستوں کا علم ہوگا تو وہ فضائی حملے کرکے انہیں تباہ کردیں گے۔ ہمارے زیرزمین راستے بند ہوجائیں گے۔ باہر کی دنیا سے خفیہ رابطہ ختم ہوجائے گا۔“

”بیشک۔ سرنگیں ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ میں کسی سرنگ کے دہانے کی دن رات نگرانی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری وہاں ڈیوٹی لگائیں۔“

”تم ہماری ایک بڑی اہم سرنگ کے پاس رہتی ہو۔ جلالت کے گھر کے احاطے میں جو خشک کنواں ہے۔ وہاں سے سرنگ کا راستہ جاتا ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ پریشان ہوگئی۔ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنے لگی۔ عمر محمود نے کہا۔ ”تم اچانک پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ کیا بات ہے؟“

وہ بولی۔ ”مجھے وہاں نہیں رہنا چاہیے۔“

”کیوں نہیں رہنا چاہیے؟“

”اسرائیلی میرے خون کے پیاسے ہیں۔ یہاں سے ان کا کوئی ایجنٹ اطلاع دے گا کہ میں نے جلالت کے گھر میں رہائش اختیار کی ہے تو وہ فضائی حملہ کرکے وہاں بم گراسکتے ہیں۔ میں مروں نہ مروں، مگر وہ سرنگ تباہ ہوجائے گی۔“

تمام رہنماؤں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے کہا۔ ”ہم نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔ واقعی مخبری ہوسکتی ہے کہ تم اس گھر میں رہتی ہو۔ وہ تم پر جھنجلائے ہوئے ہیں۔ اس گھر پر بمباری کر سکتے ہیں۔“

عبدالباری نے کہا۔ ”تم اس گھر کی طرف نہ جاؤ۔ ہم یہ خبر پھیلائیں گے کہ تمہاری رہائش گاہ بدل گئی ہے۔ اسرائیلی ایجنٹوں تک یہ بات پہنچے گی کہ تم ہر دوسرے تیسرے دن رہائش گاہ بدلتی رہتی ہو۔“

پھر یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ جلالت کے مکان کی طرف نہیں گئی۔ ایک بڑی اہم سرنگ کی حفاظت ہر حال میں لازمی تھی۔ اسے وہاں سے دور دوسری فیملی کے ساتھ رہنے کے لیے ایک کمرا مل گیا۔

تیسرے دن ٹی وی چینل کے ذریعے اعلان ہوا کہ رات کے دس بجے ہیکل کے سورما کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یہ ثابت کیا جائے گا کہ یہودیوں کی ایک دینی کتاب میں کتنی سچی پیشگوئی کی گئی ہے۔

غزہ میں تباہ حال گھرانے تھے۔ ہر گھر میں ٹی وی نہیں تھا۔ یہ تو سب ہی کو معلوم ہوگیا تھا کہ جلالت اسرار ہیکل کا سورما ہے۔ سب ہی عورتیں، بچے، بوڑھے اُس سورما کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

سب نے یہ طے کیا کہ جس کے گھر میں ٹی وی ہے، وہ اسے محلے کی گلی اور چوراہے پر لاکر رکھے۔ تاکہ پورا محلہ اپنے جلالت اسرار کو دیکھ سکے۔ وہ غزہ سے گرفتار ہوکر گیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ آج اسے دیکھنے والے تھے۔ ورقہ کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بہت دنوں کے بعد اپنے محبوب کا دیدار کرنے والی تھی۔

ایان کا دل بھی باپ کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ وہ شرمندہ تھا۔ اس کی غلط بیانی کے باعث باپ قیدی بن کر اسرائیلیوں کے شکنجے میں پہنچ گیا تھا۔

رات کے نو بجے سے ہی جگہ جگہ چوراہوں اور محلوں میں ٹی وی کے سامنے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کی بھیڑ لگ گئی۔ دس بجے پروگرام شروع ہوا تو پیشوائے اعظم نے کہا۔ ”آج ہم ایک سورما کو پیش کرنے والے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اچانک ہی دوسرا سورما نمودار ہوگیا ہے۔“

اسکرین پر پہلے اس دوسرے سورما کو پیش کیا گیا۔ اس سے گفتگو ہونے لگی۔ تمام فلسطینی بیزار ہوگئے۔ انہیں ہیکل کے کسی سورما سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے سورما کو دیکھنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر ان کا مطلوب و محبوب اسکرین پر نظر آیا۔ سب ہی خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ ان لمحات میں پورا غزہ تالیوں سے گونج رہا تھا۔ وہ مجاہد جو قیدی بن کر اسرائیل گیا تھا۔ وہاں یہودی ربیوں کے سر کا تاج بن گیا تھا۔

ایان باپ کو دیکھ کر خوشی سے رونے لگا۔ ورقہ نے پوچھا۔ ”کیوں رو رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ندامت سے رو رہا ہوں کہ میں نے بابا پر الزام لگا کر نظروں سے گرا دیا تھا اور خوشی سے بھی رو رہا ہوں۔ انہیں گرا نہ سکا، وہ بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔“

ورقہ بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے باپ کو سحر زدہ ہوکر دیکھ رہی تھی۔ اس کے جی میں آرہا تھا کہ آگے بڑھ کر اسے چھو لے۔ پیشوائے اعظم اور ربّی کہہ رہے تھے کہ آئندہ اور دس سورما آئیں گے۔ پھر یہ بارہ سورما یہودی قوم کو وہ تابوت یہودا پیش کریں گے۔ اس کی برکت سے یہودی قوم قیامت تک سلامت رہے گی۔ باقی تمام مذاہب اس دنیا سے نابود ہوجائیں گے۔

یہ بات سن کر تمام فلسطینی لعنت بھیج رہے تھے اور کامل یقین سے کہہ رہے تھے کہ ہمارا اسلام قیامت تک رہے گا۔

ان ربّیوں نے کہا۔ ”سورماؤں کی سب سے اہم پہچان یہ ہے کہ ان کے دائیں بازو پر ایک پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہوتا ہے اور وہ تمام نشانات ایک جیسے ہوتے ہیں۔“

ورقہ نے ایان کے بارے میں سوچا۔ اس کے دائیں بازو پر بالکل ویسا ہی نشان تھا۔ اس نے عمر محمود سے کہا۔ ”اگر سورماؤں کی سب سے اہم پہچان وہ بازو کا نشان ہے تو پھر ایان کو بھی ہیکل کا سورما کہنا چاہیے۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ بچہ ہے۔ سورما کیسے بن جائے گا؟“

ورقہ نے پوچھا۔ ”کیا آپ نے ایان کو تکلیف میں روتے یا کراہتے دیکھا ہے؟“

”میں نے اسے ماں کی موت پر روتے دیکھا ہے۔“

”وہ تو ماں کے لیے صدمہ تھا۔ ایک جذباتی معاملہ تھا۔ کیا وہ دکھ، تکلیف یا اذیت سہتے وقت ہائے ہائے کرتا ہے؟“

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اس نے یہاں آکر مختلف ہتھیاروں سے نشانہ بازی سیکھی ہے۔ جنگی مشقوں کے دوران کئی بار زخمی ہوا، مگر میں نے اسے روتے یا کراہتے نہیں دیکھا۔ جبکہ بچے ہوں یا بڑے سب ہی زخمی ہوکر کراہتے ضرور ہیں۔ ایسے وقت ہم اس کی تعریفیں کرتے

تھے اور کہتے تھے، وہ اپنے باپ کی طرح جیدار ہے۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر نئی رہائش گاہ کی طرف جانے لگی۔ عمر محمود نے کہا۔ ”سنو...!“

وہ رک گئی۔ اس نے کہا۔ ”کسی کے سامنے یہ بات زبان پر نہ لاؤ کہ ایان کے بازو پر باپ دادا کے جیسا پیدائشی نشان ہے۔ اس لیے وہ بھی ہیکل کا سورما ہوسکتا ہے۔ یہ بات اسرائیلیوں اور ان کے ربیوں تک پہنچے گی تو وہ ایان کو حاصل کرنا چاہیں گے۔“

عبدالباری نے کہا۔ ”اگر ان کے گیارہ سورما یکجا ہوجائیں گے تو وہ گنتی پوری کرنے کے لیے ایان کو بارہواں سورما بنانا چاہیں گے۔“

ورقہ نے کہا۔ ”ہاں۔ اگرچہ یہ مضحکہ خیز بات ہے لیکن وہ اپنی دینی کتاب کی پیشگوئیاں سچ ثابت کرنے کے لیے ایسا کرسکتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں ایان کے سلسلے میں ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ دفتر کے باہر ایک خاتون اس کی منتظر تھی۔ جس کے خاندان میں اب اسے بھی جاکر رہنا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

وہاں جو اسرائیلی ایجنٹ تھے، وہ ایان کو اور اس کے بازو کے نشان کو بچپن سے دیکھتے آرہے تھے۔ اس رات انہوں نے پیشوائے اعظم کی باتیں سنیں کہ ہیکل کے سورماؤں کی ایک خاص پہچان ان کا پیدائشی نشان ہے۔

دو دنوں کے بعد ایک اسرائیلی ایجنٹ کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اپنے آقاؤں سے ایان کے سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔ یہ بات ان یہودیوں کے لیے اہم ہوسکتی ہے۔

اس نے اسرائیلی انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر سے فون پر رابطہ کیا۔ افسر نے پوچھا۔ ”کیا رپورٹ ہے؟“

وہ بولا۔ ”سر! مونیکا کا نام بدل گیا ہے۔ وہ ورقہ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اس نے رہائش گاہ بدل دی ہے۔ صبح تک معلوم ہوگا، وہ کہاں رہنے گئی ہے؟“

افسر نے کہا۔ ”جہاں بھی موقع ملے، اسے گولی سے اڑا دو۔“

اس زرخرید شخص نے کہا۔ ”سر! ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ ٹی وی پر پیشوائے اعظم نے کہا تھا کہ جس کے بازو پر ایک خاص پیدائشی نشان ہوگا، وہ ضرور ہیکل کا سورما ہوگا۔ یہاں غزہ میں ایک بارہ برس کے لڑکے کے بازو پر ویسا ہی پیدائشی نشان ہے۔ وہ بناوٹی نہیں ہے۔ ہم بچپن سے اسے دیکھتے آرہے ہیں۔“

”اس کا نام ایان ہے اور وہ ہیکل کے پہلے سورما سولومن یہودا کا بیٹا ہے۔“

”اوہ گاڈ! وہ ہمارے پہلے سورما کا بیٹا ہے۔ میں ابھی اعلیٰ افسران سے اور پیشوائے اعظم سے بات کرتا ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کردیا۔

پھر پیشوائے اعظم سے پوچھا۔ ”کیا سولومن یہودا کے بیٹے ایان کو ہیکل کا سورما کہا جاسکتا ہے؟“

پیشوائے اعظم نے کہا۔ ”یہ بہت ہی روحانی اور جذباتی حقیقت ہے۔ یقیناً سولومن کے بیٹے کے بازو پر ویسا ہی پیدائشی نشان ہوگا۔ اب یہ معلوم کرنا ہے کہ باپ کی طرح بیٹے میں بھی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں یا نہیں؟ ہم اس سلسلے میں ابھی سولومن سے بات کریں گے۔“

وہ بات تو کرنے والے تھے۔ اس سے پہلے یہ ارادہ دماغ میں پکنے لگا کہ ایان میں باپ کی طرح غیر معمولی صلاحیتیں ہوں گی تو اسے ضرور ہیکل کا سورما تسلیم کیا جائے گا۔ چونکہ ابھی وہ کم سن ہے، اس لیے اسے دنیا والوں پر ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ آئندہ بارہ کی گنتی پوری کرنے کے لیے اسے ایک اثاثے کے طور پر محفوظ رکھا جائے گا۔

☆☆☆

جلالت نے فون پر نمبر پنچ کیے پھر ایک ربّی سے پوچھا۔ ”بنجامن کا کیا حال ہے؟“

ربّی نے کہا۔ ”میں اسپتال میں ہوں۔ بنجامن کی حالت تشویشناک ہے۔ جو آبلے پڑ گئے تھے، وہ پھوٹ رہے ہیں۔ ان میں سے مواد بہہ رہا ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی تھا، کھال بری طرح جل گئی تھی۔ اندر سے گوشت جھلک رہا تھا۔ ڈاکٹر دوائیں لگاتے ہیں تو وہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔“

پھر ربّی نے رازدارانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ذرا دھیمی آواز میں کہا۔ ”ایک بات ہمارے دعوے کے خلاف ہورہی ہے۔ بنجامن سے تکلیف اور جلن برداشت نہیں ہورہی ہے۔ یہ آنکھیں بند کیے کراہ رہا ہے۔ اپنے بارے میں کہو، کیا تمہاری جلن اور تکلیف بھی بڑھ گئی ہے؟“

اس نے کہا۔ ”کیسی جلن؟ کیسی تکلیف؟ وہ تو کل رات ہی ختم ہوگئی تھی۔ تمام چھالے ماند پڑ گئے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی پرابلم نہیں ہے اور بنجامن کے ساتھ بھی نہیں ہونی چاہیے۔“

”مگر ہورہی ہے۔ میں نے دروازے کو بند رکھا ہے تاکہ کوئی اندر نہ آئے اور اسے کراہتے ہوئے نہ دیکھے۔ ہمارے حکمرانوں اور آرمی کے افسروں کو معلوم ہوگا تو وہ

اسے ہیکل کا سورما ماننے سے انکار کردیں گے اور سچ تو یہ ہے کہ ہمیں بھی انکار کرنا چاہیے لیکن....۔"

جلالت نے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"بنجامن کی تکلیف حد سے بڑھ گئی ہے۔ ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ آخر ہیکل کے سورما بھی انسان ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کی معمولی سی کمزوری کو چھپانا چاہیے۔ پیشوائے اعظم ابھی آنے والے ہیں۔ تم بھی آجاؤ۔ ہم آپس میں مشورے کریں گے۔ میں نہیں چاہتا' ہمارا یہ سورما نااہل ثابت ہو اور ہمیں پھر سے کسی دوسرے سورما کا انتظار کرنا پڑے۔ جب دو ہو چکے ہیں تو دو کی گنتی کو کم نہیں ہونا چاہیے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

وہ فون بند کرکے لباس تبدیل کرنے لگا۔

یہ کہنا کہ ہیکل کے بارہ سورما اور نسل در نسل ان کی بارہ اولادیں سب ہی سخت جان ہیں۔ تکلیف کی شدت سے اُف تک نہیں کرتیں تو یہ دعویٰ خلافِ فطرت ہے اور اسپتال کے کمرے میں اس دعوے کا پول کھل رہا تھا۔

وہ اسپتال پہنچ گیا۔ اسی وقت پیشوائے اعظم بھی ایک ربی کے ساتھ آگیا۔ انہوں نے بنجامن کے کمرے میں آکر دیکھا۔ اس کے تمام بدن پر ایک دوا کا لیپ چڑھایا گیا تھا۔ جلی ہوئی کھال' گوشت اور چھالوں سے بہتا ہوا مواد ایسا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ناقابل برداشت تکلیف سہ رہا ہے۔ ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ تشویش کی بات نہیں ہے۔ اسے چند گھنٹوں میں آرام آجائے گا۔

ربی نے پیشوائے اعظم اور جلالت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ رہ رہ کر بڑے کرب سے کراہتا ہے۔ ایسے میں حکومت کا کوئی عہدیدار یا آرمی کا افسر آئے گا تو صاف کہے گا کہ یہ ہیکل کا سورما نہیں ہے۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "ہماری یہ بات جھوٹی ہوجائے گی کہ سورما جیدار اور سخت جان ہوتے ہیں۔ کبھی روتے' کراہتے نہیں ہیں۔ بنجامن کی یہ کمزوری تشویش میں مبتلا کر رہی ہے۔ یہ ہر پہلو سے سورما ہے۔ صرف ایک پہلو سے کمزور ہوگیا ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

ایک ربی نے کہا۔ "ہمیں اپنے بیان میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی چاہیے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار ہوں یا ارب پتی' کھرب پتی تاجر ہوں۔ سب ہی آپ کی بات مانتے ہیں۔ آپ فیصلہ سنائیں کہ آئندہ کسی سورما کو نہ آگ سے جلایا جائے گا' نہ کسی طرح کی اذیت دی جائے گی۔"

جلالت نے کہا۔ "بیشک' ہیکل کے سورما بھی انسان ہیں۔ سب ہی میری طرح سخت جان نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا پیشوائے اعظم یہ فیصلہ صادر کردیں کہ آئندہ کسی سورما کو کسی طرح کی آزمائشوں سے نہیں گزارا جائے گا۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "ہفتے کے دن حکومت کے عہدیدار اور آرمی کے افسران عبادت کرنے کے لیے سینی گاگ میں آتے ہیں۔ میں وہاں یہ فیصلہ سناؤں گا۔"

ایک ربی نے جلالت سے کہا۔ "تم معمول کی طرح نارمل دکھائی دے رہے ہو۔ جیسے تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پلیز۔ اپنے بدن کے جلے ہوئے حصے دکھاؤ۔"

اس نے اوپری لباس اتارا تو سب حیرانی سے دیکھنے لگے۔ اس کے جسم پر کہیں کہیں جلنے کے آثار تھے۔ وہ ایسا ہوگیا تھا' جیسے آگ اسے چھو کر بھی نہ گزری ہو۔

پیشوائے اعظم نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "بائی گاڈ! تم سچے سورما ہو۔ افسوس کہ سب ہی تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔ یہ بتاؤ' کیا تمہارا بیٹا بھی سخت جان ہے؟ کیا تم نے اسے کبھی روتے کراہتے سنا ہے؟"

جلالت حیران ہوا کہ اچانک ہی اس سلسلے میں ایان کے متعلق کیوں سوال کیا جا رہا ہے؟ اس نے کہا۔ "اسے کسی حد تک سخت جان کہا جاسکتا ہے۔ ابھی وہ بچہ ہے۔ جوان ہوگا تو اس کے متعلق صحیح رائے قائم کی جائے گی۔ بائی داوے۔۔ آپ میرے بیٹے کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ہمیں یقین ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح سچا اور کھرا سورما ہوگا۔ اسے یہاں تمہارے پاس ہونا چاہیے۔"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ وہ ایک نادان بچہ ہے' سورما کیسے بن سکتا ہے؟"

"یہاں اس نادان کی تعلیم و تربیت ہوگی تو دانا کہلائے گا۔"

جلالت کے دماغ میں ایک نئی مصیبت دستک دینے لگی۔ اسے یہ کبھی منظور نہ ہوتا کہ بیٹا وہاں آکر یہودی بن جائے۔ لیکن اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا؟

اگر پیشوائے اعظم کے حکم سے انکار کرتا تو باغی اور مسلمان کہلاتا۔ پھر بازی ایکدم سے پلٹ جاتی۔ اس کی تمام پلاننگ چوپٹ ہوجاتی۔ وہ سورما بن کر ان کے اندر رہ کر ان کی جڑیں کمزور کرنے کے مواقع سے محروم ہوجاتا۔

ایک ربی نے پوچھا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے؟"

وہ بولا۔ "میرا بیٹا یہاں نہیں آسکے گا۔ پارٹی کے لیڈر اسے میرے پاس نہیں آنے دیں گے۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "ہاں۔ باغی اسے ہمارے حوالے نہیں کریں گے۔ لیکن ایان ہمارے لیے جان سے زیادہ اہم ہے۔ آئندہ ہیکل کا سورما بننے والا ہے۔ ہم ہر قیمت پر اسے یہاں لائیں گے۔"

وہ بڑی بے دلی سے بولا۔ "اگر آپ اسے لاسکے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی؟ میرا بچھڑا ہوا بیٹا مجھے مل جائے گا۔"

اس نے بہ ظاہر باتوں سے یقین دلایا کہ باپ اپنے بیٹے کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے راضی ہے۔ لیکن وہ کسی حال میں بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایان پارٹی کی پناہ سے باہر یہودیوں کی تربیت گاہ میں آئے اور اپنا مذہب بدل دے۔

جلالت کو اب تک یہ اطمینان تھا کہ وہ تنہا ہے۔ اگر کبھی بھید کھلتا کہ وہ مسلمان ہے اور اسرائیلی آستینوں میں رہ کر انہیں ڈس رہا ہے تو گرفتاری سے بچنے کے لیے تنہا ان سے جنگ لڑتا ہوا سرحد پار کر جاتا۔

اب ایان کی آمد مسئلہ بن جاتی۔ اگر فرار ہوتے وقت بیٹا اسرائیلی ٹریننگ سینٹر میں ہوتا اور وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے جا پاتا تو باپ کی سزا بیٹے کو ملتی۔ وہ ایان کو قیدی بنا کر اسے اذیتیں دیتے۔ باپ کو واپس آنے پر مجبور کرتے۔ وہ گرفتاری پیش کرنے کے لیے نہ آتا تو ایان کو مار ڈالتے۔

پیشوا نے فون پر کسی سے بات کی پھر کہا۔ "مسٹر ڈیسوزا کی تدفین ہونے والی ہے۔ ہم اس کی آخری رسومات ادا کرنے جا رہے ہیں۔ ایان کا مسئلہ آرمی انٹیلی جنس اور موساد کے سامنے رکھا جائے گا۔ ہم بعد میں اس مسئلے پر بات کریں گے۔"

وہ اسپتال سے چلے گئے۔ بنجامن کو آرام آگیا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ جلالت وہاں سے اپنی رہائش گاہ میں چلا آیا۔ اگرچہ وہ آزاد تھا لیکن بیٹے کو اسرائیلی گرفت سے دور رکھنے کے لیے تنہا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

شام کو اچانک ہی سوزانہ آگئی۔ وہ بولا۔ "تم پھر آگئیں؟ میں نے کہا تھا' دو چار روز مجھ سے دور رہو۔"

وہ بولی۔ "میں نے کوشش کی ہے کہ کسی کو میرے یہاں آنے کا علم نہ ہو۔ راستے میں محتاط رہی۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا ہے۔"

"ڈیسوزا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ ایک منسٹر تھا۔ اس وقت ہزاروں تعزیت کرنے والے تم سے ملنے آرہے ہوں گے اور تم یہاں آگئی ہو۔"

"ہاں۔ صبح سے ہزاروں پُرسا کرنے والے آرہے ہیں۔ میں نے وہاں بیزار ہوکر سب سے کہہ دیا کہ کسی تعزیت کرنے والے سے نہیں ملوں گی۔ میری طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ اپنے فارم ہاؤس میں جا رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "میں ایک بہت ہی سنگین مسئلے سے دوچار ہوں۔ اچھا ہوا' تم آگئیں۔ تمہارے ذریعے میں کچھ کرسکوں گا۔"

"عورت سے بڑا مسئلہ کوئی نہیں ہوتا۔ مجھے آغوش میں لو۔ میں سنگین مسئلے کو رنگین بنا دوں گی۔"

وہ اسے الگ کرتے ہوئے بولا۔ "آرام سے بیٹھو۔ میں بہت پریشان ہوں۔ پیشوائے اعظم میرے بیٹے کو یہاں لانا چاہتے ہیں۔"

"کیوں لانا چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ میرے بیٹے ایان میں بھی ہیکل کے سورماؤں والی نشانیاں دیکھ رہے ہیں۔"

"کیا وہ بھی تمہاری طرح قدآور اور طاقتور ہے؟"

"وہ ابھی بارہ برس کا بچہ ہے۔"

وہ حیرت سے چیخ پڑی۔ "کیا....؟ کیا وہ بارہ برس کے بچے کو ہیکل کا سورما بنائیں گے؟"

"فی الحال اسے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق تعلیم و تربیت دیتے رہیں گے اور بارہ سورماؤں کے یکجا ہونے کا انتظار کرتے رہیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے' پیشوائے اعظم کو اور ربیوں کو ایسی حرکت سے کیسے باز رکھ سکتا ہوں؟"

"تم کسی مجاہد کے ذریعے اپنا پیغام پارٹی تک پہنچا سکتے ہو۔"

"میرا کسی مجاہد سے ملنا مناسب نہیں ہے۔ یہ کام تم کرو۔"

"ابھی کروں گی۔ مجھے بتاؤ کہاں جانا ہے؟ کس سے ملنا ہے اور اس سے کیا کہنا ہے؟"

جلالت نے ڈیوڈ براؤن کا نام' حلیہ اور پتا بتا کر کہا۔ "میں نے اب تک اس مجاہد سے دو بار ملاقات کی ہے۔ ٹی وی اسٹوڈیو میں ایک اور ہمارا ساتھی وکی موسس میک اپ مین ہے۔ اس سے ملنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لیے کبھی ملاقات نہیں کی۔"

"میرے پاس اپنے چہرے کو سنوارنے اور نکھارنے کا جواز ہے۔ میں اس سے بھی مل سکتی ہوں۔"

جلالت نے اسے پوری تفصیل سے سمجھایا کہ ان

مجاہدین سے کیا کہنا ہے اور پارٹی تک کیا پیغام پہنچانا ہے؟

وہ اس سے رخصت ہو کر باہر آئی۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ کر جنرل اسٹور میں پہنچ گئی۔ اس نے سیلز گرل سے پوچھا۔ ''میں مسٹر ڈیوڈ براؤن سے ملنا چاہتی ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟''

سیلز گرل نے سامان کی دو قطاروں کے درمیان اشارہ کیا۔ ''وہاں دیکھیں' وہ نظر آرہے ہیں۔''

وہ اس کے پاس آکر بولی۔ ''مسٹر براؤن.....!''

وہ پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''فرمائیے.....؟''

''میں سوزانہ ہوں۔ جلالت اسرار کی دوست اور رازدار بھی اور ہونے والی لائف پارٹنر بھی.....''

وہ آسانی سے اس پر بھروسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے انجان بن کر کہا۔ ''یہ جلالت اسرار کون ہے؟''

سوزانہ نے کوڈ ورڈز ادا کیے۔ تب اس نے مسکرا کر جواباً کوڈ ورڈز ادا کرتے ہوئے مصافحہ کیا پھر کہا۔ ''مسٹر سولومن نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ آپ کی بڑی تعریفیں کررہے تھے۔''

''وہ بار بار یہاں نہیں آسکتے۔ اس لیے میں آئی ہوں۔ سولومن ایک نئے اور سنگین مسئلے سے دوچار ہے۔''

''خدا ان پر رحم کرے۔ مسئلہ کیا ہے؟''

سوزانہ ایان کے متعلق بتانے لگی۔ خریداری کے بہانے براؤن کے ساتھ سامان کی مختلف قطاروں سے گزرنے لگی۔

''ایان بابا کو یہودیوں کے پاس نہیں آنا چاہیے۔ سٹر سولومن کے لیے بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔ میں بھی برادر محمود سے بات کرتا ہوں۔''

اس نے فون کی سم بدل کر عمر محمود سے رابطہ کیا۔ اس نے فون نمبر پڑھ کر کہا۔ ''ہاں میں سمجھ گیا' تم ہو۔ بولو میں سن ہا ہوں۔''

''ایک سنگین مسئلہ پیش آنے والا ہے۔ یہودیوں کی نڈی میں یہ کھچڑی پک رہی ہے کہ ایان میں اپنے باپ کی رح سورما کہلانے کی تمام نشانیاں ہیں۔ لہٰذا اسے غزہ سے کال کر اسرائیل لایا جائے۔''

''یا خدا! ایان پر اور اس کے باپ پر رحم فرما۔ ہمیں پہلے ن یہ اندیشہ تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی بارہ سورماؤں کی نتی پوری کرنے لیے ایان کو حاصل کرنا چاہیں گے۔''

''وہ پھر عداوت اور جارحیت پر اتر آئیں گے۔ مینی اور فضائی حملے کریں گے۔''

''ہاں۔ ہمارے معصوم بچوں' عورتوں اور ڈھوں پر مصیبتیں نازل ہوں گی۔ جانے کتنے شہید اور بے گھر ہوں گے۔ ہم ایان کے معاملے میں ابھی سنجیدگی سے غور کریں گے۔''

''غور کریں لیکن اسے یہاں نہ آنے دیں۔ ورنہ باپ کی طرح بیٹے کو بھی قیدی بنادیا جائے گا۔''

ڈیوڈ براؤن نے فون کی سم بدلتے ہوئے سوزانہ سے کہا۔ ''پارٹی والے الرٹ ہوگئے ہیں۔ وہ ایان کو ادھر نہیں آنے دیں گے تو اسرائیلی جارحیت پر اتر آئیں گے۔ دیکھتے ہیں' کیا ہونے والا ہے؟''

وہ بولی۔ ''سولومن کا ایک اور اہم پیغام ہے۔ آپ ہیکل کے سورما کی ڈمی تیار نہ کریں۔ یہ کام روک دیں۔''

''کیا سولومن منصوبہ تبدیل کررہے ہیں؟''

''ہاں۔ اب تک ایان سمیت تین سورماؤں کے بازوؤں کے نشانات پیدائشی ہیں۔ پلاسٹک سرجری کے ماہرین نے بنجامن کے نشان کا معائنہ کرکے تصدیق کی ہے کہ وہ بناوٹی نہیں' پیدائشی ہے۔ ماہرین آئندہ آنے والے سورماؤں کا بھی اسی طرح معائنہ کریں گے۔ سولومن نہیں چاہتا کہ ہمارا ڈمی سورما وہاں جعلی ثابت ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ کام روک دیا جائے گا۔ کیا میں تم سے ایک ذاتی بات پوچھوں؟''

''ہاں۔ ضرور پوچھو؟''

''کیا تم سولومن سے محبت اور شادی کے معاملے میں اتنی سنجیدہ ہو کہ اپنا مذہب چھوڑ دو گی؟''

''بیشک۔ عورت کا دین اور دنیا اس کا مرد ہوتا ہے۔ ایک ذمے داری تمہیں دیتی ہوں۔ بڑی رازداری سے ایسا انتظام کرو کہ میں دین اسلام قبول کرلوں اور اسلام کے مطابق جلالت سے میرا نکاح ہوجائے۔''

ڈیوڈ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تم پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں۔ میں انتظام کرتا ہوں۔ کل جمعے کا مبارک دن ہے۔ دوپہر تین بجے یہاں آؤ۔ ہمارے ایک عالم دین ہوں گے۔ وہ تمہیں کلمہ پڑھائیں گے۔''

''میں جلالت کے ساتھ آؤں گی۔''

''نہیں۔ جلالت کے ساتھ نہ آنا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد تمہیں عدت کے دن گزارنے ہوں گے۔ چار ماہ اور دس دنوں تک جلالت اسرار سے دور رہنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسلام قبول کرتے ہی اس سے ذرا دور دور رہوں گی۔''

''ذرا دور نہیں۔ اس کے سامنے چار ماہ دس دنوں تک نہیں جاؤ گی۔ تنہائی میں تو کیا کسی محفل میں بھی اس سے

پردہ کرو گی۔''

''او گاڈ! بڑے سخت احکامات ہیں۔ میں جلالت سے بات کروں گی۔''

وہ فوراً ہی اس سے رخصت ہو کر جلالت کے پاس آئی۔ پھر بولی۔ ''پارٹی کے رہنما تک ایان کے سلسلے میں اطلاع پہنچ گئی ہے۔ مسٹر براؤن ڈمی سورما کی تیاری روک دیں گے۔ میں تمہارے کام کرکے آئی ہوں۔ مگر میرا کام بگڑ رہا ہے۔''

''تمہارا کون سا کام بگڑ رہا ہے؟''

''میں کل براؤن کے پاس جاؤں گی۔ وہاں ایک عالم دین ہوں گے۔ میں اسلام قبول کروں گی۔''

''یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے۔ تم کام بگڑنے کی بات کیوں کررہی ہو؟''

''براؤن کہتا ہے' ایک مسلمان خاتون بننے کے بعد مجھے چار ماہ اور دس دنوں تک تم سے دور رہنا ہوگا۔ تنہائی میں تو کیا کسی محفل میں بھی ہم نہیں ملیں گے۔''

''ہاں۔ ایام عدت گزارنے کا حکم ہے۔ تمہیں تعمیل کرنی ہوگی۔''

''میں نہ کروں تو کیا فرق پڑے گا؟ ہم چھپ کر ملتے رہیں گے۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا۔''

''خدا تو دیکھتا رہتا ہے۔ مسلمان وہ ہے' جو بندوں سے نہیں خدا سے ڈرتا ہے۔ جھوٹ اور فریب سے باز آکر اس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔ خدا سے ڈرنا ہے تو اسلام قبول کرو ورنہ یہودی رہو گی تو شریک حیات نہیں بناؤں گا۔''

خاموشی سے سر تسلیم خم ہوگیا۔

☆☆☆

وکی موسس میک اپ روم میں تھا۔ اس نے سنا کہ ہیکل کا سورما سولومن یہود آیا ہے تو اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس مجاہد میک اپ مین سے ملنے آیا ہے۔

وہ ڈرامے کی ایک ہیروئن کا ہیئر اسٹائل سیٹ کررہا تھا۔ جلالت اس سے ملنے کے لیے کمرے میں آیا تو آئینے میں اس ہیروئن کی چکا چوند دیکھی۔ اس نے پہلی نظر میں دھڑکنوں کی رفتار بڑھادی تھی۔

وہ پرانا کھلاڑی تھا۔ یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس سے متاثر ہوگیا ہے۔ حسینہ نے اسے آئینے میں دیکھا تو فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ بڑی عقیدت سے اس روحانی شخصیت کو دیکھنے لگی۔ وکی نے نہایت ادب سے جلالت کا ہاتھ تھام کر اسے چوم کر کہا۔ ''میری خوش نصیبی ہے کہ آپ یہاں آئے ہیں۔ میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے حکم دیں۔''

حسینہ نے پوچھا۔ ''کیا میں ہاتھ ملاسکتی ہوں؟''

جلالت نے بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لے کر چوم لیا۔ جلالت کے وجود میں حرارت سی دوڑ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہاری تعریف؟''

وکی نے کہا۔ ''یہ ایک ڈراما سیریل کی ہیروئن سیلینا فورڈ ہیں۔''

وہ بولی۔ ''ابھی تمہارا ہی کا ذکر ہورہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا' تمہیں قریب سے دیکھوں۔ میں سیٹ پر جارہی ہوں۔ میرے دو شاٹس رہ گئے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں آجاؤں گی۔ کیا تم یہاں میرے لیے رکو گے؟''

''تم اطمینان سے اپنا کام کرکے آؤ۔ میں ابھی یہیں ہوں۔''

''شکریہ۔ میں جلد ہی واپس آؤں گی۔'' وہ کمرے سے چلی گئی۔ وکی نے دروازے کو اندر سے بند کرکے کہا۔ ''آج سے تین دن پہلے ڈیوڈ براؤن نے کہا تھا کہ آپ کسی بھی ضرورت کے وقت مجھ سے رابطہ کریں گے۔''

''ہاں۔ میں بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ ابھی پارٹی کے کسی رہنما سے رابطہ کرو۔ یہ پیغام دو کہ میرے بیٹے ایان کو غزہ سے اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور یہ کام غزہ میں موجود اسرائیلی ایجنٹوں سے کرایا جائے گا۔''

''میں ابھی پیغام پہنچاتا ہوں۔''

اس نے فون کی سم بدل کر رابطہ کیا۔ پھر عمر محمود سے کہا۔ ''ابھی ایک نئی اسرائیلی سازش کا پتا چلا ہے۔ جلالت اسرار کے بیٹے ایان کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ غزہ میں جو اسرائیلی ایجنٹ ہیں۔ وہ اس منصوبے پر عمل کریں گے۔ آپ ایان کے لیے سخت حفاظتی انتظامات کریں۔''

عمر نے کہا۔ ''ہمیں بہت پہلے سے اندیشہ تھا کہ وہ اپنے سورما کو حاصل کرنے کے لیے ایسا کرسکتے ہیں۔ فکر نہ کرو' ہم کسی دشمن کو ایان تک پہنچنے نہیں دیں گے۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے پھر فون کی سم بدل دی۔ جلالت نے کہا۔ ''سوزانہ میری ہمراز ہے۔ آئندہ وہ تمہارے پاس آیا کرے گی۔ اپنی روحانی شخصیت کے پیش نظر مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ مجھے اس حسینہ سیلینا کا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟''

''وہ ایک بہت بڑے دولتمند تاجر انتھونی فورڈ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ٹی وی ڈراموں میں شوقیہ کام کرتی ہے۔''

''کیا یہودی ہے؟''

"صیہونی عیسائی ہے۔ باپ بہت مغرور ہے۔ اپنی حیثیت سے کم لوگوں کو منہ نہیں لگاتا۔ ایک برس پہلے سیلینا کسی مسلمان سے متاثر ہوگئی تھی۔ باپ نے کرائے کے قاتل کے ذریعے اسے قتل کرادیا۔ ایک یہودی جوان نے اس کا رشتہ مانگا تھا۔ وہ کوئی رئیس زادہ نہیں تھا۔ اس کے باپ نے غنڈوں سے اس بیچارے کی پٹائی کرادی۔"

"یعنی وہ رئیس اعظم ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا اور بیٹی کا مزاج کیسا ہے؟"

"وہ بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ابھی آپ سے متاثر ہوئی ہے۔ میرا مشورہ ہے ان باپ بیٹی سے محتاط رہیں۔"

"میری فکر نہ کرو۔ آج کے بعد وہ باپ بیٹی اپنی فکر کریں گے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ جلالت نے کہا۔ "اگر کوئی پوچھے کہ میں تم سے ملنے کیوں آیا تھا تو جواب دو گے کہ تم سے نہیں سیلینا پر عاشق ہو کر اس سے ملنے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی اسی کمرے میں اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا تھا۔"

اسی وقت وہ واپس آگئی۔ مسکرا کر جلالت سے بولی۔ "میرا دل کہہ رہا تھا تم سورما ہو۔ زبان کے سچے ہو۔ وعدے کے مطابق میرا انتظار کررہے ہوگے۔"

جلالت نے پوچھا۔ "کیا خیال ہے؟ کہیں آؤٹنگ کے لیے چلوگی؟"

"ہاں، ضرور۔ تم میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ میں تو ساحلی ریسٹورنٹ میں ڈنر بھی کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈال کر کہا۔ "ڈیڈ کال کررہے ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کمرے سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "ہائے ڈیڈ...!"

دوسری طرف سے انتھونی فورڈ نے کہا۔ "تمہارے باڈی گارڈ نے بتایا ہے وہاں سولومن یہودا آیا ہے اور تم اس کے ساتھ کمرے میں ہو؟"

"یس ڈیڈ! میں اس کے ساتھ آؤٹنگ پر جارہی ہوں۔ لیٹ نائٹ گھر آؤں گی۔"

"میں نہیں چاہتا تم اس کے ساتھ وقت گزارو۔"

"ڈیڈ! وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہے۔ ہیکل کا سورما ہے۔ میں پبلک مقامات پر اس کے ساتھ فخر محسوس کروں گی۔"

"میں کسی ہیکل کے سورما کو نہیں مانتا۔ یہ خوابوں خیالوں کی باتیں ہیں اور ہم جیتی جاگتی پریکٹیکل دنیا میں بہت اونچی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"تو ڈیڈ! وہ کئی دنوں سے میرے خیالوں میں آرہا تھا۔ آج سچ مچ آگیا ہے۔ ابھی آپ سے بحث نہیں کروں گی۔ فون بند رکھوں گی۔ گھر آکر بات کروں گی۔"

اس نے فون بند کردیا تاکہ کسی کی کال نہ آئے۔ پھر اس نے کمرے میں آکر جلالت سے کہا۔ "میں تمہاری گاڑی میں چلوں گی۔ میری کار باڈی گارڈ گھر لے جائے گا۔"

اس نے کہا۔ "جو تم چاہوگی، وہی ہوگا۔"

باڈی گارڈ نے کمرے میں آکر جلالت سے کہا۔ "سر! پلیز اپنا فون نمبر بتائیں؟"

سیلینا اعتراض کرنا چاہتی تھی لیکن جلالت نے اسے نمبر بتادیے۔ اس نے وہ نمبر اپنے آقا کو سینٹ کیے۔ دومنٹ کے اندر ہی جلالت کے فون پر کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے سیلینا کو دیکھا پھر فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو فرمائیے؟"

انتھونی فورڈ نے کہا۔ "میری بیٹی سے دور رہو۔ اس کے ساتھ کہیں بھی جانے سے انکار کردو۔"

"سوری۔ یہ بات اپنی بیٹی سے کہو کہ یہ مجھ سے دور رہے۔ میرے ساتھ کہیں جانے سے انکار کردے۔"

"مجھ سے بحث نہ کرو۔ تم مجھے نہیں جانتے۔"

"اور تم مجھے جاننے کی کوشش کرتے رہو۔ میں تمہاری بیٹی کو یہاں سے لے جارہا ہوں۔"

اس نے فون بند کرکے سیلینا سے کہا۔ "یہ تمہارا باپ تو بہت ہی مغرور ہے۔ اس نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ تم میرے ساتھ چلنا چاہوگی تو اس کا چیلنج قبول کروں گا۔"

"ہم باپ بیٹی میں ایسے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ پھر دوستی ہوجاتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔"

اس نے باڈی گارڈ سے کہا۔ "تم گاڑی لے جاؤ۔ جب میں کہوں تو گاڑی لے آنا۔ فی الحال مجھے کسی گارڈ کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بڑے ادب سے بولا۔ "سوری بے بی! ہم باس کے تابعدار ہیں۔ انہوں نے حکم دیا ہے آپ کو تنہا نہ چھوڑیں۔ دور ہی دور سے نگرانی کرتے رہیں۔"

وہ غصے سے بولی۔ "تم لوگ جہنم میں جاؤ۔ کم آن مسٹر سولومن! ہمیں اپنی لائف انجوائے کرنا ہے اور اچھا وقت گزارنا ہے۔"

جلالت نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے دلیر اور بیباک لڑکیاں

پسند ہیں۔ واقعی تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔"

وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چلتا ہوا اسٹوڈیو سے باہر آیا۔ باہر سیلینا کے لیے مزید چار سیکیورٹی گارڈز آگئے تھے۔ انہوں نے اسے سیلوٹ کیا۔

وہ بولی۔ "کوئی میرے قریب نہ رہے۔ ڈیڈ کا حکم مانتے رہو مگر مجھ سے دور رہو۔"

وہ جلالت کی کار میں اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتا ہوا ایک شاہراہ پر آگیا۔ عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے گارڈز پیچھا کررہے ہیں۔ مگر ہم سے دور ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "بڑی رومانٹک اور تھرلنگ سچویشن ہے۔ ڈیڈ مخالفت کررہے ہیں، ان کے کتے ہمارے پیچھے لگے ہیں اور ہم رومانس کررہے ہیں۔"

وہ اپنی سیٹ پر کھسک کر اس کے قریب ہوگئی۔ جلالت نے اسے ایک بازو کے حصار میں لے لیا۔ وہ بولی۔ "میں ڈیڈ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ وہ مجھے جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ ہم ہنری فورڈ کے خاندان سے ہیں۔ وہ فورڈ خاندان کے کسی ارب پتی سے میری شادی کرانا چاہتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "اسی لیے میری مخالفت کررہے ہیں۔"

وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی جلالت کے فون نے اسے پکارا۔ وہ ذرا الگ ہوگئی اس نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں عالی جناب کا پی اے بول رہا ہوں۔ ہولڈ کریں وہ آپ سے بات کریں گے۔"

جلالت نے کار کی رفتار کم کی۔ اسے سڑک کے کنارے روک دیا۔ سیلینا نے پوچھا۔ "کوئی اہم کال ہے؟"

"ہمارے ملک کا ایک اعلیٰ حاکم مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

اسی وقت رعب و دبدبے سے بھرپور آواز سنائی دی۔ "مسٹر سولومن یہودا! ہم اپنے ملک کے اکابرین ہیں۔ ٹوٹ جاتے ہیں، پر جھکنا نہیں جانتے۔ لیکن آپ کے سامنے جھک کر بولتے ہیں، آپ ہمارے دین کے مطابق ہیکل کے سورما ہیں۔ ہمارے لیے معزز اور محترم ہیں۔"

جلالت نے کہا۔ "شکریہ۔ فرمائیے مجھے کس لیے یاد کیا؟"

اس نے کہا۔ "انتھونی فورڈ کی بیٹی آپ کے ساتھ ہے؟ اسے باپ کے پاس پہنچادیں۔ مسٹر سولومن! ہم جو کہتے ہیں اسے مان لیں۔ آپ نہیں جانتے مسٹر انتھونی ہماری ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورلڈ بینک کا اعلیٰ عہدیدار ہے۔ بہت ہی سرپھرا ہے۔ ہمارے لیے مسائل پیدا کردے گا۔ آپ ہیکل کے سورما ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے ذریعے سے آپ کو روک رہا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے اسرائیل کی زمین سے نابود کردیتا۔"

"ہم ہیکل کے سورما ہیں۔ آپ دیکھتے رہیں وہ کیا کرتا ہے اور میں کیا کروں گا؟"

"میں سمجھ گیا، آپ ہم اکابرین میں سے کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ تمام سورما صرف پیشوائے اعظم اور ربیوں کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے ابھی پیشوائے اعظم آپ سے بات کریں گے۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ جلالت نے فوراً ہی اپنے فون سے سم نکال کر دوسری سم لگاتے ہوئے زیرلب کہا۔ "پیشوائے اعظم ہدایت دیں گے تو مجھے عمل کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے ان سے فی الحال رابطہ نہ ہو۔"

پھر اس نے سیلینا سے کہا۔ "تمہاری دوستی میرے لیے چیلنج بن گئی ہے۔ اب اعلیٰ حاکم کے ذریعے تم سے دور رہنے کو کہا جارہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد انٹیلی جنس والے ہمارے راستے کی رکاوٹ بنیں گے۔ کیا تم ساتھ چھوڑنا چاہتی ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ ڈیڈ مجھے کسی چاہنے والے کے ساتھ وقت گزارنے نہیں دیتے۔ میرے جذبات بھڑکتے رہے تو میں ذہنی مریضہ بن جاؤں گی۔ تم ہیکل کے سورما ہو۔ تمہیں موت نہیں آئے گی۔ تم میرے ساتھ رہنے کے لیے فائٹ کرسکتے ہو۔"

وہ کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارے بنگلے میں پچھلے راستے سے اندر جاسکتے ہیں؟"

"ہاں۔ ادھر سناٹا رہتا ہے۔ ملازم ضرورت کے وقت پچھلا دروازہ استعمال کرتے ہیں۔"

"کیا وہ پچھلا دروازہ کھلا ہوگا؟"

"بند ہوگا، تب بھی میں اسے کھول سکتی ہوں۔ کیا چاہتے ہو میں اپنے ہی گھر میں تمہارے ساتھ چھپ کر رہوں؟"

"ہاں۔ ہم وہاں محفوظ رہیں گے۔ ہمیں پورے تل ابیب میں اور پورے اسرائیل میں ڈھونڈا جائے گا۔ کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئے گی کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے باپ کی بنائی ہوئی چھت کے نیچے ہوں۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "فنٹاسٹک آئیڈیا ہے۔ میرے بنگلے کی طرف چلو۔"

سیکیورٹی گارڈز ان کے پیچھے کچھ فاصلہ رکھ کر چلے

آرہے تھے۔ جلالت نے ایک بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے کار روک دی۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ اسٹور کے اندر اور باہر گاہکوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ دونوں کار سے اتر کر اسٹور کے اندر آگئے۔

انہوں نے گاہکوں کی بھیڑ سے گزرتے ہوئے پلٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ سیکیورٹی گارڈز باہر ان کی کار کے پاس کھڑے تھے۔ وہ اسٹور کے پچھلے دروازے سے نکل گئے۔ وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر تمام گارڈز کی نگرانی سے دور چلے آئے۔

انہوں نے بنگلے سے بہت دور ٹیکسی رکوائی۔ پھر وہاں سے چلتے ہوئے بنگلے کے پچھلے حصے میں آئے۔ سیلینا نے کہا۔ ”سیکیورٹی گارڈز اگلے حصے میں ہوتے ہیں۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد کوئی گارڈ ادھر گشت کرتا ہوا آتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔“

انہوں نے رات کی تاریکی میں چھپ کر انتظار کیا۔ بیس منٹ بعد ایک گارڈ نظر آیا۔ وہ ٹہلتا ہوا' چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے پر آئے۔ جلالت نے نیم تاریکی میں یہ نہیں دیکھا کہ سیلینا نے دروازہ کیسے کھولا؟ وہ بنگلے میں داخل ہوگئے۔ اسے اندر سے لاک کردیا۔

یہ ایسی کامیابی تھی کہ وہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ ”یہ تو کمال ہوگیا۔ یہاں ہم دن رات چھپ کر رہیں گے، تب بھی ڈیڈ کو معلوم نہیں ہوسکے گا کہ تم میرے ساتھ رہتے ہو۔“

وہ اس وسیع و عریض بنگلے کو اندر سے دیکھنے لگا۔ اس کے ایک پورشن میں باپ رہتا تھا۔ دوسرے میں بیٹی رہتی تھی۔ باپ کبھی کبھی وقت ضرورت بیٹی کی طرف آتا تھا۔ ورنہ اسے اپنے پاس بلاتا تھا۔ یوں بھی وہ کاروباری معاملات میں ملک سے باہر ہی رہا کرتا تھا۔

جب وہ غیر ملکی دورے پر رہتا تو اس کے خاص جاسوس سیلینا کی دن رات کی مصروفیات پر نظر رکھتے اور اپنے باس کو تفصیلی رپورٹ پہنچاتے رہتے۔ بنگلے کے اندر اس کے رہائشی حصے میں کسی جاسوس کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

انہیں ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوگیا تھا۔ انتھونی فورڈ نے کہا تھا کہ وہ اس کی بیٹی سے دور نہیں ہوگا تو اسے نابود کردیا جائے گا۔ وہ دور کیا ہوتا' اس کی چھت کے نیچے ہی اس کی بیٹی کے ساتھ رات گزارنے آگیا تھا۔

باہر دونوں کو تلاش کیا جارہا تھا۔ پیشوائے اعظم اور ربی پریشان ہورہے تھے کہ اس نے اپنا فون کیوں بند رکھا ہے؟ پولیس اور انٹیلی جنس والے انہیں پورے شہر میں تلاش کررہے تھے۔

اسرائیلی حکمران اور آرمی کے افسران انتھونی فورڈ کو ناراض نہیں کرسکتے تھے اور پیشوائے اعظم اور دین کے خلاف بول نہیں سکتے تھے۔

اس رات ان سب کی نیندیں اڑگئی تھیں۔ صبح چھ بجے سیلینا نے پیشوائے اعظم کو اور اعلیٰ حکام کو فون پر کہا۔ ”سولومن یہودا مجھے جبراً نہیں لے گیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے گئی تھی اور ابھی اپنے بنگلے میں خیریت سے ہوں۔“

انہوں نے پوچھا۔ ”سولومن کہاں ہے؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ فون بند کردیا۔ تمام اکابرین نے کہا۔ ”سیلینا یہی بیان باپ کے سامنے دے گی تو ہم مسٹر فورڈ کا غصہ ٹھنڈا کردیں گے لیکن سولومن کہاں ہے؟ اسے بھی بیان دینا چاہیے۔“

تھوڑی دیر بعد اس نے فون پر کہا۔ ”میں اپنے بنگلے میں ہوں۔ میں نے سیلینا کا بیان ایک کیسٹ میں ریکارڈ کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق نہ میں نے اسے اغوا کیا تھا' نہ کسی طرح کی زور زبردستی کی تھی۔ وہ پچھلی رات اپنی مرضی سے میرے ساتھ گھومتی پھرتی رہی تھی۔“

پیشوائے اعظم اور انٹیلی جنس والے اس کی رہائش گاہ میں آگئے۔ انہوں نے سیلینا کا ریکارڈ کیا ہوا بیان سنا۔ اس کی ایک کاپی حکمرانوں کو دی۔ انہوں نے انتھونی کو بلا کر کہا۔ ”آپ کی بیٹی گھر واپس آگئی ہے۔ یقیناً آپ اس سے مل چکے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”میں اپنے دوسرے بنگلے میں ہوں۔ پہلے سولومن یہودا سے انتقام لوں گا۔ پھر بیٹی کا منہ دیکھوں گا۔“

”سولومن بے قصور ہے۔ سیلینا راضی خوشی اس کے ساتھ گئی تھی۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ کل رات ہیکل کے سورما نے اس پر ظلم کیا ہے۔“

انہوں نے سیلینا کی آواز میں کیسٹ سنائی۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ ”میں اس ریکارڈنگ کو نہیں مانوں گا۔ سولومن نے جبر سے یا پیار محبت سے پھسلا کر ایسی باتیں کہلوائی ہیں۔ میں ابھی جاؤں گا۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھوں گا تو وہ سولومن کے خلاف بیان دے گی۔ وہ روحانی شخصیت رکھتا ہے۔ اس کی شیطانیت کا پول کھل جائے گا۔“

وہ سمجھانے سے سمجھنے والا نہیں تھا۔ وہی کرنے والا تھا' جو اب تک اپنی بیٹی کے عاشقوں کے خلاف کرتا آیا تھا۔

پیشوائے اعظم نے جلالت کو ہیکل میں بلایا اور کہا۔ ”ہم تمہاری اور تمام سورماؤں کی سلامتی چاہتے ہیں۔ کوئی تمہاری طرف دشمنی سے دیکھے گا تو ہم اس کی آنکھیں پھوڑ دیں گے۔ لیکن...“

وہ قدرے بے بسی سے بولا۔ ”انتھونی فورڈ یہاں سے ورلڈ بینک تک وسیع ذرائع اور اختیارات کا مالک ہے۔ ہماری سیاسی اور معاشی کمزوریوں سے کھیلتا ہے۔ تمہاری زندگی سے بھی کھیلے گا تو یہاں کی پولیس' انٹیلی جنس اور آرمی والے نہ تمہیں سیکیورٹی دے سکیں گے نہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرسکیں گے۔“

جلالت نے کہا۔ ”آپ ہی کہتے ہیں کہ ہیکل کے سورما روحانی قوتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ جب ہم ایسے ہیں تو آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ میری روحانی قوتیں دشمنوں کو خاک میں ملادیں گی۔“

اس نے نظریں اٹھا کر جلالت کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ہم اپنی قوم کے سامنے دعوے کرتے ہیں کہ جب تک سورما تابوت یہودا نہیں لائیں گے' تب تک انہیں موت نہیں آئے گی' نہ ہی کوئی انہیں ہلاک کرسکے گا۔ میں نے یہاں ہیکل میں تمہیں بلایا ہے۔ تم یہاں پیدا ہوئے تھے۔ یہیں تمہاری زندگی کی بات کی جائے۔ کوئی سننے والا نہیں ہے۔ اس لیے کہہ رہا ہوں' ہمارا دعویٰ کمزور ہے۔ موت کسی کو بھی کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ انتھونی فورڈ جیسے فرعون کسی وقت بھی تمہاری زندگی تمام کرسکتے ہیں۔“

جلالت نے کہا۔ ”اس سے پہلے انتھونی فورڈ کو اس دنیا سے رخصت کردوں گا۔“

اس نے چونک کر جلالت کو دیکھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر قریب آیا۔ پھر اس کے کان میں بولا۔ ”میں یہی چاہتا ہوں' تم اسے ختم کردو۔ میں اس سلسلے میں راستے ہموار کروں گا۔“

وہ اس ہیکل میں تھے۔ جسے سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا۔ ہزار ہا برس سے یہودی' عیسائی اور مسلمان وہاں عبادت کرتے آئے تھے۔ وہ جگہ تینوں مذاہب' تینوں اقوام کے لیے مقدس تھی۔ وہاں سب ہی سلامتی اور خیر کی دعائیں مانگتے تھے۔ مگر اب وہاں ایک یہودی پیشوا بڑی رازداری سے کسی کو قتل کرنے کا حکم دے رہا تھا۔

☆☆☆

انتھونی فورڈ غصے سے بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر تھی۔ بڑی بے پروائی سے ایک چکن پیس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر چبا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے فورڈ خاندان کی عزت کو خاک میں ملادیا۔ اب تمہارا کلیجا ٹھنڈا ہوگیا؟“

”میں اپنی عمر کے تقاضے پورے کرنا چاہتی ہوں اور آپ کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ یہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟“

”تم نے پوری سوسائٹی میں میرا سر جھکادیا ہے۔“

وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ ”جو ہوا اسے بھول جائیں۔ رات گئی بات گئی۔“

”اگر تم باپ کی عزت رکھنے کے لیے اپنا بیان بدل دو تو میں اکابرین کے سامنے سر اٹھا کر رہوں گا۔ آج تک کوئی مجھے چیلنج کرکے زندہ نہیں رہ سکا۔ سولومن نے تو منہ پر جوتا مارا ہے۔ وہ زندہ نہیں رہے گا۔ تم بیان بدل دو۔ مجھے انتقام لینے کا موقع دے دو۔ پھر تم جو کہوگی' وہ کروں گا۔ تمہیں کسی بھی بوائے فرینڈ سے ملنے کی آزادی دے دوں گا۔“

اس نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ پھر بے یقینی سے پوچھا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

”یہ اچھی طرح جانتی ہو' میں تم سے کوئی وعدہ کرتا ہوں تو اسے ضرور پورا کرتا ہوں۔“

”مانتی ہوں۔ آپ مجھے جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ میری ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ بس ایک ہی بات پر ہم جھگڑتے رہتے ہیں۔“

”اب جھگڑا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں آزادی دیتا ہوں۔ کسی کو بھی رازداری سے بوائے فرینڈ بنالو۔“

اس نے پہلی بار ٹی وی پر دو سورماؤں کو دیکھا تھا۔ کبھی سولومن کو اور کبھی بنجامن کو سحر زدہ ہوکر دیکھتی رہی تھی۔ دل مچل رہا تھا کہ ان میں سے کوئی اس کا دوست بن جائے اور یہ خواہش پوری ہوگئی تھی۔ جلالت دوست بن گیا تھا۔ آئندہ اس جیسا ہی کوئی دوسرا دوست بن سکتا تھا اور وہ دوسرا بنجامن یہودا ہوسکتا تھا۔

انتھونی فورڈ بڑی توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہی ہو؟ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہیں ایک بوائے فرینڈ بنانے کی آزادی دوں گا؟“

وہ بولی۔ ”یقین ہے۔ مگر میں ایسا ہی دوست چاہتی ہوں' جیسا سولومن ہے۔ کیا آپ مجھے بنجامن یہودا کو دوست بنانے کی اجازت دیں گے؟“

”پیشوائے اعظم اور ربیوں سے میرا جھگڑا چل رہا ہے۔ وہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے سورماؤں کا ڈراما

پلے کررہے ہیں۔ تم ہو کہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے سورما کے چکر میں پڑنا چاہتی ہو۔"

"میں کسی چکر میں نہیں پڑوں گی۔ پہلے سولومن آئیڈیل تھا۔ اب بنجامن ہے۔ آپ جب بھی کہیں گے، میں سولومن کی طرح بنجامن کی بھی چھٹی کردوں گی۔"

وہ سوچنے لگا۔ "یہ میری بیٹی ہے۔ میری طرح ہی ہے۔ جس کی ضرورت نہ رہے، پھر اس کی طرف تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتی۔"

وہ ایک نئے پہلو سے سوچنے لگا۔ "میں بنجامن اور سولومن کو ایک دوسرے کا رقیب بنا سکتا ہوں۔ وہ سیلینا کو اپنانے کے لیے ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ تو پھر سولومن کو میں ہلاک نہیں کروں گا، بلکہ ایک سورما دوسرے سورما کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔"

اس نے بیٹی سے کہا۔ "میں بنجامن کو دوست بنانے کی اجازت دیتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے جو کہوں گا، وہ تم کرو گی۔"

"آپ کیا کہنا اور کیا کروانا چاہتے ہیں؟"

"میں ٹی وی چینل کا آدھا گھنٹا خرید لوں گا۔ تم اس آدھے گھنٹے میں دنیا والوں کے سامنے دیوانی محبت کا اظہار کرو گی۔ رو رو کر کہو گی کہ تم بنجامن سے ملنا چاہتی تھیں۔ سولومن تمہیں اس سے ملانے کے بہانے ویرانے میں لے گیا۔ اس نے جبراً تمہاری عزت لوٹی۔ پھر گن پوائنٹ پر یہ بیان ریکارڈ کرایا کہ تم نے راضی خوشی اس کے ساتھ رات گزاری ہے۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "بنجامن ٹی وی اسکرین پر مجھے روتے اور فریاد کرتے دیکھے گا تو میری مظلومیت سے ضرور متاثر ہوگا۔ میں اسے اپنی طرف مائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔ او کے ڈیڈ!"

انتھونی فورڈ نے اسی وقت ایک فون کال کے ذریعے ٹی وی چینل کا آدھا گھنٹا خرید لیا۔ اس ٹی وی کے ذریعے یہ خبر پھیلائی کہ دوسرے دن شام سات بجے انتھونی فورڈ کی بیٹی سیلینا فورڈ، ہیکل کے ایک سورما سولومن یہودا کے بارے میں اہم بیان دے گی اور اس نام نہاد سورما کا اصلی مکروہ چہرہ دکھائے گی۔

لوگوں سے اپیل کی گئی کہ یہ پروگرام دیکھنا نہ بھولیں۔ اس پروگرام کی ایسی زبردست پبلسٹی کی گئی کہ ہر سو سیلینا اور ہیکل کے سورماؤں کا چرچا ہونے لگا۔ سیلینا، سولومن اور بنجامن کی بڑی بڑی تصویروں والے پوسٹر ہر جگہ دیواروں پر دکھائی دے رہے تھے۔ ہر پوسٹر پر جلی حروف سے لکھا تھا۔ "ہیکل کا سورما یا اغوا کا مجرم...؟"

دوسرے دن شام کو ٹی وی ناظرین کی تعداد بڑھ گئی۔ سب ہی اپنے گھروں، دفتروں اور کارخانوں میں سیلینا کو اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ وہ نیم تاریکی، نیم روشنی میں ایک صوفے پر بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ ماتمی لباس میں تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ایسا تاثر پیدا کیا گیا تھا، جیسے سولومن ابھی ابھی اسے لوٹ کھسوٹ کر گیا ہے۔

اس کے پس منظر میں سولومن اور بنجامن کی بڑی سی تصویریں تھیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک جوان عورت فرش پر پڑی ہوئی تھی اور دو ہاتھ اس کا لباس نوچ رہے تھے۔

سیلینا جیسے صدمات سے ٹوٹ کر بول رہی تھی۔ "ہیکل کے بارہ سورما میرے آئیڈیل ہیں۔ میں نے اسکول لائف میں وہ دینی کتاب پڑھی تھی، جس میں بارہ سورماؤں کے بارے میں لکھا تھا۔ میں کتاب پڑھنے کے بعد انہیں تصور میں دیکھتی تھی۔

ایسے تصور کے مطابق ہیکل کا ایک سورما سچ مچ میری زندگی میں آگیا۔ چند دنوں پہلے میں نے ٹی وی کے ایک پروگرام میں ہیکل کے دو سورماؤں سولومن یہودا اور بنجامن یہودا کو دیکھا تھا۔ بنجامن کو دیکھ کر میرے دل نے دھڑک دھڑک کر کہا کہ یہی وہ سورما ہے، جو میرے تصور میں آتا رہا ہے۔ فیصلہ کیا کہ بنجامن سے ضرور ملاقات کروں گی۔

میں اسٹوڈیو کے میک اپ روم میں تھی۔ باہر شور ہوا کہ ہیکل کا ایک سورما آیا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ دھڑکنوں نے کہا، میرا آئیڈیل، میرا محبوب بنجامن آیا ہے لیکن پھر مایوسی ہوئی۔ سولومن یہودا میک اپ روم میں آیا۔ میں نے سولومن کی تعظیم کی۔ عقیدت سے مصافحہ کیا۔ پھر پوچھا، مسٹر بنجامن یہودا کہاں ہیں؟ میں ان سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔

اس نے کہا کہ تم بہت حسین اور دلنشین ہو۔ اسے تمہارے پاس آنا چاہیے۔ جیسے میں آیا ہوں، مگر نہیں آئے گا۔ وہ بہت مغرور ہے۔ کیا مجھ سے دوستی کرو گی؟

میں نے کہا۔ "آپ مائنڈ نہ کریں۔ میرا دل، میرا دماغ، میرے خواب اور خیالات صرف بنجامن کے لیے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "بنجامن میرا دوست ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ کیا میرے ساتھ چلو گی؟"

بنجامن سے ملنے کی ایسی دیوانگی تھی کہ میں سولومن کے ساتھ آکر اس کی کار میں بیٹھ گئی۔

اس نے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کار روک دی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا مسٹر بنجامن شہر سے دور اس ویرانے میں رہتے ہیں؟"

اس نے کہا۔ "ہاں۔ وہ آدم بیزار ہے۔ مگر حوا بیزار نہیں ہے۔ تمہیں دیکھ کر خوش ہوگا۔"

میں کار سے اتر کر اس کے ساتھ مکان کے اندر آئی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "وہ نہیں ہے، میں ہوں۔ وہ بھی سورما ہے۔ میں بھی ہوں۔ تم اسے خوش کرنے والی تھیں۔ مجھے خوش کرو۔"

میں نے کہا۔ "بکواس مت کرو۔ مجھے دھوکے سے یہاں لائے ہو۔ مجھے جانے دو۔ ورنہ چیخنا شروع کردوں گی۔"

اس نے ایک ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی۔ کیا بتاؤں، اس کی گرفت کتنی فولادی تھی؟ چیخنا تو دور کی بات میں کچھ کہہ نہیں پارہی تھی۔ میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

وہ مجھے بازوؤں کی گرفت میں لے کر من مانی کرنے لگا۔ میں تڑپتی رہی۔ اس سے نجات حاصل کرنے کی کوششیں کرتی رہی۔ لیکن آہنی شکنجے میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

آہ! میں نے ان لمحات میں اپنے بنجامن کو یاد کیا۔ میرا رنگ روپ، میرا حسن و شباب صرف میرے بنجامن کے لیے تھا۔ لیکن اس ڈاکو نے سب کا سب لوٹ لیا۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ "میں جو بات کہنے جارہی ہوں، اسے سن کر سب ہی چونک جائیں گے۔ رات کے دس بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سولومن نے دروازہ کھولا۔ باہر تین افراد دکھائی دیے۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے فلسطینی لگ رہے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی انہوں نے السلام علیکم کہا۔ سولومن نے جواباً وعلیکم السلام کہا۔ وہ ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں لائے تھے۔ تمام سامان ایک بڑی سی میز پر رکھ رہے تھے۔

میں حیرانی سے سولومن کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پارٹی کے لیڈروں کی خیریت دریافت کررہا تھا۔ اس نے باتوں کے دوران کئی بار خدا اور اس کے رسول کا نام بھی لیا۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ وہ مسلمان ہے یا یہودی ہیکل کا سورما ہے؟

وہ آنے والے واپس چلے گئے۔

اس نے کہا، تم نے مجاہدین کو دیکھا ہے۔ ہماری باتیں سنی ہیں۔ یہاں سے جا کر کسی سے کہو گی کہ میں مسلمان ہوں اور مجاہدین سے خفیہ رابطے رکھتا ہوں تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ پیشوائے اعظم اور تمام ربی مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ وہ کبھی شبہ نہیں کریں گے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ "میں یہ نہیں کہتی کہ ہیکل کے سورما غلط ہیں۔ نہیں...۔ اپنی دینی کتابوں پر میرا ایمان ہے۔ ہیکل کے سورما میرے بنجامن کی طرح سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ میں پوری یہودی قوم سے اپیل کرتی ہوں کہ سب مل کر اس بہروپیے سولومن کا محاسبہ کریں۔ جلد ہی اس کا اصلی چہرہ سامنے آجائے گا اور یہ ثابت ہوجائے گا کہ وہ دشمن کا جاسوس ہے۔ ہمارے درمیان سورما بن کر رہتا ہے۔ پتا نہیں آستین کا سانپ بن کر اب تک ہمیں کس طرح نقصان پہنچاتا آرہا ہے؟"

سیلینا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جلالت کے پوسٹر کے پاس جا کر اس کے منہ پر سیاہی پھیر دی پھر کہا۔ "اس نے میرے سامنے ایک کیسٹ ریکارڈر رکھ کر کہا کہ میری حمایت میں بولو۔ تم میری دیوانی ہوگئی ہو۔ تم نے اپنی مرضی سے میرے ساتھ رات گزاری ہے۔

اس نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ یہ حکم دیا تھا کہ میں ہنستے، مسکراتے ہوئے اس سے پیار جتاتے ہوئے بولتی رہوں تاکہ کیسٹ سننے والوں کو یقین ہوجائے کہ میں سچ مچ راضی ہو کر اس کے ساتھ گناہ گار بنتی رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے بنجامن کے پوسٹر کے پاس آکر کہا۔ "میرے محبوب! میں نے تمہاری امانت لٹائی نہیں ہے۔ جبراً لوٹ لی گئی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ رونے لگی۔ پھر بولی۔ "میں اس چینل کے ذریعے دنیا والوں کے سامنے تم سے پوچھتی ہوں، کیا مجھے اپنے پیار کے قابل سمجھتے ہو؟ میں ایک دولتمند عزت دار باپ کی بیٹی ہوں لیکن مجھے عزت ملے گی تو تم سے ورنہ میں منہ چھپا لوں گی۔ دنیا والوں کے سامنے نہیں آؤں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ بیشک وہ بڑی زبردست ایکٹنگ کررہی تھی اور نہ جانے کتنے ناظرین کو اپنے ساتھ رُلا رہی تھی۔

پروگرام ختم ہوگیا تھا۔ ربی، پیشوائے اعظم اور تمام اکابرین سیلینا کے ابتدائی بیان کو جھوٹ اور بکواس کہہ رہے تھے لیکن جب اس نے مجاہدین کا اور سولومن کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا تو سب ہی چونک گئے۔ اس کے بیان پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے۔ جو شک و شبے کا ہلکا سا سوراخ تھا، وہ شگاف بن رہا تھا۔ ربیوں اور پیشوائے اعظم نے حکمرانوں کی موجودگی میں جلالت کا محاسبہ کیا۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے پوچھا۔ "تم نے وہ رات سیلینا کے ساتھ کہاں

گزاری تھی؟"

وہ بولا۔ "میں نے پیشوائے اعظم اور ربیوں کو دوسری صبح رپورٹ دی تھی۔ یہ سچ کہا تھا کہ سیلینا کے بیڈ روم میں اس کے بنگلے کے اندر تھا۔ اس طرح کسی کو شبہ نہیں ہوا کہ ہم انتھونی فورڈ کی چھت کے نیچے ہیں۔ صبح ہوتے ہی میں اپنی رہائش گاہ میں واپس آگیا تھا۔"

بنجامن ایک ایزی چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "کیا وہ جھوٹ بول رہی ہے؟ تم اسے شہر سے دور کسی ویرانے میں لے گئے تھے۔"

وہ بولا۔ "ہاں۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

بنجامن نے کہا۔ "وہ تمام دنیا والوں کے سامنے کہہ رہی ہے کہ میں اس کا آئیڈیل، اس کا محبوب ہوں۔ تم نہیں ہو۔ کیا اس کے آنسو مگرمچھ کے تھے؟ کیا ایسے کوئی روتی ہے جیسے وہ میرے لیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی؟"

"وہ سراسر ایکٹنگ کر رہی تھی۔ بہت چالباز ہے۔ تم اسے نہیں جانتے۔"

"اور تم نے ایک ہی رات میں جان لیا۔ تم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ تمہیں اپنے بنگلے میں اپنی مرضی سے لے گئی تھی۔"

ایک آرمی افسر نے کہا۔ "وہ لڑکی جو تم سے نفرت کر رہی ہے۔ دنیا والوں کے سامنے حقارت سے کہہ رہی ہے کہ تم ہیکل کے سورما نہیں، ایک بہروپیے مسلمان ہو۔ وہ لڑکی کبھی تمہیں اپنے بیڈ روم میں نہیں لے جائے گی۔"

جلالت نے کہا۔ "میرے باپ دادا اور پردادا یہودی تھے۔ ہیکل کے سورما تھے۔ ان کے بازو کا پیدائشی نشان میرے بازو تک پہنچا ہے۔ دینی کتابوں کی پیشگوئی کے مطابق میں ہیکل سے نمودار ہوا ہوں۔ اس کے باوجود آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ایک فراڈ لڑکی کے بیان کے مطابق میں ایک مسلمان ہوں اور ہیکل کا سورما نہیں ہوں تو آپ مجھ پر شبہ کرتے رہیں۔ میں تو اصلی سونا ہوں اور رہوں گا۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "وہ باپ بیٹی فراڈ ہیں۔ انتھونی فورڈ ہمارے سچے عقیدے کے مطابق سولومن کو نہ ہلاک کر سکتا ہے، نہ کسی طرح کا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے بڑی شاطرانہ چال چل رہا ہے۔ اپنی بیٹی کے ذریعے ساری دنیا کے سامنے ہیکل کے اس سورما کو مسلمان اور جاسوس کہہ کر سب ہی کو شک و شبہے میں مبتلا کر رہا ہے۔"

ایک ربی نے کہا۔ "بنجامن! سیلینا بڑی مکاری سے تمہارے اور سولومن کے درمیان حسد، رقابت اور عداوت پیدا کر رہی ہے۔ اس عورت کے مکروفریب میں نہ آؤ۔"

بنجامن نے کہا۔ "میں نادان بچہ نہیں ہوں۔ میرے پاس عقل ہے۔ میں ناقابلِ شکست ہیکل کا سورما ہوں۔ سولومن سے کہتا ہوں، اپنے جھوٹے بیان سے باز آجائے۔ یہ کوئی بھی نہیں مانے گا کہ اس سے نفرت کرنے والی اسے اپنے بیڈ روم میں لے گئی تھی۔ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔ میری دیوانی ہے۔ یہ اعتراف کرے کہ اس پر نیت خراب ہوگئی تھی۔ یہ ایسا عیاش اور بدکردار ہے کہ مسٹر ڈیسوزا کی وائف پر بھی اس نے نیت خراب کی۔ اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لیے ڈیسوزا کو ہلاک کیا۔"

جلالت نے کہا۔ "بنجامن! بکواس نہ کرو۔ سیلینا کے فریب میں آکر مجھ پر جھوٹے الزامات نہ لگاؤ۔"

"یہ خوامخواہ دشمنی نہیں ہے۔ ہمارے انٹیلی جنس اور موساد کے تمام جاسوس سولومن کا سختی سے محاسبہ کریں۔ اس کی اصلیت معلوم کریں۔ کیا یہ اب تک مسلمان ہے؟ جب تک یہ ثابت نہیں ہوگا کہ یہ کسی شک و شبے کے بغیر واقعی ہیکل کا سورما ہے، تب تک میں اسے نہ سورما تسلیم کروں گا، نہ اس سے کوئی تعلق رکھوں گا۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "دو سورماؤں کے درمیان عداوتیں پیدا کرنے والی باتیں نہ کرو۔ تمہیں ہم پر بھروسا کرنا ہے اور سولومن پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے گہرا برادرانہ تعلق رکھنا ہے۔"

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی آپ پر بھروسا کرتے ہوئے سولومن کو ہیکل کا سورما مان رہے ہیں۔ ورنہ دل نہیں مان رہا ہے۔ آئندہ دیکھیں گے کہ یہ ہماری طرح یہودی ہے یا نہیں؟"

آرمی کے افسران نے بھی یہی کہا۔ پھر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔

پیشوائے اعظم نے بنجامن سے کہا۔ "سیلینا کے آنسوؤں نے تمہیں جذباتی دیوانہ بنا دیا ہے۔ کم از کم اس حد تک حواس میں رہو کہ اپنے پیشوا اور ربیوں کے سامنے اپنے برادر سورما کو چیلنج نہ کرو۔ سورما کسی حال میں بھی اپنے مذہبی رہنماؤں کے مزاج اور عقیدے کے خلاف کوئی بات نہیں کہتے۔ جاؤ اور تنہائی میں اپنا محاسبہ کرو۔ کان پکڑو اور توبہ کرو۔ آئندہ ہماری ہدایت کے خلاف نہ سوچو، نہ سورما کے مزاج کے خلاف کچھ کرو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ ابھی جا کر تنہائی میں اپنا محاسبہ کروں گا۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ جلالت نے پیشوا کو اور ربیوں کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بڑی سنجیدگی سے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ وہ ذرا دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "میرے بیٹے ایان کے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟ یہاں حکمرانوں میں اور آرمی والوں میں نہ جانے میرے کتنے مخالفین ہیں؟ یہ لوگ مجھے مسلمان کہتے ہیں، کیا میرے بیٹے کو مسلمان نہیں کہیں گے؟ ابھی جو میرے ساتھ ہو رہا ہے، کل میرے بیٹے کے ساتھ نہیں ہوگا؟"

"ہم اسے سخت سیکیورٹی میں رکھا کریں گے۔"

"سیکیورٹی محض دم دلاسے کے لیے ہوتی ہے۔ سیکیورٹی دینے والے بھی اس پولیس اور آرمی سے تعلق رکھتے ہیں جو میرے مخالفین ہیں۔ آپ دل میں کینہ رکھنے والے مخالفین کو پہچان نہیں سکیں گے۔ پھر ان کے شر سے میرے بیٹے کو کیسے بچائیں گے؟"

ان کے پاس اس بات کا خاطر خواہ جواب نہیں تھا۔ پیشوا نے کہا۔ "سولومن! ہم پہلے ہی پریشان ہیں۔ اب ایان کے مسئلے میں ہمیں نہ الجھاؤ۔"

"ہم دینی رہنما ہیں۔ تمہاری اور ایان کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ کیا ہم پر سے بھروسا اٹھ رہا ہے؟ کیا تم بھی اس وقت بنجامن کا رویہ اختیار کر رہے ہو؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر پیشوا کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بولا۔ "بیٹے کے لیے ایسے جذبات ہیں کہ مجھ سے گستاخی ہوگئی۔ معافی چاہتا ہوں۔ میں اور میرا بیٹا آپ پر قربان ہوں۔ آئندہ مجھ سے گستاخی نہیں ہوگی۔"

تمام ربی اس کے اعتراف سے اور جھکنے کے انداز سے خوش ہوگئے۔ پیشوا نے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہم جانتے ہیں، تم وفادار اور تابعدار ہو۔ ہم نے معاف کیا۔ جاؤ اپنے بنگلے میں جا کر آرام کرو۔"

وہ اپنے بنگلے میں واپس آگیا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ پیشوا اور ربی اسے انتھونی فورڈ اور بنجامن کی دشمنی سے تحفظ اور سلامتی نہیں دے سکیں گے۔ وہ ان دشمنوں کو رازداری سے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ لیکن دشمنوں سے بعد میں نمٹنا تھا۔ پہلے اپنی حفاظت اور سلامتی لازمی تھی اور اب تو بیٹے کے لیے بھی خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ باپ اور بیٹے کی سلامتی کا معاملہ سنگین تھا۔ اسرائیل میں حالات خطرناک حد تک مخالفانہ ہوچکے تھے۔ اب وہ نئی حکمت عملی کے مطابق وہاں سے پرواز کرنے والا تھا اور یہ بھی طے کر رہا تھا کہ بیٹے کو غزہ میں نہیں رہنے دے گا۔

وہ کیا کرے گا؟ یہ منصوبہ ابھی ذہن میں پک رہا تھا۔

☆☆☆

بنجامن کار ڈرائیو کرتا ہوا اپنے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے وقت ونڈ اسکرین کے پار کار کے بونٹ پر سیلینا دکھائی دے رہی تھی۔

اس کا سلگتا ہوا حسن، بکھری ہوئی زلفیں اور آنسو بھری آنکھیں اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

اسے ٹی وی اسکرین پر لاکھوں ناظرین دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ ان کی موجودگی میں صرف اپنے بنجامن کی محبت کا دم بھر رہی تھی۔ اس کے لیے تڑپ رہی تھی اور اس کی جدائی میں آنسو بہا رہی تھی۔ یہ متاثر کرنے اور دل کھینچنے والی بات تھی۔ وہ اس کے لیے اندر ہی اندر تڑپنے لگا۔ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

وہ اپنے بنگلے میں آگیا۔ سیلینا کا فون نمبر معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ورق گردانی کی۔ انتھونی فورڈ کے دفتروں، بینکوں اور رہائش گاہوں کے درجنوں فون نمبرز تھے۔ اس نے ایک بنگلے کے نمبر پنچ کیے پھر انتظار کرنے لگا۔

دوسری طرف سے رابطہ بیل سنائی دے رہی تھی۔ پھر انتھونی فورڈ کی پرغرور آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں ہوں، ہیکل کا سورما بنجامن یہودا..."

اچانک اس مغرور شخص کا لہجہ میٹھا اور نرم ہوگیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "تم....؟ بنجامن یہودا ہو؟ پلیز یقین دلاؤ، تم بنجامن ہی ہو۔ میری بیٹی تم سے ملنے کے لیے رو رو کر پاگل ہو رہی ہے۔"

وہ بولا۔ "میں ملنے کے بعد ہی اپنے بنجامن ہونے کا یقین دلا سکوں گا۔ بائی دا وے، ملنے سے پہلے فون پر اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد سیلینا کی آواز سنائی دی۔ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ایکدم سے روتے ہوئے بولی۔ "بنجامن! ہائے میں مر جاؤں گی۔ یقین نہیں آرہا ہے۔ یہ تم ہی ہو ناں...؟"

"ہاں۔ میں ہوں۔ تمہیں یقین ہوجائے گا۔ تم نے ٹی وی اسکرین پر مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ "کیا تم مجھے پیار کے قابل سمجھتے ہو؟ میری جان! تم نے مجھے جیت لیا ہے۔ میں تمہیں گلے لگانا چاہتا ہوں۔ پھر تم میرے ساتھ ساری دنیا کو فخر سے منہ دکھاؤ گی۔"

"پھر تو ابھی آؤں گی۔ بولو کہاں ہو تم؟"

اس نے اپنی رہائش گاہ کا پتا بتا کر کہا۔ ''آجاؤ۔''

وہ فون بند کر کے باپ سے لپٹ گئی۔ ''اوہ ڈیڈ! آپ جو چاہتے تھے' وہی ہو رہا ہے۔ وہ میری طرف مائل ہو گیا ہے۔ دونوں سورماؤں کے درمیان رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ میں لباس بدل کر آتی ہوں۔ آپ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہیں۔ مجھے وہاں فوراً پہنچنا چاہیے۔''

وہ اپنے بیڈ روم میں آئی۔ وارڈ روب سے ایک بہترین لباس کا انتخاب کیا۔

پھر وہ پوری طرح تیار ہو کر قیامت بن کر باپ کے پاس آئی پھر ٹھٹک گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا ایک ریوالور سے سائیلینسر منسلک کر رہا تھا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں؟''

''میں کچھ نہیں کروں گا۔ کسی کو گولی نہیں ماروں گا۔ بس آج کل میں ایک سورما دوسرے سورما پر گولی چلائے گا۔ ہم تو بس اتنا ہی کریں گے کہ بنجامن کو سولومن پر گولی چلانے کے جنون میں مبتلا کر دیں گے۔''

اس نے پوچھا۔ ''پلیز۔ مجھے بتائیں' بنجامن کو رقابت کے جنون میں کیسے مبتلا کریں گے؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔ بتاتا ہوں۔''

وہ باپ کے ساتھ بنگلے سے باہر کار کے پاس آئی۔ باپ نے کہا۔ ''تم نے فون پر بنجامن سے کہا ہے کہ ابھی ملنے آ رہی ہو؟''

''ہاں۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہا ہوگا۔''

انتھونی نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کا نشانہ لے کر گولی چلائی۔ سائیلنسر کے باعث فائر کی آواز نہیں گونجی لیکن کھڑکی کا بلٹ پروف شیشہ تڑخ گیا۔

سیلینا نے شدید حیرانی سے باپ کو دیکھا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا؟''

''یہ میں نے نہیں' سولومن یا اس کے کرائے کے قاتلوں نے کیا ہے۔ تم بنجامن سے ملنے جا رہی ہو۔ رقیب نے تم پر گولیاں چلائی ہیں۔ تم گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرتی ہوئی اس سے ملنے آ گئی ہو۔''

یہ کہتے ہی اس نے کار کے بونٹ پر پھر پچھلی کھڑکی کی سیٹ پر ایک گولی چلائی۔ وہ دوسرا شیشہ بھی تڑخ گیا۔ بونٹ پر بلٹ کا نشان پڑ گیا۔

وہ باپ کے ریوالور والے ہاتھ کو تھام کر پھر چوم کر بولی۔ ''واٹ اے فنٹاسٹک آئیڈیا... بنجامن اس بات سے متاثر ہوگا کہ میں گولیوں کی بوچھاڑ میں موت کی پروا کیے بغیر اس سے ملنے آئی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''اور دوسری اہم بات یہ کہ وہ تمہاری جان لینے والے دشمن کا جانی دشمن بن جائے گا۔ انتقام کے جنون میں آج ہی اس پر قاتلانہ حملہ کرے گا۔ ہم دور سے تماشا دیکھیں گے کہ وہ سورما ایک دوسرے سے کس طرح ٹکراتے ہیں!''

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ''میں اپنے دیوانے کو مرنے نہیں دوں گی۔ مرے گا' وہی بہروپیا مسلمان۔''

مقدر جب تک موت کی لکیر نہ کھینچے' تب تک کوئی کسی کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے خود اس گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

وہ بنجامن کے پاس جانے کے لیے کار کا دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ ایسے وقت تڑا تڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ ابھری۔ وہ کار کے دروازے سے ٹکراتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ انتھونی پہلے ہی زمین پر اوندھے منہ لیٹ گیا تھا۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ فائر کرنے والے ایک ویگن کار اور بائیک پر تھے۔ آندھی طوفان کی طرح آ کر گزر گئے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز نے انجانے دشمنوں پر جوابی فائرنگ کی تھی لیکن وہ سلامتی سے گزر گئے تھے۔

انتھونی فوراً ہی اٹھ کر دوڑتا ہوا بیٹی کے پاس آیا۔ کئی ملازم اور گارڈز بھی آ گئے۔ وہ زندہ تھی' تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ ایک گولی پسلی کی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔

وہ اتنی جلدی مرنے والی نہیں تھی۔ بیہوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سوزانہ نے فون پر کہا۔ ''تم نے منع کیا تھا کہ میں نہ تو تم سے ملاقات کروں' نہ ہی فون پر بات کروں۔ لیکن پچھلی شام ٹی وی پر سیلینا فورڈ کا بیان سن کر مجبوراً تمہیں کال کر رہی ہوں۔''

جلالت نے کہا۔ ''آگے کچھ نہ کہو۔ فوراً یہاں چلی آؤ۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''میں ابھی آئی۔''

جلالت فون بند کر کے اپنے موجودہ حالات پر ہر پہلو سے غور کرنے لگا۔ یہ پہلو زیادہ تشویشناک تھا کہ بنجامن یہودا دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اس کے عاشقانہ تیور بتا رہے تھے کہ سیلینا اپنی کافرانہ اداؤں سے جہاں موڑے گی' وہ اُدھر مڑ جائے گا۔

باپ بیٹی کیسی سازشیں کرنے والے تھے' وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن عقل اور تجربے نے سمجھا دیا تھا کہ وہ مغرور رئیس اعظم اس سے دشمنی کی انتہا کر دے گا۔

سوزانہ آ گئی۔ بنگلے میں داخل ہوتے ہی اپنے مزاج کے مطابق اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''اسٹاپ۔ یہ مت بھولو کہ ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔''

وہ مایوس ہو کر بولی۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جب دور دور رہنا ہے تو مجھے یہاں کیوں بلایا؟''

''اس لیے کہ جو باتیں میں کرنے والا ہوں' وہ فون پر نہیں ہو سکتی تھیں۔ سامنے صوفے پر بیٹھو اور میری بات سنو۔''

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''سیلینا فورڈ نے ٹی وی کے ذریعے تمہارے خلاف خوب زہر اگلا ہے۔ پوری یہودی قوم تم پر شبہ کر رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ تم ہیکل کے سورما نہیں ہو سکتے کیونکہ مسلمان ہو۔''

''اسی لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ ابھی یہاں سے جا کر ہمارے مجاہدین سے ملو۔ ان سے کہو' جتنی جلدی ممکن ہو سکے' مجھے سرحد پار کرا دی جائے۔''

''کہاں جانا چاہو گے؟''

''ابھی تو لبنان جانے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد دیکھو کہ کہاں کس ملک میں آزادی سے رہ سکوں گا؟''

''میں بھی سوچ رہی تھی' کچھ عرصے کے لیے یورپ یا امریکا چلی جاؤں گی۔ اب تو لبنان جاؤں گی۔''

''کیا مجھے پھنساؤ گی؟ ہمارے دشمن اکابرین جانتے ہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان کیا تعلقات ہیں۔ تم اس ملک سے باہر جاؤ گی تو سی آئی اے اور موساد کے جاسوس تمہارے آس پاس مجھے ڈھونڈتے رہیں گے۔''

وہ مایوسی سے بولی۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو شاید واپس نہیں آؤ گے۔ کیا مجھے اپنی شریک حیات نہیں بناؤ گے؟''

''میں اپنی زبان سے نہیں پھرتا اور تم میری مجاہدانہ زندگی کے مطابق جان کی بازی لگانے والی ساتھی ہو۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی۔ فی الحال عدت کے دن گزارنے ہیں۔ تم اسرائیل سے باہر نہ جاؤ۔''

''تم نے مونیکا کے بارے میں بتایا تھا۔ اب اس کا نام ورقہ ہے۔ تم نے اس سے بھی شادی کا وعدہ کیا ہے؟''

''ہاں۔ میں وعدے سے نہیں پھروں گا۔ تم سے کہہ چکا ہوں' حالات سازگار ہوں گے تو تم ایک سوکن کو برداشت کر لو گی۔''

"یہ بہت مشکل ہے لیکن تمہاری خاطر برداشت کروں گی۔ ویسے تمہیں خوب سمجھتی ہوں' تم عورت کے بغیر نہیں رہو گے۔ جہاں جاؤ گے' ورقہ کو بلاؤ گے۔"

"ورقہ شاید غزہ سے باہر نہ نکل سکے۔ مجھے اپنے بیٹے کو وہاں سے نکالنا ہے۔ آئندہ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

"پھر تو سمجھو ورقہ بھی وہاں سے نکلے گی۔ تمہارے بیٹے کو لانے کے بہانے پیا ملن کے لیے آئے گی۔"

"تم خوامخواہ ورقہ کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ وہ آئے نہ آئے کوئی دوسری تیسری ضرور آئے گی۔ پھر ورقہ سے ہی حسد جلن کیوں؟"

"بات حسد جلن کی نہیں ہے۔ تم ہر رات رنگ رلیاں مناؤ' میں اعتراض نہیں کروں گی لیکن منکوحہ گھر والی صرف میں رہنا چاہتی ہوں۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "میں ابھی سنگین حالات سے دوچار ہو رہا ہوں۔ باہر ہر قدم پر میرے دشمن ہیں۔ انتھونی اور بنجامن مجھے کسی وقت بھی کسی طرح کی سازشی موت مار سکتے ہیں اور تم ہو کہ مجھے دو سوکنوں کے مسئلے میں الجھا رہی ہو۔"

"دل میں ایک بات آئی تھی' وہ کہہ دی۔ اب سوکن کی بات نہیں کروں گی۔ بولو' ابھی کیا کرنا ہے؟"

"ڈیوڈ براؤن یا ووکی موسس کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو' مجھے آج رات اسرائیلی سرحد پار کرائیں۔ میں اسرائیل سے قریب لبنان میں رہنا چاہتا ہوں اور پارٹی کو میرا پیغام دیں کہ وہ کسی طرح میرے بیٹے ایان کو بھی وہاں پہنچا دیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر بولی۔ "تمہارا پیغام ابھی پہنچا دوں گی۔ انہیں تمہارے حالات بھی بتاؤں گی۔ کیا اس کے بعد تمہارے پاس واپس آؤں؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ پھر بولا۔ "تم ناراضی دکھا رہی ہو۔ کیونکہ میری طرف سے تمہیں صدمہ پہنچ رہا ہے۔ کسی سوکن کو برداشت نہیں کرنا چاہتیں اور میرے فیصلے سے مجھے روک نہیں سکتیں۔ تم کشمکش میں ہو کہ آئندہ میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہیے یا نہیں؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہی ہوں۔ مگر صاف کہہ دیتی ہوں' کسی سوکن کو برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

"میں صاف کہہ دیتا ہوں۔ دو عورتوں کی لڑائی میں مرد مارا جاتا ہے۔ تم دونوں کے جھگڑے میرے لیے نئے نئے مسائل پیدا کرتے رہیں گے۔ میں معلوم کروں گا۔ شاید ورقہ بھی تمہیں برداشت نہیں کرے گی۔ پھر میں تم دونوں پر لعنت بھیج دوں گا۔"

سوزانہ نے چونک کر پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ جلالت نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میری زندگی سے نکل جاؤ۔ میرا کوئی کام نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ جیسے ہاتھ سے نکلنے والی چیز کو جھپٹنے آئی۔ اس کی مرضی کے خلاف آ کر اس سے لپٹ گئی۔ "نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ تمہارا کام کرتی رہوں گی۔ تمہاری زندگی سے کبھی نہیں نکلوں گی۔ میری انسلٹ نہ کرو۔ میں آخری سانس تک تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے کہا تھا کہ فاصلہ رکھو لیکن اس کی محبت' وفاداری اور جوش و جذبے نے فاصلہ ختم کر دیا تھا۔ وہ آ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ جواباً اسے بازوؤں میں نہیں لے رہا تھا۔ ایک ذرا گرمجوشی نہیں دکھا رہا تھا۔

وہ بڑی دیر تک بولتی رہی۔ اس سے وفاداری کی قسمیں کھاتی رہی۔ اس نے پوچھا۔ "کب تک لپٹی رہو گی؟ تم مجھ سے لپٹ کر اپنی ہوس کو تسکین دے رہی ہو۔ اپنے بدن کی گرمی سے میرے اندر تحریک پیدا کرنے کی کوششیں کر رہی ہو۔"

وہ الگ ہو کر بولی۔ "کسی لڑکی کا نیا بدن ہوتا تو تمہارے اندر تحریک پیدا ہوتی۔ مجھ سے تو دل بھر گیا ہے۔ کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں کہ میرے لیے کچھ تو جذبہ پیدا ہوگا۔ پیار نہیں کرو گے' کم سے کم بازوؤں میں تو بھر و گے مگر نہیں۔ اب میں وہ عورت نہیں رہی' جس سے پیار کیا جاتا ہے۔ صرف وہ ہوں' جس سے اپنا کام نکالا جاتا ہے۔"

"میں عورت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے والا خود غرض اور مطلب پرست نہیں ہوں۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "تم ہو۔ تم نے مجھ سے بڑے بڑے جان جوکھم میں ڈالنے والے کام لیے ہیں۔ اب اس ملک سے بھاگ رہے ہو۔ یہاں سے جانے کے بعد میری ضرورت نہیں رہے گی۔ اس لیے فاصلہ رکھنے لگے ہو۔ آج رات یا کل چلے جاؤ گے تو کہاں کی قربت؟ کہاں کا فاصلہ...؟"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولی۔ "یہاں سے جا کر ورقہ کے ساتھ موج مستی کرو گے۔"

"میں بحث نہیں کروں گی۔ اب تو صاف صاف کہہ دوں کہ مجھے مذہب بدلنے سے دلچسپی نہیں ہے۔ صرف تمہیں خوش کرنے اور تمہیں حاصل کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے۔ اگر تم یہاں سے نہیں جاؤ گے' میرے ساتھ دن رات

رہو گے تو تمہاری مسلمان شریکِ حیات بن کر رہوں گی۔"

"میں نے بہت پہلے ہی تمہیں سمجھا دیا تھا کہ میری خاطر دین کی طرف نہ آؤ۔ سچے دل سے اسلام قبول کرو۔ اب تمہاری شرط یہ ہے کہ تمہارا بستر گرم کرتا رہوں گا تو تم مسلمان بن کر رہو گی تو میں تمہیں ابھی دھتکارتا ہوں۔ میرے گھر سے' میری زندگی سے نکل جاؤ۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "سوچ لو' میں تمہاری رازدار ہوں۔ ابھی یہ کوئی نہیں جانتا کہ تم آج رات یہاں سے فرار ہونے والے ہو۔ فرار کے تمام راستے مسدود ہو سکتے ہیں۔"

وہ اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں یہاں نام بدل کر' بھیس بدل کر رہنے والے دو مجاہدین کے نام پتے اور فون نمبر جانتی ہوں۔ انہیں گرفتار کراؤں گی تو موساد کے ایجنٹ انہیں ٹارچر سیل میں لے جا کر دوسرے روپوش رہنے والے مجاہدین تک بھی پہنچ جائیں گے۔"

جلالت نے غصے میں سوزانہ کو دھتکار دیا تھا۔ اب سوچ رہا تھا کہ وہ رازدار بن کر مصیبت بن گئی ہے۔ صرف اس کا راستہ نہیں روکے گی' دوسرے مجاہدین کی بھی موت کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس نے بےبسی سے اسے دیکھا۔ وہ اچانک بہت خطرناک طاقتور ہو گئی تھی۔ اگر ابھی وہ اس کی گردن دبوچ لیتا تو دوسری سانس نہ لے پاتی۔ لیکن اس چار دیواری میں اس کی موت مسئلہ بن جاتی۔ پہلے ہی مخالفتیں اور مسائل کم نہ تھے۔

وہ بولی۔ "یقیناً ابھی تم مجھے مار ڈالنے کے متعلق سوچ رہے ہو گے۔ سوچو' اچھی طرح سوچو' اس گھر میں میری موت تمہارے گلے کا پھندا بن جائے گی۔"

وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "ابھی نہ میں تم سے دشمنی کر رہی ہوں' نہ تم دشمن بن کر سوچو۔ میں پہلے کی طرح تمہاری ہمراز اور وفادار بن کر رہوں گی۔ میری یہ شرط ہے کہ تم دشمنوں سے بھاگ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں کسی بھی دشمن کو تمہارے سائے تک پہنچنے نہیں دوں گی۔ پھر بھی جانا چاہو گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

اب اس سے وفا کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ جلالت نے اس پر اعتماد کر کے اسے دو مجاہدین تک پہنچا کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جو عورت اس کے ساتھ سونے کے لیے شہر کے میئر کو ہلاک کر سکتی ہے' شوہر کی موت پر خوش ہو سکتی ہے۔ دکھاوے کے لیے' دھوکا دینے کے لیے اسلام قبول کر سکتی ہے۔ وہ بھلا ایک سورما کی وفادار کب تک رہتی؟ اس سے دل بھر جاتا تو سیلینا کی طرح کسی نئے آنے والے سورما کی سیج پر جا کر جلالت کا اور مجاہدین کا تمام بھید کھول دیتی۔ اب وہ اس پر بھروسا کرنے والا نہیں تھا۔ اسے اپنی بھی فکر نہیں تھی۔ لیکن اپنے دو مجاہدین کو بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے والا تھا۔

سوزانہ اپنی بات کہہ کر دروازے سے باہر جانا چاہتی تھی۔ پھر رک گئی۔ پریشان ہو کر بولی۔ "سولومن! یہاں آؤ۔ دیکھو کیا ہو رہا ہے؟"

وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ پولیس کے مسلح سپاہی بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر رہے تھے۔ آگے اور پیچھے والی گلی کو بند کر رہے تھے۔ وہاں سے کسی کو گزرنے کی اجازت نہیں دی جانے والی تھی۔

پیشوائے اعظم' ربّی اور انٹیلی جنس کے افسران کی گاڑیاں احاطے کے اندر اور باہر آ کر رک گئی تھیں۔ وہ سب بنگلے کے اندر آ رہے تھے۔

جلالت نے ان سے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

پولیس کے ایک افسر نے کہا۔ "تمہارے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ اسی لیے سیکیورٹی کے سخت انتظامات کیے جا رہے ہیں۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "سیلینا پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ بچ گئی ہے لیکن بری طرح زخمی ہے۔ اسپتال میں اسے خون پہنچایا جا رہا ہے۔"

انٹیلی جنس کے ایک افسر نے پوچھا۔ "مسٹر سولومن! تم دو گھنٹے پہلے کہاں تھے؟"

"میں اسی بنگلے میں تھا۔ صبح آٹھ بجے پیشوائے اعظم کی رہائش گاہ میں میٹنگ تھی۔ آپ سب موجود تھے۔ ٹھیک گیارہ بجے میں وہاں سے یہاں اپنے بنگلے میں آ گیا۔"

"جب تم پیشوائے اعظم کی رہائش گاہ سے نکلے تھے' اس کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد سیلینا پر حملہ ہوا۔ انتھونی فورڈ تمام اعلیٰ حکام اور آرمی کے افسران سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تم مسلح افراد کے ساتھ آئے تھے اور فائرنگ کرتے ہوئے گزر گئے تھے۔"

جلالت نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ میں پیشوائے اعظم کے گھر سے نکلتے ہی مسلح افراد کے ساتھ وہاں گولیاں چلانے پہنچ جاؤں گا؟"

ایک ربّی نے کہا۔ "ہم یقین سے کہہ رہے ہیں' تم نے اس واردات کی پلاننگ پہلے سے نہیں کی تھی۔ تم کل

ابیب میں تھے اور اس کا بنگلا حیفہ ضلع کے شہر باقہ جت میں ہے۔ تم وہاں پندرہ منٹ میں پہنچ نہیں سکتے تھے۔"

انٹیلی جنس کے افسر نے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ انتھونی بھاری بھرکم شخصیت کا حامل ہے۔ اس کی چشم دید گواہی کو آسانی سے جھٹلایا نہیں جاسکے گا۔"

ایک افسر نے کہا۔ "انتھونی کہہ رہا ہے' اس کی بیٹی کا اور کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس نے ٹی وی کے ذریعے ہیکل کے سورما کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کی اصلیت بتائی تھی کہ وہ یہودی نہیں' مسلمان ہے۔"

اس نے جلالت سے کہا۔ "سب ہی کہیں گے کہ سیلینا نے تمہیں بے نقاب کر کے تم سے دشمنی کی ہے۔ اسی لیے تم نے اسے قتل کرنا چاہا تھا۔"

ایک ربی نے کہا۔ "وہ قتل کی ٹھوس وجہ بیان کر رہا ہے۔ جبکہ بیان غلط ہے۔ سیلینا بھی ہوش میں آئے گی' بولنے کے قابل ہوگی تو وہ بھی تمہیں قاتلانہ حملے کا مجرم کہے گی۔"

پیشوا نے کہا۔ "وہ باپ بیٹی یہودی قوم کو تمہارے خلاف بھڑکانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہم تمام دینی رہنما عوام کو سمجھائیں گے' تب تک تم اس گھر کی چار دیواری میں رہو گے۔ باہر نہیں نکلو گے۔"

پولیس افسر نے کہا۔ "جب تک اصلی مجرم گرفتار نہیں ہوں گے' تب تک ہمارے سپاہی تمہیں یہاں سے باہر نہیں جانے دیں گے۔"

جلالت نے کہا۔ "یعنی مجرم گرفتار نہ ہوئے تو مجھے گرفتار کیا جائے گا؟ اسی لیے یہاں نظر بند رکھا جا رہا ہے تاکہ میں فرار نہ ہو جاؤں؟"

"دینی رہنما بھی تمہاری نظر بندی پر اعتراض کر رہے ہیں۔ یہ تمہاری آزادی چاہتے ہیں لیکن ہم مجبور ہیں۔"

پھر افسر نے سوزانہ سے کہا۔ "میڈم! آپ کو یہاں سے جانا چاہیے۔ آج سے ہماری اجازت کے بغیر کوئی ان سے ملنے نہیں آئے گا۔"

سوزانہ جلالت کے لیے زندگی کی طرح اہم اور موت کی طرح اٹل ہو گئی تھی۔ اس سے نمٹنے کے لیے رابطہ رکھنا اور اس سے ملتے رہنا بہت ضروری تھا۔ سوزانہ نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں فون کے ذریعے تمہاری تنہائی دور کروں گی۔ تم سے ملنے اور یہ پابندیاں ہٹانے کے لیے انتھونی فورڈ اور سیلینا کے خلاف فائٹ کرتی رہوں گی۔"

وہ پہاڑ جیسے مرد کے ساتھ رہنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ جلالت سے پیار بھی کر رہی تھی اور اسے بلیک میل بھی کر رہی تھی۔ اس کی دشمنی مہنگی پڑنے والی تھی اور دوستی سلامتی دینے والی تھی۔ فی الحال وہ وہاں سے چلی گئی۔

جلالت تھوڑی دیر تک دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس عورت سے دشمنی نہیں کی جاسکتی تھی اور یہی عقل سمجھا رہی تھی کہ ایسی عورت سے دوستی بھی نہ کرے۔

پولیس اور انٹیلی جنس کے افسران نے کہا۔ "ہم باہر جا رہے ہیں۔ ہمارے تمام معزز ربی اور پیشوائے اعظم صرف آدھے گھنٹے تک تم سے باتیں کریں گے پھر یہ بھی آجائیں گے۔ دروازے کو باہر سے لاک کر دیا جائے گا۔"

وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ ایک ربی نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ پیشوا نے جلالت سے کہا۔ "دوسرے کمرے میں چلو۔"

وہ اس کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آیا۔ پیشوا نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ موجودہ حکمران اور آرمی کے کچھ افسران انتھونی فورڈ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہم تمام دینی رہنما انتھونی کے خلاف ہیں۔ یہ لوگ پیشوائے اعظم کے اختیارات ختم کر رہے ہیں۔ تمہاری گرفتاری اور پابندی کو قانونی معاملہ کہہ کر تمہیں ہم سے دور کیا جا رہا ہے۔"

"آپ نے فرمایا تھا کہ میں ہیکل کا سورما ہوں اور ہر قیمت پر مجھے تحفظ فراہم کریں گے۔"

"بیشک ہم تم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ ہم نے عدالت سے یہ ضمانت حاصل کی ہے کہ آج شام چھ بجے دینی رسومات ادا کرنے کے لیے تمہیں سینی گاگ لے جائیں گے۔ وہاں ہیکل کے دو سورما شمعیں روشن کریں گے اور وہاں عبادت کریں گے۔"

"کیا بنجامن رسومات ادا کرنے آئے گا؟"

"وہ ضرور آئے گا۔ مسلح گارڈز کی موجودگی میں تم سے دشمنی نہیں کرے گا۔"

وہ اس کی طرف جھک کر دھیمی سرگوشی میں بولا۔ "ہم تم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ تمہیں ان تمام دشمنوں کی موجودگی میں غائب کر دیں گے۔ پھر جب تک تمہارے تمام مخالفین سے نمٹ نہیں لیں گے' تم یہاں واپس نہیں آؤ گے۔"

جلالت نے حیرانی سے پیشوا کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جلالت پہلے ہی فرار ہونے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ جسے سوزانہ ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ پیشوا اور تمام ربی

انجانے میں اس کی مشکل آسان کرنے والے تھے۔

پیشوا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ بتانے کا وقت نہیں ہے۔ یہاں سے فرار ہوتے وقت تمہیں ہماری تمام پلاننگ معلوم ہو جائے گی۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ جلالت اس کے پیچھے تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ پیشوا تمام ربیوں کے ساتھ چلا گیا۔ ایک پولیس افسر نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

وہ ہر طرف سے جکڑا ہوا تھا۔ دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ ایک خیال یہ آرہا تھا کہ سوزانہ بھی اس کے ساتھ جائے گی تو مجاہدین سے دشمنی کرنے کے لیے یہاں نہیں رہے گی۔ اگرچہ خطرناک بلا تھی' لیکن جتنے عرصے تک وہ اپنے پہلو میں اسے آباد رکھتا تو بلاشبہ وفادار بن کر رہتی اور دشمنوں کے خلاف اس کے کام آتی رہتی۔

اس نے اس پہلو پر اچھی طرح غور کیا پھر پیشوائے اعظم سے فون پر کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ بہت الجھا ہوا ہوں۔ سوزانہ میری اہم ضرورت ہے۔ اگر مجھے جنت میں جانے کو کہا جائے گا تو میں اس کے بغیر نہیں جاؤں گا۔ وہ میرے ساتھ نہیں ہوگی تو میں آج سینی گاگ میں شمعیں روشن کرنے نہیں آؤں گا۔"

"ایک عورت کی خاطر عبادت سے انکار نہ کرو۔"

"میں انکار نہیں کروں گا۔ آپ سے التجا کرتا ہوں' سوزانہ کو سینی گاگ میں بلائیں۔ پھر آپ مجھے سینی گاگ سے آگے جہاں لے جائیں گے' میں سوزانہ کو ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

پیشوا ذرا فکر میں مبتلا ہوا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ابھی سوزانہ سے ملوں گا۔ پھر تم سے بات کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد پیشوا نے کہا۔ "میری اس سے بات ہو گئی ہے۔ وہ عبادت کے وقت تمہارے ساتھ رہے گی۔ عبادت جنت کے دروازے کھولتی ہے۔ تم جنت میں جاؤ گے' وہ بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔"

جلالت نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اشارے کنائے میں یہ معلوم ہو گیا کہ سوزانہ راضی ہے۔ پیشوا اور ربی جلالت کو جہاں پہنچائیں گے' وہ بھی وہاں جائے گی۔ خواہ جہنم میں ہی کیوں نہ جانا ہو' اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔

☆☆☆

بنجامن یہودا اسپتال پہنچا تو سیلینا کے زخموں کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ وہ غافل پڑی تھی۔ اسے خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اس نے بے ہوش محبوبہ کو دیکھا تو محبت کے جذبات سے بھر گیا۔ بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر اس کے خوبصورت ملائم ہاتھ کو تھام کر قسم کھانے لگا کہ دشمن کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ انتھونی معصوم سی صورت بنائے کہہ رہا تھا۔ "ہائے میری بچی! اس نے گولی کھا کر گرتے وقت تمہیں پکارا تھا۔ تمہارا ہی نام لیتے ہوئے جان دینے والی تھی۔ خدا نے اسے تمہارے لیے زندہ رکھا ہے۔"

یہ ایسی باتیں تھیں جو دیوانے کو اور دیوانہ بنا دیتی ہیں۔ بنجامن نے کہا۔ "میں خوب سمجھ رہا ہوں' سیلینا نے اس بہروپیے کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے تاکہ کوئی بھید کھولنے والا نہ رہے۔ ایک سورما دوسرے سورما کی جان نہیں لیتا۔ میں مذہبی رہنماؤں کو ناراض نہیں کروں گا۔ ان کی موجودگی میں اس سے جان لیوا دشمنی نہیں کروں گا لیکن اس کے دل اور دماغ کو مجروح کرتا رہوں گا۔ ایسی اندرونی چوٹیں پہنچاؤں گا کہ وہ گھبرا کر خودکشی کر لے گا۔"

"تم اسے تڑپا تڑپا کر مارو گے تو میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑتی رہے گی۔ سیلینا تو تم پر قربان ہوتی رہے گی۔"

وہ گہری نیند میں تھی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر آکر ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ بنجامن کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے نمبر پڑھ کر کہا۔ "پیشوائے اعظم کال کر رہے ہیں۔" پھر اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "معزز پیشوائے اعظم پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں۔ فرمایئے کیسے یاد کیا؟"

"تم کہاں ہو؟ کیا تمہیں معلوم ہے' سیلینا پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سولومن نے میری سیلینا پر گولی چلائی ہے۔"

"پلیز بنجامن! ایک عورت کے عشق میں اندھے نہ بنو۔"

"مسٹر فورڈ نے قاتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"وہ دو سورماؤں کو لڑانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ وہاں جو واردات ہوئی' اس سے پندرہ منٹ پہلے سولومن تل ابیب میں ہمارے اور کئی اکابرین کے ساتھ تھا۔ تل ابیب سے حیفہ کے شہر باقہ جت تک کوئی ایک گھنٹے میں نہیں پہنچ سکتا۔"

"وقت کا صحیح حساب کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ وہ واردات سے پندرہ منٹ پہلے نہیں' ایک گھنٹا پہلے آپ لوگوں سے رخصت ہوا ہوگا۔"

"تمہارے سر پر وہ عورت ایسے سوار ہو گئی ہے کہ تم اپنے پیشوا کے صحیح حساب کو غلط کہہ رہے ہو۔ بہتر ہے' ابھی

ہمارے پاس آؤ۔"

"میں اسپتال میں سیلینا کے ہوش میں آنے کا انتظار کررہا ہوں۔ اس سے باتیں کرکے اسے تسلیاں دینے کے بعد آؤں گا۔"

"تمہیں یاد ہے' آج ہفتہ ہے۔ آج رات دونوں سورما سینی گاگ میں شمعیں روشن کریں گے۔ پھر وہ شمعیں ہیکل میں لے جاکر عبادت کریں گے۔"

"مجھے یاد ہے۔ شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے سینی گاگ میں آجاؤں گا۔"

"شام سے پہلے آؤ۔ ہم چاہتے ہیں' تمہارے اور سولومن کے درمیان جو رنجش ہے' وہ ختم ہوجائے۔"

"میں آپ کے مقدس سائے میں اس کے ساتھ رہ کر شمعیں روشن کروں گا لیکن اس سے نہ مصافحہ کروں گا' نہ بات کروں گا۔ شام کو سینی گاگ میں آجاؤں گا۔"

اس نے فون بند کردیا۔ سیلینا دو گھنٹے بعد بیدار ہوئی۔ اسے نیند میں رہنے کی دوا دی گئی تھی۔ اس نے خوابیدہ آنکھوں سے دیکھا۔ بنجامن کو وہ کچھ زیادہ ہی حسین لگی۔ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔ اس وقت ناٹک کرنے والی کی آنکھوں میں آنسو نہیں آرہے تھے۔ وہ ان لمحات میں رو رو کر اسے دیوانہ بنانا چاہتی تھی۔ ٹی وی پر اس سے پیار جتاتے وقت اس نے آنکھوں میں گلیسرین لگا کر آنسو بہائے تھے۔

پھر بھی حالات اس کے حسب حال تھے۔ وہ ناٹک تو نہ کرسکی لیکن اچانک زخم سے درد کی ٹیسیں اٹھیں تو وہ رو پڑی۔ اسے الو بنانے کے لیے تقدیر ساتھ دے رہی تھی۔

وہ ایک طرف تکلیف برداشت کررہی تھی۔ دوسری طرف روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں تم سے ملنے آرہی تھی۔ اس دشمن نے مجھے یہاں پہنچادیا۔ چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی پھر تمہارے پاس آؤں گی۔ ہزار بار گولیاں کھاؤں گی اور ہزار بار آؤں گی۔"

ایسی باتیں تو دل میں گھس جاتی ہیں۔ وہ اس پر جھک کر اسے چومنے لگا۔ باپ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ آگے سارا کام بیٹی سنبھالنے والی تھی۔

☆☆☆

شام پانچ بجے ہی پیشوائے اعظم دو ربیوں کے ساتھ اپنی گاڑی میں آیا۔ جلالت ان کے ساتھ سینی گاگ جانے کے لیے گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ ان کے آگے پیچھے مسلح پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی گاڑیاں تھیں۔ سفر کے دوران وہ ان کی باتیں سن نہیں سکتے تھے۔

پیشوا نے جلالت سے کہا۔ "تم نے اشارے کنایوں میں بات کی تھی۔ میں سمجھ گیا' تم سوزانہ کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ جب میں نے اس سے ملاقات کی تو اس نے بھی یہی کہا کہ تمہارے بغیر یہاں نہیں رہے گی۔"

جلالت نے کہا۔ "وہ میرے ساتھ جائے گی۔ مگر معلوم تو ہو' آپ مجھے کہاں پہنچانا اور دشمنوں سے کہاں چھپانا چاہتے ہیں؟"

وہ جلالت کو بتانے لگا کہ وہاں سے کس طرح فرار ہوگا اور فی الحال اسی شہر میں کہاں چھپ کر رہے گا پھر اس نے کہا۔ "سوزانہ کو ساتھ لے جارہے ہو۔ اچھی طرح سوچ لو' عورت ہمیشہ اپنے ساتھ مصیبتیں لاتی ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔" پھر دل میں کہا۔ "یہاں مجاہدین پر وہ جو مصیبتیں لانے والی تھی' ان مصیبتوں کو لے جارہا ہوں۔ آئندہ دیکھوں گا' اس کے ساتھ کیسے گزارہ ہوگا؟"

وہ جلالت سے ملنے کے لیے اور اس کے ساتھ کہیں جانے کے لیے بے چین ہورہی تھی۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی سینی گاگ آگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی بنجامن وہاں پہنچ گیا۔

وہ جلالت کے دشمن کو دیکھ کر کترانا چاہتی تھی۔ وہ بولا۔ "تمہارا اور سولومن کا خوب چرچا ہورہا ہے۔"

"ہاں۔ ہم ایک دوسرے کو جان سے زیادہ چاہتے ہیں اور میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس نے سیلینا سے کوئی زیادتی نہیں کی ہے اور نہ ہی آج اس پر گولیاں چلائی ہیں۔"

وہ بولا۔ "میں جانتا ہوں۔ اچھا ہوا تم مل گئیں۔ تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ میں سیلینا کے جھوٹ اور فریب کو سمجھ رہا ہوں۔"

وہ حیرانی اور بے یقینی سے بولی۔ "پھر سولومن کے دشمن کیوں بن گئے ہو؟"

"میں ناٹک کررہا ہوں۔ کیوں کررہا ہوں' یہاں نہیں بتا سکتا۔ سینی گاگ کے پیچھے تنہائی ہے۔ وہاں چلو اور میری رازدار بن جاؤ۔"

بنجامن کا ایک نیا روپ سامنے آرہا تھا۔ وہ مزید معلومات کے لیے اس کے ساتھ سینی گاگ کے پیچھے ایک کمرے میں آگئی۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ "سولومن نے میری سیلینا کو اسی طرح دھوکا دے کر ایک کمرے میں بند کیا تھا۔"

وہ اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ سیلینا نے ٹی وی اسکرین پر جھوٹی باتیں کی تھیں۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ اس نے گردن دبوچ لی۔ ایسی سخت گرفت تھی کہ منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "سولومن نے بھی اسی طرح گردن دبوچ لی تھی۔ وہ بیچاری چیخ نہ سکی۔ کسی کو مدد کے لیے بلا نہ سکی اور اس طرح اس نے میری سیلینا کی عزت لوٹ لی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اوپری لباس کو پھاڑ ڈالا۔ اس نے دوسری بار چیخنا چاہا تو پھر اس کی آہنی گرفت سے ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ ہتھیار ڈال دیے۔

سیلینا نے ٹی وی پر جس طرح لٹ جانے کی رُوداد سنائی تھی۔ بنجامن ٹھیک اسی طرح سوزانہ سے سلوک کرتا رہا۔ آخر میں اس نے نڈھال ہوجانے والی کے سر کو اور ٹھوڑی کو دو ہاتھوں کی گرفت میں لے کر ایک جھٹکا دیا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ ایک کے بعد دوسری سانس نہ لے سکی۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔

اس نے کمرے سے باہر آکر دیکھا۔ سینی گاگ کے پچھلے حصے میں سناٹا تھا۔ وہ ایک طرف سے گھوم کر بڑے سے احاطے میں آیا۔ وہاں پیشوائے اعظم پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی گاڑیاں آکر رک رہی تھیں۔ جلالت ان کے ساتھ ایک گاڑی سے اتر کر سینی گاگ کے بیرونی دروازے کی طرف جارہا تھا۔

اس نے فون پر سیلینا کو مخاطب کیا۔ "ہائے میری جان! میں نے ابھی تمہارا پہلا قرض ادا کیا ہے۔ سولومن نے جیسا سلوک تمہارے ساتھ کیا تھا۔ ٹھیک ویسا ہی سلوک میں نے اس کی محبوبہ سوزانہ سے کیا ہے۔ اس کے بدن کی بوٹیاں نوچنے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "او بنجامن! آئی لو یو۔ میں تمہاری دوسری کال کا انتظار کرتی رہوں گی۔ مجھے بتاتے رہو' وہاں کیا ہورہا ہے؟"

جلالت نے وہاں پہنچ کر پیشوا سے کہا۔ "سوزانہ نے فون پر کہا تھا' وہ یہاں آچکی ہے۔ مگر کہیں نظر نہیں آرہی ہے۔"

بنجامن نے وہاں آکر پیشوا اور ربیوں کے آگے سر جھکایا۔ جلالت نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ بولا۔ "سوری۔ میں کسی قاتلانہ حملہ کرنے والے سے ہاتھ نہیں ملاتا۔ تم سے دشمنی تو نہیں کروں گا۔ لیکن دوستی بھی نہیں کروں گا۔ ویسے میں نے سوزانہ کو یہاں دیکھا تھا۔ وہ بیرونی دروازے پر آپ لوگوں کا انتظار کررہی تھی۔"

ایسے ہی وقت ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔ "وہ میڈم جو یہاں آئی تھیں' ان کی لاش پیچھے ایک کمرے میں پڑی ہے۔"

یہ سنتے ہی جلالت اچھل پڑا۔ وہاں سے دوڑتا ہوا پچھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ دینی رہنما' پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی تیزی سے وہاں پہنچے۔ ایک بیڈ پر اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پھیلے ہوئے دیدے جیسے آنے والوں کو تک رہے تھے۔

پھٹا ہوا لباس اور جسمانی حالت بتارہی تھی کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ انٹیلی جنس کے ایک افسر اور جاسوس نے قریب جاکر بہ غور معائنہ کیا۔ پھر جاسوس نے کہا۔ "قاتل کوئی بہت ہی شہ زور اور ماہر فائٹر ہے۔ اس نے گردن کی ہڈی توڑ دی ہے۔"

جلالت نے چونک کر بنجامن کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں' ہاں۔ وہ شہ زور اور ماہر فائٹر میں ہی ہوں۔ میرا کیا بگاڑ لوگے؟

انٹیلی جنس کے افسر نے بنجامن سے کہا۔ "آپ نے مقتولہ کو کتنی دیر پہلے سینی گاگ کے بیرونی دروازے پر دیکھا تھا؟"

"میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔ شاید چالیس یا پچاس منٹ پہلے دیکھا تھا۔"

"اس کے ساتھ کوئی تھا؟"

وہ بولا۔ "اکیلی عورت کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ میں نے لائبریری میں جاکر کھڑکی سے دیکھا' وہ کسی کے ساتھ پچھلے حصے کی طرف جارہی تھی۔ میں نے اس شخص کی صورت نہیں دیکھی۔"

انٹیلی جنس والے معمول کے مطابق قانونی کارروائی کرنے لگے۔ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جانے والی تھی۔ وہ سب سینی گاگ میں واپس آگئے۔

جلالت سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ "اچانک کیا ہوگیا؟ جو سوچا نہ تھا' وہ ہوگیا۔ میں نے مجاہدین کی سلامتی کے لیے ایک بار سوچا تھا کہ سوزانہ کو موت کی نیند سلا دوں۔ مگر میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔

پھر میں نے سوچا' اسے مجاہدین سے دور لبنان لے جاؤں گا۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں تھی۔ جب بھی اس کا دل بھر جاتا تو وہ مجھے اور مجاہدین کو بہت نقصان پہنچاتی۔ شاید میں لبنان جاکر اس سے نجات حاصل کرلیتا۔ لیکن اس کی موت تو یہاں لکھی تھی۔"

وہ خیالات سے چونک گیا۔ بنجامن اس کے پاس آکر

مسکرا رہا تھا۔ "آؤ ہم شمعیں روشن کریں۔"

اس نے ایک موم بتی کو تیلی دکھاتے ہوئے کہا۔ "آگ لگاتے وقت یہ سوچنا چاہیے کہ تمہارا گھر بھی جل سکتا ہے۔"

وہ کن انکھیوں سے جلالت کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم سیلینا کو قتل کرنے گئے تھے۔ مگر کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے کہ تم نے میری سیلینا پر گولی چلائی ہے اور . . . اس بات کا بھی کوئی چشم دید گواہ نہیں ہوگا کہ میں نے تمہاری سوزانہ کی گردن توڑی ہے۔"

جلالت اور پیشوا نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بولا۔ "پیشوائے اعظم! میں سورما ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں' میں نے دوسرے سورما سے جانی دشمنی نہیں کی۔ اس کے بدن پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی اور ایسا کبھی ہوگا بھی نہیں۔ ابھی اور سورما آئیں گے۔ ہمیں بارہ کی تعداد میں یکجا ہونا ہے۔"

پیشوا نے کہا۔ "یہ بات بڑی اطمینان بخش ہے کہ تم سولومن کو جانی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ لیکن دلوں میں بغض اور کینہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اپنی ذہانت سے سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ سمجھنا چاہیے۔ عورت کی شیطانی کشش مرد کو مرد سے لڑاتی ہے۔"

جلالت نے کہا۔ "تم نے سیلینا کی باتوں میں آکر میری محبوبہ کو مار ڈالا۔ میں سوزانہ کا انتقام لینے کے لیے سیلینا یا اس کے باپ کو مار ڈالوں گا یا انہیں اپاہج بنا دوں گا۔ اس کے جواب میں تم پھر مجھ سے انتقام لو گے اور یہ سلسلہ نجانے کب تک چلتا رہے گا؟"

وہ بولا۔ "یہ سلسلہ تو اب چلتا ہی رہے گا۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ میں نے پیشوائے اعظم کو زبان دی ہے۔ تمہیں کبھی اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کروں گا۔"

"تم بھی خدا کا شکر ادا کرو کہ اس وقت میرے برابر زندہ سلامت کھڑے ہو۔ اگر سورما کو ہلاک کرنے کی اجازت ہوتی تو۔"

اس نے پھونک مار کر ایک موم بتی بجھائی پھر کہا۔ "تو ایک ہی پھونک میں تمہیں بجھا کر رکھ دیتا۔"

بنجامن نے حملہ کرنے کے انداز میں تن کر کہا۔ "پیشوائے اعظم! یہ مجھے للکار رہا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پیشوا فوراً ہی ان کے درمیان آکر بولا۔ "ذرا عقل سے سوچو اور سمجھو' دلوں میں بغض اور کینہ رہے گا اور عورت فساد کا سبب بنے گی تو تم اپنی زبان سے پھر جاؤ گے۔ بھول جاؤ گے کہ کسی سورما کو ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔ اور ابھی تم سے یہی غلطی ہو سکتی ہے۔"

جلالت نے کہا۔ "چلو غصہ تھوک دو۔ میں سوزانہ کا خون معاف کرتا ہوں۔"

وہ گرج کر بولا۔ "میں تم سے معافی نہیں مانگ رہا ہوں۔"

جلالت نے مسکرا کر کہا۔ "تم نے انتقاماً جو کیا ہے' اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے برادر سورما! تم نے دشمنی نہیں کی ہے۔ سوزانہ کو ہلاک کر کے ایک خطرناک بلا سے نجات دلائی ہے۔"

بنجامن اس بات سے الجھ گیا۔ اس نے گھور کر پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "وہ میرے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گئی تھی۔ جسے نہ میں نگل سکتا تھا' نہ اگل سکتا تھا۔ وہ میری بہت بڑی کمزوری بن گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کیسے اس سے پیچھا چھڑاؤں؟ مگر تم نے پلک جھپکتے ہی پیچھا چھڑا دیا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"بکواس کر رہے ہو۔ میں اور تم پر احسان کروں گا۔ اونہہ..."

"تم نے یہ مہربانی انجانے میں کی ہے۔ ہم دونوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ تم غصہ اور انتقام کے جنون میں مجھے نقصان پہنچاؤ گے اور میں اپنی ذہانت سے' ٹھنڈے دماغ سے اس نقصان کو منافع میں بدل دوں گا۔"

پیشوائے اعظم نے اور ربیوں نے شمعدان اٹھا لیں۔

بنجامن سنجیدگی سے دل ہی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ ابھی اس نے سولومن کو نقصان پہنچایا تھا مگر اس عداوت سے اسے فائدہ حاصل ہوا تھا۔ جلالت نے اپنی شمعدان اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آؤ! اب ہیکل کی چاردیواری میں چلو۔ وہاں ایک ایسا دماغی جھٹکا پہنچاؤں گا کہ اس کے بعد تم بھی مجھ سے دشمنی نہیں کرو گے۔"

جلالت نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ وہ اپنی شمعدان اٹھا کر رقیب کے ساتھ چل رہا تھا۔ اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ آگے کیا کرنے والا ہے؟

اب تک دو ہی سورما آئے تھے اور طرح طرح کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔

آئندہ مزید دس سورما آئیں گے تو کیا ہوگا؟ ایک دوسرے کی نیندیں اڑا دینے والے کیسے کیسے مسائل پیدا کریں گے؟

(جاری ہے)